فروری 2023
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
جولائی 2012
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
www.pklibrary.com

جلد53 • شمارہ 02 • فروری 2023 • زرِ سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 150 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

یادِ یاراں سے مہکتا گلشن

یادوں کے جھروکے میں کھڑے ہوں تو دور تک کے مناظر دکھائی دینے لگتے ہیں...... 22 فروری 2019، جمعۃ المبارک کا سورج طلوع ہونے سے قبل فجر کی اذانوں کے وقت معراج رسول صاحب کی زندگی کا سورج غروب ہوا تھا...... سوچیں تو کل ہی کی بات لگتی ہے مگر آج اس اندوہناک سانحے کو چار سال بیت چکے ہیں۔

نرم خو... حساس دل...... کم گو...... مردم شناس جیسی خوبیوں کے مالک معراج رسول نے اپنی اَن تھک محنت اور کوششوں سے جس ادارے کی بنیاد رکھی...... ایک تناور درخت کی صورت دی...... وہ ادارہ گویا ایک داستان سرائے ہے...... جس کی چھاؤں میں اُن کے ہر دل عزیز مصنفین...... رفقائے کار...... شاعر...... ادیب اور مصور آکر بیٹھتے تھے...... ہر شخص ان کے اخلاق...... مروت اور ضیافت کا ایسا اسیر ہوتا کہ پھر اس داستان سرائے کو چھوڑنا ممکن نہیں رہتا...... ان کی پُر خلوص عنایات اور مہمان نوازی کا سلسلہ تھما نہیں بلکہ اسی تسلسل کو محترمہ عذرا رسول نے جاری رکھا ہوا ہے...... ان نامساعد حالات میں جہاں ہر شے گرانی کی زد میں آچکی ہے...... اپنی نیک نیتی...... اور دوراندیشی سے ادارے کو آگے کی جانب بڑھا رہی ہیں۔ رواں ہے نبضِ دوراں، گردشوں میں آسمان سارے...... اے خدا، قائم و دائم رہیں...... داستاں سرائے کے مخلص و ہمدرد سارے...... معراج صاحب کی جدائی کے اس لمحے کو

یاد کرتے ہوئے ان کے دیرینہ ساتھیوں نے اپنی شمولیت کو اہم گردانا اور اپنے دلی جذبات...... کیفیات اور احساسات کا کچھ اس طرح اظہار کیا ہے......

لئیق خیال

نقشِ آخر

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یادیں دھندلا جاتی ہیں لیکن کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی یادیں نہ صرف اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں بلکہ بوجوہ مزید روشن ہو جاتی ہیں۔ سب سے اہم وجہ تو اُن کے گراں قدر کام ہوتے ہیں جو انہیں زندہ رکھتے ہیں۔ اپنے معراج صاحب بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ مجھے یاد ہے جب وہ بسترِ علالت پر تھے، میں نے اور علی سفیان آفاقی صاحب نے کئی بار پروگرام بنایا کہ کراچی جا کر ان کی عیادت کی جائے، انہیں دیکھا جائے لیکن میں نہیں جاسکا۔ بے شک اس میں معمولی سا دخل میری سستی کا بھی ہوگا مگر اہم ترین...... جی ہاں اہم ترین بات یہ تھی کہ میں معراج صاحب کو شدید علالت، کمزوری و ناتوانی کے حصار میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ ایسی ہی بات آفاقی صاحب بھی کہتے تھے۔ نہ جانے کا دکھ تو رہا مگر اس دکھ پر یہ طمانیت بہت حاوی تھی کہ معراج صاحب کا ہنستا مسکراتا دلآویز چہرہ ہمیشہ تصور میں رہے گا۔ ان کی آنکھیں...... ان کی روشن پیشانی...... ان کا شگفتہ لب و لہجہ...... ان کی نشست و برخاست کا انداز...... ان کی پُرلطف گفتگو سب کچھ ان کے "نقشِ آخر" کے طور پر دل و دماغ میں محفوظ ہو گیا۔ اس محفوظ نقش کے ذریعے انہیں دوبارہ سے دیکھنا بالکل بھی مشکل نہیں اور اگر کبھی تھوڑا مشکل لگے بھی تو آسان ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے چاروں موقر جریدوں کے ساتھ ہی ملکِ عزیز کے گلی کوچوں اور گھروں میں آ موجود ہوتے ہیں۔ ان پرچوں کے خوش رنگ ٹائٹلز میں سے جھانکتے ہیں...... ان کے لفظوں میں مجسم پائے جاتے ہیں...... ان کے کاغذ میں ان کی مہک ہوتی ہے۔ انہیں کون بھول سکتا ہے...... کوئی نہیں۔

موت کہتے ہیں جس کو اے ساغر
زندگی کی کوئی کڑی ہو گی

علم دوست
طاہر جاوید مغل

میرے مربّی، میرے محسن!

معراج صاحب، میرے مربّی، میرے محسن، ان کی برسی آتی ہے تو دل میں ان کی جدائی کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔ میں ان کے ادارے کا ملازم نہیں تھا لیکن ان کی حیثیت میری نظر میں باس کی سی تھی مگر عجیب بات ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ میرے دوست بھی تھے...... اور ایسا ہی دہرا رشتہ ان کا دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ بھی تھا۔ ان سب کے وہ ہمدرد، خیر خواہ، اچھے برے وقت کے ساتھی...... ہر مشکل میں کام آنے والے، زندگی کے ہر ٹیڑھے معاملے میں بہترین مشورہ دینے والے، محض زبانی کلامی نہیں، بلکہ عملی طور پر بیسیوں لوگوں کا ساتھ دینے والے اور اپنی مصروف زندگی میں سے ان کے لیے وقت نکالنے والے...... وہ لوگوں پر مہربان تھے اور اللہ تعالیٰ ان پر مہربان تھا۔ زندگی کے آخری چند سالوں میں، بستر پر گر جانے سے پہلے انہوں نے ایک شاندار اور کامیاب زندگی گزاری۔ ان کی کامیابیوں کا سفر مسلسل جاری رہا...... بہت سے لوگوں نے ان جیسا بننے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ معراج صاحب پر تو اوپر والے کی خاص نظرِ کرم تھی...... جو ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔ اب یہ ایک رسمی سا جملہ بن گیا ہے کہ فلاں کے، اس دنیا سے رخصت ہونے سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ کبھی پُر نہیں ہو سکتا لیکن جن لوگوں کا معراج صاحب سے کوئی تعلق، کوئی وابستگی رہی ہے...... وہ پوری دیانت داری اور سچائی سے کہہ سکتے ہیں کہ معراج صاحب کے جانے سے ان کی زندگیوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے...... وہ کبھی پُر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انہیں فردوسِ بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

دل سے ان کا مداح
محمود احمد مودی

جوہر شناس

جاسوسی گروپ کے بانی معراج رسول صاحب کا ذکر یا خیال آتا ہے تو بحیثیت قاری، لکھاری اور مداح کے دل حسرت محزوں گویا اندر ہی اندر پگھل جاتا ہے۔ عاجز دس سال پہلے حاضر ہوا۔ خیال نہ تھا کہ اتنا زیادہ لکھ جاؤں گا۔ ابتدائی

خواہش تو یہی تھی کہ کم از کم معراج صاحب سے ہی ملاقات ہو جائے گی۔ انکشاف ہوا کہ وہ صاحبِ فراش ہیں اور علالت طول کھینچتی گئی۔ عاجز بھی ملاقات کی آس میں لٹکتا گیا۔ وقت پر لگا کے اُڑ گیا۔ پتا ہی نہیں چلا۔ حسرت و آس مایوسی کی نذر ہوئی اور گوناگوں خوبیوں کا مالک ادارہ ساز، جوہر شناس شخص چاہنے والوں کو اشک بار چھوڑ کر جہان فانی کو خیر باد کہہ گیا۔ عاجز کے ہمراہ کتنے ہی لوگ دعا گو ہیں۔ اب چوتھی برسی آ گئی...... چند الفاظ یا سطور میں کیا خیال آرائی کروں۔ آنکھیں بند کیے معراج صاحب کی تصویر کو گھورتا رہا......

یوں صاحبِ دل بھی ہیں دیوانے بھی
عشاق میں کوئی صاحبِ دل نہ ملا

ربِ کریم ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

عاجز
امجد رئیس

روشن چراغ

معراج رسول صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ پاکستان میں اردو کی ترویج اور مطالعے کی عادت کے فروغ میں ان کے اہم کردار کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ڈائجسٹوں میں چھپنے والی دلچسپ تخلیقات نے شہروں اور دور دراز کے گاؤں، قصبوں، دیہاتوں، گوٹھوں میں اردو کے بے شمار قاری پیدا کیے۔ انہیں زبان کی چاشنی اور داستان گوئی کے حسن کا اسیر بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو ادب اور عالمی ادب کو عام قاری تک پہنچانے کی عظیم ذمے داری انہوں نے نہایت شاندار طریقے سے نبھائی۔ عام فہم زبان اور دلچسپ انداز میں اعلیٰ تخلیقات کو قارئین تک پہنچانا آسان کام نہیں ہے مگر انہوں نے اسے کر دکھایا۔ معراج صاحب کی خدمات...... پاکستان، ساؤتھ ایشیا بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں ان کا نام ہمیشہ ادب، احترام اور محبت سے لیا جاتا رہے گا۔ انہیں یقیناً اس کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے ان کے ڈائجسٹوں سے جڑے لاکھوں کروڑوں قارئین ان کی محنتِ شاقہ اور جذبۂ صادق کی عکاسی کے لیے کافی ہیں مگر زندہ قومیں اپنے ہیروز کو یاد رکھتی ہیں۔ انہیں اگرچہ اس کی ضرورت نہیں مگر علم کے ذریعے لوگوں تک علم و ادراک کی روشنی اور تحریروں کے چراغ جلانے والے معراج رسول صاحب کو ادبی حلقوں اور مقتدر اداروں کی جانب سے اعلیٰ اعزاز سے نوازا جانا چاہیے تاکہ دوسروں کی حوصلہ افزائی ہو اور کچھ تو حق ادا ہو سکے۔ معراج رسول صاحب کا نام اردو زبان، ادب کی تاریخ میں یقیناً زندہ رہے گا۔

ادنیٰ سی قلم کار
روبینہ رشید

اِک حسرت

لکھنے کا سلسلہ نوعمری میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ اوٹ پٹانگ لکھتے ہوئے میں جاسوسی کے لیے لکھنے کے خواب دیکھتا تھا۔ آپ مختلف رسائل سے جڑے ہو اور معراج رسول سے واقف نہ ہو...... یہ ممکن نہیں ہے۔ معراج صاحب کے بارے میں اکثر ہی پڑھنے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے رہے اور میں بھی ان کی شخصیت کے سحر میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔

اس وقت معراج رسول صاحب کو ڈائجسٹوں کی دنیا کا دیوتا کہا جاتا تھا اور میں اس دور میں اس دیوتا کو رُوبرو دیکھنے اور ملنے کی حسرت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ وقت کے ساتھ حسرت زیادہ اور قلم معمولی سا پختہ ہوا تو کراچی کے لیے رختِ سفر باندھا...... خوابوں کی منزل میں قدم رکھا...... اقلیم علیم صاحب کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ ثمر عباس صاحب سمیت دیگر افراد کی محبتوں سے فیض یاب ہوا...... اپنی حسرت مٹانا چاہی تو معلوم ہوا معراج صاحب خاصے علیل ہیں اور فی الوقت ملاقات ممکن نہیں ہے۔ حسرت کو دل میں دبائے واپس لوٹ آیا۔ اس وقت یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ حسرت خلش بن کر دل میں تاحیات رہے گی۔ دیوتا نے بہت جلدی دنیا سے منہ موڑ لیا اور لاکھوں چاہنے والوں کو اداس کر گیا۔ مجھ سمیت اور نہ جانے کون کون اس دیوتا کو بھول چکا مگر اس کے حقیقی چاہنے والے اسے بھلا کہاں بھلانے دیتے ہیں۔ ان ہی حقیقی چاہنے والوں میں سے ایک لیتی خیال بھی ہیں جو ہر سال یاد دلاتی ہیں کہ اس دیوتا کو بچھڑے ایک اور سال بیت گیا ہے۔

معراج صاحب کے لیے ہر دفعہ فاتحہ خوانی کرتے ہوئے اپنی حسرت کو بھی تازہ دم پاتا ہوں۔

اللہ، معراج صاحب کی مغفرت فرمائے اور اُن کے درجات بلند فرمائے۔

حسرت گزیدہ
یعقوب بھٹی

احسان پرور

وہ 1952ء کا سال تھا جب صدر کے اٹھاون بی کے صدارتی حکم کے تحت حکومت ختم ہوئی تو میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اسلام آباد سے آزاد قبائلی علاقے میں منتقل ہو گیا۔ میرے دونوں ساتھیوں کا تعلق بھی میری ہی سیاسی جماعت سے تھا اور وہ بھی میری طرح پولیس کو مطلوب تھے۔ ہم قبائلی علاقے میں آ تو گئے لیکن وہاں پہاڑ اور چٹان کے سوا کچھ نہ تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں پہاڑوں کی زبان آتی تھی نہ یہاں کے پٹھان ہماری زبان جانتے تھے۔ ایسے میں ہمارے میزبان نے ایک وی سی آر کا بندوبست کر رکھا تھا۔ دوسرا مسئلہ میرے لیے یہ تھا کہ میرے ایک ساتھی کو سونے کا مرض تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد جو وہ سوتا تو دوپہر کے کھانے پر زبردستی اٹھانے پر بیدار ہوتا جبکہ دوسرے ساتھی کو سونے کا تو نہیں لیکن فلمیں دیکھنے کا مرض تھا۔ میزبان نے اپنے ذمے یہ بھی لے لیا تھا کہ ناشتے کے ساتھ تین فلموں کے تو کیسٹ بھی لے آتے۔ میرے اس ساتھی کا اصرار تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ فلم دیکھوں اب یہ ایک الگ تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ فلمیں میں دیکھتا تھا لیکن دیکھی ہوئی فلم کو بار بار دیکھنا کسی اذیت سے کم نہ تھا۔ آپ خود سوچیں کہ اگر فلم چاہے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو آپ کتنی بار دیکھ سکتے ہیں۔ اس تکلیف دہ عمل سے بچنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا اور میں نے ذہن میں موجود کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ چھ ماہ میں بہت سی کہانیاں مکمل ہوئیں اور مجھے آبائی شہر جانے کا موقع ملا تو میں کراچی پریس کلب وسعت اللہ سے ملنے پہنچا اور اسے کہانیاں دکھائیں۔ اس نے کہا، کہانیوں کی زبان ڈائجسٹ والی ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم نے ڈائجسٹ بہت پڑھے ہیں۔ میں نے کہا ڈائجسٹ بھی پڑھے ہیں اور ابن صفی کو تو بہت پڑھا ہے لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ قابلِ اشاعت ہیں بھی؟ تو وسعت نے کہا۔ اس کے فیصلے کے لیے تمہیں جمال احسانی سے ملنا ہوگا جو آج کل سسپنس ڈائجسٹ کے ایڈیٹر ہیں۔ میں پریس کلب سے نکل کر سسپنس ڈائجسٹ پہنچا اور اپنی کہانیاں دکھائیں، اس نے کہانیاں دیکھیں اور کہا۔ ”تم ایک سیاسی کارکن ہو، ایسے لطیف جذبات سیاسی کارکنوں میں کہاں ہوتے ہیں“ میں تڑپ کر رہ گیا اور کہا۔ ”مجھے صرف یہ بتادو چھپ سکتی ہیں یا نہیں؟“ تو جمال نے کہا۔ ”یہ کہانی اسی ماہ چھپ جائے گی۔“

میرا معراج صاحب سے وہ پہلا تعارف تھا جو غائبانہ تھا۔ میری وہ کہانی جمال نے معراج صاحب کو دکھائی تھی اور انہی کی اجازت سے چھپی تھی۔ اس کے بعد معراج صاحب سے ملاقات جمال کے ذریعے ہوئی۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے جمال سے ادارے سے کچھ ایڈوانس کی بات کی تھی۔ میری معراج صاحب سے ملاقات ہوئی، جمال انہیں پہلے ہی بریف کر چکا تھا۔ کافی پینے کے بعد میں نے ان سے اپنے مطلب کی بات کرنی چاہی تو انہوں نے کہا۔ ”میں نے ہدایت کر دی ہے آپ بیس ہزار روپے لے لیں۔ یہ رقم کہانیوں کی پیمنٹ سے کاٹ لی جائے گی۔ بیس ہزار کا لفافہ لینے کے ساتھ ہی یہ خوش خبری بھی ملی کہ اس ماہ سے آپ کی فی صفحہ پےمنٹ میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ معراج صاحب کا پہلا احسان تھا۔ دوسرا احسان اس وقت کیا جب میری بیگم بیٹی کی پیدائش کے لیے اسپتال میں داخل ہوئی تھیں اور اس کے بل کی پیمنٹ کرنی تھی۔ معراج صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے فراز کے ذریعے رقم بھجوادی اور فراز نے بتایا کہ معراج صاحب نے کہا ہے، اس ماہ سے فی صفحہ تمہاری پےمنٹ دوگنی کر دی گئی ہے۔ کیونکہ معراج صاحب نے کہا ہے کہ اب بچی کا خرچہ بھی بڑھ گیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے رائٹر کو کچھ تنگی ہو۔ یہ تھا معراج صاحب کا احساس...... ان کا مخلصانہ انداز جو بھلائے نہیں بھولتا...... ان کی یہی یادیں زادِ راہ ہیں۔

احساس شناس
غلام قادر

یادِ محسن...

معراج صاحب کو ہم کبھی نہیں بھول سکتے، وہ ہمیں یاد آتے رہیں گے۔ یادوں کے کارنس پر رکھے ان کے چار گل دستے

جاسوسی، پاکیزہ، سسپنس اور سرگزشت کی صورت ہمیشہ مہکتے رہیں گے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل انسان تھے۔ جوہر شناس تھے، قدرداں تھے اور...... محسن بھی...... جاسوسی، سسپنس، پاکیزہ اور سرگزشت ہم پر ایک احسان ہی تو ہیں، جو تقریباً پچاس دہائیوں سے اردو ادب کی آبیاری اور خدمت کر رہے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ان کے لگائے ہوئے اشجار ثمر بار سے مستفید ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے...... ساتھ ہی ہمیں اس عظیم شخصیت کے لیے دعا گو بھی رہنا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ معراج صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین......

مخلص

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مہربان باغبان

22 فروری 2019 کی صبح یہ روح فرسا خبر سوشل میڈیا کے ذریعے معلوم ہوئی کہ محترم معراج رسول صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ دل نے یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ اتنے لوگوں کی محبوب ہستی انہیں روتا ہوا کیسے چھوڑ کر جا سکتی ہے؟ ادارے سے رابطہ کرنے پر یہ دھچکا حقیقت کا روپ دھار گیا اور بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

معراج انکل سے محفل چیں نکتہ چینی میں پہلی واقفیت تب ہوئی تھی جب میں صرف تبصرے بھیجا کرتا تھا۔ اُن کے برجستہ جملے اور شستہ مزاح آج بھی یاد ہے۔ وقت کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ پیار، محبت اور احترام کا یہ رشتہ صرف قارئین تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے مصنفین کو بھی وہ مقام دیا ہے جو اس سے قبل کسی نے نہیں دیا تھا۔ وہ ایک ایسے مہربان باغبان تھے جنہوں نے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز جیسا خوب صورت باغ نہ صرف بسایا بلکہ اس کی ایسے شاندار طریقے سے آبیاری کی کہ آج یہ ادارہ ڈائجسٹ کی دنیا کا معتبر ترین نام ہے۔ انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اس گلشن میں ایسے ایسے پھول کھلے جو آج دنیائے ادب میں اپنی مہک اس طور پھیلا رہے ہیں کہ ہر ادب شناس طبقہ اس سے محظوظ ہو رہا۔ اردو زبان کی ترویج میں اُن کا جو کردار ہے، وہ ناقابلِ فراموش ہے اور ہمیشہ سنہری الفاظ میں لکھا جائے گا۔ ان کی وفات سے دلی صدمہ پہنچا۔ یہ احساس دوچند ہو گیا کہ ادارے کا نگران اعلیٰ...... جیسے ادارے کا والد اس دنیا سے چلا گیا ہو۔ دلی آرزو تھی کہ وہ ایک بار ہشاش بشاش اور صحت مند ہو کر اپنے لگائے اس پودے کو تناور درخت بنا دیکھ کر ضرور خوشی کا اظہار کرتے۔ کاش ایک بار وہ جاسوسی کی محفل میں پھر سے آ کر ہنستے مسکراتے۔ ہم اُن جیسے سرپرست کو کھو دینے پر افسردہ ہیں جن سے واقفیت تقریباً غائبانہ ہی تھی تو ان لوگوں کے غم کا تو اندازہ کرنا ہی مشکل ہے جنہوں نے اپنی زندگی ان کے ساتھ گزار دی۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے لگائے اس باغ کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ (آمین)

دعاگو

مظہر سلیم ہاشمی

دائمی محبت

محبت فاتح عالم...... پڑھا تھا، سنا تھا لیکن عملی روپ میں اس وقت دیکھا جب جے ڈی پی سے قاری کا رشتہ استوار ہوا۔ جے ڈی پی کے ان ڈائجسٹ کے اولین مطالعے سے ہی مجھے ان سے محبت ہو گئی تھی اور کیوں نہ ہوتی...... ان کے بانی، اس گلشن کو اپنی شب و روز محنت سے سینچنے والے کی محبت بھی تو گندھی تھی...... آج اگر سوچنے بیٹھوں تو اس معمار کی محبت پر رشک آتا ہے۔ کیا عظیم جذبہ تھا اور کیا ہی کمال لگن۔ ستر کی اس دہائی میں جب کتابی دنیا کی مسابقت عروج پر تھی۔ سوشل میڈیا کے ناسور نے عوام کا ذہنی شعور سرطان زدہ نہیں کیا تھا اور مطالعے کا رجحان سلامت تھا۔ ایسے کٹھن دور میں ڈائجسٹ پروان چڑھانا ایک کمال ہی تو تھا۔ یہ کمال ایسے باکمال انداز میں رواں ہوا کہ جے ڈی پی کے رسائل مقبولیت کی معراج تک پہنچے...... کیوں نہ پہنچتے...... انہیں اپنی محبت و لگن اور خونِ جگر سے سینچنے والے بھی تو معراج رسول تھے۔ محبت و خلوص کا ایک پیکر۔ جن کی محبت ایسی لازوال تھی کہ آج بھی لاکھوں دل و دماغ میں خوشبو بن کے بستی ہے۔ اس محبت کی عظمت کو سلام...... اس محبت کی دائمی خوشبو کو سلام...... اس محبت کو بڑی محبت سے نبھانے والے کو سلام......

اس محبت کی دائمی بقا کے لیے دعاگو

زویا صفوان

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

فروری 2023ء کا دوسرا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ کسی بھی ملک کو مضبوط لیڈر شپ ہی مستحکم رکھتی ہے...... جس کی وجہ سے معیشت کا پہیا تیز رفتاری سے دوڑتا ہے...... یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک کو ایمان دار...... پُرخلوص قیادت نہ مل سکی...... موجودہ سیاسی بے یقینی نے ہر شخص کو ہلا کر رکھ دیا ہے...... سیاست کے لحہ بہ لحہ بدلتے مہروں نے سیاسی بے یقینی اور معاشی بحران کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا ہے...... عام، غریب شخص کے لیے دو وقت کی روٹی حاصل کرنا بھی مشکل تر ہو گیا ہے...... مہنگائی کے اس بڑھتے عفریت کا مقابلہ کیونکر ہو سکے گا...... یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے...... آخری لمحوں تک یہ روح فرسا خبر بھی آچکی ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں ڈالرز انتہائی بلند سطح پر پہنچ چکا ہے...... ماہرین کا کہنا ہے کہ معیشت پر منڈلاتے خطرات انتہا کی طرف بڑھتے دکھائی دے رہے ہیں...... ان دگرگوں حالات میں اپنے مالکِ حقیقی سے دعاؤں کے خواستگار ہیں...... اپنے ملک اور اپنے لوگوں کی بقا کے لیے گڑگڑا کر گناہوں کی معافی کے طلب گار ہیں۔ کہ ایک اچھی سوچ کا مالک، ایک اچھا انسان اس ملک کی تقدیر میں لکھ دیا جائے...... اللہ کی قدرت یہ معجزہ دکھا سکتی ہے...... اب ہمیں کسی معجزے کے ذریعے ہی تباہی سے بچایا جا سکتا ہے......

ملتان سے جنید علی کے پُرسوچ انداز ے" جاسوسی ڈائجسٹ میں پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کی ہے۔ (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے) وہ الگ بات ہے کہ ایک طویل عرصے سے جے ڈی پی کے رسائل پڑھتا ہوں۔ میں بی ایس کا طالب علم ہوں فارغ وقت میں مطالعہ میرا پسندیدہ کام ہے۔ ڈائجسٹ و ناولز کا شوق اپنے والدین سے منتقل ہوا۔ میری والدہ فہمیدہ جاوید پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ہیں اور والد بھی ایک طویل عرصے سے سسپنس و جاسوسی پڑھتے ہیں۔ دسمبر کے آخر میں کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو جہاں ڈائجسٹ کی موسٹ سینئر رائٹر افشاں آفریدی سے ملاقات ہوئی وہیں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے آفس میں وزٹ کیا۔ سسپنس، جاسوسی، سرگزشت اور پاکیزہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹرز سے مثبت و تعمیری اور علمی گفتگو ہوئی اور بہت اچھا لگا۔ ادارہ ماشاء اللہ احسن طریقے سے اشاعتی نظام کو چلا رہا ہے یعنی ایک ایسا ادارہ جو اردو اور مطالعے کو فروغ دیتا ہے۔ اس بار سال نو کا سرورق اچھا تھا بس بیچ میں جو صاحب تھے، بیک سائڈ پر موجود دوشیزہ ان صاحب کے دراز قد کی وجہ سے مکمل نظر نہیں آرہی تھیں۔ ذاکر صاحب کے بعد اب وہ بات نہیں رہی سرورق کی جو ان کے دور میں ہوتی تھی۔ یہ موجودہ مصور ہر بار ایک ہی نین نقش کی دوشیزہ کی تصویر بناتے ہیں اور اب پہلے جیسی انفرادیت نہیں سرورق میں۔ مصور کو چاہیے کہ منظر کشی پر بھی بھرپور توجہ دیں اور ضروری بھی نہیں کہ ہر سرورق پر کسی دوشیزہ کا اسکیچ لازمی ہو، خیر اب اندر ڈائجسٹ میں بھی چلتے ہیں تو فہرست میں اس بار بہت خاص رائٹرز کے نام تھے۔ زندہ مردہ، امجد صاحب کی طویل تحریر میں بہت سسپنس رہا۔ مائیکل آخر میں بچ ہی گیا اور تابوت سے رہا ہو ہی گیا۔ ناول طویل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دلچسپ تھا۔ کاش ایسی ہی تحریریں ہر ماہ ہمیں پڑھنے کو ملیں۔ سایہ، عمران قریشی نے بھی بہت تلخ حقیقت کو تحریر میں واضح کیا۔ کس قدر گھٹیا انسان تھا وہ اور اپنے گھٹیا مقصد کے لیے کیسے بلیک میل کر رہا تھا۔ درس و تدریس جیسے مقدس شعبے کو بدنام کر رہا تھا اور آخر میں پھر ذلالت ہی ہوئی۔ ایسے لوگوں کا بہت بھیانک انجام ہونا چاہیے تھا...... طاہر جاوید صاحب کی تحریر چارہ گر میں ڈاکٹر ثمینہ کا کردار یاد رہے گا کہ کوکب اور ناشاد کو ملانے کے لیے کتنی ایفرٹ کی اور واقعی اب بھی اتنے مخلص لوگ ہوتے ہیں تب ہی تو یہ دنیا قائم ہے۔ طاہر جاوید صاحب اب پلیز جاسوسی میں ذرا جلدی کسی منفرد موضوع پر طویل سلسلے وار ناول کے ہمراہ آجائیں للکار کی طرح۔ دہر میں جاسم نے اپنا بدلہ پورا کر لیا تو یہ ڈیوڈ آ گیا بیچ میں، ریالٹی شو کے نام پر اور اس قسط میں جاسم کا تماس کی وائف سے زیادہ فری ہونا اچھا نہیں لگا۔ وہی ایک کردار کے گرد گھومتی تحریریں چاہے جاسم ہو، روبینہ رشید کی ہیروئن ہو یا پھر سسپنس میں چلنے والے ناول شہ زور کا معاذ ہو ایک جیسے لگتے ہیں ناول۔ وہی اچھے + بہادر + اپنی کسی زیادتی کا بدلہ لینے والے + محبِ وطن + خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہیرو اور ساتھ ان کے ایک کے بعد ایک پیدا ہونے والے دشمنوں کی بھرمار اور یہ ہی سسپنس و جاسوسی کی موجودہ تحریروں میں پڑھنے کو ہر ماہ مل رہا ہے۔ اب وہ چیز نہیں جو بھی للکار، انگارے، گرداب اور دیوی میں دیکھنے کو ملتی تھی یا محی الدین صاحب کے دیوتا میں۔ اگرچہ میں قسط وار تحریریں بھی پڑھتا ہوں مگر ان کا ہر ماہ انتظار نہیں کرتا کہ قسط وار سے زیادہ مکمل ناول ہی پسند آتے ہیں ان کی انفرادیت کی بنا پر۔ اے آر راجپوت بھی میرے پسندیدہ ہیں۔ یہ تحریر بھی بہت اچھی رہی یعنی اتنی کھوج کی مگر پھر بھی

پاگل بننے والے شاہنواز کو خزانہ نہیں ملا کہ تھا ہی نہیں۔ یہ تو شاطر افتخار کا منصوبہ تھا۔ عائشہ نصیر جاسوسی میں اچھا اضافہ ہیں۔ چکما پڑھ کر ٹنگ بھی رہا تھا کہ واقعی ہم جاسوسی پڑھ رہے ہیں۔ بے باک میں بھی عکس فاطمہ صاحبہ نے بتایا کہ رانی یعنی زوجہ محترمہ نے اپنے راجا یعنی شریکِ حیات سے کس طرح جان چھڑائی کہ اگلے جہاں میں ہی ایک انجکشن کے ساتھ پہنچا دیا۔ عشق ناتمام تین اقساط پر مشتمل تھا جو اپنے منفرد انداز، موضوع اور دلچسپ منظر نگاری کے ساتھ ایک مخصوص قبیلے کی نشان دہی کر رہا تھا اور آخری قسط بھی پسند آئی۔ ویل ڈن احمد صاحب۔ اسما قادری کی سرورق کی پہلی تحریر میں سسپنس کی کمی محسوس ہوئی۔ کہ میرا اندازہ درست نکلا۔ چند صفحات پڑھ کر کہ قاتل مقتولہ کے شوہر کی ہی کزن + پہلی پسند ہے۔ آخری تحریر میں ایچ اقبال کی خوب صورت موت واقعی بہت خوب صورت تھی کہ دنیا میں تو اداکارہ صاحبہ اور ابصار تو نہ مل سکے مگر ایک ساتھ خودکشی کر کے اس دنیا سے چلے گئے اور سوچ بھی تو دیکھیں کہ اگلے جہان میں تو مل جائیں گے۔ تراش خراش نے تحریروں کو پڑھنے کے دوران بہت لطف دیا۔ ہاں مجھے آپ لوگوں کے ڈائجسٹ کی یہ بات بہت پسند ہے کہ اسکیچز تحریروں کے عین مطابق ہوتے ہیں جو کہ ڈائجسٹ کے بہتر معیار میں اضافہ کرتے ہیں۔ چٹنی نکتہ چینی میں تمام تبصرے شاندار رہے۔ کاش ہم بھی ایسے تبصرے کر سکیں۔ چلیں اب تو سیکھ ہی جائیں گے۔" (ان شاء اللہ)

اسلام آباد سے بینا راجپوت کا اظہارِ خیال" سال کا پہلا شمارہ اپنے وقت پر ہی موصول ہوا۔ ظفر صاحب نے نئے سال میں بھی سرورق کو عجیب تر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حسینہ کی آنکھیں تو مشرق و مغرب تھیں ہی...... لیکن نیچے جو کارٹون نما انسان بنا رکھے تھے ان کو دیکھ کر مجھے اسکوبی ڈو کی کارٹون سیریز یاد آ گئی۔ اس میں ایسی شکلوں والے ولن ہوا کرتے تھے۔ خیر سو باتوں کی ایک بات سرورق بالکل پسند نہیں آیا۔ نکتہ چینی کی محفل میں محمد حسنین صاحب اپنے مخصوص چلبلے رنگ میں کرسیٔ صدارت پر براجمان نظر آئے۔ مگر معذرت کے ساتھ بھائی صاحب کا تبصرہ کہانیوں پر کم اور نکتہ چینی پر زیادہ محسوس ہوا۔ دہر کے حوالے سے بٹ صاحب پر ان کے لطیف سے طنز نے بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ راحیلہ بھٹی کے خیال میں کہانی کو کہانی سمجھ کر پڑھنا چاہیے تو ایمانداری سے کہوں گی کہ غیر منطقی باتیں مجھ سے کسی طور ہضم نہیں ہوتیں۔ ایک طویل مدت سے جاسوسی کی مستقل قاری بھی اسی لیے ہوں کہ غیر منطقی انجام کی کہانیاں اس ڈائجسٹ کی ریت کبھی بھی نہیں رہیں۔ سندھی کے ڈاکٹر ارسلان کا تجزیہ لاجواب تھا۔ ڈاکٹر صاحب احباب کی محفل میں پورے سال کے بعد شریک ہوئے اور کیا ہی بھرپور شرکت کی۔ اپنے تبصرے میں مجھے یاد رکھنے کے لیے شکر گزار ہوں۔ ان کے تبصرے کی بدولت 2022ء کی بہت سی عمدہ کہانیاں ذہن میں دوبارہ تازہ ہو گئیں جیسے امجد رئیس کی سرخ رات لاجواب تھی۔ ویسے بھی انگریزی تراجم میں امجد رئیس صاحب کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ایکشن سے بھرپور انگریزی ناولوں کے تراجم امجد صاحب کے قلم سے موتیوں کی طرح نکلتے ہیں۔ لفظ لفظ اپنے آپ میں مکمل اور جامع ...... ان کو پڑھنا کھانے کی ایک بھرپور دعوت جیسا لگتا ہے جس میں انسان سیر ہو کر پیٹ بھر لیتا ہے مگر نیت نہیں بھرتی۔ امجد صاحب کی زندہ مردہ بہترین تھی۔ اشلے کے کردار نے دماغ کا فیوز اڑا دیا۔ بیچارہ مائیکل اس کے عشق میں جس بری طرح مبتلا تھا، زوئے کے لیے اس کو حقیقت بتانا واقعی کارِ دشوار ہوگا۔ مارک جیسے دوستوں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ یہاں میں تھوڑی تفصیل میں جاؤں گی کیونکہ کافی حد تک مغرب زدہ ہونے کے باوجود ہمارے معاشرے میں ابھی اس قسم کی روایات نے اپنے پنجے مکمل طور پر نہیں گاڑے اور ہم میں سے بہت سوں کو اسٹیگ نائٹ کا علم نہیں۔ یہ ایک طرح سے بیچلر پارٹی ہوتی ہے جس میں شادی سے چند دن پہلے دلہن اور دولہا کے سب دوست شغل میلہ لگاتے ہیں۔ شراب نوشی، رقص ناچ گانا اور بے ہنگم شور شرابا اس طرح برپا کیا جاتا ہے جیسے خدانخواستہ یہ ان کی آخری رات ہو۔ امجد صاحب نے کہانی کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ اس بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ بعض اوقات مذاق مذاق میں کئی قیمتی زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ سلیم احمد سلیمی کی عشقِ ناتمام بالآخر اس ماہ میں تمام ہو گئی۔ ہجر و وصال کی آنکھ مچولی میں حنا ہمیشہ کے لیے سلمان سے بچھڑ گئی اور عشق کے خارزار سفر کی بے شمار کٹھنائیاں اٹھانے کے باوجود سلمان کے حصے میں ابدی ہجر ہی آیا۔ خالص ادبی رنگ میں ڈھلی بے حد عمدہ تحریر کے لیے سلیمی صاحب کو بہت مبارکباد۔ اندازِ تحریر نے بہت متاثر کیا۔ خصوصاً منظر کشی اور ذخیرۂ الفاظ کا سحر آخری سطر تک قائم رہا۔ عائشہ نصیر کی چکما دلچسپ تھی۔ کہانی کے انجام کی درست سمت آخری چند پیراگراف میں جا کر سمجھ آئی۔ عمدہ لکھا ماشاء اللہ۔ اے آر راجپوت کی کھوج اچھی تھی بے چارے شاہنواز کی سادگی کا افتخار روف نے بہت فائدہ اٹھایا۔ عکس فاطمہ کی بے باک ٹھیک تھی۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اس سے زیادہ اگر کسی کو آزمایا جائے تو راجا جیسا ہی انجام ہوتا ہے۔ عمران قریشی کی سایہ عمدہ تھی۔ نفسانی خواہشات اور سرکشی کی ڈور جتنی مرضی ڈھیلی ہوتی جائے، ایک نہ ایک دن مجرم اسی ڈور میں کسا جاتا ہے۔ کہانی کار کو تو بیسے منہ کی کھانی پڑی اور جب توقیر نے اسے حقیقت کے آئینے میں اس کا بدصورت کردار دکھایا تو وہ بے بس کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ طاہر جاوید مغل کی دلگداز رومانوی کہانی چارہ گر جنوری کا خاص تحفہ تھی۔ ثمینہ کی ناشاد اور کوکب کے لیے بے لوث محبت نے دل کو چھو لیا۔ اسما قادری کی پگھلتے رشتے نے پہلی چند سطور سے ہی اپنے ساتھ ایسا باندھا کہ ایک ہی نشست میں کہانی ختم کر کے دم لیا۔ بچپن کی محرومیوں اور والدین کی بے جا سختیوں کی بدولت

شمس جیسی کم ہمت اور ڈرپوک اولاد ہی پروان چڑھتی ہے جو کبھی درست وقت پر درست فیصلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتی۔ نتیجتاً ایسی اولاد تاعمر ناخوش اور غیر مطمئن رہتی ہے۔ شمس بھی ایک سگھڑ اور خوش گفتار بیوی اور دو بیٹوں کے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزار سکتا تھا۔ لیکن اس نے بھی اپنی فیملی کے ساتھ سخت رویہ روا رکھا اور اپنے والد والی غلطی دہرانے لگا۔ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے نہ وہ افشین سے شادی کے وقت انکار کر سکا اور نہ ہی سبرینہ کو چھوڑنے یا اپنانے کا فیصلہ کر پایا جس کا خمیازہ افشین اور اس کے دو بچوں کے علاوہ سبرینہ کو بھی بھگتنا پڑا۔ خوب صورت موت چونکہ ایچ اقبال نے لکھی ہے تو یقیناً اعلیٰ پائے کی تحریر ہوگی مگر شومیٔ قسمت تا حال میں پڑھ نہیں سکی۔ اس لیے تبصرے سے بھی قاصر ہوں۔ جنوری کا شمارہ مجموعی طور پر بہت عمدہ تھا۔ اس ماہ بیچ میں جو اقتباسات لگائے گئے وہ بھی اچھے تھے۔ خصوصاً دبئی سے دانش اظہار کا خواجہ حسن نظامی کی لالٹین سے یکجائی کے زیرِ عنوان اقتباس لاجواب تھا۔‘‘ (پسندیدگی کا شکریہ)

کراچی سے محمد اقبال کی شکایت و پسند ’’ماشاء اللہ جناب جنوری 2023ء کا پہلا شمارہ سالِ نو کی مبارک باد اور خوب صورت سرورق کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ سرورق پر دو انار اور دو بیمار موجود ہیں۔ پہلی خاتون خوب صورت جبکہ دوسری قبول صورت، درمیان والے صاحب واقعی جاسوس لگ رہے تھے، دوسرے پستول والے حضرت اپنے پستول کے ساتھ خود بتا رہے تھے کہ وہ کون ہیں۔ فہرست خوب صورت لگ رہی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہمارے سارے فیورٹ رائٹرز موجود ہیں۔ کمال ہو گیا جنوری کا شمارہ دھما کا خیز ثابت ہوا۔ دعا ہے کہ تمام رائٹرز اپنی آمد کو مسلسل رکھیں، آمین۔ اداریہ اچھا اور شعر بہت ہی اچھا تھا، آپ کی دعاؤں کی قبولیت کے لیے ہم بھی آمین کہتے ہیں۔ ملتان سے محمد حسنین اچھے تبصرے کے ساتھ پہلے نمبر پر موجود ہیں، مبارکاں جی۔ بھائی صاحب کو ہم سے شکایت ہے یا بیر، کچھ سمجھ نہیں آیا۔ اسلام آباد سے بینا راجپوت کی 2022ء کے بارہ مہینے آمد قابلِ داد ہے، گزارش یہ ہے کہ 2023ء میں بھی اسی طرح اپنی آمد کو یقینی بنائیں۔ آپ کی تنقید، تعریف سے بھرپور تبصرے مزہ دیتے ہیں۔ ہمارا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ کوٹری کی حمیرا رفیق کی نٹ کھٹ سی باتیں اچھی لگیں، بھئی ذرا بھرپور تبصرہ بھیجا کریں۔ لاہور سے راحیلہ بھٹی اپنے عمدہ تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ جس طرح آپ نے انگارے کی تاجور اور للکار کے عمران کا ذکر کرتے ہوئے طاہر جاوید مغل کو یاد کیا، دل جیت لیا ہمارا۔ سڈنی سے ڈاکٹر ارسلان کی کیا بات ہے جناب سارے سال کی کسر بھرپور تبصرے میں نکال دی۔ بہترین اور مکمل جائزہ پیش کرنے پر ہماری طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔ اسلام آباد سے انور یوسف زئی اپنے مختصر تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ کہانیوں میں طاہر جاوید مغل کی مختصر تحریر چارہ گر سے شروع ہوئے۔ ندیم ناشاد اور کوکب کی محبت بھری کہانی جس میں ڈاکٹر ثمینہ نے چار چاند لگا دیے۔ اصل ہیروئن تو وہی تھی۔ بہترین کہانی رہی۔ امجد رئیس کی زندہ مردہ واہ بھئی مزہ آ گیا۔ کہانی میں بھرپور سسپنس، رومانس، ایکشن سب کچھ تھا۔ ایسے دوستوں کی کہانی جنھوں نے مذاق ہی مذاق میں زندگی کو کھیل بنا دیا۔ زندگی اور موت کی کشمکش کو بہترین انداز میں ترتیب دینا امجد رئیس ہی کا کمال ہے۔ احمد سلیم سلیمی کی عشقِ ناتمام دلچسپ، محبت کے دلگداز احساسات کے ساتھ مکمل ہوئی۔ جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ ایسی تحریریں ڈائجسٹ کو چار چاند لگا دیتی ہیں، ویلڈن جناب۔ ایچ اقبال خوب صورت موت لیے جاسوسی کی زینت بنے۔ بھلا موت بھی کبھی خوب صورت ہوتی ہے۔ (کہانی پڑھ کر اندازہ ہو گیا ہوگا؟) بہرحال ابصار جزوی ہیرو رہا، اصل ہیرو شیما صاحبہ تھیں حالانکہ وہ فلمی ہیروئن تھیں مگر کہانی میں وہ ہیرو کا کردار ادا کرتی رہیں اپنی خواہشات کی تکمیل کی جستجو میں اپنی جان سمیت چار دوسرے لوگوں کو بھی موت سے ہمکنار کیا۔ مناسب کہانی تھی۔ اسما قادری پگھلتے رشتے لیے حاضر تھیں۔ بزرگوں کی ضد اور زبردستی ایسی ہی کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ ایک تو شمس کم ہمت تھا جو اپنے والد سے اپنی بات منوا نہیں سکا اور افشین سے شادی کر لی۔ لیکن سبرینہ اپنی محبت کو پانے کے لیے اس حد تک چلی گئی کہ اس نے افشین کو ٹھکانے لگا دیا، روایتی سی کہانی تھی لیکن اچھی لگی۔ حسام بٹ کی دہرا اس قسط میں متاثر نہیں کر سکی۔ ٹیپو سلو رہا۔ بٹ صاحب نے ڈیوڈ کی بنائی گئی ٹیموں کو منزلِ مقصود پر پہنچانے میں ہی پوری کہانی نمٹا دی۔ عمران قریشی کی مختصر تحریر سایہ بہت عمدہ رہی۔ ثوبیہ توقیر کی محبت تھی اور توقیر نے جو ثوبیہ کے ساتھ کیا تھا، اس کی سزا توقیر کو بھی ملی بالآخر محبت جیت گئی اور سایہ ہار گیا۔ ویلڈن عمران قریشی۔ عکس فاطمہ کی بے باک کہانی واقعی بے باک لگی۔ جو کام رانی نے کیا وہ رانی ہی کر سکتی تھی۔ راجا اپنی حرکتوں کے باعث رانی کے ہاتھوں بے باک ہو گیا۔ اے۔ آر۔ راجپوت کھوج کے ساتھ موجود تھے۔ انسان اپنی قسمت کے ساتھ لگن کا پکا ہو تو وہ اپنا مقصد حاصل کر ہی لیتا ہے جیسا کہ اس کہانی میں افتخار نے اپنے ملازم دراب خان کے ساتھ مل کر افتخار کو بے وقوف بنا کر اپنا مقصد حاصل کر ہی لیا۔‘‘

حمیرا رفیق کی باتیں کوٹری سے ’’جنوری 2023ء کا شمارہ حسبِ روایت چھوٹے بھائی صاحب کے ہاتھوں ہمیں دستیاب ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ یہ سال تمام مسلمانوں اور بالخصوص پاکستان اور ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کے لیے خیر و عافیت کا باعث رہے، دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے، آمین۔ سب کو نئے سال کی آمد مبارک ہو۔ سرورق بہت اچھا لگا۔ فہرست بھی اچھی تھی اور سب سے اچھی بات یہ کہ تمام اچھے لکھنے والے موجود تھے۔ اداریے میں نئے سال کی مبارک باد کے ساتھ وقت کے تیزی سے گزرنے، ملک

کے حالات پر جمود طاری ہونے کے ساتھ دنیا بھر بالخصوص ملک کی سلامتی کی دعا نے بہت متاثر کیا۔ اداریے میں شعر کا بہترین چناؤ کیا گیا۔ ملتان سے محمد حسنین پہلے نمبر پر براجمان تھے بہت عمدہ تبصرہ تھا۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اسلام آباد سے بینا راجپوت کا طویل اور بھرپور تبصرہ اچھا تھا اور یہ بات بالکل درست ہے کہ اپنا نام جاسوسی کے صفحات پر دیکھ کر بے انتہا خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کراچی سے محمد اقبال کی خوشی ان کے تبصرے کی طرح اچھی لگی۔ سرورق پر عمدہ تبصرہ کیا۔ محمد حسنین کی بات درست ہے کہ اقبال صاحب اپنے فیورٹ رائٹرز پر بھرپور تبصرہ کرتے ہیں۔ لاہور سے راحیلہ بھٹی کا عمدہ تبصرہ موجود تھا۔ ان کی یہ بات درست ہے کہ فیملی کو ٹائم دینے کے ساتھ ڈائجسٹ پڑھنا اور اس پر تبصرہ لکھ کر بھیجنا آسان نہیں۔ انہوں نے طاہر جاوید مغل کی جس طرح یاد دلائی اور ایڈیٹر نے انتظار ختم ہونے کی نوید دی، پڑھ کر اچھا لگا۔ سڈنی سے ڈاکٹر ارسلان کا سال 2022ء کے شمارے کی بہترین کہانیوں پر بھرپور طویل تبصرہ شاندار لگا۔ ہماری طرح ارسلان صاحب کو بھی چھوٹے بھائی کی بدولت شمارے ملتے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی کا بھی شکریہ کہ وہ یہ اہتمام کرتے ہیں اپنے بھائی کے لیے۔ سڈنی میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب کا ڈائجسٹ پڑھنا اور تبصرے بھیجنا ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ خوش رہیں ڈاکٹر صاحب جہاں بھی رہیں مگر جاسوسی سے تبصروں کا سلسلہ یقینی بنائے رکھیں۔ اسلام آباد سے انور یوسف زئی کا تبصرہ ہمارے تبصرے کی طرح مختصر سہی لیکن موجود تھا۔ دیگر ساتھیوں سے بھی گزارش ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ چھوٹی کہانیوں سے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔ طاہر جاوید مغل کی مختصر تحریر چارہ گر محبت کے لطیف احساسات لیے کب ختم ہوگئی معلوم ہی نہ ہو سکا، ڈاکٹر شینہ نے جس طرح ندیم ناشاد اور کوکب کو ملایا ایسا کہاں ہوتا ہے۔ اے آر راجپوت کی کھوج بہت پسند آئی۔ عکس فاطمہ کی بے باک بھی عمدہ تحریر تھی۔ عمران قریشی کی سایہ بہت زیادہ پسند آئی، ویل ڈن جی۔ اسما قادری کی پگھلتے رشتے اچھی تحریر تھی۔ عکس کو ایک کم ہمت شخص دکھایا گیا جس کی وجہ سے معاملات خراب تر ہوتے گئے۔ اگر وہ اپنے والد کو اچھی طرح کنوینس کرتا تو معاملات اس طرح نہیں ہوتے مگر پھر کہانی اس طرح تو تحریر نہیں کی جاسکتی تھی۔ ببرینہ کا کردار طاقتور دکھایا گیا۔ بہرحال ایک عمدہ تحریر پڑھنے کو ملی۔ خوب صورت موت، ایچ اقبال کی تحریر اچھی لگی۔ اس میں بھی شیما کا کردار بھرپور دکھایا گیا۔ زندہ مردہ، امجد رئیس کی ایک یادگار ترجمہ کہانی رہی۔ جہاں امجد رئیس کا نام ہو وہاں تحریر میں مزہ نہ آئے ایسا شاید ہی ہو۔ بھرپور توجہ کے ساتھ ان کی تحریر پڑھتی ہوں اور آخر تک اتار چڑھاؤ سے لطف اندوز ہوتی ہوں، ویلڈن جی۔ حسام بٹ کی دہر عمدہ چل رہی ہے مگر تکنیک ہوتی جارہی ہے جتنا زیادہ کردار بڑھ جاتے ہیں، ان کو یاد رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ آخر میں احمد سلیم سلیمی کی عشق ناتمام پڑھی۔ عمدہ منظر نگاری، شاندار ڈائیلاگ کے ساتھ بہترین تحریر رہی۔ حنا اور سلمان کی محبت بھری داستان دائمی جدائی پر ختم ہوئی اور ہمیں بھی افسردہ کر گئی۔

ملتان کینٹ سے انوشے ملک کی پسند ناپسند ’’نئے سال کا جاسوسی بڑے ارمانوں کے بعد دس تاریخ کو ملا۔ شاید کراچی میں نیو ائر نائٹ منانے میں مصروف ہوگیا تھا اس لیے ہمارے شہر پہنچتے پہنچتے وقت لگ گیا۔ ٹائٹل منفرد تھا لیکن جاذب نظر نہیں کہہ سکتے۔ ٹائٹل گرل اپنی تو بہ شکن خوب صورتی سے ... دوسروں کا دل جیتنے کی کوشش میں مصروف تھی لیکن اس کے منہ پر ہی اور لوگوں کو چیٹ کر دیا جو اچھا نہیں لگا۔ مجموعی طور پر پرانے زمانے کی اردو فیچر فلموں کے پوسٹر جیسا لگ رہا تھا۔ بہت دنوں سے خواہش تھی کہ میں بھی کوئی لمبا چوڑا تبصرہ لکھوں لیکن اپنی ڈاکٹری مصروفیات میں مختصر لکھنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ اس بار ڈاکٹر ارسلان فرام سڈنی کا سالانہ تجزیہ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ یہ جاسوسی کا ہی کمال ہے کہ آج بھی اس سے اتنی محبت کرنے والے موجود ہیں جو سات سمندر پار سے بھی ایسے لمبے چوڑے اور بھرپور تبصرے لکھ کر بھیجتے ہیں۔ ویل ڈن ڈاکٹر صاحب۔ پہلی سیٹ پر اپنے شہر کے محمد حسنین نے قبضہ جما رکھا تھا۔ چٹکلوں اور چٹکیوں سے سجا اچھا تجزیہ پیش کیا۔ بینا راجپوت نے بھی اسلام آباد سے گل پاشی کی۔ محمد اقبال اور راحیلہ بھٹی کے تبصرے بھی پسند آئے۔ مزید لوگوں کو بھی تبصرے کرنے چاہئیں۔ زندہ مردہ پیش کرنے پر جاسوسی ڈائجسٹ اور امجد رئیس کو مبارک باد قبول ہو۔ ایسی عمدہ، خوب صورت اور معیاری تحریر شاید ہی کوئی اور ڈائجسٹ پیش کرتا ہو۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد ذہن کے کئی دریچے وا ہوئے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ذہن کی فرحت کا سامان بنے۔ لالچ و ہوس میں انسان کہاں تک گر سکتا ہے، وہ اشلے بارپر کے کردار کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مائیکل ہیریسن کی زندگی اور موت کے بیچ جھولتے خیالات کہانی کی جان تھے۔ انجانے میں وہ اس سانپ سے محبت کر بیٹھا تھا جو اسے ہی ڈس لیتا ہے۔ اس تحریر کا ایک مقصد انسان کے ظاہر اور باطن کو سامنے لاتا ہے۔ ہم منہ پر کچھ ہوتے ہیں اور پیٹھ پیچھے کچھ اور ہی بن جاتے ہیں۔ اس کہانی کا موضوع انسان کی کبھی نہ ختم ہونے والی ہوسِ زر بھی تھا۔ سال نو پر اس اولین پیشکش کو ایک بہترین تحفہ کہا جاسکتا ہے۔ سایہ ایک اچھی کوشش تھی لیکن انجام کا پہلے ہی اندازہ ہوگیا۔ طاہر جاوید مغل کی چارہ گر نوجوان لڑکیوں کی نادانی اور بھولپن پر ایک اچھی کہانی تھی۔ انجام رُلا دینے والا تھا۔ دنیا میں محبت سے محبت کرنے والے لوگ واقعی پائے جاتے ہیں یا پھر ہمیں صرف مغل صاحب کی کہانیوں میں ہی ملیں گے؟ (انتظار کرلیں، شاید آپ کو بھی مل جائیں) اب ذکر ہوجائے جاسوسی کی دل گرما دینے والی لہو رنگ کہانی دہر کا۔ حسام بٹ بہت اچھا لکھ رہے ہیں لیکن کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً اس کہانی میں

مزاح نہ ہونے کے برابر ہے لیکن جاسم باری کی خود پسندی کی ہر قسط میں اتنی تعریف ہوتی ہے کہ بس۔ ہر کوئی جاسم باری سے متاثر ہو جاتا ہے (آپ کیوں جل رہی ہیں؟) کھوج عام سی کہانی تھی، زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ عشقِ ناتمام ایک ایسی کہانی ہے جس کا مجھے ہی نہیں شاید ہر قاری کو ہر ماہ انتظار رہا ہوگا۔ اگر تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو مجھے تو کوئی کمزور پہلو نظر نہیں آیا۔ کوئی جھول نہیں تھا اور ہر لحاظ سے ایک مکمل اور اچھی کہانی لگی۔ مگر کیا آپ بتا سکیں گے کہ معاشرے کے ان ناسوروں کی نشاندہی کا کوئی فائدہ بھی ہوا؟ کیا ایسی تحریروں کو پڑھ کر کوئی مردہ ضمیر انسان اپنے ضمیر کی آواز پر جاگا؟ بے باک ایک بیکار کہانی تھی۔ چکما دل جیتنے میں کامیاب رہی۔ سرورق... دونوں بہترین تھے۔ اسما قادری نے میدان مار لیا۔ ایچ اقبال کی خوب صورت موت بھی اچھی لگی۔

ملتان سے محمد حسنین کی کسلمندی ”ملتان والوں کے لیے تھوڑی سردی بھی بہت ہوتی ہے لیکن اس بار نئے سال کی آمد کے ساتھ ہی کڑاکے کی سردی نے استقبال کیا ہے۔ سردی کے مارے کہیں باہر نکلنے کو دل نہیں کرتا۔ اسکول سے ویسے ہی چھٹیاں بڑھ گئی تھیں تو ان چھٹیوں کو یادگار بنانے کے لیے جاسوسی کا حصول ناگزیر ہو چکا تھا۔ (ہمیں تو سردی میں بھی اٹھنا پڑتا ہے کوئی چھٹی نہیں اسکولوں کی) گرما گرم چائے پیتے اور لذیذ سوہن حلوہ کھاتے ہوئے بازار سے جب جاسوسی ڈائجسٹ کا نیا شمارہ وصول کیا ہاتھ تب بھی سردی سے کپکپا رہے تھے۔ جاسوسی میں اس بار میرے لیے بہت سے سرپرائز تھے۔ پہلا سرپرائز تو ایک نسبتاً اچھے ٹائٹل کی شکل میں دیکھنے کو ملا۔ شکر ہے مصور صاحب نے کچھ مختلف بنانے کی کوشش کی۔ (اچھا......!) دوسرا سرپرائز چینی نکتہ چینی میں خود کو پہلی پوزیشن پر دیکھ کر لگا۔ (ہاں یہ اچھا ہے) شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ۔ آپ کے جو کھٹے میٹھے جواب ہوتے ہیں، وہ اپنے ہی تبصرے کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔ (اب زیادہ خوش نہ ہوں) بیا راجپوت کی فصیح و بلیغ گفتگو پڑھنے کا بھی بڑا مزہ آیا۔ محمد اقبال اپنے پسندیدہ رائٹرز پر تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ اقبال صاحب برا نہ مانیے گا صرف چھیڑ خانی کرتا ہوں ورنہ یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کل صرف اپنے فیورٹ رائٹرز کو پڑھنے کا وقت بھی نکال لیا جائے تو بڑی بات ہے۔ آپ تو ان کو پڑھ کر تبصرہ بھی کر لیتے ہیں۔ کوٹری کی حمیرا اور لاہور کی راحیلہ کے تبصرے بھی مزیدار تھے۔ ڈاکٹر ارسلان شاہ کا تبصرہ بہت جاندار تھا۔ پورے سال کے رسالوں پر ایسا جامع اور تفصیلی تبصرہ کرنا ہمت کی بات ہے۔ (سرد علاقے میں رہ کر بہت باہمت ہو گئے ہیں...... کمر کس لی ہے) ویسے ہر ایک دو ماہ بعد تبصرہ کر دیا کریں تو ایسے سالانہ تبصرہ شاید نہ بھیجنا پڑیں۔ ان کے شہر سڈنی سے مشہور رائٹر سڈنی شیلڈن یاد آ گئے جن کی انگریزی کہانیوں کے تراجم آج بھی میں پرانے جاسوسی ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا ہوں۔ (جی بہترین ہوتے تھے) موجودہ دور میں انگریزی کرائم فکشن کے شاہکار ہمیں امجد رئیس کے توسط سے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اولین صفحات پر ان کی غیر متوقع آمد پلیزنٹ سرپرائز سے کم نہیں تھی۔ زندہ مردہ ایک تیز رفتار اور سنسنی خیز داستان تھی جس میں آخر تک بے چینی رہی کہ یہ مائیکل نامی زندہ مردہ، زندہ رہے گا یا مردہ بن جائے گا۔ روئے گریس کی سراغ رسانی قابل تعریف رہی لیکن یہ ماورائی طریقہ تفتیش کچھ ہضم نہیں ہوا۔ کہانی ایک لمحے پر تو لگا ختم ہو گئی ہے اور مارک پکڑا جائے گا لیکن وک نے آکر نئے ولن کا مورچا سنبھال لیا۔ خوشگوار انجام کے باوجود اختتامی لائنز پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ بہترین کہانی نے دل خوش کر دیا۔ امید ہے کہ امجد رئیس کا اگلا شاہکار پڑھنے کے لیے مزید چھ مہینے انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور وہ جلد ہی اگلی کہانی کے ساتھ جاسوسی کے صفحات پر جلوہ گر ہوں گے۔ احمد سلیم سلیمی کی عشقِ ناتمام بھی اس ماہ ختم ہوئی۔ ایک اچھی کہانی ہے اور سلیمی صاحب جاسوسی کے لیے بہترین لکھنے والوں میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔ شعلہ زن کی کمی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ دہری کی یہ قسط بھی ٹھیک ٹھاک رہی۔ ایکشن کم اور باتیں زیادہ۔ جاسوسی کے صفحات کم ہوئے ہیں لیکن قسط وار پھر بھی کم از کم پینتیس صفحات کی ہونی چاہیے۔ پچیس صفحات میں تو بٹ صاحب کے ہیرو کی باتیں ہی پوری نہیں ہوتی ہیں تو ایکشن کب کرے گا؟ سرورق کی کہانیوں میں اسما قادری تو آتی ہی رہتی ہیں لیکن ایچ اقبال کو بڑے عرصے بعد دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہانی کا نام ہی بڑا پیارا تھا۔ خوب صورت موت، بھلا موت بھی کبھی خوب صورت ہوئی ہے؟ لیکن حالات ایسے بھی ہو جاتے ہیں جہاں زندگی سے بڑھ کر انسان کو موت پیاری لگنے لگتی ہے۔ شیما کی کہانی نے کئی رنگ بدلے اور سارے کے سارے پسند آئے لیکن یہ آخر میں موت کا فیصلہ اچھا نہیں لگا۔ زیادہ غصہ اس بات پر آیا کہ ہیرو نے بھی سمجھانے کے بجائے موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسما قادری کی پگھلتے رشتے اخباری تراشوں پر مشتمل ایک متاثر کن اچھی کوشش تھی۔ غلام قادر کا انداز بھی اس بار نظر آیا۔ سسپنس اچھا تھا لیکن دوسری عورت کا کردار جب بھی کہانی میں آجائے تب سسپنس نہیں رہتا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا اور کہانی اپنے منطقی انجام تک پہنچی۔ چھوٹی کہانیوں میں طاہر جاوید مغل متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ عائشہ نصیر ہمیں چکما دینے میں کامیاب رہیں اور اے آر راجپوت نے بھی زبردست کھوج لگائی۔ دونوں کی کہانیوں نے پسندیدگی کی سند حاصل کی۔ بے باک اور سایہ اوسط درجے کی تھیں، زیادہ پسند نہیں آئیں۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

صائمہ حیدر، راولپنڈی۔ آفاق احمد، کوٹری۔ ہما انصار، کراچی۔ امان اللہ خان، پشاور۔ زینب حنیف، کراچی۔

زہریلا تریاق

طاہر جاوید مغل

کسی بڑے واقعے کے پہلے دن کی خوشی ہو یا افسردگی... اِس قدر لامحدود ہوتی ہے کہ اس کے اثرات دور تک پیچھا کرتے ہیں... اُن دونوں کی زندگی کا بھی وہ واقعہ حد سے سوا تھا... اس واقعے سے جنم لینے والی صورتِ حال سے نبردآزما ہونا آسان نہیں تھا... قدم قدم پر پائوں ڈگمگاتے اور خارِراہ دامن کو مضبوطی سے تھام لیتے... چاروں جانب کسی طرف کوئی جائے پناہ نہ تھی... جھوٹ و فریب نے جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں... سچ تک پہنچنے کے لیے کئی مراحل درپیش تھے... اس کڑے اور بے سائبان وقت میں صرف سچائی ہی زادِراہ تھی...

کوچہ جاناں میں بے خطر آوارہ گردی کے خواہش مند مجنوں کی عشوہ طرازی...

اِس کہانی کا آغاز نومبر کی ایک نہایت سرد لیکن سنہری دھوپ والی دوپہر کو ہوا۔ اتوار کا روز تھا۔ میں عمران جونیئر سے ملنے اسی گنجان آبادی میں پہنچا جہاں اس کی رہائش تھی۔ ارادہ تھا کہ کچھ دیر اس کے ساتھ گپ شپ لگاؤں گا اور حال احوال دریافت کروں گا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ وہاں پہلے ہی ایک مسئلہ موجود ہے...... گاڑی ایک نسبتاً کشادہ جگہ پارک کرنے کے بعد میں بارونق بازار سے گزر کر اُس کے دروازے تک پہنچا۔ اس کے دوست ضیا نے بتایا کہ وہ کہیں باہر نکلا ہوا ہے، ابھی آتا ہی ہوگا۔ ضیا نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ فوراً ہی نظر آ گیا مگر اس حالت میں کہ ایک، دو تین سالہ بچہ کمبل میں لپٹا ہوا اُس کی بانہوں میں تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں تقریباً دوڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں یقیناً بچے کی پریشان والدہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک معمر جوڑا بھی بھاگا آ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر عمران سید ھا میری ہی طرف آیا۔ ''کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بچہ بیمار ہے، بہت زیادہ...... اِسے اسپتال لے جانا ہوگا۔''

''ہوا کیا ہے عمران؟''

”نمونیا کی شکایت ہے۔ الٹی سیدھی دوائیں کھانے سے معاملہ بگڑ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے سانس لے رہا ہے۔“

بچے کی جواں سال والدہ جو شکل سے ہی مفلسی کی ماری نظر آتی تھی، ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”اللہ کے واسطے میرے ندیم کو بچالو۔ اسے کچھ ہوگیا تو میں بھی نہیں بچوں گی۔“

میں نے کمبل سرکا کر بچے کو دیکھا۔ اس کا چہرہ مرجھائے پھول کی طرح تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر ہچکولوں سے سانس لے رہا تھا۔ ہم اسے لے کر گاڑی تک آئے۔ بچے کی والدہ اور اس کا نانا بھی ساتھ بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے حتی الامکان تیزی سے سڑک پر لے آیا۔ پتا چلا کہ یہ لوگ پتوکی قصبے سے آگے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ بچے کی طبیعت زیادہ بگڑنے پر کل رات یہاں لاہور میں اپنے عزیزوں کے پاس آئے ہیں۔

قریباً چالیس منٹ بعد ہم میو اسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹرز نے فوری طور پر کچھ دوائیں منگوائیں جو عمران لے آیا۔ ایسے موقعوں پر عمران کی پریشانی دیکھ کر ایسے ہی لگتا تھا کہ یہ کسی اور کی نہیں اس کی اپنی ذاتی پریشانی ہے۔ اس نے بتایا۔ ”یہ عورت بیوہ ہے۔ بس دو بچے ہیں۔ چھ سات سال کی لڑکی اور یہ لڑکا۔ ایک طرح سے اس کی زندگی کا واحد سہارا ہے۔“

یہ بچہ اُس کی زندگی کا سہارا تھا۔ اسپتال پہنچنے کے قریباً ایک گھنٹے بعد یہ سہارا اس سے چھن گیا۔ بچہ جانبر نہیں ہوسکا۔ وہ روتے، روتے بے ہوش ہوگئی۔ نانا بھی دہاڑیں مار رہا تھا۔ سینئر ڈاکٹر میرے اور عمران کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک میلا کچیلا شاپر تھا۔ اس شاپر میں وہ دوائیں تھیں جو بچے کے گھر والے اسے گاؤں میں دیتے رہے تھے۔ یہ دوائیں ڈاکٹری نسخے کے عین مطابق تھیں مگر صرف ناموں کی حد تک۔ ڈاکٹر نے ایک انجکشن اور ایک سیرپ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا۔ ”مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ یہ دونوں میڈیسنز جعلی ہیں۔ اگر یہ اصل ہوتیں تو شاید یہ معصوم اس نازک حالت تک نہ پہنچتا...... دکھ کا مقام ہے کہ ہمارے اکثر چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں میں یہ مکروہ دھندا چل رہا ہے۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اب اس کا کیا کریں گے آپ؟“

وہ بولا۔ ”آپ کا تعلق جس ڈپارٹمنٹ سے ہے وہاں آپ سے کون سی بات چھپی رہتی ہے۔ وہی ہوگا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ تجزیے میں دوائیں نقلی ثابت ہوگئیں تو اس میڈیکل اسٹور پر چھاپا پڑے گا جہاں سے یہ خریدی گئی تھیں۔ میڈیکل اسٹور والا ہول سیلر کو پکڑوائے گا۔ ہول سیلر تگڑا ہوا تو خود پر کیس ہی نہیں بننے دے گا اور اگر بن گیا تو دو چار پیشیوں میں خود کو بچالے گا۔ بات تو تب ہے جب اس زہریلے درخت کی جڑوں تک پہنچا جائے۔ جڑوں کو زمین سے کھینچا جائے۔“

سینئر ڈاکٹر صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ بڑے مجرموں تک پہنچے بغیر ایسی برائیوں کا قلع قمع ممکن نہیں...... اور یہ جعلی ادویات والی لعنت تو ایسی زہرناک تھی کہ اس کی تباہ کاری اور وسعت لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتی تھی۔ میں خود بھی اس کا ڈسا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں ماضی کی فلم سی چلنے لگی۔

اپنے بچے کی لاش سے لپٹ کر بین کرتی ہوئی ماں کو چھوڑ کر میں اور عمران اسپتال کے احاطے میں آگئے۔ عمران نے بچے کے نانا اور ماموں کو ساتھ لیا اور لاش لے جانے کے لیے کاغذی کارروائی مکمل کروانے لگا۔ میں سوچ میں گم ہوگیا۔ قریباً ڈیڑھ سال پہلے میری بیوی ثروت کے ساتھ بھی تو یہی کچھ ہوا تھا...... آہ...... کتنی جانکاہ یادیں تھیں...... میں اور ثروت کافی عرصے بعد لاہور سے نکلے تھے۔ ہم تین ہفتے کے تفریحی ٹور کے لیے ایوبیہ، خانسپور میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہیں پر ثروت کو ہلکا بخار ہوا تھا۔ وہ اکثر اپنی تکلیف مجھ سے چھپاتی تھی کہ میں پریشانی میں مبتلا ہوجاتا تھا۔ وہاں بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ دائیں پہلو میں ہلکا سا درد بھی تھا جو اس نے مجھ سے چھپائے رکھا۔ یہ پتے کا درد تھا۔ وہ بے چاری نہیں چاہتی تھی کہ اتنے عرصے بعد مجھے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے جو تھوڑا سا فارغ وقت ملا ہے، وہ اس کی وجہ سے غارت ہوجائے۔ ہم نے وہیں پر ایک ڈاکٹر کو دکھایا اور اس نے بخار کی دوا کے علاوہ ایک اینٹی بائیوٹک بھی لکھ دی۔ سات آٹھ روز تک ثروت وہی دوا کھاتی رہی اور بظاہر ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش بھی کرتی رہی مگر پھر نتھیا گلی میں اس کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی۔ اسے بہت ”وومٹنگ“ ہوئی۔ میں اسے لے کر فوراً لاہور پہنچا۔ ڈاکٹرز نے تفصیلی معائنہ کیا اور پتا چلا کہ اس کا گال بلیڈر سوج چکا ہے اور بُری طرح متاثر ہے۔ گال بلیڈر (پتے) کا انفیکشن قریبی اعضا کو بھی متاثر کر چکا تھا۔ جو اینٹی بائیوٹک دوا وہ استعمال کرتی رہی تھی، وہ نقل بمطابق اصل تھی اور اس کی وجہ سے ثروت کا بلڈ پریشر غیر معمولی طور پر

بڑھ گیا تھا۔ ایمرجنسی میں ثروت کے پتے کا آپریشن کیا گیا...... تاہم آپریشن کے صرف چار گھنٹے بعد جب ابھی وہ نیم بے ہوشی میں تھی، اسے سخت قسم کا برین ہیمرج ہوا اور وہ اپنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھڑا گئی۔

قریباً ڈیڑھ برس پہلے کے یہ واقعات میرے لیے ایک ایسی تلخ یاد کی طرح تھے جسے میں کسی صورت اپنے دماغ تک راستہ دینا نہیں چاہتا تھا مگر یہ ہزار ہا زہریلے کانٹوں والی یاد کسی نہ کسی سبب میرے دل و دماغ میں گھس ہی آتی تھی۔ جیسے آج اس بدنصیب بچے کی وجہ سے یہ واقعہ ہوا تھا۔

ثروت کی ناگہانی موت کے بعد میں کئی ہفتوں تک تو سوگ کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبا رہا تھا۔ وہ در و دیوار مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتے تھے جہاں سے وہ میرے ساتھ خوشی خوشی ایک تفریحی سفر کے لیے نکلی تھی اور پھر ایک ایمبولینس میں لاش کی صورت واپس آئی تھی، بالآخر میں نے خود کو سنبھالا تھا اور ان اصل مجرموں کی تلاش میں نکلا تھا جو اَب تک نجانے کتنے لوگوں کو سسکا سسکا کر مار چکے تھے۔ میڈیکل اسٹور، سپلائر اور ہول سیلر وغیرہ تو چھوٹے چھوٹے مہرے تھے۔ ضلع ایبٹ آباد کی مقامی پولیس نے انہیں گرفتار بھی کیا تھا۔ جعلی ادویات بنانے والی ایک چھوٹی فیکٹری کو ایبٹ آباد میں ٹریس بھی کیا گیا تھا...... مگر اس کی صحیح لوکیشن ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ ثروت کے سوگ سے نکلنے کے بعد میں نے خود ایبٹ آباد جا کر تگ و دو کی تھی اور بالآخر اس فیکٹری تک جا پہنچا تھا مگر اسی رات اس فیکٹری کا مالک اپنے بیڈ روم میں پُراسرار طور پر مردہ پایا گیا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ شخص بھی ایک مہرہ ہی تھا اور اسے صرف اسی وجہ سے خاموش کیا گیا تھا کہ وہ قانون کو اصل ذمے داروں یا ذمے داروں تک رسائی نہ دے دے۔

وہاں دسمبر کی اس سنہری دھوپ میں اسپتال کے احاطے میں بیٹھے بیٹھے یہ سارے واقعات ایک دو منٹ کے اندر اندر میرے ذہن سے گزر گئے۔ بچے کا اشک بار ماموں بچے کی لاش کو بازوؤں میں اٹھائے باہر آرہا تھا۔ دکھیاری ماں پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ نانا رو، رو کر بتا رہا تھا۔ ''ہمارے گھر میں فاقے تھے لیکن اپنے بچے کو بچانے کے لیے ہم نے گاؤں میں اپنے برتن تک بیچ دیے۔ ہمیں کیا پتا تھا برتن بیچ کر ہم اپنے بچے کے لیے دوا نہیں زہر لا رہے ہیں۔''

☆☆☆

بچے والے اندوہناک واقعے کو دس پندرہ روز گزر چکے تھے۔ اس واقعے نے میرے اندر تحریک پیدا کر دی تھی۔ جعلی ادویہ سازوں کے خلاف میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ جو ذرا ماند پڑی تھی پھر بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے کیس کی فائل منگوا کر ایک بار پھر اس کا مکمل مطالعہ کیا اور ضروری نوٹس لیے۔ یہ کیس میرے دوست اور خیرخواہ انسپکٹر زبیر کے ذمے تھا۔ وہ ان لوگوں کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا جنہوں نے ایبٹ آباد میں جعلی ادویات کی ایک چھوٹی فیکٹری کے مالک کو قتل کیا تھا۔

موسم سرد تھا۔ کئی دنوں بعد ہلکی سی دھوپ نکلی تھی۔ میں گھر کے لان میں چہل قدمی کر رہا تھا، جب عمران اپنی خستہ حال موٹر بائیک پر آدھمکا۔ وہ آج کل عجیب الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔ ''کے ٹو'' کے نواحی پہاڑوں سے واپسی کے بعد ماہین نے اسے کسی نہ کسی طرح منا تو لیا تھا اور اس بات پر نیم رضامند بھی کر لیا تھا کہ وہ انڈیا واپس نہیں جائے گا مگر اس کے ارادے سخت ڈانواں ڈول تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ آج بھی اسی موضوع پر بات کرنے آیا ہے۔ خلافِ معمول سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ کرسی کھینچ کر میرے پاس دھوپ میں بیٹھ گیا۔ ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' وہ طویل سانس لے کر بولا۔

میں سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ ''چاچو! میں غلط بیانی نہیں کروں گا...... اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ جو کچھ میرے دل میں ہے، وہ آپ بھی اچھی طرح جان ہی چکے ہیں۔ ماہین کو میں کسی اور نظر سے دیکھتا ہوں اور یہ جو کچھ بھی ہوا ہے آپوں آپ ہوا ہے...... میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔''

''تو پھر؟'' میں نے اس کے چہرے پر کرب کا سایہ دیکھ کر پوچھا۔

''تو پھر...... جو کچھ ماہین نے کہا ہے، وہ بھی آپ کے علم میں ہے۔ وہ مجھے ایک مخلص دوست کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور اسی حیثیت سے مجھے اپنے آس پاس دیکھنا چاہتی ہے۔''

''اور تم اس بات پر آمادہ بھی ہو گئے تھے۔''

اس نے افسردگی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں چاچو جان! میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ میں اپنی سچائی پر جھوٹ کا پردہ ڈال کر ماہین کے اردگرد رہنا نہیں چاہتا۔ یہ مجھ سے ہو ہی نہیں سکے گا...... آپ بھی جانتے ہوں گے جھوٹ کے اثرات کسی نہ کسی طور ظاہر ضرور ہوتے

ہیں۔ میں اس بات سے بہت ڈرتا ہوں کہ کہیں میری وجہ سے ماہین اور حسام کی زندگیوں میں کوئی دراڑ نہ آجائے۔“

”واپس انڈیا جانا چاہتے ہو؟“

”چاہتا نہیں ہوں...... میں جارہا ہوں چاچو۔“ وہ اٹل لہجے میں بولا۔ ”بدھ تک مجھے سفری کاغذات مل جائیں گے۔“

اس کے لہجے کی قطعیت کو محسوس کر کے اداسی کی ایک لہر سی میرے سینے میں دوڑ گئی۔ مجھے لگا کہ اب اس سے کچھ کہنا بیکار ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ”اور بات صرف اکیلی ماہین ہی کی تو نہیں ہے پیارے چاچو! اس میں کچھ نہ کچھ دخل آپ کا بھی تو ہے۔ آپ کے ذہن میں بھی تو ہر وقت یہ وہم کھٹکتا رہتا ہے کہ یہاں میرے ساتھ کچھ نہ کچھ برا ہو جاتا ہے جس کی تمام تر ذمے داری آپ پر آجاتی ہے۔“

”اب الٹی سیدھی مت ہانکو۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے خیالات اب وہ نہیں جو پہلے تھے، میں تمہیں یہاں اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”چلیں جو بھی سمجھ لیں لیکن اب چند روز تک مجھے یہاں سے جانا ہے۔ ہاں یہ وعدہ ہے کہ آپ سے مسلسل رابطہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ذہنی طور پر بھی آپ کے ساتھ ہی رہوں گا...... اور ہاں......“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

”کیا کہنے لگے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس ایک درخواست کرنی تھی آپ سے...... لیکن...... چلیں ابھی نہیں۔ ایک دو روز ٹھہر کر کروں گا۔“

اس کی خوب صورت آنکھوں میں ایک افسانوی سا رنگ تھا، ایک بھید بھرا رنگ۔ اس کا یہ روپ ایک رومانی ہیرو کا سا تھا اور اُس روپ سے بہت مختلف تھا جو کبھی کبھار کسی خطرے کے وقت نظر آتا تھا اور اس کے مدِمقابل پر لرزہ طاری کرتا تھا۔

میں نے اسے زیادہ کُریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

”ماہین کو اپنے فیصلے کے بارے میں بتا چکے ہو؟“

”اررر رے...... نہیں، نہیں اور آپ بھی یہ غضب نہ کرنا۔ اُسے بالکل آخر میں بتائیں گے۔“ وہ بولا۔

☆☆☆

تھوڑا سا دکھ تو ہوا تھا مگر گہرائی میں جا کر سوچا جاتا تو وہ جو کہہ رہا تھا، ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کی یہاں موجودگی کا بہت بُرا اثر ماہین اور حسام کے رشتے پر پڑ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں ایسے دیگر خطرات بھی تھے جو عمران کی جوشیلی طبیعت کی وجہ سے اسے نقصان پہنچا سکتے تھے۔ میں اسی سوچ میں گم بیٹھا تھا کہ فون پر کال آئی۔ یہ ماہین کی اُس خالہ کی طرف سے تھی جو ماہین کے پاس رہ رہی تھیں۔ دو تین روز پہلے بھی وہ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کر چکی تھیں۔ وہ فون پر بولیں۔ ”تابش! دراصل میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔ اتفاقاً اس وقت ماہین گھر میں نہیں ہے۔ اگر آپ ابھی آجائیں تو مناسب ہے۔“

میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔ ماہین کے بارے میں ماہین کی خالہ فوزیہ نے بتایا کہ وہ حسام کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی ہے۔

راستے میں، میں ماہین اور حسام کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ ماہین نے دل کڑا کر کے حسام کو یہ بات بتا دی تھی کہ شمالی علاقے کے سفر میں عمران بھی میرے اور اس کے ساتھ تھا۔ بقول ماہین، حسام نے یہ بات سن تو لی تھی مگر کوئی فراخدلانہ تاثر نہیں دیا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ جو ہو گیا، سو ہو گیا لیکن اب عمران سے ان دونوں کا ملنا جلنا کم ہی رہے تو اچھا ہے۔ یہ نسبتاً نرم رویہ بھی حسام نے غالباً اسی لیے اختیار کیا ہوگا کہ اسے ہمارے سفر میں پیش آنے والے خطرناک واقعے کا علم ہوا ہوگا (پچھلی روداد میں قارئین پڑھ چکے ہیں کہ خاقان والا میں آتشزدگی کے دوران میں عمران نے ماہین کو ایک پھنسے ہوئے دروازے میں سے بحفاظت نکلنے میں مدد دی تھی)

میں ماہین کے گھر پہنچا تو راتو نامی نوجوان ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ میں زینے طے کر کے بالائی منزل کے اس آرام دہ کمرے میں پہنچ گیا جہاں ماہین کی علیل خالہ لیٹی رہتی تھیں۔ وہ اب بھی بیڈ پر نیم دراز تھیں۔ عمر پچاس سے اوپر تھی۔ بالوں کی چند لٹیں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ کسی وقت وہ یقیناً خوب صورت رہی ہوں گی۔

رسمی کلمات کے بعد انہوں نے کہا۔ ”تابش! میں ماہین کے لیے بہت پریشان ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ آج کل وہ ہر وقت کسی گہری الجھن میں رہتی ہے۔ کھوئی کھوئی سی اور بالکل غیر حاضر۔ کیا آپ کو بھی ایسا لگا ہے؟“

میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولیں۔ ”وہ آپ کو بہت عزت دیتی ہے...... اکثر باتیں آپ سے شیئر بھی کرتی

ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کے اندر کیا چل رہا ہے۔ اپنے چینل میں بھی وہ کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہی۔ پچھلے ہفتے بیٹھے بیٹھے اچانک مجھ سے کہنے لگی۔ ''خالہ! آپ اور ماموں بہت سست ہیں، آپ لوگ اب میری شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ کب تک اس طرح منگیتر بن کر پھرتی رہوں گی۔ پھر خود ہی حساب کتاب جوڑنے بیٹھ گئی کہ ایک ڈیڑھ مہینے میں اس کی شادی کس طرح ہو سکتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو پھر اچھی علامت ہے جی، کہ وہ جلدی شادی پر رضامند ہو گئی ہے۔'' (مجھے اونچی آواز میں بولنا پڑا کیونکہ ان کی قوتِ سماعت کم تھی)

خالہ کے چہرے پر اُلجھن کے آثار برقرار رہے۔ پانی کا گھونٹ لے کر بولیں۔ ''مگر تابش! مجھے لگتا ہے کہ ماہین شادی والی بات بھی اپنی اندرونی پریشانی سے فرار حاصل کرنے کے لیے کر رہی ہے۔ اس سے پہلے تو وہ دو ڈھائی سال بعد کی بات کر رہی تھی۔ ویسے بھی اتنی جلدی شادی ہو کیسے سکتی ہے۔ حسام کے پاپا اس کے لیے راولپنڈی میں نیا بزنس سیٹ اَپ بنا رہے ہیں۔ بہرحال ماہین ہی کے کہنے پر ہم نے ان لوگوں سے بات کی ہے اور وہ کسی حد تک رضامند بھی ہو گئے ہیں مگر...... مگر اصل میں تو اس بات کا پتا چلنا چاہیے کہ وہ اس شادی سے پوری طرح خوش بھی ہے؟''

''کم از کم اتنا تو مجھے پتا ہے کہ وہ ناخوش نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اپنے اور حسام کے طویل ساتھ کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے۔''

ماہین اور حسام کسی بھی وقت واپس آسکتے تھے۔ فوزیہ بیگم سے تھوڑی مزید گفتگو کے بعد میں وہاں سے آ گیا۔

یہ چوتھے، پانچویں روز کی بات ہے، میں انسپکٹر زبیر احمد سے مصروفِ گفتگو تھا اور ساتھ ساتھ اپنے گھر کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے انسپکٹر زبیر احمد کو نقلی دواؤں والے کیس کے سلسلے میں ہی ایبٹ آباد بھیجا ہوا تھا۔ ایک بار پھر سرگرمی سے ان لوگوں کی تلاش جاری تھی جنہوں نے قریباً پانچ ماہ قبل ہماری اور مقامی پولیس کی تفتیش کو فل اسٹاپ لگایا تھا اور نقلی ادویہ بنانے والے شخص کو قتل کر دیا تھا۔

انسپکٹر زبیر کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ایبٹ آباد میں تفتیش تسلی بخش طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے...... اور ایک دو نئے کلیو بھی ملے ہیں۔

انسپکٹر سے میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ عمران آ گیا۔ وہ اب روانگی کے لیے پوری طرح پر تول چکا تھا۔ وہاں اُس کے کسی عزیز کی شادی بھی شیڈول تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ آج وہ قدرے خوش گوار موڈ میں ہے۔ ایک دو چٹکلے چھوڑنے کے بعد اس نے ایک طویل سانس لی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ ''آپ کو یاد ہے چند روز پہلے میں نے آپ سے اپنی ایک درخواست کا ذکر کیا تھا؟''

''ہاں ذکر کیا تھا لیکن بتایا کچھ نہیں تھا۔''

''آپ مذاق تو نہیں اُڑائیں گے؟''

''نہیں۔''

''اور بُرا بھی نہیں منائیں گے۔''

''مجھے امید ہے کہ تم کوئی ایسی بات کرو گے بھی نہیں۔''

وہ چند لمحوں کے لیے کسی سوچ میں گم رہنے کے بعد بولا۔ ''ہر بندے کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایک چہرہ ایسا ہوتا ہے جو آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتا ہے اور پھر کبھی بھی پوری طرح نکلتا نہیں۔ شاید ماہین کا چہرہ بھی وہی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اسے کبھی بھول نہیں سکوں گا۔ کاش میں اُس سے ملا ہی نہ ہوتا...... یا پھر بہت پہلے ملا ہوتا جب کوئی دوسرا اس کی زندگی میں نہیں تھا۔''

میں گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ آج ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی ٹھوڑی کھجا کر ہولے سے مسکرایا۔ ''چاچو! میں جانے سے پہلے ایک بار ماہین سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''تو ملو نا...... بلکہ ضرور ملو۔ اس میں کون سی رکاوٹ ہے؟''

''نہیں چاچو، میں ذرا اور طرح ملنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اپنی زندگی کا ایک دن...... ایک پورا دن اُس کے ساتھ گزاروں...... بلکہ وہ اپنا ایک پورا دن مجھے دے دے۔ میں اسے جہاں چاہوں لے جاؤں۔ وہ میرے ساتھ گھومے پھرے...... ہم تفریح کریں، کھائیں پئیں، کھل کر ہنسیں بولیں پھر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''دیکھیں نا چاچو! پھر تو اُس کی شادی ہو ہی جانی ہے۔ اگر کبھی دوبارہ اس سے ملنا ہوا بھی تو پھر وہ اور طرح کا ہوگا۔ شاید وہ مجھ سے زیادہ بات کرنا بھی پسند نہ کرے۔ ایک شوہر اور دو تین پیارے پیارے بچے اسے گھیرے

ہوئے ہوں۔“

میں نے دیکھا اُس کی خوب صورت آنکھوں میں عجیب طرح کی اداسی کسی انمول جذبے کے رنگوں میں گندھی نظر آتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”آج تو فلموں اور کہانیوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔“

”کہانیاں بھی تو میرے اور آپ جیسے لوگوں سے ہی بنتی ہیں اور ویسے بھی، دیوانوں سی جو نہ بات کرے تو اور کرے دیوانہ کیا۔“

ان لمحوں میں مجھے پھر وہ گفتگو یاد آگئی جو چار پانچ روز پہلے میرے اور ماہین کی خالہ فوزیہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس نے ماہین کی کسی خاموش اُلجھن کا ذکر کیا تھا۔ کئی بار یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ماہین کی اس کیفیت کی وجہ عمران ہی ہو۔ تاہم ایک بات میں اچھی طرح جان چکا تھا۔ ماہین بے حد مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ وہ اپنے بڑوں کی مرضی کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے علاوہ حشام کے ساتھ اپنا دیرینہ ساتھ بھی اُسے بے حد عزیز تھا۔

عمران سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھے چلا جا رہا تھا، میں نے کہا۔ ”میری طرف ایسے کیا دیکھ رہے ہو، جو بات تم کہنا چاہتے ہو، ماہین سے خود کہہ لو۔“

”وہ تو خود ہی کہوں گا۔ لیکن آپ سے اجازت بھی تو ضروری تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ وہ ہر کام آپ سے پوچھ کر کرتی ہے۔ اگر وہ اس بارے میں بھی پوچھے تو میری درخواست آپ کے پیشِ نظر ہونی چاہیے نا۔“ وہ پھر مسکرایا۔

اُس کے بھرے بھرے ہونٹ کچھ سانولے سے نظر آرہے تھے۔ مجھے اس کے قریبی دوست ضیا کی بات یاد آئی اس نے ایک روز فون پر مجھے بتایا تھا کہ عمران آج کل بہت سگریٹ پی رہا ہے۔ ضیا کا ایک دوست وکی بھی زبردست قسم کا سگریٹ نوش تھا بلکہ وہ کبھی کبھی ”بھرا ہوا سگریٹ“ بھی پیتا تھا۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا تھا کہ کہیں کسی ترنگ میں عمران بھی اس طرف نہ چل پڑے۔ میں نے احتیاطاً ضیا سے کہا تھا کہ وہ اس حوالے سے عمران پر نگاہ رکھے اور وکی سے اپنا میل جول ختم کرے۔

”تمہارے ہونٹوں کی رنگت بتا رہی ہے کہ آج کل بہت اسموکنگ کر رہے ہو؟“

”آپ جمع خاطر رکھیے، اس اسموکنگ کا تعلق ماہین وغیرہ سے ہرگز نہیں ہے۔“

”تو پھر کس سے ہے؟“

وہ ایک دم ہنسنے سے اُکھڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شرارت ناچی، آہ بھر کر بولا۔ ”جب سے مہوش حیات کو میرے جانے کا پتا چلا ہے، رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ کسی پل میری جان نہیں چھوڑتی۔ کہتی ہے مجھے نیلا تھوتھا لادو یا اپنے ساتھ انڈیا لے جاؤ۔ میری عقل گھاس چرنے نہیں گئی کہ اسے اپنے ساتھ انڈیا لے جاؤں اور وہاں اُس کے اور رانی مکرجی کے درمیان یوں پس جاؤں جیسے چکی کے دو پاٹوں میں گندم پستی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے مہوش کے ساتھ کسی جوان ہیروئن کا ذکر کیا ہوتا تو بات سمجھ میں آتی، یہ رانی مکرجی تو زیادہ عمر کی ہے۔“

”تو کیا آپ مہوش کو کم عمر سمجھتے ہیں۔ کیا ہو گیا ہے چاچو آپ کو؟ وہ تو آپ کے ایج گروپ میں آتی ہے۔“

”بکواس بند کرو، وہ ہماری انڈسٹری کی ہر دلعزیز ٹاپ ہیروئن ہے۔“

”لیکن خدا جانتا ہے، میں تو کترینہ، کرینہ اور عالیہ بھٹ جیسی ہائی وولٹیج ہیروئنز سے جان بچاتا پھر رہا ہوں یہ تو پھر مہوی ہے۔ ہونٹ صرف اس لیے کالے کیے ہوئے ہیں کہ تمباکو کی بو سے وہ بھاگ جائے...... بس اور کچھ نہیں۔“

اس کی باتوں کا چرخا چل نکلا تھا۔ اب اس نے رکنا نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے پولیس ٹریننگ سینٹر سے میرے ایک سینئر اسٹوڈنٹ کا فون آگیا۔ میں گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ تاہم دل ہی دل میں یہ بھی سوچتا رہا کہ عمران چلا گیا تو اس کی ان اوٹ پٹانگ باتوں کو مِس کروں گا۔

دوسرے روز ماہین کی متوقع کال آئی۔ اُس نے وہی کچھ بتایا جو ایک روز پہلے عمران نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا اور ایک دن اس کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ ماہین ذرا اداسی سے بولی۔ ”آپ کی کیا رائے ہے؟“

”میری رائے وہی ہوگی جو تمہاری ہے۔“

”تو پھر...... چلی جاتی ہوں۔ دو اچھے دوستوں کی طرح تو مل ہی سکتے ہیں۔“

”حشام سے بات کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو تین چار روز سے کراچی گیا ہوا ہے۔ اتنا مصروف ہے کہ رابطہ بھی نہیں ہو پا رہا۔ اس کے ڈیڈ بھی ساتھ ہی ہیں، کوئی کاروباری ڈیل ہے وہاں۔“

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حشام کو بتانے سے کچھ جھجک بھی رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی حشام نے کچھ تنگ

ذہنی کا ثبوت دیا تھا۔ ماہین نے شمالی علاقوں کے سفر کے بارے میں صورتِ حال کو چھپانا مناسب نہیں سمجھا تھا اور حسّام کو بتا دیا تھا کہ اس ٹور میں عمران بھی ان کے ساتھ تھا۔ تاہم ماہین کی اس صاف گوئی کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا تھا۔ سب کچھ جاننے کے باوجود حسّام نے بہت ناک بھوں چڑھائی تھی۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" فون پر ماہین کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری۔

"مجھے کیا سوچنا ہے۔ سوچنا تو تم کو ہے۔ اگر جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ، چند گھنٹوں کی بات ہی ہوگی۔"

"چلیں...... پھر دیکھتی ہوں۔" وہ اُلجھی اُلجھی سی آواز میں بولی۔

دسمبر یخ بستہ تھا۔ سردی اور دُھند جوبن پر تھی۔ اگلے روز دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ ہلکی سی لرزتی کانپتی دھوپ نکلی۔ تبھی مجھے ماہین کا فون موصول ہوا۔ وہ اور عمران ساتھ تھے۔ ماہین کی گاڑی پر وہ دونوں شالامار باغ پہنچے ہوئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے جلو پارک اور پھر ایک شاپنگ سینٹر جانا تھا۔ عمران کی طرح ماہین بھی اچھے موڈ میں نظر آتی تھی۔

مجھے خوشی ہوئی کہ اپنی جذباتی ترنگ کے مطابق عمران کچھ وقت ماہین کے ساتھ گزار رہا ہے۔ اگر کوئی واقفِ حال انہیں دیکھ بھی لیتا تو مضائقہ نہیں تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ دونوں پبلک پلیسز پر تھے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے عمران کا فون آیا۔ وہ چہک رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "آج کا دن بہت یادگار رہا چاچو! میں اسے بہت سنبھال سنبھال کر رکھوں گا۔ ہم نے دریائے راوی کی سیر کی۔ ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں بھاگتے رہے۔ ہم جوائے لینڈ میں بچوں کی طرح جھولے جھولے، پھر ہم نے جی ٹی روڈ کے ایک چھپر ہوٹل میں بہت مزیدار کھانا کھایا اور ایک فور اسٹار ہوٹل میں چائے پی کر "میٹرو" میں شاپنگ کی۔"

"اور اب کیا کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اب ہم جلو پارک میں ہیں۔ ماہین کی گاڑی میں ہی ڈرائیو کر کے یہاں لایا ہوں۔ اب میں لکڑی کے بینچ پر بیٹھا ہوں۔ ماہین میرے لیے اپنی پسند کی آئس کریم لینے کے لیے وہ سامنے اسٹال پر گئی ہوئی ہے۔"

"اتنی سردی میں آئس کریم؟"

"آپ کو بتایا ہے نا کہ آج جو کچھ ہوتا رہا ہے انوکھا ہی ہوتا رہا ہے اور اس انوکھے پن کو دسمبر کی اس دُھند میں لپیٹ کر میں اپنے دل کے سب سے خفیہ خانے میں چھپا لوں گا۔ بہت سنبھال کر رکھوں گا۔"

"اچھا اب اس انوکھے پن کو بریک لگاؤ۔ شام ہونے والی ہے، واپس آجاؤ۔"

"دسمبر کے دن کتنے چھوٹے ہوتے ہیں، اس کا پتا مجھے آج چلا ہے۔" اس نے آہ بھری۔ اسی دوران میں کچھ فاصلے سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ یقیناً یہ ماہین ہی تھی جو شاید آئس کریم لے کر آرہی تھی۔ "ٹھیک ہے باس۔" عمران نے جلدی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

سات بجے کے قریب میں نے یہ جاننے کے لیے ماہین کو فون کیا کہ وہ گھر پہنچ گئی ہے۔ مجھے اس کا فون بند ملا۔ میں نے عمران کے نمبر پر کال کی۔ وہاں بیل تو جاتی رہی مگر عمران نے فون نہیں اٹھایا۔ دو تین کوششوں کے باوجود جب کال اٹینڈ نہیں ہوئی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے پھر ماہین کا نمبر پریس کیا۔ اس کا نمبر بدستور بند جا رہا تھا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے ماہین کی خالہ فوزیہ کا نمبر ملایا۔ ان کی نقاہت سے بھری ہوئی آواز ابھری۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ماہین گھر آ گئی ہے۔

وہ میری آواز پہچان کر بولیں۔ "تابش! میں خود آپ کو فون کر رہی تھی۔ اندھیرا ہو گیا ہے..... بلکہ سات بج چکے ہیں، وہ ابھی نہیں پہنچی۔ حسّام بھی ایک دن پہلے ہی لوٹ

عملی مظاہرہ

ایک دیوہیکل پہلوان ٹائپ آدمی ایک شراب خانے میں آیا اور بارٹینڈر سے کہنے لگا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہیں ایک گن کٹے بدمعاش کی ضرورت ہے جو ناپسندیدہ افراد سے نمٹ سکے۔"

"ضرورت تو بڑی شدید ہے مگر تمہیں اس کام کا کوئی تجربہ بھی ہے؟" بارٹینڈر نے پوچھا۔

"تجربہ تو کوئی خاص نہیں لیکن میں عملی مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر گن کٹے بدمعاش نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک مست شرابی قسم کا آدمی فون پر کسی کو گالیاں دے رہا تھا۔ گن کٹے نے کمرے میں جا کر اس شخص کو دبوچا اور کسی احتجاج کی پروا کیے بغیر اسے شراب خانے سے باہر پھینک دیا اور فاتحانہ انداز سے جھومتا ہوا واپس آ کر کہنے لگا۔

"عملی مظاہرہ پسند آیا؟"

"بہت خوب۔" بارٹینڈر نے کہا۔ "مگر نوکری کی اجازت تمہیں باس سے لینی پڑے گی۔"

"باس کہاں ہے؟" بدمعاش نے پوچھا۔

"جسے تم باہر پھینک آئے ہو وہی اس بار کا مالک ہے۔"

رہا ہے۔ وہ کراچی سے روانہ ہو چکا ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک پہنچ جائے گا۔ وہ سیدھا ماہی سے ملنے ہی آئے گا۔ اگر اسے پتا چلا کہ وہ آپ کے بھتیجے عمران کے ساتھ گئی ہے تو اسے اچھا نہیں لگے گا۔ وہ پہلے ہی آپ لوگوں کے پہاڑی علاقے والے ٹور سے زیادہ خوش نہیں ہے۔ ابھی وہ فون پر بتا رہا تھا کہ کراچی سے کسی لیڈی ڈریس ڈیزائنر کو ساتھ لا رہا ہے۔ ماہین کے عروسی جوڑے کا ناپ وغیرہ لینے کے لیے...... اصل میں شادی کی تیاری بھی شروع ہو گئی ہے نا۔''

میں نے انہیں تسلی دی۔ ایک بار پھر عمران کے نمبر پر ٹرائی شروع کی۔ ایک دفعہ کال گئی لیکن پھر فون بند ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ انجانے اندیشے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ عمران کے دو دوستوں کے فون نمبر بھی میرے پاس تھے۔ انہیں بھی کال کی۔ وہ بھی اس کے بارے میں لاعلم تھے۔ رات نو بجے کے لگ بھگ میں نے پھر ماہین کی خالہ کو فون کیا۔ اس مرتبہ جواب میں ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ یہ ماہین کے چچا ثاقب رشید صاحب تھے۔ ماہین ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ذرا سخت گیر بھی ہیں۔ ان کی سختی واقعی ان کے لب و لہجے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ ''آپ تابش صاحب بول رہے ہو؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

''جی ہاں، آپ غالباً ثاقب صاحب ہیں۔ مجھے ماہین کے بارے میں پوچھنا تھا۔''

''ماہین اس وقت اسپتال میں ہے۔ میں بھی وہیں سے بول رہا ہوں۔''

''کیا ہوا ماہین کو؟'' میں بُری طرح چونکا۔

''یہ تو آپ کو پتا ہوگا یا آپ کے اُس منہ بولے بھتیجے کو۔'' زہر خند لہجے میں کہا گیا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''مزید سمجھنے کے لیے آپ یہاں اسپتال میں تشریف لے آئیں۔'' غصیلے لہجے میں جواب آیا اور اسپتال کا ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا گیا۔

ثاقب رشید کے لب و لہجے سے سخت خطرے کی بُو آ رہی تھی۔ ماہین اسپتال میں تھی تو کیسے پہنچی تھی...... اور عمران...... وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔

میں نے اسی وقت گاڑی نکالی اور جیل روڈ پر واقع اس پرائیویٹ اسپتال میں پہنچ گیا۔ یہاں کا منظر ہی کچھ مختلف نظر آ رہا تھا۔ ماہین کے چچا اور خالہ فوزیہ کے علاوہ ایک دو اور رشتے دار بھی یہاں موجود تھے۔ ثاقب رشید چالیس کے پیٹے میں تھے۔ وہ الیکٹرانکس کا کاروبار کرتے تھے اور اپنی مارکیٹ کے صدر وغیرہ بھی تھے۔ اُن کے بھاری بھرکم چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ فوزیہ بیگم بھی بالکل گم صم نظر آ رہی تھیں۔

میں ماہین کو دیکھنا چاہ رہا تھا مگر ثاقب رشید مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے۔ گمبھیر آواز میں گویا ہوئے۔ ''تابش صاحب، آپ اصل بات بتائیں، یہ عمران آپ کا کیا لگتا ہے؟''

''وہ میرے عزیز دوست کا بیٹا ہے لیکن میرے لیے سگے بھتیجے سے بڑھ کر ہے۔''

''تو جناب، آپ کے اُس سگے بھتیجے نے ماہین کو اغوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماہین نے چلتی گاڑی سے کود کر اپنی جان بچائی ہے۔ اس کے سر پر سخت چوٹ آئی ہے۔ وہ نیم بے ہوش پڑی ہوئی ہے...... اور آپ کا سگا بھتیجا ماہین کی گاڑی سمیت فرار ہو چکا ہے۔''

میرا دماغ چکرانے لگا۔ یہ میں کیا سن رہا تھا۔ مجھے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہوا۔ ''یہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟'' میں نے ترش لہجے میں پوچھا۔

''خود ماہین نے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''کچھ دیر پہلے وہ چند منٹ کے لیے ہوش میں آئی تھی۔ اسی نے ساری حقیقت بتائی ہے۔ میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ ہم اس واقعے کی ایف آئی آر درج کرا رہے ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ثاقب صاحب، بچّی کا معاملہ ہے۔ کیوں اس کی بدنامی کا اشتہار لگانا چاہ رہے ہیں۔ آپ ذرا تحمل سے کام لیں۔ معاملے کی تہ تک پہنچنے دیں۔ اگر واقعی کسی قسم کا جرم ہوا اور پرچہ کٹوانا ضروری ہوا تو میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

''جرم تو ہو چکا ہے جناب...... اور آپ کے بھتیجے نے کیا ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں ہے کہ اُسے بچالیں گے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ معاملہ کافی بگڑ چکا ہے۔ شاید ابھی آپ کو پتا نہیں چلا۔ ماہین کو اغوا کرنے کی کوشش میں آپ کے بھتیجے صاحب نے ایک ناکے پر دو پولیس والوں کو بھی کچل دیا ہے۔ ان میں سے ایک کی حالت اسپتال میں نازک ہے۔ پرچہ تو اس کے خلاف آل ریڈی درج ہو چکا ہے۔''

میں سناٹے میں تھا۔ میں ماہین کو دیکھنا چاہ رہا تھا مگر ثاقب رشید اور ڈیوٹی ڈاکٹر نے صرف اتنی اجازت دی کہ میں اسے دور سے دیکھ سکوں۔ وہ سفید بستر پر چت لیٹی تھی۔

اس کے سر پر بھاری بینڈیج تھی۔ گردن پر بھی دو جگہ میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ وہ بالکل بے حرکت تھی۔ کچھ چوٹ کے سبب اور غالباً کچھ ٹرینکولائزرز کے سبب وہ بے ہوش نظر آرہی تھی۔

انسپکٹر زبیر احمد دو روز پہلے ایبٹ آباد سے واپس آچکا تھا۔ میں نے اسے فون کیا اور صورتِ حال پوچھی۔ اسے مکمل تفصیل تو معلوم نہیں تھی تاہم اس نے تصدیق کرتے ہوئے بتایا۔ ”کینال روڈ کے ایک ناکے پر یہ واقعہ ہوا ہے۔ ایک تیز رفتار کار کو روکنے کی کوشش کی گئی تو کار چلانے والے نے کار اہلکاروں پر چڑھا دی۔ پہلے دو اہلکاروں کے زخمی ہونے کی اطلاع تھی، اب تین کی ہے۔ ان میں سے ایک کی حالت جنرل اسپتال میں سیریس بتائی جاتی ہے۔“

”کار کا نمبر وغیرہ نوٹ ہوا؟“

”نہیں جی، کافی دُھند تھی۔ پلیٹ دیکھی نہیں جاسکی۔ کچھ ایسی بات بھی سننے میں آرہی ہے کہ کار کی پلیٹس تھیں ہی نہیں۔“

انسپکٹر زبیر احمد نے کار کا جو ماڈل اور رنگ بتایا وہ ماہین کی کار ہی کا تھا۔ شام سے پہلے مجھے عمران کا جو فون آیا تھا، اس میں بھی عمران نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ماہین کی کار کو ڈرائیو کر کے جلو پارک لایا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں سے واپسی پر بھی وہی کار ڈرائیو کر رہا تھا جو الزام عمران پر لگایا جا رہا تھا اس پر تو میں کسی صورت یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ ان دونوں کو پولیس ناکے پر روکنے کی کوشش کی گئی ہو اور کسی غلطی کے سبب پولیس اہلکار گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہو گئے ہوں مگر اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی ذہن میں اُبھر رہا تھا کہ اگر ایسا ہی ہوا ہے تو پھر عمران نے ابھی تک مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔

اسی اثنا میں ایک اور بُری خبر اسپتال پہنچی اور اس نے صورتِ حال مزید گمبھیر کر دی۔ پتا چلا کہ گاڑی کے نیچے کچلا جانے والا اے ایس آئی زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا ہے۔ یہ عمران کے لیے بہت مخدوش صورتِ حال تھی۔ بلکہ اس بات کا امکان بھی موجود تھا کہ عمران کے دوستوں میں سے ایک دو کو دھر لیا جاتا۔ میں نے اسپتال ہی سے عمران کے قریبی دوست ضیا کو فون کیا اور اسے صورتِ حال بتانے کے بعد ہدایت کی کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دو تین روز کے لیے دائیں بائیں ہو جائے پولیس انہیں پریشان کر سکتی ہے۔

اس کے بعد میں فوراً ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایس ایس پی جمشید وڑائچ صاحب میرے بہی خواہوں میں سے تھے۔ میں نے کچھ عرصہ اُن کی ماتحتی میں بھی کام کیا تھا۔ وہ اپنے آفس میں مل گئے۔ ایک اہلکار کی ناگہانی موت نے انہیں بھی ملول کر رکھا تھا۔ میرے پہنچتے ساتھ ہی انہوں نے جونہی اطلاع مجھے دی، وہ یہ تھی کہ مطلوبہ گاڑی کا پتا چل گیا ہے۔ وہ بولے۔ ”گاڑی نشاط ہاؤسنگ سوسائٹی کی ایک ویران سڑک پر کھڑی ملی ہے۔ اس کی جانچ کی جارہی ہے۔“ اس کے بعد وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ جیسے جاننا چاہ رہے ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ یہ بات تو وہ جان ہی چکے تھے کہ اس واردات میں جس نوجوان کا نام لیا جارہا ہے وہ میرا قریبی ہے۔

میں نے کہا۔ ”جمشید صاحب! میں یہاں کسی کے لیے فیور مانگنے نہیں آیا۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایف آئی آر میں جلدی نہ کی جائے......“

”ایف آئی آر تو پہلے ہی کٹ چکی ہے۔ لیکن اب اس میں قتل اور اغوا کی دفعات شامل کرنا ہوں گی۔ لڑکی کے لواحقین نے جو بیان دیا ہے، اس کے مطابق لڑکی ماہین کو اس نوجوان عمران نے اغوا کیا ہے......“

”میں یہی عرض کرنا چاہ رہا ہوں جی۔ ابھی ہم نے براہِ راست لڑکی کا بیان نہیں سنا ہے۔ اُس کی زبانی یہ سب سننا ضروری ہے۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں دفعات شامل کرلیں۔“

”ابھی اُس کی حالت بیان دینے کے قابل نہیں ہے تابش۔“

”تو چند گھنٹے انتظار کر لیتے ہیں جی...... یہ ملزم کے لیے اب زندگی موت کا سوال بن گیا ہے۔“

میرا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ جمشید صاحب کی وسیع ٹیبل پر رکھے ایک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ کچھ دیر بات سنتے رہے اور اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ پھر فون رکھ کر انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”تابش! تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ گاڑی کی ایک سیٹ کے نیچے سے سو گرام کے قریب چرس بھی ملی ہے۔ لگتا ہے کہ گاڑی چلانے والا نشے میں بھی تھا۔ اس کے علاوہ لڑکی کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے اور خون کے کچھ دھبے بھی نظر آئے ہیں۔“

کمرے میں کچھ دیر تک بوجھل خاموشی طاری رہی۔ تب میں نے کہا۔ ”جمشید صاحب! یہ بات میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہمارا ایک ساتھی جان سے گیا ہے اور دو

زخمی ہوئے ہیں۔ ایسے موقعوں پر بیٹی بھائیوں کا غم و غصہ ایک قدرتی بات ہے......"

"شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ چرس وغیرہ خود تفتیشی انسپکٹر نے ڈالی ہے۔ یہ ہو بھی سکتا ہے، لیکن باقی کے شواہد بھی تو کچھ کم سنگین نہیں ہیں۔ گاڑی کی نمبر پلیٹس نہیں ہیں۔ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ چکا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ لڑکی چلتی گاڑی سے کودی ہے......"

"اسی لیے تو گزارش کر رہا ہوں جی کہ جتنی جلدی ممکن ہو لڑکی کا بیان قلم بند کیا جائے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ لڑکی ماہین کے لواحقین اس کا بیان دلوانے سے کنی کترا رہے ہیں۔"

دوپہر سے کچھ دیر پہلے ہم، یعنی میں اور جمشید وڑائچ صاحب، تفتیشی انسپکٹر کے ساتھ ماہین کے گھر پہنچے۔ اطلاع کے مطابق اب اس کی طبیعت سنبھل چکی تھی اور وہ بیان کے قابل تھی۔ ہم ماہین کا بیان تنہائی میں لینا چاہتے تھے مگر وہاں موجود ماہین کے چچا ثاقب رشید نے کہا کہ وہ بہت ڈری ہوئی ہے۔ اکیلے میں بیان نہیں دے سکے گی۔ وہاں پر ماہین کے ایک خالو اور ایک ماموں زاد بھی پائے جا رہے تھے۔ انہوں نے بھی تائید کی کہ ماہین بہت خوف زدہ ہے۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ ہم ابھی اسے بیان دینے پر مجبور ہی نہ کریں۔

بہر حال، ہم ماہین کے چچا ثاقب کی موجودگی میں ماہین کے پاس پہنچے۔ اُس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ سر پر بینڈیج بھی موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ پھر میری طرف سیدھا دیکھنے کے بجائے اس نے چہرہ ذرا سا پھیر لیا۔ کیا واقعی عمران کا کوئی دوسرا روپ بھی تھا جو اَب میرے سامنے آ رہا ہے؟ یہ سوال ایک کراہ کی طرح میرے اندر سے اُبھرا۔

ایس ایس پی جمشید کے علاوہ میں نے بھی ماہین کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ وہ بلا کسی اندیشے اور دباؤ کے بے خوف ہو کر اپنا بیان لکھوائے۔

ماہین نے کچھ بولنا چاہا مگر ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ "بولو بیٹی بولو۔" اس کے چچا ثاقب نے اس کی ہمت بندھائی۔ "اس لوفر نے کس بہانے تمہیں اپنے پاس بلایا تھا؟"

کوشش کے باوجود ماہین کچھ بول نہ سکی۔ اس کا چہرہ مزید زرد ہو گیا تھا۔ اس کے چچا ثاقب نے دو تین بار کہا کہ وہ اپنا بیان لکھوائے۔ مگر جب وہ چند بے ربط الفاظ کے علاوہ کچھ نہ بول پائی تو ثاقب رشید نے کہا۔ "اس بدمعاش کے اصل روپ سے ماہین آگاہ نہیں تھی۔ اُس نے فون پر ماہین کو بتایا کہ وہ دو تین روز میں واپس انڈیا جا رہا ہے۔ لاہور کی قابلِ دید جگہوں کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ ماہین اپنی گاڑی پر اسے تھوڑا سا گھما دے۔ یہ نادان اسے اپنا مخلص دوست سمجھتی تھی۔ اس کے کہنے پر چلی گئی۔ اپنی گاڑی پر اسے گھماتی رہی۔ اِسے اُس بدنیت کے ارادوں کا پتا نہیں تھا......"

اس مرحلے پر میں نے ثاقب رشید کو ٹوکا۔ میں نے ماہین سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "ماہین! آپ کے انکل جو کچھ کہہ رہے ہیں آپ اس سے ایگری ہیں؟"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد ماہین نے بڑے کرب سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چچا کی بات کی تائید کر رہی تھی۔ ثاقب رشید نے ماہین کا کندھا تھامتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ بیٹا! جب تمہاری گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ویران سڑک پر مڑا تو تم نے کیا کہا؟"

ایک دلدوز ہچکی سی ماہین کے سینے سے اُبھری۔ اس نے بمشکل کہا۔ "میں نے...... اُسے...... میں نے اُسے گاڑی...... روکنے کو کہا۔"

"مگر اس نے گاڑی نہیں روکی۔ دروازے اندر سے لاک کر دیے۔ رفتار بھی ایک دم تیز کر دی......" ثاقب رشید نے جیسے ماہین کی بات مکمل کی اور سوالیہ نظروں سے ماہین کو دیکھا۔ ہماری سوالیہ نظریں بھی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ماہین نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور دو آنسو اس کے رخساروں کی طرف رینگ گئے۔ آج میں جس ماہین کو دیکھ رہا تھا، وہ اُس ماہین سے بہت مختلف تھی۔ جو اپنے اندر بلا کا اعتماد رکھتی تھی اور جس کی چہکاریں سماعتوں میں رس گھولتی تھیں۔

اگلے چند منٹ میں ثاقب رشید اور انسپکٹر عاقل کے سوالات کے ٹوٹے پھوٹے مختصر جوابات سے ہمیں جو کچھ معلوم ہوا وہ میرے لیے بہت تحیر خیز تھا...... اس گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شام سے تھوڑی دیر پہلے عمران کے رویے میں یکایک تبدیلی رونما ہوئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دہرا روپ رکھتا ہے۔ اُس نے ماہین کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ ماہین اس کے رویے سے ششدر تھی۔ اس نے اپنی ہمت طاقت کے مطابق عمران کے خلاف مزاحمت کی اور جب پانی سر سے گزرنے لگا تو اس نے ایک موڑ پر چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔

بیان دینے کے بعد ماہین ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کے چچا ثاقب رشید اور خالو امتیاز احمد نے اسے بمشکل چپ کرایا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے میں اور جمشید صاحب، تفتیشی افسر سمیت کمرے سے باہر آ گئے۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ حقیقت وہی ہے جو ماہین بتا رہی ہے۔ ابھی کمرے میں ہونے والی گفتگو پر اعتبار کیا جاتا تو پھر تو عمران نہ صرف اغوا کا مرتکب ہوا تھا بلکہ اس سے ایک سرکاری اہلکار کا قتل بھی سرزد ہو چکا تھا۔ اس واقعے نے میڈیا پر بھی بہت ''ہائپ'' پکڑ لی تھی۔ اتفاقاً دو ہفتے پہلے اس طرح کا ایک اور واقعہ بھی رونما ہو چکا تھا جس میں ایک امیرزادے نے پولیس کے روکنے پر اپنی لینڈ کروزر جیپ ایک بدنصیب ہیڈ کانسٹیبل پر چڑھا دی تھی اور اس بے چارے نے موقع پر ہی تڑپ تڑپ کر جان دے دی تھی۔ اب میڈیا پر شور بپا تھا کہ اس تازہ واردات کے مجرم کو بھی پکڑا جائے اور قرار واقعی سزا دی جائے۔

ابھی ہم وہیں تھے کہ ماہین کا ہونے والا شوہر حشام بھی وہاں آ گیا۔ ان سارے واقعات کی واضح برہمی اس کے چہرے پر نظر آرہی تھی۔ اس نے مجھ سے مکمل بے رخی برتی اور بس ایک دو فقروں کا تبادلہ کر کے ماہین کے چچا ثاقب رشید سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

ماہین کے گھر کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ماہین کی شادی کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔ تازہ رنگ و روغن کی باس تھی۔ ایک میز پر شادی کارڈز کے کچھ نمونے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ اطلاع یہی تھی کہ اس مہینے ماہین رخصت ہو کر حشام کے گھر جانے والی ہے۔ اب اس نئی ابتلا کی وجہ سے بہت کچھ درہم برہم ہو گیا تھا۔

سکتہ زدہ سی ماہین کو تسلی تشفی دے کر میں سینئر ایس پی جمشید صاحب کے ساتھ واپس آ گیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر عمران کی طرف سے تھی۔ اس نے ابھی تک رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟

میری یہ تشویش رات ایک بجے کے لگ بھگ دور ہوئی۔ میں جاگ رہا تھا اور ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ تقریباً ہر چینل پر یہ خبر مرچ مسالے کے ساتھ موجود تھی۔ جاں بحق ہونے والے پولیس اہلکار کے اشک بار لواحقین کو دکھایا جا رہا تھا۔ مجرم کو قرار واقعی سزا کی اپیلیں ہو رہی تھیں۔ خبروں میں واقعے کی سی سی ٹی وی فوٹیج کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ حالانکہ میری اطلاع کے مطابق پولیس ناکے کے قریب بھی ایک کیمرا موجود تھا۔

میں نے ایک بار پھر متعلقہ پولیس اسٹیشن فون کیا اور ایس ایچ او سے فوٹیج کا پوچھا۔ ''نہیں جناب!'' قدرے بے رخی سے جواب ملا۔ ''وہاں دو کیمرے تھے۔ ایک تو ایک مہینے سے بند پڑا تھا۔ دوسرے میں بھی فالٹ ٹریس ہوا ہے۔''

''آگے کسی کیمرے کا ریکارڈ ملا ہے؟''

''جی ہاں، سلیم احمد کو مارنے کے بعد مجرم جی ٹی روڈ کی طرف جاتا نظر آتا ہے۔ آگے دُھند بہت زیادہ تھی۔ مزید ٹریسنگ ابھی تک نہیں ہوئی۔'' (سلیم احمد وہی اے ایس آئی تھا جس کی موت واقع ہوئی تھی) میں نے جھلا کر فون بند کر دیا۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ فوٹیج واقعی نہیں ملی یا پھر اسے چھپایا جا رہا ہے۔

میں نے فون صوفے پر پھینکا ہی تھا کہ وہ پھر بول اٹھا۔ میں نے لپک کر اٹھایا۔ عمران کا نمبر دیکھ کر دھڑکن سرپٹ ہو گئی۔ ''ہیلو عمران کہاں ہو؟''

''مصیبت میں ہوں چاچو جان! چارجنگ بھی بہت کم رہ گئی ہے۔ لمبی بات نہیں کر سکتا۔''

''ہوا کیا تھا پولیس ناکے پر...... مجھے جلدی بتاؤ۔''

''وہی جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' اس کی آواز شکستہ تھی۔ ''ناکے پر ایک پولیس والا بالکل اچانک ہمارے سامنے آ گیا تھا، بلکہ کر گیا تھا۔ میں نے اُسے بچانے کے لیے تیزی سے گاڑی موڑی، مگر وہ ٹائروں کے نیچے کچلا گیا۔ اس کے بعد گاڑی بُری طرح لہرا گئی تھی۔ اس نے دو پولیس اہلکاروں کو زخمی بھی کیا۔ اس کے بعد ہم پر ناکے سے دو فائر کیے گئے۔''

''تم ناکے پر رکے کیوں نہیں؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

''اس کی بھی وجہ تھی۔ چارجنگ بڑی کم ہے۔ فون بند ہو جائے گا۔ پھر بتاؤں گا۔ ناکے سے پولیس کی گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی۔ میں اس معاملے میں ماہین کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ آگے جا کر میں نے جلدی سے اسے اتار دیا۔ خود جی ٹی روڈ کی طرف نکل گیا۔ پہلے تو مجھے یہی لگا کہ پولیس سے پیچھا چھوٹ گیا ہے مگر کچھ آگے جا کر پھر ایک ناکے پر مجھے روکنے کی کوشش کی گئی۔''

''اب کہاں ہو تم؟'' میں نے جھلا کر پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں ہے۔ قریباً آدھ گھنٹا گاڑی بھگانے کے بعد میں نے اسے کسی ویران ہاؤسنگ سوسائٹی میں چھوڑ دیا۔ ایک دیہاتی سے موٹر سائیکل پر لفٹ لے کر کچھ آگے

گیا۔ اب ایک گھر میں چھپا ہوا ہوں۔ کسی بڑے مجاور یا پیر وغیرہ کا گھر لگتا ہے۔ دیوار پھاند کر اندر آیا ہوں۔ اوپر والی منزل پر کوئی موجود ہے شاید۔ پولیس والے بھی آس پاس ہی ہیں۔ فی الحال نکل نہیں سکتا۔''

''کچھ اندازہ نہیں کہ لاہور سے کس جانب نکلے تھے اور کتنی دور ہو؟''

''بتایا ہے نا کہ آدھ گھنٹا سے زیادہ گاڑی چلائی ہے اور رخ تو شاید شمال کی طرف ہی تھا۔ جہاں چھپا ہوا ہوں وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر کوئی خانقاہ یا مزار وغیرہ بھی ہے۔ وہاں سے ''حق ہُو'' کی آوازیں آرہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو عمران، کام پہلے ہی بہت خراب ہو چکا ہے۔ اب کسی سے بھی کوئی پنگا نہیں لینا، خاص طور سے پولیس کے ساتھ۔ پولیس اہلکار کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔''

وہ ایک دم چپ سا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس والے کے جانبر نہ ہونے کی اطلاع اسے مجھ سے ہی ملی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، فون بند ہو گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ چارجنگ ختم ہو گئی تھی۔

میں اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ عمران جونیئر کو لاہور کے سوا اردگرد کے علاقے کا کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ فی الوقت بتانے سے قاصر تھا کہ کہاں ہے۔ ہاں اس کی فون کال کی بنیاد پر لوکیشن ڈھونڈنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ مجھے یہ بھی حیرانی تھی کہ ابھی تک لاہور پولیس کو یہ پتا کیوں نہیں چلا کہ لاہور سے تیس چالیس میل دور کسی علاقے کی پولیس مفرور عمران کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں نے گوجرانوالا اور شیخوپورہ وغیرہ میں اپنے ہرکاروں کو فون کیے اور ان سے اس بارے میں جاننا چاہا مگر کوئی ٹھوس اطلاع سامنے نہیں آسکی۔ میں نے انسپکٹر زبیر اور انسپکٹر رائے کو ضروری ہدایات دیں اور انہیں یہ معلوم کرنے کو کہا کہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں عمران خود کو پولیس کے گھیرے میں محسوس کر رہا ہے۔

☆☆☆

اگلے قریباً 72 گھنٹے سخت تشویش کے تھے۔ سوشل میڈیا اور مین اسٹریم میڈیا پر اے ایس آئی سلیم احمد کا قتل بہت ہائپ پکڑ چکا تھا۔ مجرم کو عبرت ناک سزا دینے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ عمران کے حوالے سے میں سخت الجھن میں تھا۔ اس سے دوبارہ رابطہ نہیں ہوا تھا پھر اس نے حادثے کے سلسلے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ اُس بیان سے بالکل مختلف تھا جو ماہین اور اس کے اہل خانہ دے رہے تھے۔ تیسرے دن پھر دو فون کالز ایسی آئیں جنہوں نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ پہلی کال ماہین کے سخت گیر چچا ثاقب رشید کی طرف سے تھی۔ ثاقب رشید اپنی مارکیٹ کا صدر تھا اور گھن گرج سے بولتا تھا۔ اس نے کہا۔

''تابش صاحب، اگر تمہارا خیال ہے کہ اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر بھتیجے کو بچا لو گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ اسے اس کے کیے کی سزا مل کے رہے گی۔ اگر آپ جناب نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے تو اس سے آپ کے لیے بھی مشکلات پیدا ہوں گی۔''

''تمیز سے بات کرو ثاقب رشید، یہ چھپانے والی بات کر کے تم ایک ذمے دار سرکاری اہلکار پر الزام لگا رہے ہو۔''

''الزام اس لیے لگا رہے ہیں کہ تم نے خود بتایا ہے کہ اس نے کسی جگہ سے تمہارے ساتھ رابطہ کیا ہے۔''

''میں جو کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ اُس نے صرف ایک بار رابطہ کیا ہے لیکن اسے خود بھی معلوم نہیں کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ اردگرد کی پولیس بھی اس کی ''فون لوکیشن'' نہیں ڈھونڈ سکی۔''

ثاقب بولا۔ ''کب تک چھپے گا۔ اس نے ہمیں برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یہ تو شکر ہے اوپر والے کا۔ ہمارا داماد فرشتہ صفت ہے۔ ورنہ ہماری بچی کی شادی والا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہوتا۔ اُس بدبخت نے عین شادی کے دنوں میں اپنا یہ گندا کھیل کھیلا ہے۔''

''دیکھو ثاقب! تم زبان سنبھال کر بات کرو۔ وہ مجرم نہیں صرف ملزم ہے اور ملزم بھی صرف اتنا کہ حادثاتی طور پر ایک اہلکار اس کی گاڑی کے نیچے آیا ہے۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس نے کسی کو دھوکے سے بلایا ہے اور نہ اغوا کیا ہے اور یہ بات تم لوگ بھی جانتے ہو۔''

''ان باتوں کا پتا تو اب عدالت میں چلے گا۔''

ثاقب نے آتشیں لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

اس کال کے دوران میں ہی بیپ کی آواز سنائی دیتی رہی تھی۔ یہ ایک دوسری کال تھی جو ایک ایجنسی کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے ''کال بیک'' کی۔ یہ خفیہ ایجنسی کا افسر تھا جو پہلے بھی ایک بار عمران کے بارے میں بات کر چکا تھا۔ اس نے شائستہ لہجے میں مگر کچھ سخت باتیں کہیں۔ اس نے کہا کہ ابھی یہ خبر عام نہیں ہوئی کہ عمران انڈیا سے آیا ہے اور اس کے ویزے کی میعاد بڑھائی گئی ہے وغیرہ

وغیرہ۔ یہ خبریں پھیل گئیں تو شکوک وشبہات اور بڑھ جائیں گے۔ بہتری اسی میں ہے کہ وہ جلد از جلد اپنی گرفتاری دے دے، اور جو جرم ہوا ہے، اس کی سزا پائے۔

اگلا دن میرے لیے بے حد حیرت ناک تھا۔ میں گھر میں تھا۔ میری ملازمہ کرن جو اپنے نام کے برعکس کافی فربہ اندام تھی، ڈگمگاتی ہوئی اندر آئی اور بولی کہ کوئی برقع پوش عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے اندر بلالیا۔ وہ عورت کے بجائے لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ کرن کے جانے کے بعد جب بند کمرے میں اس نے اپنا نقاب اٹھایا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں خود ماہین تھی۔ اس کے سر کی پٹی تو اتر چکی تھی مگر گردن پر ابھی تک دو جگہ بینڈیج موجود تھی۔ اس کا رنگ ہلدی تھا اور خوب صورت آنکھوں میں نقاہت اتری ہوئی تھی۔

”ماہین! تم یہاں؟“

وہ سسک کر میرے بازو سے لگ گئی اور سر میرے کندھے پر ٹکادیا۔ میں نے اسے پچکارا، دلاسا دیا۔ تھوڑا پانی پلا کر اسے صوفے پر بٹھایا۔ وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ”انکل تابش! میں چچا ثاقب اور ماموں سے چھپ کر یہاں آئی ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”تو تم نے فون کرلیا ہوتا۔“

”میرا فون تو ابھی تک پولیس والوں کے پاس ہے۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہ رہی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں پھر نمی آگئی۔

میں نے اُسے دوبارہ دلاسا دیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھ کر انکشاف کیا۔ ”انکل تابش! جب ناکے پر پولیس والا نیچے آکر کچلا گیا تب گاڑی عمران نہیں چلا رہا تھا، میں چلا رہی تھی۔ اگر کوئی مجرم ہے تو میں ہوں۔ وہ بالکل بے قصور ہے۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ بولی۔ ”انکل...... اُس نے صرف مجھے بچانے کے لیے یہ الزام اپنے سر لیا۔ اسے پتا تھا کہ میری شادی کی تیاری ہورہی ہے اور بس چند دن بعد شادی ہے۔ وہ مجھے مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ شاید...... وہ شاید کسی کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ وہ بالکل اور طرح کا بندہ ہے انکل......“ وہ پھر سسک پڑی۔

میں نے حیرت کے دھچکے سے سنبھل کر کہا۔ ”لیکن پتا تو یہ چل رہا ہے کہ وہ ڈرائیونگ کررہا تھا۔ کیا...... اس نے حادثے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی؟“

”ہاں انکل! دراصل ہمیں اسی وقت پتا چل گیا تھا کہ دو بندے زخمی ہوئے ہیں مگر تیسرا جو گاڑی کے نیچے آیا ہے، بچ نہیں پایا ہوگا۔ وہ دور تک گاڑی کے نیچے ہی گھسٹ گیا تھا۔ ہم پر دو گولیاں بھی چلائی گئیں۔ جلد ہی ہمیں یہ پتا بھی چل گیا کہ پولیس پیچھے لگ گئی ہے۔ تب درختوں کے درمیان ایک موڑ پر عمران نے گاڑی روکنے کا کہا۔ میں نے بریک لگائے۔ وہ مجھے باہر نکال کر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنا چاہ رہا تھا۔ میں نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ وہ مجھے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ جب میں نہیں مانی تو وہ غصے میں آگیا۔ اس نے مجھے زبردستی باہر دھکا دے دیا۔ یہاں تاریکی اور دُھند تھی۔ ڈھلوان کے سبب میں لڑکھڑائی اور گر گئی۔ میرا سر درخت سے ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا جو آخری آواز میں نے سنی، وہ فاصلے پر پولیس کاروں کے سائرنوں کی تھی۔“

یہ مناظر بیان کرتے ہوئے ماہین کے زرد چہرے پر کرب کے سائے لہرانے لگے تھے۔

”لیکن یہ ہوا کیسے ماہین! تم اچھی بھلی ڈرائیونگ کرتی ہو...... تم نے گاڑی پولیس والوں پر کیسے چڑھا دی...... اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ تم دونوں ناکے پر رکے نہیں۔“

”اس کی وجہ بھی پولیس کے لوگ ہی ہیں انکل! ہم جلو پارک سے نکلے تو اندھیرا ہورہا تھا۔ پارکنگ کی جگہ پر صرف ہماری گاڑی ہی موجود تھی۔ ہماری گاڑی کے پیچھے ایک ہائی ایس کھڑی تھی۔ ہم اندر بیٹھنے لگے تو تین پولیس والے آگئے۔ ایک شاید سب انسپکٹر تھا اور وردی میں تھا، دو سادہ لباس میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ان کے ساتھ چلنا ہوگا کیونکہ انہیں شبہ ہے کہ یہ گاڑی آج دوپہر ایک واردات میں استعمال ہوئی ہے۔ عمران اُن سے بحث کرنے لگا، میں اس دوران میں گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور دروازے اندر سے لاک کرلیے تھے۔ عمران نے روکنے والوں سے کہا کہ ان کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہ گاڑی صبح سے ہمارے استعمال میں ہے۔ پولیس والا بولا کہ غلط فہمی ہے تو تھانے پہنچ کر دور ہوجائے گی۔ پتا نہیں کیا بات تھی، شاید رشوت کھانا چاہتے تھے۔ ہم سے الٹے سیدھے سوال بھی پوچھ رہے تھے۔ عمران آپ کو فون کرنا چاہ رہا تھا مگر انہوں نے فون نہیں کرنے دیا۔ فون چھیننے کی کوشش کی تو بات بڑھ گئی۔ انہوں نے گالیاں دیں۔ عمران نے تھانیدار کو دھکا دیا اور تیزی سے گاڑی کی طرف آیا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ عمران اندر آگیا اور اس نے مجھے نکلنے کو کہا۔

پیچھے پولیس والوں کی گاڑی تھی، سامنے معمولی سی باڑ تھی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم تیزی سے سڑک پر آ گئے۔ ہمیں یہ بھی پتا نہیں کہ وہ لوگ پیچھے آئے یا نہیں اور اگر آئے تو کتنی دور تھے۔ اچانک آگے بھی پولیس ناکا نظر آیا۔ ہم نے رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ پتا نہیں کہ اب یہ غلطی تھی یا نہیں تھی......" اس کی آواز بھرّا گئی۔

اُس نے سر جھکایا اور آنسو اس کے شفاف زرد رخساروں پر رینگ گئے۔ گال کا ڈمپل بھی تر نظر آنے لگا۔

"چلو، یہ غلطی تو تم سے ہوگئی۔ مگر پولیس والوں پر گاڑی چڑھا دینا......؟" میں نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

ماہین نے ایک دم سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ "انکل! میں یہی بات آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔ اس میں میرا قصور نہیں تھا اور اگر تھا تو بہت کم۔ جب ہم ناکا کراس کر رہے تھے ایک پولیس والا بالکل اچانک گاڑی کے سامنے آگیا، بلکہ گر گیا۔ وہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ میں کچھ بھی نہ کرسکی۔ میں نے آخری کوشش کی مگر گاڑی نے اسے کچل دیا۔ میری بدحواسی کے سبب گاڑی لہرا کر سڑک کے بائیں کنارے چلی گئی۔ دو اور پولیس اہلکار بھی اس سے ٹکرائے اور زخمی ہوئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں دو کیمرے بھی موجود تھے۔ آپ...... پلیز آپ ان کی فوٹیج نکال کر دیکھیں۔ آپ کو پتا چل جائے گا کہ اس میں میرا قصور کتنا تھا اور کتنا نہیں تھا۔"

"سی سی ٹی وی فوٹیج نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

وہ روہانسی ہوگئی۔ "انکل تابش! آپ تو جانتے ہیں ایسے سارے ہتھکنڈے...... مجھے یقین ہے اپنے بیٹی بھائی کے لیے ان لوگوں نے فوٹیج چھپائی ہوگی۔ وہ جو گاڑی میں چرس وغیرہ کی بات ہو رہی ہے، وہ بھی سراسر جھوٹ ہے انکل۔ عمران اسموکنگ ضرور کرتا رہا ہے مگر میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں، اس نے کوئی نشہ نہیں کیا تھا۔"

"ماہین! گاڑی میں کچھ خون کے دھبے اور ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بھی ملی ہیں۔"

"میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ عمران نے مجھے زبردستی گاڑی سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس میں تھوڑی سی کھینچاتانی بھی ہوئی۔ یہ اس کلائی پر بھی زخم آئے۔" اس نے کلائی دکھائی۔

ماہین جو کچھ بتا رہی تھی، وہ میرے ذہن میں موجود خدشات کو ابھار رہا تھا۔ فوٹیج کے حوالے سے بھی مجھے پختہ شک تھا۔ ماہین اب عمران کے بارے میں سخت پریشان تھی۔ وہ مجھ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں اسے کیا بتاتا جب خود میں بھی بے خبر تھا۔

وہ بولی۔ "انکل تابش میرے دل پر بہت زیادہ بوجھ ہے۔ میں سچ بولنا چاہتی ہوں لیکن......" اس کی آواز پھر بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی۔

میں سمجھ گیا، وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس پر اپنے چچا ثاقب اور دیگر بڑوں کی طرف سے زبردست دباؤ تھا۔ یہ دباؤ میں نے اسی وقت محسوس کرلیا تھا جب اس کا بیان قلم بند کیا گیا تھا۔ بات بالکل واضح تھی۔ میڈیا پر شور برپا تھا اور صورتِ حال ایسی تھی کہ ماہین کے اہلِ خانہ حقیقت چھپانے پر مجبور تھے۔ وہ حقیقت ظاہر کرتے تو کئی سوالات پیدا ہو جاتے۔ مثلاً ماہین، جس کی دو ہفتے بعد شادی تھی ایک غیر لڑکے کے ساتھ کیوں گھومتی پھر رہی تھی؟ وہ رات کے وقت ایک ویران جگہ پر کیوں موجود تھے؟ گاڑی میں موجود نشہ کس کے استعمال میں تھا؟ ماہین نے ناکے پر گاڑی کیوں نہ روکی، کیوں بھاگنے کی کوشش میں آن ڈیوٹی سرکاری اہلکار کی جان لے لی؟ یہ بڑے سنگین سوال تھے۔ نہ صرف ماہین کی شادی اور شادی کی تیاریاں خاک میں مل جاتیں بلکہ وہ جیل جاسکتی تھی اور پوری زندگی کا رونا پلّے پڑ سکتا تھا اور بات صرف ماہین تک ہی محدود نہ رہتی پورے خاندان کی ناک کٹ جاتی۔ اِس کا حل اُس کے بڑوں نے یہی نکالا تھا کہ سارا ملبا عمران پر ڈال دیا جائے اور واقعے کو وہ رنگ دے دیا جائے جس سے ماہین پر کوئی حرف نہ آئے۔ اس واقعے پر یہ جھوٹا رنگ بڑی اچھی طرح اس لیے بھی چڑھ گیا تھا کہ ماہین زخمی تھی اور دوسرے یہ کہ بعدازاں جی ٹی روڈ کے ایک پولیس ناکے پر ماہین کی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر عمران کی شناخت ہوئی تھی۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ماہین میرا بازو تھام کر کراہی۔ "انکل! بیان دیتے ہوئے میں یہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر میرے گھر والوں نے مجبور کر دیا۔ خاص طور سے انکل ثاقب نے۔ وہ بہت زیادہ بدحواس تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں نے پولیس کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات کی تو وہ مجھے گولی مار دیں گے اور اپنی جان بھی لے لیں گے۔ انہوں نے نیویارک میں آپی شاہین سے بھی میری بات وڈیو لنک پر کرائی۔ آپی نے مجھے اپنے سر کی قسم دی کہ میں وہی کہوں جو میرے بڑے کہہ رہے ہیں...... آپ جانتے ہیں، آپی کی کسی بات کو ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ میں اُن کے

کہنے پر جان بھی دے سکتی ہوں۔" اس کا گلا رُندھ گیا۔

وقتِ رخصت وہ کہنے لگی۔ "انکل تابش! جو کچھ ہوا، نہیں ہونا چاہیے تھا۔ عمران نے میری خاطر ایک بڑا الزام اپنے سر لیا ہے۔ میڈیا پر اسے قاتل کہا جا رہا ہے۔ وہ قاتل نہیں ہے...... بلکہ...... کوئی بھی قاتل نہیں ہے...... اگر اس حادثے کی فوٹیج مل جائیں تو سب کچھ کلیئر ہو جائے گا۔ وہ سراسر ایک حادثہ تھا۔"

میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں اس سلسلے میں اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ فوٹیج کا کھوج لگ جائے۔"

وہ اس سارے واقعے کی وجہ سے بے حد افسردہ تھی۔ اس کی باتوں سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اس کی شادی والا معاملہ کچھ دنوں یا ہفتوں کے لیے ٹل گیا ہے۔ ماہین کے جانے کے فوراً بعد میں نے انسپکٹر زبیر کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ پتا کرے، بدھ کے روز جلو پارک کے علاقے میں، شام کو وہ کون سے اہلکار تھے جنہوں نے عمران اور ماہین کو ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ زبیر سے مجھے یہ پتا بھی چلا کہ متعلقہ پولیس نے عمران کے دو دوستوں ضیا اور وکی کو پکڑا ہے اور ان کی سفارش آنے سے پہلے ہی ان سے کچھ مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔ اب جمشید صاحب نے اس معاملے میں مداخلت کی ہے۔

اسی روز شام سات بجے کے لگ بھگ ایک بار پھر وہ کال آ گئی جس کا انتظار میں بے حد شدت سے کر رہا تھا۔ یہ عمران کی کال تھی۔ وہ حسبِ سابق آواز دبا کر بول رہا تھا۔ میں چھوٹتے ہی اس پر برس پڑا۔ "ہم پر قیامت گزر رہی ہے، تم نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟"

وہ سرگوشی جیسے لہجے میں بولا۔ "آپ کو بتایا تو تھا میں یہاں پھنسا ہوا ہوں اور میرے فون کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی۔ آج خوش قسمتی سے ایک بوسیدہ الماری کے اندر رکھے کاٹھ کباڑ میں ایک چارجر مل گیا ہے۔ اسی کی وجہ سے فون کرنے کے قابل ہوا ہوں۔"

"تمہارے ساتھ مصیبت کیا ہے۔ 72 گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ کہاں پھنسے ہوئے ہو تم؟"

"چاچو جانی، آپ کو بتایا تو تھا یہ کسی پیر مخدوم صاحب کا گھر ہے۔ پاس ہی کوئی مزار بھی ہے جسے پرانا دربار کہا جاتا ہے۔ میں یہاں ایک درمیانے سائز کے کمرے میں ہوں، یہ ایک اسٹور نما جگہ ہے یہاں باتھ روم میں بھی لنگر خانے کی چیزیں پڑی ہوئی ہیں، اب آپ پوچھیں گے کہ میں یہاں سے نکلتا کیوں نہیں ہوں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے مجھے کسی بھی چھوٹے بڑے پنگے سے منع کیا ہوا ہے۔ خاص طور پر پولیس والوں کے ساتھ۔"

"تو یہاں پولیس ہے؟"

"جی جناب! ایک پولیس موبائل 24 گھنٹے گھر کے عین سامنے کھڑی رہتی ہے۔ پولیس اہلکار بھی گھر کے اردگرد موجود ہیں۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہ میری میزبانی کے لیے ہیں مگر پھر پتا چلا کہ یہ یہاں مخدوم صاحب کی ڈیوٹی پر ہیں۔ کیونکہ جب میں یہاں گھسا تھا یہاں کوئی پہرا نہیں تھا۔ یہ سیکیورٹی انتظام مخدوم صاحب کی آمد کے بعد ہوا اور مسلسل جاری ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں یہاں سے نکلتے ہی پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤں گا۔"

"اب تمہیں یہ بھی پتا نہیں کہ ہو کہاں پر؟"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ اب اگر آپ کا حکم ہو تو رسک لے کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ویسے بھی لنگر کے سوکھے نان، پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہا ہوں، حشر ہو گیا ہے۔"

"نہیں...... یہ ٹھیک نہیں ہو گا...... ایسا کرتے ہیں کہ تم دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ کال کرو، میں تمہاری لوکیشن ٹریس کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جیسا آپ کہتے ہیں مگر ذرا جلدی کیجیے گا۔ پھر مخدوم صاحب ایک ساتھ والے کمرے میں تشریف لے آئیں گے اور میں بات نہیں کر سکوں گا۔"

عمران نے فون بند کیا تو میں نے اپنے مہربان ایس ایس پی جمشید صاحب کو کال کی اور ان سے کہا کہ وہ اپنے طور پر موبائل فون کی لوکیشن ٹریس کرانے کی کوشش کریں۔ اس سے پہلے میں نے گوجرانوالا اور شیخوپورہ پولیس سے یہ درخواست کی تھی اور کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

جمشید صاحب سے بات کرنے کے بعد میں عمران کی کال کا انتظار کرنے لگا اور وہ فوراً ہی آ گئی۔ وہ اسی طرح آواز دبا کر بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے مخدوم صاحب کا جغرافیہ پوچھا تو وہ بولا۔ "بڑا ڈھنگ سا بندہ ہے۔ عمر پینتالیس کے قریب رہی ہو گی۔ گھنی داڑھی، بھاری مونچھیں اور کندھوں تک جاتے ہوئے بال ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں بلوچستان کی طرف کا ہے مگر بندہ صحیح نہیں لگتا۔"

"وہ کیوں؟"

"اس نے دو بیویاں کر رکھی ہیں اور دونوں خوب

صورت ہیں۔"

"تو کیا دو بیویاں رکھنا گناہ ہے؟"

"لیکن دونوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا اور سونا گناہ ہے بلکہ حرام ہے۔" عمران معنی خیز لہجے میں بولا۔

"اوہ۔" میں نے ہونٹ سکیڑے۔ "مطلب یہ کہ عیاش ٹائپ شخص ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ میں جس کمرے میں پھنسا ہوا ہوں وہاں سے مخدوم صاحب کا بیڈ روم دور نہیں ہے۔ رات کے وقت بیڈ روم سے ابھرنے والی آوازیں میرے کانوں تک پہنچتی ہیں...... اور کبھی کبھی الکحل کی بُو بھی نتھنوں تک آجاتی ہے۔ یہ مخدوم صاحب جس کا اصل نام ابھی تک معلوم نہیں ہوا، آبائی طور پر کہیں نوشکی کی طرف کا رہنے والا ہے۔ یہ پرانے دربار کے پہلے متولی اور مجاوروں سے اس کی کوئی دشمنی وغیرہ بھی چل رہی ہے۔ اس کی اضافی سیکیورٹی کی وجہ یہی ہے۔"

میں اور عمران گفتگو کو دانستہ طول دے رہے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ لوکیشن کو ٹریس کرنے میں آسانی ہو۔ عمران نے بتایا کہ وہ جس اسٹور روم نما کمرے میں موجود ہے وہاں مزار پر چڑھائی جانے والی ریشمی چادروں کے تہ در تہ انبار لگے ہوئے ہیں۔ ایک کافی بھاری تجوری بھی موجود ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس میں نذرانوں کی رقوم یا رقوم کا کچھ حصہ موجود ہوتا ہو۔

پھر عمران نے بتایا۔ "ایک الماری کے اندرونی خانے سے مجھے کچھ کاغذات بھی ملے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب کا اصل نام شاید عابد خان ہے اور یہ نوشکی کے علاقے میں پندرہ بیس سال پہلے پراپرٹی ڈیلری بھی کرتا رہا ہے۔"

تب عمران نے اچانک اپنی آواز زیادہ پست کر لی۔ "یہ سنیں جی...... یہ ہلکی ہلکی آوازیں مخدوم کے بیڈ روم کی طرف سے آ رہی ہیں۔ اپنی "شریکائے حیات" کے ساتھ موجود ہے۔"

میں نے دھیان سے سنا۔ نسوانی ہنسی ابھر رہی تھی۔ کبھی کبھی ایک بھاری مخموری سی آواز بھی سنائی دیتی تھی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ یقیناً یہ رنگین مزاج مخدوم ہی رہا ہوگا۔ دنیا میں کیا کیا تماشے ہوتے ہیں اور چہروں پر کیسے کیسے خول چڑھائے جاتے ہیں، بندہ گہرائی میں جا کر دیکھتا ہے تو ورطۂ حیرت میں رہ جاتا ہے۔

میں نے کہا۔ "عمران! میرا خیال ہے کہ اب کال ختم کر دینی چاہیے۔ اللہ کرے لوکیشن ٹریس ہو جائے۔ ایسا ہو گیا تو میں تمہیں میسج بھیجتا ہوں...... اور آگے کا بھی بتاتا ہوں۔"

"لیکن چاچو! آپ نے ماہین کا کچھ نہیں بتایا۔" اس نے مدھم سرگوشی کی۔ "وہ بالکل ٹھیک ہے نا؟"

"بس اس کے سر پر تھوڑی سی چوٹ آئی تھی مگر اب ٹھیک ہے۔" میں نے اسے تفصیل بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

"پولیس کو کوئی الٹا سیدھا بیان تو نہیں دیا ماہین نے؟"

"الٹا سیدھا کیا دینا تھا۔ سیدھا سیدھا معاملہ ہے جلو پارک کے قریب تمہیں کچھ پولیس والوں نے ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ تم وہاں سے نکل آئے...... تم ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ آگے ناکا آ گیا۔ تم نے گاڑی نہ روکی۔ وہ پولیس والوں پر چڑھ گئی۔" میرے لہجے کی تہ میں ہلکا سا طنز موجود تھا جو عمران نے شاید محسوس کیا یا نہیں۔

"اور ماہین کے گھر والوں کا کیا رویّہ ہے اور حسام کا؟"

"بس ٹھیک ہی ہے۔ تمہارے بھاگ جانے کی وجہ سے اور اس سارے واقعے کی وجہ سے وہ کچھ پریشان تو ہیں۔" میں نے گول مول بات کی۔ میں فی الحال اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کی طرف سے اس پر اغوا اور دھوکا دہی جیسے سنگین الزام لگائے گئے ہیں۔ اس پر سنگین دفعات کے تحت ایف آئی آر کٹ چکی ہے اور حسام بھی اس کے لیے آگ بگولا ہوا پھرتا ہے۔

عمران سے بات ختم کرتے ہی میں نے جمشید صاحب کو کال کی۔ انہوں نے مجھے دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کا کہا اور پھر یہ خوش خبری سنائی کہ فون کی ٹھیک ٹھیک لوکیشن کا پتا چل گیا ہے۔ یہ جی ٹی روڈ پر نشاط ہاؤسنگ سوسائٹی سے قریباً دس کلومیٹر آگے ایک "لال پُلی" نامی جگہ تھی۔ یہ جگہ ضلع گوجرانوالا کی حدود میں آتی تھی۔ لاہور سے اس کا فاصلہ قریباً 55 کلومیٹر تھا۔ اب انتظار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں نے اسی وقت متعلقہ پولیس اسٹیشن... فون کیا۔ انہیں اہم معلومات دیے بغیر تیار رہنے کا کہا۔ پھر جمشید صاحب سے اجازت لی اور انسپکٹر زبیر اور چند اہلکاروں کے ساتھ اس "لال پُلی" نامی علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ یہ قریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا لیکن میں جانتا نہیں تھا اور نہ انسپکٹر زبیر جانتا تھا کہ ہم وہاں پہنچ کر عمران کو اپنی تحویل میں نہیں

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

شہر	نمبر	شہر	نمبر	شہر	نمبر
کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	سیالکوٹ	0524568440
لاہور	03004009578	وزیر آباد	03456892591	میرپور AK	03460397119
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	اٹک سٹی	057210003
حیدر آباد	03213060477	خان پور	03337472654	دیپالپور	03004854922
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	لیہ	03002373988
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	قصبہ ڈنگہ	03083360600
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	عارف والا	03008758799
فیصل آباد	03006698022	مظفر آباد	03469616224	لورالائی	03023844266
راولپنڈی	03335205014	بورے والا	03347193958	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	جلالپور پیروالا	03338303131
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	ہری پور	03321905703
رحیم یار خان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	چکوال	03348761952
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	وہوا	03346383400
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	حافظ آباد	0307-6479946
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	واہ کینٹ	0301-5497007
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	ایبٹ آباد	0992335847
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	چونکی	03454678832
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	مانسہرہ	0333-5021421
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	کوٹ رادھا کشن	03004992290
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	قصور	0300-6575020
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459		

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

لے سکیں گے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے پہلے وہاں ایک ایسا واقعہ رونما ہو چکا ہوگا جو عمران کو مزید بُری طرح پھنسا دے گا......اور میڈیا کو ایک اور دھما کا خیز خبر مل جائے گی۔

☆☆☆

جب ہم جی ٹی روڈ اور دو ذیلی سڑکوں پر سفر کر کے لال ٹُبّی کے علاقے میں پہنچے، رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ دیہاتی فضا کی وجہ سے کہرا اور اضافی سردی بھی موجود تھی۔ وہ مزار جسے عمران نے پرانا دربار کہا تھا، دور ہی سے نظر آ گیا۔ یہاں جھنڈے لہرا رہے تھے اور وسیع احاطے والی ایک سفید مسجد بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ مزار اس قصبے کی اصل آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا اور درختوں میں گھرا ہوا تھا......میں نے فون پر پھر عمران سے رابطے کی کوشش کی مگر غیر متوقع طور پر رابطہ نہیں ہوا۔ صرف بیل جاتی رہی، اسی دوران میں کچے پکے راستے کے کنارے پر ہمیں مقامی تھانے کی پولیس موبائل نظر آ گئی۔ اس کی چھت پر گھومتی ہوئی نیلی لائٹ آن تھی۔ انجن بھی اسٹارٹ تھا۔ مقامی ایس ایچ او وحید گوندل گاڑی کے قریب ہی کھڑا نظر آ گیا۔ وہ تیزی سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سگریٹ بجھایا اور ہماری جیپ کے قریب آ گیا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا سیلوٹ کیا اور بولا۔ ”آپ آ گئے جی۔“

”ہاں......کوئی کارروائی تو نہیں کی تم نے؟“

”نہیں جی، ہم تو آپ کے انتظار میں تھے۔ کارروائی دوسری طرف سے ہو گئی ہے۔“

اس کے گمبھیر لہجے نے مجھے چونکایا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”عمران نام کے جس بندے کا آپ بتا رہے تھے، اس نے مخدوم صاحب کو قتل کر دیا ہے اور بھاگ گیا ہے۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ”کیا کہہ رہے ہو گوندل، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں جیپ سے اتر آیا۔ انسپکٹر زبیر بھی میرے ساتھ تھا۔

”سر! اس نے مخدوم جی کو گولی مار کر شدید زخمی کیا پھر ان کو یرغمال بنایا اور ان کے مسلح سیکیورٹی اہلکاروں کے سامنے انہیں گھسیٹتا ہوا پولیس موبائل میں لے گیا۔ یہاں سے کوئی دو کلومیٹر آگے اس نے مخدوم جی کو مردہ حالت میں پولیس موبائل کے اندر چھوڑ دیا اور فرار ہو گیا۔“

میں گرجا۔ ”میں اس اسٹوری پر یقین نہیں کر سکتا۔ ابھی 45 منٹ پہلے فون پر میری بات ہوئی ہے عمران سے۔“

”جناب پینتالیس پچاس منٹ میں کیا نہیں ہو سکتا۔

ابھی چند منٹ میں ایس ایس پی صاحب بھی پہنچ رہے ہیں۔ وہ ساری بات بتائیں گے آپ کو...... بلکہ شاید وہ پہنچ ہی گئے ہیں۔“ اس نے دور کسی جیپ کی ہیڈ لائٹس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اگر مخدوم جیسا شخص واقعی کسی وجہ سے مارا جا چکا تھا تو یہ بہت ہائی فائی کیس بن جاتا تھا۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ کا ہنگامی طور پر یہاں پہنچنا اسی بات کی غمازی کرتا تھا۔ مجھے اور زبیر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ دوسری طرف مقامی ایس ایچ او گوندل کے تاثرات بھی بتا رہے تھے کہ وہ یہ خبر پورے اعتماد کے ساتھ دے رہا ہے۔

اسی اثنا میں ایس ایس پی کی جیپ دھول اُڑاتی موقع پر پہنچ گئی۔ مجھے اتنا پتا تھا کہ گوجرانوالا کا یہ ایس ایس پی چند ہی روز پہلے ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا ہے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ میری جانی پہچانی شخصیت ہے۔ یہ محترم و مکرم رانا صاحب تھے۔ رانا صاحب کو ہمیشہ مجھ سے کچھ نہ کچھ شکایت رہی تھی، بلکہ اسے باہمی نسل کہنا چاہیے جیسا کہ قارئین ایک پچھلے واقعے میں پڑھ چکے ہیں وہ اکثر مجھ سے خفا ہی رہتے تھے۔ میں نے ڈی ایس پی کی حیثیت سے انہیں سیلوٹ کیا جس کا روکھے پھیکے انداز میں جواب ملا۔ پھر انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ”تابش! میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا، یہ بندہ تمہارے لیے مصیبت پیدا کرے گا۔ مجھے اس کی آنکھ میں سؤر کا بال نظر آیا تھا۔ اب دیکھ لو کیا چاند چڑھایا ہے اس نے۔ پہلے لاہور میں ایک اے ایس آئی کی جان لی۔ اب یہاں مخدوم صاحب کی جان سے کھیل گیا ہے اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ پورے علاقے میں آگ لگ جائے گی۔ میڈیا پہلے ہی ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔“ رانا صاحب ایک ہی سانس میں بولتے چلے گئے۔

مجھے اب یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہاں مقامی پولیس کی طرف سے ہم کو اندھیرے میں کیوں رکھا گیا۔ اس کی وجہ یقیناً ایس ایس پی رانا صاحب ہی تھے۔ مقامی پولیس جانتی تھی کہ ناکے والے حادثے کے بعد عمران کو آخری بار ”لال ٹُبّی“ کے آس پاس دیکھا گیا ہے مگر ہمیں تین روز تک بے خبر رکھا گیا۔ یقیناً رانا صاحب اور ان کا ماتحت عملہ کسی مداخلت کے بغیر عمران کو خود گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اگر ہم کو یوں بے خبر نہ رکھا جاتا تو شاید یہ مخدوم والا واقعہ بھی رونما نہ ہوتا۔

رانا صاحب نے حرف بہ حرف اپنے ایس ایچ او گوندل کی تائید کی اور بتایا کہ کچھ دیر پہلے عمران، زخمی

مخدوم صاحب کی آڑ لے کر فرار ہوا ہے اور انہیں پولیس کی موبائل میں مردہ چھوڑ گیا ہے۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ آدھی رات کے وقت اس پورے علاقے میں پولیس کی نقل و حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً عمران کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اگر واقعی صورتِ حال وہی تھی جو بتائی جا رہی تھی تو پھر عمران ایک ناقابلِ بیان مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ ابھی ہم وہیں کھڑے تھے کہ وہاں سے ایک ٹریکٹر ٹرالی گزری۔ اس پر پندرہ بیس افراد سوار تھے۔ چند عورتیں بھی تھیں۔ یہ لوگ "مخدوم صاحب" کی ناگہانی موت کی خبر سن کر مزار کی طرف جا رہے تھے۔ ان سب کے چہرے غم و غصے کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ چند افراد باقاعدہ رو رہے تھے۔

رانا صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر زہرخند انداز میں بولے۔ "دیکھ لیا نا اپنے سگے کا کارنامہ اور اس کا ری ایکشن۔ صبح تک یہاں خلقت جمع ہو جائے گی اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو وہ ہماری بوٹیاں بھی نوچ لیں گے۔"

اسی اثنا میں ایک پرائیویٹ لوڈر گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے پاس سے گزری۔ اس میں تین چار بوگیر گتے موجود تھے۔ یہ پولیس کے گتے نہیں تھے۔ یقیناً مخدوم کے کسی کھاتے پیتے مرید کے ہوں گے...... ظاہر تھا کہ یہ عمران کی تلاش کے لیے لے جائے جا رہے ہیں۔ کافی فاصلے پر پولیس موبائلز کے ہوٹر بھی سنائی دے رہے تھے۔ پتا نہیں کہ یہاں کیا ہوا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ میرے مرحوم یار عمران دانش کا بیٹا یہاں ایک بدترین مشکل میں پھنس چکا تھا۔ مجھے لگا کہ میرے ذہن میں کئی ہفتوں سے جو وہم پل رہا تھا، وہ صرف وہم یا خدشہ نہیں رہا، حقیقت بن گیا ہے۔ میں اور انسپکٹر زبیر جیپ پر سوار موقع واردات پر پہنچے، یعنی وہ جگہ جہاں مخدوم صاحب کی لاش ملی تھی۔ یہ جگہ درختوں میں گھری ہوئی تھی اور اس کا فاصلہ مزار سے قریباً دو کلومیٹر تھا۔

یہ مخدوم کی سیکیورٹی والی وہی پولیس موبائل تھی جس کا ذکر عمران نے اپنے فون میں کیا تھا۔ گرد میں اَٹی ہوئی اس گاڑی کے گرد پولیس اہلکار موجود تھے۔ گاڑی کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی نشست پر خون کے نشانات نظر آرہے تھے۔ مقتول کا ایک جوتا بھی ابھی تک جیپ میں ہی پڑا تھا اگر یہ سب کچھ عمران نے کیا تھا تو پھر آثار سے تو یہی نظر آتا تھا کہ وہ مخدوم کو زخمی حالت میں گن پوائنٹ پر گھسیٹ کر گاڑی میں لے آیا۔ ایک بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹے رکھا، دوسرے ہاتھ سے ڈرائیونگ کی اور یہاں تک پہنچ کر گاڑی چھوڑ کر نکل گیا۔

ایک بات میرے ساتھ ساتھ زبیر نے بھی نوٹ کی۔ گاڑی میں خون کا کوئی زیادہ اخراج ثابت نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سیکیورٹی پر مامور ایک اہلکار سے پوچھا۔ "گولی کہاں لگی تھی مخدوم صاحب کو؟"

"لگتا تو یہی تھا جی کہ پیٹ میں دائیں طرف لگی ہے مگر یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

"ملزم کا حلیہ بتا سکتے ہو؟"

اس نے جو حلیہ بتایا وہ عمران سے ملتا جلتا ہی تھا۔

"ہتھیار کون سا تھا اُس کے پاس؟" میں نے سیکیورٹی اہلکار سے دریافت کیا۔

"یہ ماؤزر تھا جی۔ اُس نے مسلسل مخدوم جی کے سر سے لگائے رکھا اور ہمیں دور رہنے کے لیے دھمکیاں دیں۔"

"تم لوگوں نے تو مخدوم صاحب کی لاش دیکھی ہو گی۔ بعد میں ملزم نے کوئی اور فائر بھی کیا تھا اُن پر؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے جی۔ لیکن فائر کی آواز دوبارہ نہیں آئی۔"

"فائر کی پہلی آواز کہاں سے آئی تھی؟" انسپکٹر زبیر نے پوچھا۔

"مخدوم جی کی رہائش گاہ کے اندر سے، اس کے چند سیکنڈ بعد ہی وہ بندہ مخدوم جی کو ڈھال بنا کر باہر نکل آیا......"

میں سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ یہ شخص جسے مخدوم جیسے معزز لقب سے پکارا جاتا تھا، شدید زخمی نہیں ہوا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک گولی لگی تھی، خون کا اخراج بھی زیادہ نہیں تھا، پھر سات آٹھ منٹ کے اندر وہ ہلاک ہو گیا......

گہری تاریکی اور سردی میں درختوں کے درمیان ہماری یہ گفتگو جاری تھی کہ مزار کے اندر سے لاؤڈ اسپیکر پر کچھ جذباتی اعلانات ہونے لگے۔ ان میں مخدوم کی ناگہانی موت کا ذکر تھا اور کچھ اشتعال انگیز باتیں بھی کی جا رہی تھیں۔ پورے ایریا میں ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی دوران میں وائرلیس پر ایک خبر چلی اور اس نے صورتِ حال کو ایک دم بدل دیا۔ بتایا گیا کہ قاتل مزار شریف سے قریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر ایک جگہ گھیر لیا گیا ہے۔

ہم تیز رفتاری سے وہاں پر پہنچے۔ یہ انگریزوں کے زمانے کا ایک ڈاک بنگلا تھا۔ کسی نے اس کی چھت پر بھی ایک دو کمرے بنا لیے تھے مگر فی الحال یہ خالی پڑا تھا۔ کہا جارہا تھا کہ مخدوم کو مارنے والے شخص نے یہیں پر پناہ لی ہے۔ ڈاک بنگلے کے خستہ دروازے کے سامنے بوسونگھنے والے کتے مسلسل شور مچارہے تھے۔ اوران کے رکھوالوں نے انہیں زنجیروں سے تھاما ہوا تھا۔ ایس ایس پی رانا صاحب بنفسِ نفیس یہاں موجود تھے۔ ان کی جیپ کی چھت پر ایک بڑی سرچ لائٹ نظر آرہی تھی جس نے بنگلے کے زیادہ تر حصے کو روشن کر رکھا تھا۔ رانا صاحب نے تلخ لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ اندر ہی موجود ہے اور اس نے دھمکانے کے لیے اندر سے دو تین ہوائی فائر بھی کیے ہیں۔

اسی دوران میں معلوم نہیں کہاں سے ایک ٹی وی چینل کی مختصر سی ٹیم بھی وہاں آن دھمکی۔ رپورٹر مائیک تھام کر اس انداز میں کیمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا کہ عقب میں ڈاک بنگلا بھی دکھائی دیتا رہے۔ وہ ہیجانی انداز میں بولنے لگا۔ ”تو ناظرین! یہ ہے وہ جگہ جہاں اس خطرناک شخص نے پناہ لی ہے۔ اس کے پاس مہلک آتشیں اسلحہ موجود ہے اور اس نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو خود سے دور رہنے کی وارننگ دے رکھی ہے۔ یاد رہے کہ یہ خطرناک شخص تین روز قبل لاہور میں ایک لڑکی کے اغوا کی ناکام کوشش کر چکا ہے۔ اس کوشش میں اس نے ایک اے ایس آئی کی جان بھی لی ہے۔ اب یہ دوسرا قتل ہے جو اس کے کھاتے میں آرہا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں، عوامی حلقوں میں سخت بے چینی پائی جارہی ہے۔ سفاک مجرم کو کڑی سے کڑی سزا دینے کا مطالبہ ہو رہا ہے۔“

رپورٹر کا واویلا جاری تھا اور میرا خون کھول رہا تھا۔ بغیر تصدیق کے یہ لوگ اسے سفاک ترین مجرم اور بے رحم قاتل گردان رہے تھے اور تو اور مجھے رانا صاحب کے ارادے بھی کچھ اچھے نظر نہیں آتے تھے۔ بے شک وہ قانون کی پاسداری کرنے والے آفیسر تھے مگر جب کسی معاملے میں میرا نام شامل ہوتا تھا ان کے رویّے میں کچھ منفی تبدیلیاں خود بخود آجاتی تھیں۔ مجھے یہ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر معاملہ بگڑا تو وہ شاید عمران کو شوٹ کرنے سے گریز نہ کریں۔

اچانک مجھے ایک بار پھر عمران سے رابطہ کرنے کا خیال آیا۔ اس مرتبہ بھی صرف بیل جاتی رہی لیکن جب میں نے دوسری مرتبہ کال کی تو کال ریسیو کر لی گئی۔ دوسری طرف عمران ہی تھا۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ درختوں کے اندر جا کر میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ”تم کہاں ہو عمران؟“

وہ اطمینان سے بولا۔ ”بس جنت دوزخ سے تھوڑی ہی دور ہوں۔ یہ مزار سے کچھ فاصلے پر کوئی پرانا ریسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلا ہے...... اور آپ کہاں ہیں؟“

”میں اس ڈاک بنگلے کے سامنے ہی ہوں۔ مجھے بتاؤ عمران، یہ سب کیا ہوا ہے؟ میں نے تو تمہیں منع کیا تھا کسی بھی پھڈے سے...... اور تم نے پھڈا چھوڑ کر بندہ ہی مار دیا۔“

”اگر آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے بندہ مار دیا ہے...... تو پھر مجھے ہی غلطی لگی ہوگی۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔“

”عمران! یہ بے تکی ہانکنے کا وقت نہیں۔ تمہارا یہی رویّہ ہے جس نے تمہیں اتنی بڑی مصیبت میں پھنسایا ہے۔ یہ لوگ یہیں پر شوٹ کر سکتے ہیں تمہیں۔“

”تو کر دیں نا۔ یہاں منع کون کر رہا ہے۔ میں قصوروار ہوں...... مجھے سزا تو ملنی چاہیے اور میں یہ بات مذاق میں نہیں کہہ رہا ہوں...... یہ جو کچھ ہوا، میری وجہ سے ہوا۔ میری ایک بیکار خواہش کی وجہ سے ہوا۔ نہ میں ماہین کو اپنے پاس بلاتا، نہ نانکے پر حادثہ ہوتا اور نہ نوبت یہاں تک پہنچتی۔“

”جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔“ میں نے دانت پیسے۔ ”اب سوچو آگے کیا ہونے والا ہے؟ مجھے بتاؤ کیا مخدوم کو گولی تم نے ماری تھی؟“

”دل تو یہی چاہتا تھا چاچو جان کہ میں مارتا...... لیکن بندے کی ساری خواہش تو پوری نہیں ہوتی نا۔ اور میں تو ہوں ہی ایسے معاملوں میں بدنصیب۔“ وہ حسبِ عادت پٹری سے اترنے لگا۔ ”اب دیکھیں نا، ہر جگہ ناکام ہوتا ہوں۔ انڈیا کی فلموں میں کام کرنا چاہتا تھا۔ لیلا بھنسالی جیسے مہان ڈائریکٹر کو آڈیشن دیا۔ وہ اش اش کر اٹھا۔ اگر صرف اش اش ہی کرتا تو ٹھیک تھا۔ اس نکھٹے نے یہ کہہ دیا کہ میں تو اکشے کمار جیسے ایکٹر کی بینڈ بجادوں گا۔ وہ خانہ خراب اکشو بھی آس پاس ہی موجود تھا۔ اس نے سن لیا۔ اگلے روز اسٹوڈیو کے ایک کونے میں میرا گریبان پکڑ لیا، بڑا کراٹے ماسٹر بنتا ہے نا۔ وہ تو اچھا ہوا اس کی بیوی ٹونکل کھنہ بیچ میں آگئی۔ ٹونکلی، راجیش کھنہ کی بیٹی ہے اور راجیش کھنہ کی میں بڑی عزت کرتا ہوں...... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ

میرا تھوبڑا کچھ نہ کچھ راجیش کھنہ سے ملتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے......"

"میرا خیال ہے کہ میں یہاں سے دفع ہو جاتا ہوں اور چھوڑ جاتا ہوں تمہیں یہاں ذلت کی موت مرنے کے لیے۔" میں پھنکارا۔ "میں پھر کہتا ہوں، تمہارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ مجھے کچھ بتا سکتے ہو تو بتاؤ۔"

میرے لب و لہجے نے اُسے سمجھا دیا کہ میں فون بند کر دوں گا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ اگلے دو تین منٹ میں اس نے جو حقیقتِ حال بتائی، وہ کچھ یوں تھی۔ بے شک عمران نے اسٹور روم کے اندر سے میرے ساتھ فون پر مدھم سرگوشیوں میں بات کی تھی مگر پتا نہیں کیسے اپنی بیویوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے مخدوم کو کچھ شک ہو گیا۔ وہ ٹوہ لیتا ہوا اسٹور نما کمرے تک پہنچا تو ایک دم معاملہ بگڑ گیا۔ مخدوم نے ایک دم اپنا سلور کلر کا خوب صورت "سی 96" ماؤزر نکال لیا اور عمران پر گولی چلانا چاہی، عمران نے اسے موقع نہیں دیا اور اس کا ماؤزر والا ہاتھ دبوچ لیا۔ بیڈ روم میں اس کی بیویوں نے شور مچانا شروع کر دیا...... باہر موجود مسلح سیکیورٹی اہلکار دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ تنومند مخدوم عمران سے گتھم گتھا تھا۔ جب عمران کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آئی تو اس نے کوشش کر کے ماؤزر کا رخ خود مخدوم کی طرف ہی کر کے ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی۔ اسی اثنا میں غضب ناک سیکیورٹی اہلکاروں نے اس پر رائفلیں تان لیں۔ اُن میں سے ایک نے للکار کر کہا۔ "یہ وہی ہے جس نے لاہور میں اے ایس آئی کو مارا۔"

عمران نے زخمی مخدوم کو اپنی ڈھال بنایا اور اُس کی اوٹ لیتا ہوا باہر پولیس کی گاڑی تک آ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے زخمی مخدوم کو سنبھالے رکھا اور دوسرے سے گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے نکل آیا۔ مخدوم کا زخم زیادہ سنگین نہیں تھا مگر وہ شدید ہیجانی کیفیت میں تھا۔ اچانک اس کی سانس اُلجھنا شروع ہو گئی۔ اسے دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ غالباً نشے اور رنگ بازیوں نے اسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ عمران نے گاڑی روکی۔ اسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش بھی کی لیکن آناً فاناً اس کی آنکھوں کی پُتلیاں الٹ گئیں، تعاقب کرنے والے کسی بھی وقت پہنچ سکتے تھے۔ عمران وہاں سے نکل گیا۔

عمران نے جس طرح اور جس لب و لہجے میں یہ سب کچھ بتایا تھا، مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔ مگر میرے یقین یا بے یقینی سے کیا فرق پڑتا تھا۔ یہاں سب کچھ اُس کے خلاف جا رہا تھا۔

میں نے اس کی ساری بات سننے کے بعد کہا۔ "عمران! تم معاملے کو حد سے زیادہ بگاڑ چکے ہو، اس کو اور مت بگاڑنا، میں ایک بار پھر تم سے یہی کہتا ہوں کہ کسی پولیس اہلکار پر فائر نہ کرنا۔ بہتر یہی ہے کہ سرنڈر کر کے باہر نکل آؤ۔"

وہ عجیب انداز سے ہنسا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ یہ میرا سرنڈر قبول کریں گے۔ میں نے ان لوگوں کی آنکھوں میں خون دیکھا ہے۔"

وہ کہہ تو ٹھیک رہا تھا۔ پیر مخدوم کی ہلاکت نے یہاں بہت سے لوگوں کو سخت مشتعل کر دیا تھا۔ ان میں وہ مقامی پولیس اہلکار بھی شامل تھے جو مخدوم کی سیکیورٹی پر مامور تھے۔ پھر مجھے رانا صاحب کے ارادے بھی کچھ ٹھیک نظر نہیں آ رہے تھے۔ چار دن پہلے کچلے جانے والے اے ایس آئی کی موت کا غم و غصہ اُن کی آنکھوں میں صاف نظر آتا تھا۔ دوسری طرف عمران تھا۔ وہ ایک دم بے پروا نظر آنے لگا تھا۔ میں اس کی کئی رگوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کی یہ بے پروائی بڑی خطرناک تھی۔ وہ جب مرنے مارنے کے موڈ میں آ جاتا تھا تو اس کے لب و لہجے میں ایک خاص قسم کا لااُبالی پن اور بے خوفی شامل ہو جاتی تھی۔

اسی دوران میں میگا فون پر پولیس فورس کا جانا پہچانا اعلان کیا جانے لگا۔ "تمہیں چاروں طرف سے پولیس نے گھیر لیا ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہتھیار نیچے صحن میں پھینک دو اور ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔" چند سیکنڈ بعد پھر اعلان دہرایا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسے باہر نکلنے کے لیے پانچ منٹ کی مہلت دی گئی۔

میں سپرنٹنڈنٹ رانا صاحب کے پاس پہنچا۔ انہیں ایک طرف لے جا کر اُن سے بات کی۔ میں نے کہا۔ "رانا صاحب! ابھی میری فون پر اس سے بات ہوئی ہے۔ وہ حلفیہ کہتا ہے کہ استعمال ہونے والا ماؤزر پیر مخدوم کا تھا اور اسے صرف اپنے دفاع میں گولی چلانا پڑی۔ دوسری بات وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مخدوم صاحب کی موت پیٹ کے زخم سے نہیں بلکہ ہارٹ اٹیک سے ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پوسٹ مارٹم میں یہ بات ثابت ہو جائے گی۔"

رانا صاحب نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "اگر گولی لگنے کے بعد مخدوم کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے تو بھی یہ دفعہ 302 ہی بنے گی اور جس غریب اے ایس آئی کو گاڑی کے نیچے دے کر مارا ہے اس بدبخت نے، اس کے بارے میں کیا خیال

ہے؟“

”سر! میں اُس کے لیے کوئی ”فیور“ نہیں مانگ رہا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ سرنڈر کرنے کے لیے تیار ہے، اگر اسے موقع پر ہی شوٹ نہ کر دیا جائے۔“

رانا صاحب کی آنکھوں میں طیش کے سرخ لہریے نظر آئے، بولے۔ ”تم بھی جانتے ہو تابش! شوٹ کر دینا کوئی سزا نہیں ہوتی۔ سزا تو یہی ہوتی ہے کہ قاتل کا ٹرائل ہو اور وہ پل پل پھانسی کے پھندے کی طرف جائے۔ بے فکر رہو، ہم نے اسے صرف پکڑنا ہے مارنا نہیں۔“

”میرے پاس اس کا فون نمبر ہے۔ میں اسے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرتا ہوں۔“

”جو کرنا ہے جلدی کرو، اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔“

”ایسا نہیں ہوگا جی، لیکن آپ بھی اہلکاروں کو ذرا تحمل کا مشورہ دیں، میں اُس سے بات کرتا ہوں۔“

”کرو، کرو۔“ انہوں نے ہاتھ لہرایا۔

مجھے اپنے ”پیٹی بھائیوں“ کا پتا تھا اور عمران کا بھی۔ وہ بپھر جاتا تو گھیرا ڈالنے والوں کو لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ میں تحش وڈیوز والے کیس میں اس کی اسپرٹ اور ایگریشن دیکھ چکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس سے فون پر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ اپنے معاملے کو مزید سنگین بنانے کی کوشش نہ کرے اور ہتھیار ڈال کر باہر نکل آئے۔ لیکن جب میں عمران سے بات کر رہا تھا، اچانک ڈاک بنگلے کے عقبی جانب سے ہلا بول دیا گیا۔ شور و غل سنائی دیا، اس کے ساتھ ہی دو تین فائر بھی ہوئے۔ آوازوں سے ہی پتا چل گیا کہ یہ پولیس والوں نے کیے ہیں۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرے ذریعے عمران کو باتوں میں لگا کر اس پر چھاپا مارا گیا ہے۔ کال کٹ چکی تھی۔ اب ڈاک بنگلے کے سامنے والے حصے سے بھی پولیس اہلکار اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں اور انسپکٹر زبیر بھی لپکتے ہوئے اندر چلے گئے۔ شکستہ سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر پہنچا تو عمران کو اہلکاروں کے ساتھ گتھم گتھا پایا۔ وہ اسے رائفلوں کے کندوں سے مار رہے تھے پھر اچانک عمران چنگھاڑا۔

”گالی نہ دینا...... میں کہتا ہوں گالی نہ دینا۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے جوابی حملہ کیا۔ ایک اہلکار کے ہاتھ سے رائفل چھین لی اور اس کے دستے کی زوردار ضرب ایک فربہ اندام حوالدار کے چہرے پر لگائی۔ اس کے جسم میں برق سی کوند گئی تھی اور یہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ میں تیزی سے عمران اور اہلکاروں کے درمیان آ گیا۔ میں نے اہلکاروں کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ بھی دیوانے ہو رہے تھے۔ ان میں سے تین چار وہی تھے جو پیر مخدوم کی سیکیورٹی پر مامور تھے۔ میں انہیں روکنے میں ناکام ہوا تو عمران کو دھکا دے کر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ میرے انسپکٹر زبیر نے پھرتی سے کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ میرا ایک اور ماتحت بھی وہاں پہنچ گیا اور ہم دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ صورت حال مزید بگڑنے سے بچ گئی۔ میں نے مشتعل اہلکاروں کو پیچھے ہٹا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہماری موجودگی میں عمران کی گرفتاری عمل میں آ گئی۔ اس نے ماؤزر بھی مقامی پولیس کے حوالے کر دیا۔ گرفتاری کے وقت عمران نے ایک بڑا زبردست کام کیا۔ اس نے بڑی خاموشی سے ایک تہ شدہ کاغذ میری مٹھی میں تھما دیا۔ اس کاغذ نے بعد میں بہت کام دکھایا۔

☆☆☆

پیر مخدوم کی ہلاکت چونکہ ضلع گوجرانوالا کی حدود میں ہوئی تھی، لہٰذا وہ مقامی تھانے کی تحویل میں تھا۔ وہاں رانا صاحب کی عملداری تھی۔ عمران پر کچھ تشدد بھی ہوا تھا مگر پھر ایس ایس پی جمشید صاحب کی فوری مداخلت سے یہ سلسلہ رک گیا تھا۔ ویسے بھی ایسی مار پیٹ کا عمران پر زیادہ اثر ہونے والا نہیں تھا۔ اسے اپنے سے زیادہ فکر اپنے دوستوں ضیا اور وکی کی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ ضیا گھر آ چکا ہے اور وکی بھی ایک دو دن تک آ جائے گا۔

ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف مجھے اطلاع ملی تھی کہ ایک ہفتے کی تاخیر کے ساتھ ماہین کی شادی کی تیاری پھر شروع ہو گئی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حشام بری طرح چونک گیا ہے اور وہ جلد از جلد ماہین پر اپنا قبضہ مستحکم کر لینا چاہتا ہے، دوسری طرف ماہین کے اہل خانہ بھی یقیناً یہی چاہتے ہوں گے کہ یہ کام جلدی نمٹ جائے۔

ایک رات دو بجے کے قریب مجھے ماہین کا فون آیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھر والوں سے چھپ کر بات کر رہی ہے۔ اس نے مجھ سے عمران کا حال احوال پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی وہ گوجرانوالا پولیس کے پاس ہے، میں کوشش کر رہا ہوں کہ اسے لاہور کے متعلقہ تھانے میں منتقل کیا جا سکے۔

وہ بہت دکھی لہجے میں بولی۔ ”انکل تابش! یہ سب

میری وجہ سے ہوا ہے۔ اُس کی جگہ مجھے لاک اَپ میں ہونا چاہیے تھا۔ پلیز آپ اس کے لیے کچھ کریں۔"

"جو کچھ ہو سکا ماہین...... ضرور کروں گا۔ بس تم دعا کرو...... اور بہت فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، اپنے حالات پر توجہ دو۔ تمہاری شادی کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟"

وہ بھرّائی آواز میں بولی۔ "کبھی سوچا بھی نہیں تھا انکل کہ میری شادی ایسے حالات میں ہوگی۔ یوں لگتا ہے کہ ایک بہت بھاری فرض ہے جو ادا کرنے پر مجبور ہو رہی ہوں۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا انکل۔ وہ میری وجہ سے لاک اَپ میں پڑا ہے اور میں یہاں رسمیں نبھا رہی ہوں۔ وہ صرف اور صرف میری وجہ سے پھنستا جا رہا ہے۔"

"گھبراؤ مت، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے نا کہ مخدوم والے معاملے میں اسے ریلیف ملنے کا امکان ہے۔"

"انکل! کیسے ملے گا ریلیف؟ اس کے ہاتھوں جان گئی ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"ماہین، اُس نے صرف اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی...... لیکن اس سے بھی بڑی ایک اور بات ہے۔ ایک دو دن میں سامنے آ جائے گی۔"

وہ چند سیکنڈ چپ رہنے کے بعد گویا ہوئی۔ "لیکن انکل وہ اے ایس آئی والا معاملہ بھی تو ہے جو زیادہ خطرناک ہے۔ اسے میں نے گاڑی کے نیچے دیا مگر اس کی سزا بھی اسے ملے گی۔"

"دیکھو ماہین! تمہیں کہا ہے نا کہ خواہ مخواہ خود کو ہلکان نہ کرو۔ اس سے کچھ حاصل وصول نہیں۔ بس تم اس کے لیے دعا کرو۔"

اسے تسلی تشفی دے کر میں نے کال ختم کر دی۔ وہ غم کے گہرے پانی میں محسوس ہوتی تھی۔ اس کے اندر جیسے کوئی خاموش جنگ چل رہی تھی۔ اس جنگ کو وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ میں سوچنے پر مجبور تھا کہ عمران جونیئر کے سینے میں محبت کی جو خاموش پکار موجود تھی اس نے کسی نہ کسی طور ماہین پر بھی اثر کیا ہے مگر یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ ایک بہت مضبوط لڑکی ہے۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور دوسری طرف ایک اور اطلاع نے مجھے سخت اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں نے انسپکٹر زبیر کے ذمّے یہ کام لگایا تھا کہ وہ اس بات کا پتا کرے کہ جلو پارک میں عمران اور ماہین کو ہراساں کرنے والے اہلکار کون تھے؟ حیران کن طور پر یہ ثابت ہوا تھا کہ اُس شام تو ایک وی آئی پی موومنٹ کی وجہ سے مذکورہ علاقے میں کوئی اہلکار موجود ہی نہیں تھا تو پھر کون لوگ تھے جن کی وجہ سے یہ سارا بکھیڑا شروع ہوا۔ کیا وہ یونیفارم والا بندہ بھی جعلی پولیس والا تھا؟ اس حوالے سے مزید چھان بین کی ضرورت تھی۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت مجھے وہ خبر مل گئی جس کا شدت سے انتظار تھا اور یہ خبر لال لُکی کے مزار پر مرنے والے پیر مخدوم کے حوالے سے تھی۔ میں نے اس سلسلے میں انسپکٹر زبیر کو پانچ روز سے کوئٹہ کے قریب، نوشکی کے علاقے میں بھیجا ہوا تھا اور وہ وہاں سے نہایت انکشاف انگیز اطلاعات لے کر واپس آیا تھا۔ اپنی گرفتاری کے وقت، عمران نے جو ایک تہ شدہ کاغذ رازداری سے مجھے تھمایا تھا، وہ دراصل ایک پلاٹ کے حوالے سے کوئی پرانا اقرار نامہ تھا۔ اس کے ساتھ شناختی کارڈ کی کاپی بھی اٹیچ تھی۔ اس کاپی پر چھوٹی چھوٹی داڑھی والے جس شخص کی تصویر تھی، وہ مخدوم سے بہت ملتا جلتا تھا۔ شناختی کارڈ پر اس کا نام عابد خان درج تھا۔ یہ کاغذ اور اس طرح کے چند دوسرے کاغذ عمران نے اس اسٹور روم کی الماری میں دیکھے تھے جہاں وہ تین روز چھپا رہا تھا۔ عمران نے اپنی فون کال میں شک ظاہر کیا تھا کہ یہ پیر مخدوم کچھ برس پہلے نوشکی کے علاقے میں رہتا تھا اور پراپرٹی ڈیلر تھا۔ اس پر شاید ایک دو کرمنل کیس بھی تھے۔

اب انسپکٹر زبیر اس دور دراز علاقے سے جو اطلاعات لے کر آیا تھا، وہ حد درجہ تہلکہ خیز تھیں۔ پتا چلا تھا کہ پیر مخدوم کا اصل نام عابد خان ہے۔ یہ قریباً دس سال پہلے بلوچستان کا رہائشی تھا اور پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ وہیں پر ایک تنازعے میں اس نے ایک اسکول ہیڈ ماسٹر کو قتل کر دیا اور اس کے بعد وہ ایک ڈیلر کے بجائے ایک قاتل بدمعاش کے طور پر سامنے آیا۔ اس پر قتل، اغوا اور آبروریزی کے دو چار نہیں کم و بیش تین درجن مقدمات درج تھے۔ بعدازاں وہ اچانک علاقے سے غائب ہو گیا اور صوبے کی پولیس لاکھ سر پٹخنے کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہ پا سکی۔ سراغ پاتی بھی کیسے وہ تو اس دور دراز علاقے سے، بدلے ہوئے روپ میں، یہاں اس مزار پر چلا آیا تھا اور اپنی ہوشیاری کے سبب دو تین سال میں ہی اسے گدی نشین بننے کا موقع مل گیا تھا۔ اب اس کی گرفتاری یا اس کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے دس لاکھ کی انعامی رقم کا اعلان موجود تھا۔

میں یہ سب کچھ فوراً اپنے مہربان ایس ایس پی جمشید صاحب کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا مگر مجھے اپنے پرانے افسر رانا صاحب کے ٹیڑھے پن کا بھی پتا تھا۔ ویسے بھی یہ کیس ان کی حدود میں تھا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ انہیں اعتماد میں لے کر یہ سب کچھ بتا دیا جائے...... پیر مخدوم کی ہلاکت کے بعد مقامی لوگوں میں عمران کے خلاف جو خطرناک اشتعال پایا جارہا تھا، اسے کم کرنے میں بھی رانا صاحب اور ان کا ایک بھانجا اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ میرا یہ فیصلہ اگلے چند ہفتوں میں عمران کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اس معاملے کی تفصیل شاید قارئین کے لیے دلچسپ نہ ہو۔ مختصراً یہ کہ ان حیران کن انکشافات کے بعد عمران اس قتل سے بری الذمہ ہو جاتا........ بلکہ اگر قانون کے عین مطابق چلا جاتا تو اسے انعامی رقم کا حق دار بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا تھا نہیں۔ جو لوگ ہمارے ہاں انصاف کی مشکلات اور پیچیدگیوں کو جانتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ پولیس کی گرفت میں آئے ہوئے فرد کو بے گناہ ہونے کے باوجود ان کے شکنجے سے نکالنے میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ لہٰذا میں نے کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر رانا صاحب کو نرم رویّے پر آمادہ کر لیا۔ رانا صاحب کا ایک بھانجا انسپکٹر وحید متعلقہ تھانے میں انچارج تھا...... اور اس نے مزار کے اردگرد ہونے والی کارروائی میں بھی حصہ لیا تھا۔ جعلی پیر مخدوم کے حوالے سے جو تہلکہ خیز انکشافات عمران کی جستجو کی وجہ سے ہوئے، ان کا سارا کریڈٹ انسپکٹر وحید کو دیا گیا۔ بالفاظ دیگر عرصہ دراز بعد اس خطرناک مجرم کو شناخت کرنے والی کارکردگی انسپکٹر وحید کے کھاتے میں ڈالی گئی اور یوں اس کی پروموشن وغیرہ کا راستہ ہموار ہوا۔ نتیجے میں عمران کو اس کیس میں نوے فیصد ریلیف مل گیا۔ وہ ضمانت کے بعد رہا ہوسکتا تھا مگر اس سے بھی بڑا کیس اب تک اس پر موجود تھا۔ اے ایس آئی کی ہلاکت کا کیس۔ بہرحال میں عمران کو گوجرانوالا سے لاہور پولیس کے پاس لانے میں کامیاب ہو گیا۔ جس روز پیر مخدوم والے کیس میں عمران کی ضمانت ہوئی، اس سے اگلے روز ہی میرے گھر میں دو اَن چاہے مہمان آدھمکے۔ وہ ایک نئی پراڈو گاڑی میں پہنچے تھے۔ یہ ماہین کا ہونے والا شوہر حشام اور اس کے بزنس مین والد وہاب صاحب تھے۔

حشام ہمیشہ کی طرح جینز اور جیکٹ میں تھا۔ بال اسپائکس کی شکل میں تھے۔ اس کے والد نہایت قیمتی تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ حشام آتے ساتھ ہی مجھ پر برس پڑا۔ ''انکل! میں ماہی کی وجہ سے آپ کی عزت کرتا ہوں۔ آپ اپنی عزت کا خیال کریں اور جو کام کر رہے ہیں، اس سے پیچھے ہٹ جائیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''آپ اُس باسٹرڈ کی پشت پناہی کر رہے ہو۔ اس نے ماہی (ماہین) کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ ہمارے منہ پر کالک ملنی چاہی۔ ایک فرض شناس پولیس ملازم کو بے رحمی سے قتل کیا اس نے...... اور آپ اپنے عہدے کے بل بوتے پر اسے چھڑانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہو۔''

''دیکھو حشام، تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کرو۔ ورنہ مجھے بھی بھولنا پڑے گا کہ تم ماہین کے ہونے والے شوہر ہو۔''

''آپ اپنی افسری کی اکڑفوں دکھا رہے ہو۔ اگر آپ کی وجہ سے وہ جانور آزاد ہوا اور اس نے ماہی کو یا ہمیں کوئی نقصان پہنچایا تو آپ کی یہ افسری بچے گی اور نہ یہ نوکری، کوئی گرے پڑے لوگ نہیں ہیں ہم۔ دن میں تارے دکھا دیں گے۔''

''یو شٹ اپ...... میری چھت کے نیچے کھڑے ہو، ورنہ میں تمہیں بتاتا۔''

اس سے پہلے کہ منہ پھٹ حشام کوئی مزید کرخت جواب دیتا، اس کا والد درمیان میں آ گیا۔ حشام کو تھوڑا ڈانٹ کر پیچھے ہٹایا پھر مجھے غصیلی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''تابش صاحب! آگ سے مت کھیلو، ایسے بندے کی پشت پناہی مت کرو جس نے ہماری بچی پر غلط نگاہ ڈالی ہے۔ وہ ہمارا اور ہماری بچی کا مجرم ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس کے لیے قانون کو اپنا راستہ بنانے دو۔''

''قانون ہی راستہ بنا رہا ہے اور بنائے گا۔''

''ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں ہم بھی کہ قانون کو چلنے دیا جاتا ہے یا نہیں۔''

وارننگ دے کر وہ دونوں دندناتے ہوئے باہر چلے گئے، جہاں ان کے دو گارڈز مستعد کھڑے تھے۔

میں سوچتا رہ گیا۔ ماہین کے گھر والوں کو تو حقیقت معلوم تھی مگر اس کے سسرالیوں کو یہ پتا نہیں تھا کہ وہ جس کو اغوا کار اور قاتل کہہ رہے ہیں، وہی ہے جس نے بڑے حوصلے سے ماہین کی بلا اپنے سر لے رکھی ہے اور اسے جیل سے بچا کر سہاگ کی سیج کی طرف بڑھا رہا ہے۔ وہ ایک ظرف مند باپ کا ظرف مند بیٹا ہے۔ وہ تو غیروں کے دکھ

بھی سمیٹ لیتا تھا، ماہین کے لیے تو پھر اُس کے دل میں خاص جذبات موجود تھے۔

پیار محبت کی وہی المیہ کہانی، جو ہر دور میں ہر جگہ بکھری نظر آتی ہے۔

میڈیا پر یہ معاملہ اور ہی رنگ اختیار کر چکا تھا۔ پبلک میں بھی شور تھا کہ بے گناہ پولیس ملازم کو ''طاقت کے نشے'' میں گاڑی کے نیچے کچلنے والے کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس سلسلے میں جو ایک دو واقعات پہلے ہوئے تھے، ان کی وجہ سے بھی معاملے کو شہرت ملی تھی۔

باپ بیٹے کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی عمران کے دوست ضیا کا فون آ گیا۔ تھانے میں مار پیٹ کی وجہ سے اس کی ناک پر بھی چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے اس کی آواز ابھی تک نزلہ زدہ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ وکی بھی چھوٹ کر گھر آ گیا ہے۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو تمہیں کتنا کہتا رہا کہ سنبھل کر رہو اور عمران کو بھی سنبھالو مگر تم لوگوں نے نہیں سنی۔ اب سب کو بھگتنا پڑا ہے مگر یہ بھی یاد رکھو، بلا ابھی ٹلی نہیں ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے چند سیکنڈ انتظار کے بعد ''ہیلو، ہیلو'' کہا تو اندازہ ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔ ''کیا بات ہے ضیا؟''

لمبے توقف کے بعد وہ بھرّائی ہوئی گمبھیر آواز میں بولا۔ ''انکل جی، پتا نہیں کہ مجھے یہ بات آپ سے کہنی چاہیے یا نہیں مگر رہ بھی نہیں سکتا...... میں آپ کو سچ بتاتا ہوں، عمران بھائی کبھی لڑکیوں کے پیچھے نہیں رہے شاید لڑکیاں ہی پیچھے رہی ہوں۔ مگر وہ مس...... ماہین...... سے بہت پیار کرتے ہیں، بلکہ اسے عشق کہنا چاہیے۔ وہ ظاہر نہیں کرتے مگر مجھے اندازہ ہے کہ وہ اس معاملے میں کتنی دور جا چکے ہیں۔''

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''یہ سب کچھ مجھے بتا کر اب تم کیا چاہتے ہو؟''

میرے انداز نے اُسے چپ سا کرا دیا۔ اس کی آزردگی دیکھ کر میں نے ذرا نرم رویّہ اختیار کیا۔ ''دیکھو ضیا! یہ بات تم نے مجھ سے کہہ دی ہے، اب کسی اور سے نہ کہنا۔ یہ آگ سے کھیلنے والی بات ہوگی۔ بس ذہن میں یہ بات رکھو اسی مہینے اس کی شادی ہو رہی ہے اور اس کی مرضی سے ہو رہی ہے۔'' میں نے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

اے ایس آئی سلیم کی ہلاکت والے کیس سے عمران کی جان آسانی سے چھوٹنے والی نہیں تھی جس وقت اے ایس آئی کچلا گیا، عمران ڈرائیونگ نہیں کر رہا تھا۔ حوالات میں، میں نے عمران کو بتایا تھا کہ مجھے یہ سب معلوم ہو چکا ہے۔ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا، چاچو، جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب آپ کو اپنے مرے ہوئے دوست کی قسم ہے کہ اس بات کو اسی طرح رہنے دیں۔ اس کی شادی سر پر ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو سب ختم ہو جائے گا اور اس خاتمے کے لیے میں خود کو زندگی بھر معاف نہیں کر پاؤں گا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے آخر تو میری ہی بچکانا خواہش کا نتیجہ ہے۔

مجھے یہ بھی پریشانی تھی کہ ابھی تک نا کے پر ہونے والے حادثے کی فوٹیج نہیں مل سکی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ اسے دانستہ اوجھل کیا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ ''معما'' بھی حل نہیں ہوا تھا کہ جلو پارک میں وہ جعلی پولیس والے کون تھے جنہوں نے عمران اور ماہین کو ڈرایا دھمکایا اور اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی...... ڈنر میں کچھ کھانے کو دل نہیں چاہا۔ زبردستی دودھ کا گلاس پی کر میں اپنے کمرے میں آ گیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ نگاہ سیدھی سامنے مرحومہ شریکِ حیات ثروت کی تصویر پر پڑی۔ جب بھی اس کا چہرہ دیکھتا تھا، ڈیڑھ سال پہلے کے سارے دلدوز مناظر نگاہوں کے سامنے آ جاتے تھے۔

مجھے احساس ہوا کہ عمران والے سنگین معاملے کی وجہ سے جعلی ادویات والے کیس سے ایک بار پھر میری توجہ کم ہو گئی ہے۔ تین ہفتے پہلے میں نے اس سلسلے میں انسپکٹر زبیر کو ایبٹ آباد بھیجا تھا اور اس نے تھوڑی بہت پیش رفت بھی کی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کام کا تسلسل ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ میں نے اسی وقت فون پر زبیر سے بات کی اور اسے تفتیش جاری رکھنے کا کہا۔ ہمارا ٹارگٹ اس فرد یا افراد کا سراغ لگانا تھا جنہوں نے عین موقع پر جعلی دواؤں کی ایک فیکٹری کے مالک کو قتل کر کے باقی سیٹ اَپ کا سراغ مٹا دیا تھا۔

فون کال کے آخر میں انسپکٹر زبیر نے مجھ سے کہا۔ ''سر آپ کو تھانے فون کر لینا چاہیے تھا۔ عمران صاحب کو کل سے تیز بخار ہے۔ قے وغیرہ بھی ہوئی ہے۔''

''تم نے مجھے بتایا نہیں۔''

''انہوں نے خود منع کیا تھا، کہتے تھے وہ پریشان ہوں گے۔''

عمران کے دس روزہ ریمانڈ میں ابھی دو دن باقی تھے۔ امید یہی تھی کہ مزید ریمانڈ نہیں ہوگا اور اُسے جوڈیشنل کر دیا جائے گا۔ میں نے متعلقہ تھانے فون کیا۔

انچارج نے ذرا پس و پیش کے بعد اُس سے میری بات کرا دی۔ اس کی آواز ہی بتا رہی تھی کہ وہ تیز بخار کی غنودگی میں ہے، تاہم اس نے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ میرے سوال کے جواب میں بولا۔ ”میں نے بھی بخار کو چڑھنے نہیں دیا، بلکہ خود اس پر چڑھ جاتا ہوں۔“

”جھوٹ مت بولو، مجھے پتا چلا ہے، صبح تمہیں الٹیاں بھی آئی ہیں۔“

”اوہو...... “ الٹیاں ہی آئی ہیں نا ”سیدھیاں“ تو نہیں آئیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا بچوں کا پیٹ خراب ہو جائے اور انہیں سیدھیاں آنے لگیں تو دو گھنٹے میں مرجھائے پھولوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔“

”خدا کا خوف کرو عمران، ڈینگی اور ملیریا وغیرہ بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ میں ابھی ڈاکٹر بھجواتا ہوں تمہارے لیے۔“

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ بہت سخت جان ہوں۔ سخت جانی اور ”ڈھیٹ پنے“ کے عالمی مقابلے ہوں تو میں ضرور سلور میڈل لے جاؤں گا۔ ظاہر ہے آپ کے ہوتے ہوئے بھی کوئی کم کارکردگی نہیں ہوگی۔“ اس نے ہنسنے کی کوشش کی تو کھانسی ہونے لگی۔ میں نے جھلا کر فون بند کر دیا اور زبیر کو کال کر کے کہا کہ وہ اسے ڈاکٹر کو دکھائے۔

اگلے روز جب میں ڈیوٹی سے واپس پہنچا اور اپنے ہوم جم کا رخ کیا تو ایس ایس پی جمشید صاحب کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ ”تابش! مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے بھتیجے کے لیے کل کوئی اچھی خبر ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے ریمانڈ میں توسیع کر دی جائے۔ بڑا تگڑا وکیل کیا ہے لڑکی کے گھر والوں نے۔“

”گھر والوں سے آپ کی مراد ماہین کا چچا ثاقب رشید ہے؟“

”وہ تو ہے ہی مگر اس سے بھی بڑھ کر کردار لڑکی کے ہونے والے سسرالی کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا ہونے والا شوہر حشام اور کیا نام ہے اس کے باپ کا وہاب قادر۔“

”فالتو روپیہ بول رہا ہے نا۔“ میں نے کہا۔

”وہی بول رہا ہے اور ایک جگہ نہیں دو جگہ بول رہا ہے۔ یہ باپ بیٹا اس تفتیش پر اوپر سے دباؤ ڈلوانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ کل وہ دونوں ایک اعلیٰ افسر سے بھی ملے ہیں۔“

میرا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ دونوں یہاں گھر آ کر مجھے جو دھمکی دے کر گئے تھے، اب اس کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ یہ ساری زیادتی میری نگاہوں کے سامنے ہو رہی تھی اور میرے لیے اسے برداشت کرنا مشکل سے مشکل تر ہو رہا تھا۔

جمشید صاحب نے مجھے ایک اور اطلاع بھی دی جس نے میرے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔ انہوں نے بتایا کہ کل حشام اور اس کا والد اپنا کوئی تعلق استعمال کر کے حوالات میں عمران کے پاس پہنچے تھے۔ وہاں انہوں نے عمران سے تلخ کلامی کی اور وہاب قادر نے عمران کو تھپڑ بھی مارا۔ میں اس اطلاع پر حیران رہ گیا تھا۔ کل ہی شام کو میں نے عمران کی عیادت کے لیے اسے فون کیا تھا اور اس نے اس تکلیف دہ واقعے کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ جمشید صاحب نے کہا کہ وہ اس واقعے کے ذمے دار پولیس اہلکاروں کی ٹھیک ٹھاک خبر لیں گے۔ میں طیش کے عالم میں اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ حالات نے ایک اور کروٹ لی۔ یہ بھی ایک ششدر کر دینے والی کروٹ تھی۔

وہ ایک یخ بستہ رات تھی۔ رات کے کھانے میں چند نوالے لے کر میں نے ملازمہ کرن سے کہا تھا کہ وہ جا کر سو جائے۔ خود میں جاگ رہا تھا اور عمران کی گمبھیر تر ہوتی مصیبت کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ میرے فون پر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف خود ماہین تھی۔ آج اُس کے ابٹن کی رسم تھی، لہٰذا اس کی کال نے مجھے حیران کر دیا۔

”السلام علیکم انکل تابش!“ وہ عجیب دبے دبے لہجے میں بولی۔ بیک گراؤنڈ میں کہیں ڈھولک کی بہت مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ رسم ختم ہو چکی ہے، ویسے ہی کوئی اِکّا دُکّا لڑکیاں ڈھولک بجا رہی ہیں۔

”خیریت ہے ماہین...... اس وقت کال کر رہی ہو؟“

”میں...... آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں انکل۔ بہت ضروری بات ہے۔ میں وہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ آواز میں لرزش تھی۔

”ماہین، مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ابھی سو جاؤ، صبح بات کر لینا۔“

”نہیں انکل، صبح مجھے موقع نہیں ملے گا۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ اس کا تعلق...... میری...... پوری لائف سے ہے۔ پلیز...... پلیز میری بات سنیں۔“

”اچھا کہو، میں سن رہا ہوں۔“

وہ جیسے آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بولی۔ ''انکل تابش! میاں بیوی کا ریلیشن محبت اور خلوص کا ہوتا ہے لیکن...... مجھے کسی وقت لگتا ہے کہ حشام مجھ پر ترس کھا رہا ہے۔ وہ جیسے...... جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا ہے کہ دیکھو میں تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری بدنامی کو بھی گلے لگا رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ اغوا کی واردات جڑی ہوئی ہے۔ تمہارا نام ٹی وی اور اخباروں میں آچکا ہے...... دیکھو پھر بھی تمہیں وہی پہلے والا مقام دے رہا ہوں۔ انکل تابش، مجھے یہ سب کچھ قبول نہیں ہے۔ میرے بڑوں نے میرے لیے جو کچھ کیا، وہ وقتی طور پر تو میری ڈھال بن گیا مگر میں اس جھوٹ کے ساتھ حشام کی زندگی میں داخل ہونا نہیں چاہتی۔ اور میں صرف حشام کی ہی نہیں، حشام سے زیادہ عمران کی گناہ گار بن رہی ہوں۔ وہ حوالات میں پڑا ہے اور میں یہاں شادیانے بجا رہی ہوں۔ میں اس بھاری بوجھ کو اب اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں سب کچھ سچ سچ کہہ دینا چاہتی ہوں۔ میں سب کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ اُس روز میں اپنی مرضی سے عمران کے ساتھ گئی تھی...... اور یہ بھی کہ پولیس مین کو عمران نے نہیں میں نے کچلا تھا۔'' وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

''ماہین...... یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ چار پانچ دن بعد تمہاری شادی ہے۔''

''یہ شادی نہیں سمجھوتا ہے انکل...... اور میں حشام سے شادی کی تمنا رکھتی تھی۔ پلیز آپ مجھے نہ روکیں۔ مجھے یہ سچ بولنے دیں۔ پھر جو میری قسمت۔''

میں حیران تھا کہ وہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ''ماہین! تم جذباتی ہو رہی ہو۔ ایسے موقعوں پر ایسے رویّوں سے نقصان ہوتا ہے۔ ابھی تم اپنا دھیان صرف اس بات پر رکھو کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی عزت اس معاملے سے جڑی ہوئی ہے جہاں تک عمران کی بات ہے، اس کی لڑائی بھی ہم لڑ رہے ہیں اور اچھے طریقے سے لڑ رہے ہیں، مخدوم والے کیس میں بھی اس کی ضمانت ہو چکی ہے۔''

''جو کچھ بھی ہے انکل! میں اس جھوٹ کے ساتھ حشام کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکتی، مجھے اس کا ترس نہیں اس کی محبت درکار ہے۔''

''اچھا، تم ایسا کرو فی الحال سو جاؤ۔ کل کسی وقت اس بارے میں تسلی سے بات کریں گے...... اور دیکھو مجھ سے پوچھے بغیر تم کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گی۔''

میں نے اسے حتی الامکان سمجھایا۔ کال ختم ہونے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا...... کسی وقت لگتا تھا کہ وہ کچھ شدید الجھنوں کے گھیرے میں ہے۔ جیسے اپنے آپ کو خود بھی سمجھ نہیں پا رہی۔ مجھے اس کی خالہ فوزیہ کی باتیں یاد آئیں جو اس کے بے حد الجھے ہوئے رویّے کے بارے میں انہوں نے کہی تھیں۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ جو کچھ عمران کے بارے میں سوچتی ہے، وہ خود اس کی اپنی سمجھ میں بھی نہ آ رہا ہو۔

میرا ارادہ تھا کہ صبح پہلے ماہین کی خالہ سے فون پر بات کروں گا پھر اسے سمجھاؤں بجھاؤں گا۔ مگر اگلے روز جو کچھ ہوا، اس نے میرا دماغ بھک سے اُڑا دیا۔ یقین ہی نہیں ہوا کہ ماہین سب مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ارادے میں اس حد تک آگے چلی جائے گی۔

میں صبح دس گیارہ بجے تک اسے فون کرتا رہا مگر رابطہ نہیں ہوا۔ تب انسپکٹر زبیر کی زبانی مجھ پر انکشاف ہوا کہ آج صبح نو بجے کے لگ بھگ ماہین ایک خاتون کے ہمراہ علاقہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئی ہے اور اس نے حلفیہ یہ بیان دیا ہے کہ تین دسمبر کے روز وہ اپنی مرضی سے عمران سے ملنے گئی تھی۔ وہ اس کے اچھے دوستوں میں تھا۔ اس کے فرینڈ سرکل میں اس کے بارے میں سب جانتے تھے۔ وہ پاکستان سے واپس جا رہا تھا اور جانے سے پہلے لاہور کے قابل دید مقامات دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ہمراہ ہو گئی۔ بدقسمتی سے جب شام کے بعد انہیں پولیس ناکے پر روکا گیا تو وہ نہ رکی۔ اس وقت وہ گاڑی خود ڈرائیو کر رہی تھی اور اس کی رفتار بھی بہت زیادہ تیز تھی لیکن ایک پولیس اہلکار اتنی تیزی سے اور غیر متوقع طور پر سامنے آیا کہ وہ اسے بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکی۔ اس نے حلفیہ یہ بھی کہا کہ اس کا پہلا بیان غلط بیانی پر مبنی تھا۔ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ برداشت نہیں کر سکی اور مکمل حقیقت بیان کر رہی ہے۔ عمران نے صرف اسے بچانے کے لیے خود پر الزام لیا ہے، وہ اس معاملے میں قطعی بے قصور ہے۔

انسپکٹر زبیر نے مجھے بتایا کہ مس ماہین نے اپنے بیان کی تصدیق میں کوئی ثبوت وغیرہ بھی پیش کیا ہے جس کے بعد پولیس نے اسے اپنی کسٹڈی میں لے لیا ہے۔

میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس جذباتی لڑکی نے وہ سب کر دیا تھا جو کرنے کا سوچ رہی تھی۔ انسپکٹر زبیر کسی خاتون کا ذکر بھی کر رہا تھا جو بیان کے وقت اس کے ساتھ تھی۔ میں نے زبیر سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

”جہاں تک مجھے معلوم ہے، خاتون کا نام شاہین ہے۔ وہ غالباً مس ماہین کی بڑی بہن ہیں اور دو تین روز پہلے ہی انگلینڈ سے آئی ہیں۔“

……شاہین وہ تھی جس نے میرے بچھڑے یار عمران دانش سے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور اس کی زندگی میں آنے کے سپنے برسوں تک اپنی آنکھوں میں سجائے تھے۔ پھر جب وہ ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر اپنی بے مثال مسکراہٹوں سمیت ابدی سفر پر روانہ ہو گیا تھا، تو شاہین بھی اس کی یادیں سمیٹ کر کسی جانب چل نکلی تھی اور اب مدتوں بعد وہ پھر منظر پر ابھری تھی۔

☆☆☆

میں اب جلد از جلد شاہین سے ملنا چاہتا تھا اور یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ ماہین نے یہ سب کیوں کیا ہے، تاہم اگلے تین چار روز میں دو تین کام ایسے ہنگامی آن پڑے کہ میں کسی اور طرف توجہ ہی نہیں دے سکا۔ ان میں سے ایک کام بڑی سنگین نوعیت کا تھا اور اس نے مجھے خاصا ڈسٹرب کیا۔

اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے مجھے کافی ڈاک موصول ہوتی تھی۔ اس میں مارشل آرٹ کے حوالے سے میرے بہت سے پرستاروں کی ڈاک بھی ہوتی تھی۔ ایک سوال بہت کامن تھا جو مجھ سے کیا جاتا تھا…… میں نے خود کو اتنا سخت جان اور تکلیف برداشت کرنے کے قابل کس طرح بنایا……؟ اور یہ کہ ہم خود کو ایسا کس طرح بنا سکتے ہیں؟ میرا جواب بھی تقریباً ایک ہی ہوتا تھا۔ ”میں نے ایک بے مثال استاد کی رہنمائی میں اپنے نفس کی مرضی کے خلاف چلنا سیکھا اور دھیرے دھیرے اس مخالفت کے لیول کو بڑھاتا چلا گیا، اس کامل یقین کے ساتھ کہ مجھے اس جفاکشی کا صلہ جلد یا بدیر مل کر رہے گا، خود کو ذائقے، جنس اور آرام طلبی جیسی ساری جسمانی لذتوں سے حتی الامکان حد تک دور کیا اور ذہنی و جسمانی مشقت کے کانٹوں پر ننگے پاؤں چلنا سیکھا۔“

تو میں بات کر رہا تھا خود کو موصول ہونے والی ڈاک کی۔ کبھی کبھی کوئی جوشیلا فین چھوٹا موٹا گفٹ بھی ارسال کر دیتا تھا۔ اُس روز ایک ایسے ہی چھوٹے سے پارسل کو دیکھ کر میں چونکا۔ یہ ایک ڈبیا سی تھی، میں نے اسے احتیاط سے کھولا تو اندر سے ایک تہ شدہ کاغذ برآمد ہوا۔ اس کاغذ کی تحریر کا آغاز ہی گندی گالیوں سے ہوا تھا۔ ساتھ میں دور مار رائفل کی دو گولیاں بھی تھیں۔ گولیوں پر سرخ رنگ کے باریک مارکر سے لکھا گیا تھا۔ ایک پر تحریر تھا۔ ”تمہارے دل کے لیے“ دوسری پر درج تھا۔ ”تمہاری منحوس کھوپڑی کے لیے۔“

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ کاغذ کی کمپوز شدہ تحریر میں لکھا تھا۔ ”ایبٹ آباد کا موسم بڑا ٹھنڈا ٹھار ہے۔ اکڑ کر رہ جاؤ گے۔ اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ ہم دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے یادگار دشمن ہیں۔ تم خود تو ڈوبو گے ہی تمہارے پیاروں کے پھیپھڑوں میں بھی ایسا برفیلا پانی بھریں گے کہ اگلی نسل بھی یاد رکھے گی۔ اس کو آخری وارننگ ہی سمجھو تو اچھا ہے۔“

ایبٹ آباد کا اشارہ یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ یہ وہی نقلی ادویات والا معاملہ ہے جس کی تحقیق میں نے دوبارہ شروع کی ہے۔ آخری وارننگ اور پیاروں والی بات نے میرا دھیان پلک جھپکتے، نجانے کیوں اس واقعے پر پہنچا دیا جس میں جعلی پولیس کی طرف سے عمران اور ماہین کو سخت ہراساں کیا گیا تھا۔ میں نے فوراً یہ ساری صورتِ حال ایس ایس پی جمشید صاحب کو بتائی اور انہوں نے اس سلسلے میں مجھے کچھ ضروری ہدایات دینے کے علاوہ خود بھی اس معاملے کی چھان بین کا آغاز کر دیا۔

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ ایک شام گوجرانوالا سے ایس ایس پی جناب رانا صاحب کی طویل فون کال آئی۔ میرے حوالے سے اُن کے دل میں کبھی نرم گوشہ نہیں رہا تھا مگر میرے اور عمران کی وجہ سے انہیں کافی فائدہ ہوا تھا، وہ کچھ نرم پڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ”تابش! ویسے وہ مُنڈا، تمہارا بھتیجا بے کئی یوائے۔ پیر مخدوم والا کیس بڑا تگڑا تھا مگر اس کی ضمانت ہو گئی…… بلکہ سمجھو بچ گیا۔ اب اس دوسرے کیس سے بھی خارج ہو رہا ہے…… مگر وہ کُڑی تو پھنس گئی ہے نا۔“

”ہاں رانا صاحب! اور یہ میڈیا والے بھی معاملے کو برابر اٹھائے ہوئے ہیں۔“

”یہی بات میں تم سے کہنا چاہ رہا ہوں۔ اس کُڑی ماہین نے اور کچھ نہیں تو چھ سات سال کے لیے جیل چلے جانا ہے۔ تباہ ہو کر رہ جائے گی۔“

بات ایسی ہی تھی، یہ تو مجھے بھی لگ رہا تھا کہ کچھ لوگ اس معاملے کو ٹیسٹ کیس بنا کر مثالی سزا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

”آپ کا کیا مشورہ ہے؟“ میں نے رانا سے پوچھا۔

”مشورہ تم نے کبھی مانا تو نہیں مگر دینے میں کیا حرج

ہے۔ اصل نکتہ ایک ہی ہے۔ کسی بھی طرح اس فوٹیج کا پتا چلوا دو جونا کے پربتی۔"

"وہ ہمارے چینی بھائیوں نے ہی غائب فرمائی۔ جی رانا صاحب۔"

"مگر مجھے اس کے علاوہ بھی شک ہے۔ واقعے کے پندرہ بیس گھنٹے بعد میں نے سنا تھا کہ فوٹیج مل گئی ہے مگر پھر اچانک اس گل کو پلٹا مار دیا گیا۔"

"سرو یلینس آفس کے دو بندوں سے کوئی پوچھ گچھ ہوئی ہے ایک تو کئی دن حراست میں بھی رہا ہے لیکن کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔"

ایک دو "قیمتی مشوروں" سے نوازنے کے بعد خشک رویّے والے رانا صاحب نے مجھے پہلی بار اپنے مخصوص انداز میں "رب راکھا" کہا۔

یہ پانچویں چھٹے روز کی بات ہے، مجھے اپنی طوفانی مصروفیت سے فراغت مل چکی تھی۔ میرے گھر میں، میں اور شاہین آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ گزرے ماہ و سال نے اس کی خوب صورتی و دلکشی پر زیادہ اثر نہیں کیا تھا۔ بس بالوں کا گھنا پن تھوڑا کم ہوا تھا اور وزن میں انیس بیس کا فرق پڑا تھا۔ جنوری کی اس خنک شام میں کئی یادیں جیسے یلغار کر کے اس کمرے میں گھس آئی تھیں۔ وہ رو رہی تھی، میری آنکھوں میں بھی نمی تھی...... لگ رہا تھا عمران دانش آج ہی بچھڑا ہے۔ آج ہی اُس نے موت سے جنگ ہاری ہے اور آج ہی میں نے اس کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا ہے۔ ہم پچھلے بیس منٹ سے عمران دانش کی باتیں ہی یاد کر رہے تھے۔ وہ ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ "ثروت کی موت کا بھی بہت دکھ ہوا تابش صاحب! پچھلے پندرہ سولہ برسوں میں وہ بھی اکثر میرے خیالوں میں رہی ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ملازمہ کرن نے آ کر اطلاع دی کہ عمران آیا ہے۔ (ماہین کے اقبالی بیان کے بعد دو روز پہلے ہی عمران کی ضمانت ہوئی تھی۔ اس حوالے سے ایک بار پھر میڈیا پر سنسنی خیز نیوز چلی تھیں) میں نے شاہین سے پوچھا۔ "عمران جونیئر کو دیکھا ہے تم نے؟"

"نہیں، ابھی صرف تصویر دیکھی ہے۔"

"کتنا ملتا ہے عمران دانش سے۔ نگاہوں کو دھوکا ہونے لگتا ہے۔"

"ہاں۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"صرف شکل کی بات ہی نہیں، اُس کی زیادہ تر عادات بھی باپ جیسی ہی ہیں، اس کا ہنسنا بولنا، اٹھنا بیٹھنا......"

اسی دوران میں عمران دروازے پر نمودار ہوا۔ پہلے سے کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ "سلام چاچو جان...... سلام آنٹی۔" اس نے کہا۔

شاہین ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر عجیب سا رنگ ابھرا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ عمران کے قریب پہنچی۔ عمران نے اپنا سر جھکایا۔ شاہین نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گلے سے لگا لیا۔ "ہو بہو اپنے باپ کی تصویر ہو۔" وہ اس کا سر چومتے ہوئے بولی۔

ہم بیٹھ گئے۔ کرن چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی آ گئی تھی۔ ہم چائے پینے لگے۔ عمران نے کہا۔ "آنٹی جان! آپ سے غائبانہ تعارف بہت پرانا ہے۔ آپ سے کہنے پوچھنے کی بھی بہت سی باتیں ہیں...... مگر فی الحال ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں...... ماہین نے یہ سب کیوں کیا؟ ماہین کو اپنے پاس بلانا اور اس کے ساتھ شہر میں گھومنا میری غلطی تھی۔ غلطی بھی کیا شاید بلینڈر تھا۔ اس بلینڈر کی سزا اس نے خود کو کیوں دی؟"

"وہ بھی تو یہی بات کہتی ہے عمران۔" شاہین مشفق لہجے میں بولی۔ "پولیس اہلکار کی موت اس کی غلطی کی وجہ سے ہوئی۔ تم اس کی سزا کیوں بھگتو۔"

"لیکن......"

"لیکن، کچھ نہیں عمران بیٹا۔" شاہین نے اس کی بات کاٹی۔ "ماہین نے جو کچھ کیا ہے، ٹھیک کیا ہے...... اور مجھ سے مشورے کے بعد کیا ہے۔ وہ ایک جھوٹ کے ساتھ حسّام کی زندگی میں داخل ہونا نہیں چاہتی۔ اس نے سب سچ کہہ دیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ گئی تھی۔ حادثے کے وقت ڈرائیونگ وہ کر رہی تھی۔ اس کی یہ بات اس کے لیے کم خطرناک ہے مگر تمہارے لیے بہت خطرناک تھی۔ تمہارے پاس تو ڈرائیونگ لائسنس تک نہیں تھا۔ اس کے پاس لائسنس ہے اور وہ شہری بھی ہے۔ اب اگر عدالت میں یہ ثابت ہو گیا کہ اے ایس آئی حادثاتی طور پر اچانک گاڑی کے سامنے آ گیا، تو یہ کیس کافی کمزور پڑ جائے گا پھر اس پر قصاص دیت وغیرہ کا قانون بھی لاگو ہو سکتا ہے۔"

"مگر یہ حادثہ ثابت ہوگا تب ہے نا۔ کیس تو یہ بن رہا ہے کہ نہ رکنے کے لیے بے رحمی سے گاڑی اے ایس آئی پر چڑھا دی۔"

"اسے حادثہ ثابت کرنے کے لیے ہم کوشش کر سکتے ہیں۔" شاہین بولی۔

"مگر میڈیا پر جو طوفان برپا ہے، اس کا کیا ہوگا۔ وہ سارے تیر جو میری طرف چلائے جا رہے تھے، ان کا رخ ماہین کی طرف ہوگیا ہے۔"

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اصل مسئلہ تو سی سی ٹی وی فوٹیج کا ہے۔ کسی وقت تو یقین ہو جاتا ہے کہ اسے جان بوجھ کر اوجھل کر دیا گیا ہے۔"

عمران نے گہری سانس لے کر اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو سہلایا اور بولا۔ "ایک اور بات بار بار میرے ذہن میں آتی ہے چاچو! جو پولیس اہلکار اچانک گاڑی کے سامنے گرا، وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھا تھا۔ وہ نشے میں لگتا تھا یا کسی دوا کے اثر میں۔ ہوسکتا ہے کہ اسے معمولی ٹھوکر بھی لگی ہو مگر وہ جس طرح گرا، وہ منظر بار بار نظروں کے سامنے آتا ہے۔ میں اپنے مشاہدے کی بنا پر گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اُس وقت نارمل نہیں تھا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اگر کسی غیر جانبدار ڈاکٹر نے اس کا پوسٹ مارٹم کیا ہے تو رپورٹ میں بھی یہ بات لازمی آنی چاہیے۔"

"میں نے رپورٹ دیکھی تھی عمران، اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں۔"

"تو پھر چاچو...... آپ کو اُس سرجن پر بھی شبہ کرنا چاہیے۔"

عمران نے یہ بات بہت زور دے کر نہیں کہی تھی مگر ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جب شاہین اور عمران دونوں چلے گئے تو میں نے انسپکٹر زبیر کے ذریعے اس سرجن کا پتا کرایا۔ 48 گھنٹے بعد زبیر نے جو رپورٹ دی، وہ چونکانے والی تھی۔ سرجن کا نام ماجد اکرام تھا اور وہ سروسز اسپتال کے قریب ہی رہائش رکھتا تھا۔ زبیر اور رائے نے اس کے بارے میں اہم معلومات حاصل کی تھیں۔ زبیر نے کہا۔

"جناب! یہ بندہ ایک عام سی پوسٹ پر ہونے کے باوجود بڑے لمبے ہاتھ رکھتا ہے۔ اس کے جو اثاثے سامنے نظر آتے ہیں، وہ بھی اس کی آمدن وغیرہ سے میل نہیں کھاتے۔ ڈیفنس میں دو کینال کی کوٹھی اس کی بیوی کے نام ہے۔ ایک بڑا پلاٹ بھی اسی علاقے میں ہے۔ اس کے علاوہ معروف ہاؤسنگ سوسائٹی میں یہ ایک چھ منزلہ پلازہ کا مالک بھی ہے۔"

"یعنی بندہ ٹھیک نہیں۔"

"لگتا تو یہی ہے جی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے کسی بہت تگڑے بندے یا پارٹی کا ہاتھ ہے۔"

میں نے کہیں پہلے بھی اس بندے کا نام سنا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ فوٹیج کے سلسلے میں مزید ٹکریں مارنے سے پہلے اس ڈاکٹر سے ملوں۔

عمران کی رہائش والے محلے ندیم ٹاؤن میں اس کی واپسی کا باقاعدہ جشن منایا گیا تھا۔ چند ماہ کے مختصر وقت میں ہی اس نے مقامی لوگوں کے دلوں میں کافی جگہ بنالی تھی۔ اس کے خلاف جو خبریں پھیلی تھیں، ان پر کسی نے بھی یقین نہیں کیا تھا اور اب تو ماہین کے بیان کے بعد سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگیا تھا۔ علاقے کے لوگ اس پر صدقے واری جا رہے تھے۔ حوالات میں عمران کو تھپڑ مارنے والی خبر بھی پتا نہیں کس طرح لیک آؤٹ ہوگئی تھی اور لوگ سیٹھ وہاب کے خلاف غم و غصے سے بھر گئے تھے مگر خود عمران پر ایسی باتوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔

دوسرے روز میں عمران کے ساتھ سرجن ڈاکٹر ماجد اکرام سے ملنے جیل روڈ پر واقع اس کی کوٹھی پر پہنچا۔ یہ اتوار کا روز تھا اور رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ میں نے ڈور بیل دی۔ ایک گارڈ نما چوکیدار باہر نکلا۔ میں نے اپنا نام تابش بتایا تو جواب میں اس نے مسکراہٹیں بکھیریں اور بڑی خوش دلی سے ہمیں اندر لے گیا۔ میں نے اور عمران نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لگتا تھا کہ چوکیدار کو ہمارے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ مسکراہٹیں بکھیرتا ہوا ہمیں اندر لے آیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ہمارے سامنے ڈرائی فروٹس سے بھری ہوئی طشتری رکھ دی۔

"ڈاکٹر صاحب نے آپ کا بتایا تھا۔ بس ابھی آجاتے ہیں۔" چوکیدار نے ٹی وی آن کرتے ہوئے کہا۔

ابھی صرف دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک خوبرو دراز قد لڑکی گھبرائی ہوئی برآمد ہوئی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی۔ رنگین دوپٹا پاؤں میں الجھ رہا تھا، بال منتشر تھے۔ لڑکی کے پیچھے ہی ماجد اکرام برآمد ہوا۔ اس کا نصف سر گنجا تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ جسم گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ اس نے لڑکی کو بازو سے تھاما۔ وہ فریادی لہجے میں بولی۔ "پلیز ماجد صاحب! ابھی مجھے جانے دیں۔ بہت دیر ہوجائے گی...... پلیز......" وہ دونوں ہمیں نہیں دیکھ پائے تھے۔

"دیکھو عالیہ یہ ٹھیک نہیں۔ پچھلی بار بھی یہی ہوا تھا......"

اسی دوران میں ایک اور لڑکی دروازے سے نکلی۔ یوں لگا جیسے وہ ڈاکٹر ماجد کی مددگار ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر سہمی ہوئی لڑکی سے کچھ کہنا چاہا اور یہی وقت تھا جب ماجد اکرام کی نگاہ ڈرائنگ روم کے اس گوشے کی طرف اٹھ گئی جہاں ہم دونوں بیٹھے تھے۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ بدحواس لڑکی کی کلائی اس کی گرفت سے نکل گئی۔ دونوں لڑکیاں بھی حیرت زدہ سی نظر آرہی تھیں۔

ماجد اکرام لڑکھڑا کر ہماری طرف بڑھا۔ ''کون ہیں آپ لوگ؟'' اس نے رعب دار لہجہ بنا کر پوچھا۔

''آپ کی مزاج پرسی کے لیے آئے ہیں۔ میں ڈی ایس پی تابش ہوں۔ ہمیں آپ کے بارے میں کچھ مشکوک اطلاعات ملی ہیں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''مشکوک اطلاعات۔'' وہ گرجا۔ ''یہ کیا فضول بکواس کر ... رہے ہو آپ۔'' پھر وہ دروازے کی طرف منہ کر کے دہاڑا۔ ''گلریز خان...... گلریز خان۔''

چوکیدار لپکا ہوا اندر آیا۔ ماجد اکرام چلایا۔ ''ان کو کس نے اندر آنے دیا؟''

''جج...... جی، آپ نے ہی تو کہا تھا کہ......''

میرے اشارے پر عمران نے آگے بڑھ کر دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ گھر میں... فی الوقت ان چاروں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ''ماجد اکرام، یہ دونوں کون ہیں؟'' میں نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اور اب یہ نہ کہنا کہ میں پوچھنے والا کون ہوتا ہوں۔'' میں نے اپنا سروس کارڈ نکال کر اس کے سامنے کیا۔ وہ زیادہ پریشان نظر آیا مگر آنکھوں میں بدستور طیش کی چمک تھی۔

''میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ غصیلے انداز میں اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں سے نکلا تھا۔

''بالکل نہیں۔'' میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''ابھی کوئی فون نہیں، نہ تم کرو گے نہ یہ لڑکیاں اور نہ کوئی اور......''

''پیچھے ہٹو۔'' وہ ایک دم پھٹ پڑا۔ اس نے دھکا دے کر مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے جوابی دھکا دیا اور کوٹ کے اندر سے اپنا سروس پسٹل نکال لیا۔

''نہیں ماجد اکرام، فی الحال یہ زورازوری نہیں چلے گی۔''

''تم مجھے جانتے نہیں ہو، میں دس منٹ میں...... تم دونوں کی دنیا اندھیر کر دوں گا۔''

''فی الحال تو تم اپنی دنیا کی فکر کرو۔'' عمران نے دھکا دے کر اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کر دونوں لڑکیوں سمیت گلریز خان کی سٹی بھی گم ہو گئی تھی۔

''ادھر بیٹھو تم دونوں بھی۔'' عمران نے تحکم سے کہا۔ اور دونوں لرزتی کانپتی لڑکیاں بھی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ عمران نے چوکیدار سمیت ان تینوں کے سیل فون قبضے میں لے لیے۔

یہی وقت تھا جب کمرے میں سیل فون کا میوزک بجنے لگا۔ یہ ڈاکٹر ماجد کا فون تھا۔ عمران اندر گیا اور اٹھا لایا۔ اسکرین پر کسی تابش چودھری کا نام چمک رہا تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ فون خاموش ہوا تو میں نے گلریز خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ وہی تابش ہے جس کے مغالطے میں تم نے ہمیں اندر آنے کا شرف بخشا ہے۔ دوبارہ کال آئے تو تم وہی کہو گے جو ہم کہیں گے۔ ورنہ تھانے کی مار تم سمجھتے ہی ہو گے۔'' وہ بس سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ کال آئے تو اسے کیا کہنا ہے۔ ابھی میری بات ختم ہی ہوئی تھی کہ تابش چودھری صاحب کی کال پھر آ گئی۔ گلریز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کال اٹینڈ کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بڑی جلدی میں کہیں نکل گئے ہیں، فون بھی گھر ہی چھوڑ گئے ہیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ دوسری طرف سے مایوسی کا اظہار کیا گیا اور پوچھا گیا کہ دونوں لڑکیاں کہاں ہیں؟ گلریز نے بتایا کہ وہ بھی ساتھ ہی گئی ہیں۔ تابش چودھری نے فرمایا۔ ''میں تو گھر سے نکلنے ہی والا تھا...... چلو جب بھی ماجد صاحب آئیں، مجھے فون کریں۔''

اس گفتگو کے دوران میں ماجد اکرام بے چینی سے پہلو بدلتا رہا تھا۔ اس کی کھا جانے والی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں مگر مجھے پسٹل بدست دیکھ کر وہ کسی بھی حرکت سے باز رہا۔

میں نے اب اپنے ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ میں نے پسٹل عمران کے ہاتھ میں دیا تاکہ وہ ماجد اکرام کے غصے کو جھاگ بنانے اور بٹھائے رکھنے میں کامیاب رہے۔ دونوں لڑکیوں کو میں نے باری، باری دوسرے کمرے میں بلایا اور ان سے پوچھ گچھ کی۔ میں

پچیس منٹ کے اندر سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔

جولڑکی ماجد اکرام کی منت سماجت کرتی رہی تھی، اس کا نام عالیہ تھا۔ دوسری کا نام الفت تھا اور وہ اپنی کچھ تصویروں کے سبب ماجد اکرام کے ہاتھوں کئی ماہ سے بلیک میل ہورہی تھی۔ ماجد نے اسے اپنے جال میں پھنسایا ہوا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ گاہے بگاہے اس کی عزت سے کھیل رہا تھا بلکہ اس شاطر نے الفت کے ذریعے اس کی سہیلی عالیہ پر بھی جال پھینک دیا تھا۔ اب عالیہ کی کچھ تصویریں بھی ماجد اکرام کے پاس تھیں اور وہ ایک بار اس کے ہاتھوں کھلونا بن چکی تھی۔ ماجد نے اسی پر بس نہیں کیا تھا اب وہ ان دونوں ڈری ہوئی لڑکیوں کو اپنے دو چار قریبی دوستوں کے سامنے بھی پیش کرنا چاہ رہا تھا۔ الفت تو اس ذلت پر بھی راضی ہو چکی تھی مگر عالیہ بدک رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ماجد اور عالیہ کا جو سین ہم نے دیکھا، وہ اسی حوالے سے تھا۔ الفت نے مجھے تصویروں کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے یہی معلوم ہوا کہ بظاہر وہ کوئی ایسی نازیبا تصویریں نہیں تھیں مگر الفت کے لیے اس لحاظ سے بے حد نازک معاملہ تھا کہ ان تصویروں میں وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ نظر آتی تھی۔ بس اس جال میں پھنستے پھنستے وہ زیادہ ہی پھنس گئی۔ (یہ ہمیں آگے جاکر پتا چلا کہ بات بلیک میلنگ کی تو تھی لیکن تصویروں کی نہیں تھی)

کئی دفعہ حالات اپنا رخ خود منتخب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم یہاں صرف پوسٹ مارٹم رپورٹ کے حوالے سے ڈاکٹر ماجد کی ٹوہ لینے آئے تھے مگر یہاں کچھ اور ہی منظر نامہ کھل گیا تھا۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر ماجد اکرام کرپٹ شخص ہے۔

میں نے دوسرے کمرے میں جاکر ایس ایس پی جمشید صاحب کو فون کیا اور انہیں ماجد اکرام کے بارے میں اور یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ ماجد اکرام کے نام نے جمشید صاحب کو بھی چونکا دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”تابش! یہ بندہ معمولی نظر آنے کے باوجود معمولی نہیں ہے۔ تم نے یوں اس پر ہاتھ ڈال کر بڑا رسک لیا ہے۔ اب تمہیں کچھ نہ کچھ ثابت کرنا پڑے گا ورنہ بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔“

”آپ کا مشورہ کیا ہے؟“

”میں کیا مشورہ دوں، جو کچھ تم بتا رہے ہو، اس کے مطابق تو اب تم پیچھے نہیں ہٹ سکتے ہو۔ اب اسے گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن لاؤ گے تو فوراً ہی فون کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جائیں گی۔ تم بے بس ہو کر رہ جاؤ گے۔“

”تو پھر اس کی گرفتاری ڈالے بغیر اس سے پوچھ گچھ کر لی جائے؟“

”مگر اس کی کوٹھی میں پوچھ گچھ کرو گے تو ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہی اس کی گرفتاری کا پول کھل جائے گا۔“

میں جمشید صاحب کی بات سمجھ رہا تھا۔ انہیں تسلی دے کر میں نے کال ختم کر دی۔

☆☆☆

یہ قریباً ایک گھنٹے بعد کا منظر تھا۔ ہم دریائے راوی کے پار ایک کوٹھی میں موجود تھے۔ یہ ایک جاننے والے کی کوٹھی تھی اور خالی پڑی تھی۔ ماجد اکرام بھی یہیں موجود تھا لیکن اس حالت میں کہ وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ دونوں لڑکیاں اور چوکیدار گلریز بھی یہیں پر تھے اور دو علیحدہ کمروں میں بند تھے۔ ماجد اکرام پہلے تو بڑے دھڑلے سے گالیاں بکتا رہا تھا پھر اس نے مجھے اور عمران کو سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں اور قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ ہمارے ہاتھ پاؤں تڑوا کر ہمیں سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کر دے گا اور ایسا نہ کر سکا تو اپنی شیو پیشاب سے کروائے گا۔ اسے گرا کر اس کے ہاتھ عمران نے ہی باندھے تھے۔ لہٰذا وہ زیادہ غصہ عمران پر ہی نکال رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ”دیکھیں ماجد صاحب! جو کچھ آپ نے بہت ذلیل ہو کر بکنا ہے، وہ پہلے ہی بک دیں تو فرشتے آپ کا نام سمجھداروں کی فہرست میں لکھیں گے۔“

”فرشتوں نے جو لکھنا تھا، وہ لکھ چکے۔“ ماجد پھنکارا۔ ”آج سورج ڈوبنے تک جن لوگوں نے ہاتھ پاؤں تڑوا کر اپاہج ہونا ہے تم ان کی لسٹ میں پکے ہو......“

”تو پھر آپ کے ان خادموں کو یعنی ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”وہی کرو جو کرنا چاہتے ہو، ننگا کر کے الٹا لٹکاؤ مجھے......“

عمران ہنسا۔ ”الٹا کیوں لٹکائیں گے جناب کو...... سیدھا لٹکائیں گے۔ غالباً حضور کو لٹکنے اور لٹکانے کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں۔ شاید غیر عورتوں کے ساتھ سو سو کر آپ کے دماغ کی بتی گل ہو چکی ہے۔“ وہ ماجد کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ”غور فرمائیں...... لٹکنے والے کے لیے الٹا لٹکنا تو ایک زبردست رعایت کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی پنڈلیوں

کو ٹخنوں کے قریب سے باندھ کر اسے ہوا میں جُھلا دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے جسم کا سارا بوجھ ٹانگوں پر آسانی سے سہار لیتا ہے۔ لٹکنے کا اصل سواد تو سیدھا لٹکنے میں آتا ہے۔ کندھے اکڑنے لگتے ہیں یاروں کے۔" عمران کے لہجے میں مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ عجیب سی تپش بھی آگئی تھی۔

"یہ سب کچھ تجھے تیرے خیال سے بھی زیادہ مہنگا پڑنے والا ہے۔ انسان کا بچہ بن انسان کا۔"

"انسان کا بچہ ہی ہوں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ مجھ سے اردو میں گفتگو فرما رہے ہیں۔ کبھی جانوروں سے بھی کسی نے اس طرح گفتگو کی ہے۔ ہاں آپ کے لیے ہمیں ضرور جانوروں والی زبان استعمال کرنا پڑے گی۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا فرماگئے ہیں، اس سلسلے میں مولانا رومی......"

اسے خاموش دیکھ کر میں نے پوچھا۔ "کیا فرما گئے ہیں؟"

وہ بولا۔ "میں آپ سے پوچھ رہا ہوں، آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔"

تقریباً پانچ منٹ بعد فربہ اندام ماجد اکرام چھت کے پنکھے سے سیدھا لٹکا ہوا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ قدرے بھاری جسم والے شخص کو سیدھا لٹکا دینا ہی اس کے لیے بہت بڑی اذیت ہوتی ہے۔ شاید کسی اضافی ایذا رسانی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ جسم کا سارا بوجھ کلائیوں اور کندھوں کے جوڑوں پر آجاتا ہے۔ کم ہمت لوگ تو آٹھ دس منٹ کے اندر ہی رونا چلّانا شروع کر دیتے ہیں۔ ماجد اکرام کم ہمت نہیں تھا اس لیے پانچ چھ منٹ تو وہ گزار گیا۔ اس دوران میں اس نے گندی گالیاں وغیرہ بھی بکیں، جس کے نتیجے میں عمران نے ایک جھاڑن اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ کندھوں کی تکلیف کے سبب تڑپنے لگا۔

میں نے عمران سے کہا۔ "لگتا ہے تمہارے "دوست" کو اضافی بونس کی ضرورت ہے۔"

عمران نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ایک طرف ویٹ لفٹنگ میں استعمال ہونے والی "پانچ کے جی" کی آہنی پلیٹیں پڑی تھیں۔ ان کے ساتھ لاسٹک کی چوڑی پٹیاں منسلک تھیں۔ عمران نے یہ پلیٹیں ماجد اکرام کے ٹخنوں سے منسلک کر دیں۔

درحقیقت اس بندے پر ہاتھ ڈال کر بڑا رسک لیا تھا ہم نے یا کہنا چاہیے کہ جُوا کھیلا تھا۔ اب ہماری بچت اسی میں تھی کہ وہ اپنے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت فراہم کردے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کرے گا...... اُس کے چہرے پر درج تھا کہ وہ ایک غیر معمولی کرپٹ شخص ہے۔

دو چار منٹ مزید گزرے اور حالت یہ ہوگئی کہ سخت سردی میں ماجد کے سر سے ایڑیوں تک پسینا چل رہا تھا۔ اس پسینے میں اس کی بنیان اور پینٹ بھیگ چکی تھی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اندر کمرے میں دونوں لڑکیوں نے رونا شروع کر دیا۔ وہ کسی ادھ کھلی کھڑکی میں سے ماجد اکرام کی حالتِ زار دیکھ رہی تھیں۔

اس کی بس ہونے لگی تو عمران نے اس کے منہ میں سے جھاڑن کا کپڑا نکال دیا۔ وہ بُری طرح کھانسنے اور چلّانے کے بعد ہچکی لہجے میں بولا۔ "دیکھو میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں...... مجھے ہارٹ اٹیک یا برین ہیمرج ہوگیا تو تم بھی بری طرح پھنسو گے۔"

"ہمارے غم میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "لاسٹک اور فوم کی جس بندش کے ذریعے تمہیں لٹکایا گیا ہے، وہ تمہاری کلائیوں پر کوئی نشان نہیں چھوڑے گی۔ باقی رہی مار پیٹ...... تو وہ ہم تمہارے ساتھ کر ہی نہیں رہے، لہٰذا تم ہارٹ اٹیک وغیرہ کی وجہ سے وفات بھی پا گئے تو تم پر کوئی تشدد ثابت نہیں ہوگا۔"

کم و بیش پانچ منٹ کی گریہ وزاری کے بعد بظاہر بہت مضبوط نظر آنے والے ماجد اکرام نے ایک دم ہتھیار ڈال دیے۔ عمران نے لکڑی کی دو فٹ اونچی ایک چوکی اس کے پاؤں کے پاس رکھ دی تاکہ وہ اس پر اپنے پاؤں کے پنجے ٹکا سکے۔ میں نے اسٹینڈ پر لگے وڈیو کیمرے کے ذریعے ماجد کے چہرے کو ٹائٹ کلوز کیا اور کیمرا آن کر دیا۔

اگلے آٹھ دس منٹ میں ہم نے ماجد اکرام سے جو کچھ اگلوایا، وہ ہماری توقع سے زیادہ انکشاف انگیز تھا۔ (اس کے لیے ہمیں ایک دو منٹ کے لیے پھر اس کے پاؤں کے نیچے سے چوکی نکالنا پڑی تھی)

ماجد اکرام ایک ایسا شخص تھا جو سرتاپا کرپشن کی کیچڑ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے وہی اعتراف کیا جس کی خاطر ہم اُس تک پہنچے تھے۔ اس نے بتایا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لیے اس پر دباؤ آیا تھا اور وہ رپورٹ مکمل درست نہیں ہے۔ اس نے تسلیم کیا کہ متوفی اے ایس آئی سلیم کے جسم میں حادثے کے وقت ZELEPLON وغیرہ کی غیر معمولی مقدار کا سراغ ملا

تھا۔ اس سے قیافہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر پریشان تھا اور ٹرینکولائزر وغیرہ کا استعمال کررہا تھا۔

میرا اور عمران کا خیال تھا کہ ماجد اکرام پر غلط رپورٹ کا دباؤ پولیس کی طرف سے ہی آیا ہوگا مگر یہ قیافہ بھی ماجد کے بیان کی رُو سے غلط تھا۔ ماجد نے رپورٹ میں یہ ردوبدل ایک اہم اخبار کے کرائم رپورٹر عدنان رفیع کے کہنے پر کیا تھا اور عدنان رفیع نے اس کے لیے اسے بھاری رشوت دی تھی۔

لڑکیوں والے معاملے میں ماجد نے انکشاف کیا کہ پہلی لڑکی الفت تصویروں کی وجہ سے بلیک میل نہیں ہوئی تھی...... بلکہ اس کی وجہ ایک سی سی ٹی وی فوٹیج تھی۔ یہ فوٹیج دراصل سرویلینس کے شعبے میں ایک کرپٹ شخص کے پاس آگئی تھی۔ ایک پارک کی اندرونی سڑک پر لگے ہوئے ایک کیمرے کی اس فوٹیج میں الفت ایک اسٹیشن ویگن کے پاس اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ نظر آئی۔ یہ کرپٹ شخص ”سرجن ماجد اکرام“ کا بھی دوست تھا۔ ان دونوں نے مل کر الفت کو پھانسا اور وہ نکلنے کی کوشش میں مزید پھنستی چلی گئی بلکہ اپنی ایک سہیلی کی بے آبروئی کا سبب بھی بنی۔

یہ فوٹیج ماجد اکرام کے اسمارٹ فون کے ایک فولڈر میں بھی پڑی تھی۔ اس کی نشاندہی پر ہم دونوں نے یہ فوٹیج دیکھیں۔ سہ پہر کے وقت پارک کی ایک سنسان سڑک پر نیلے رنگ کی ویگن کھڑی تھی جس کی کھڑکیوں پر پردے بھی تھے۔ فوٹیج میں الفت ایک فیشن ایبل لڑکے کے ساتھ چلتی ہوئی آتی ہے...... اور پھر ذرا جھجکتی ہوئی سی اس کے ساتھ ویگن میں چلی جاتی ہے۔ دو یا تین منٹ کے بعد وہ پھر باہر نکلتی ہے۔ اس مرتبہ شال اس کے سر کے بجائے ایک کندھے سے جھول رہی ہے۔ وہ جانا چاہتی ہے مگر اس کے پیچھے ہی لڑکا بھی باہر نکل آتا ہے...... وہ اسے مناکر اور تھوڑا سا کھینچ کر دوبارہ ویگن میں لے جاتا ہے۔ اس مرتبہ لڑکے اور الفت کے چہرے بالکل واضح نظر آتے ہیں۔ ریکارڈنگ کے مطابق الفت دوبارہ کم وبیش دس منٹ بعد ویگن سے باہر آتی ہے۔

یقیناً یہ وڈیو اس بے وقوف لڑکی کو پھنسانے کے لیے بہت کافی تھی۔

ماجد اکرام نے جب اپنے اس دوست کا نام بتایا جس نے فوٹیج حاصل کی تھی تو میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ سرویلینس ڈپارٹمنٹ کا وہی بندہ مقصود احمد تھا جس سے ہم متوفی اے ایس آئی کے حوالے سے بھی پوچھ گچھ کرتے رہے تھے۔ واقعے کی وڈیو غائب ہونے کی نسبت سے جن دو تین ملازموں سے تفتیش کی گئی تھی، ان میں مقصود بھی شامل تھا بلکہ وہ تین روز پولیس کسٹڈی میں بھی رہا تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال رہی ہوگی۔ شکلیں دھوکا دیتی ہیں۔ شکل وصورت سے وہ بھی بے حد شریف نظر آتا تھا مگر اب ماجد اکرام کے بیان کے بعد وہ مشکوک تر ہو گیا تھا۔

میں نے ماجد اکرام سے پوچھا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ تم اس فوٹیج کے بارے میں بھی کافی کچھ جانتے ہو جو اے ایس آئی سلیم کی موت کے وقت بنی اور پھر غائب ہوئی۔“

”مجھے جو پتا تھا، وہ میں نے بتادیا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“ وہ بُری طرح کراہتے ہوئے بولا۔

عمران نے کہا۔ ”جناب ماجد اکرام صاحب، الفت والی وڈیو سے پتا تو یہی چل رہا ہے کہ آپ اور یہ حضرت، مقصود احمد صاحب لنگوٹیے یار ہو...... بلکہ شاید آپ دونوں کے درمیان لنگوٹ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اس طرح کی اہم باتیں وہ آپ سے چھپاتا ہو......“

پہلے تو ماجد صاف انکار کرتا رہا، مگر جب ایک بار پھر عمران نے اس کے پاؤں کے نیچے سے چوکی نکالنے کا ارادہ کیا اور پانچ کلوگرام والی آہنی پلیٹیں اس کی پنڈلیوں سے جوڑیں تو اس نے بک دیا۔ اسے معلوم تھا اس وڈیو کے بارے میں...... اور یہ بھی معلوم تھا کہ مقصود احمد نے اسے جان بوجھ کر چھپایا ہے۔

اس نے لرزاں وترساں لہجے میں بتایا۔ ”حادثہ ہونے کے بعد یہ فوٹیج پولیس شاید چھپانا چاہتی ہوگی...... مگر مسئلہ یہ تھا کہ حادثے کے بعد کیمرے میں واقعی فالٹ سامنے آیا تھا۔ فوٹیج ٹریس ہی نہیں ہورہی تھی۔ مقصود اسے پلے کرنے اور کیمرے کا نقص دور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اگلے روز امید تھی کہ فوٹیج مل جائے گی اور وہ مل بھی گئی...... مگر......“ ماجد اکرام کہتے کہتے پھر اٹک گیا۔

میرے اور عمران کے تاثرات نے اسے دوبارہ بولنے پر مجبور کیا۔ اس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ ”اسی دوران میں ایک فون کال آگئی جس میں مقصود کو رشوت لینے پر مجبور کیا گیا۔“

”کیا مطلب؟ مجبور کیا گیا؟“

”اسے کہا گیا کہ وہ یہ فوٹیج منظرِعام پر نہ آنے دے۔“

میں نے ماجد اکرام کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے

کہا۔ ''کیا یہ وہی بندہ تھا جس نے تمہیں بھی رشوت لینے پر ''مجبور'' کر دیا تھا۔ میرا مطلب ہے وہی کرائم رپورٹر عدنان رفیع ؟''

''نہیں...... یہ کوئی اور تھا۔ کم از کم مقصود نے مجھے تو یہی بتایا ہے۔''

''اب آپ پھر بکواس فرما رہے ہیں۔'' عمران ترخ کر بولا۔ ''اب آپ کو لٹکایا گیا تو آپ کی وفات کے بعد ہی اتارا جائے گا۔ مجھے یقین ہے اس مرتبہ آپ کے دل پر ''ہارٹ اٹیک کا حملہ'' ضرور ہو جاتا ہے۔'' عمران جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا تو میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

میں نے اسی وقت انسپکٹر زبیر کو فون کیا اور اسے کہا کہ وہ فوبیج والے مقصود احمد کو پکڑ کر فوراً یہاں لے آئے۔ دوسری طرف میں نے انسپکٹر توفیق رائے سے کہا کہ وہ کرائم رپورٹر عدنان رفیع کے بارے میں پتا کرے کہ وہ کہاں ہے اور کس چکر میں ہے۔

مقصود احمد کو پہنچنے میں کچھ ٹائم لگنا تھا لہٰذا میں نے ماجد اکرام کو عمران کے ساتھ مل کر چھت سے اتارا اور کرسی پر بٹھایا۔ اب اس کے ہاتھ باندھنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس کی ساری اکڑفوں پسینے کے ساتھ ہی بہہ چکی تھی، دوسرے لفظوں میں پتّا پانی ہو چکا تھا۔ وہ بار بار دو ہائی دے رہا تھا کہ اس کے کندھوں کے جوڑ اکھڑ چکے ہیں حالانکہ حقیقتاً ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

دونوں لڑکیوں کے سلسلے میں ہم نے ماجد اکرام کا طویل اقبالی بیان ریکارڈ کیا جس میں اس نے اعتراف کیا کہ اس نے اور مقصود نے سی سی ٹی وی فوٹیج کے ذریعے الفت کو پھنسایا...... اور پھر مزید پھنسانے کے لیے اس کی دو اور وڈیوز بھی بنائیں۔ وہ دونوں گاہے بگاہے اسے اپنے پاس بلاتے رہتے تھے۔ پھر انہوں نے اس کے ذریعے اس کی سہیلی عالیہ کو بھی ٹریپ کیا۔ اس نے لاہور ہی کی دو اور لڑکیوں کے نام بھی لیے جو مختلف سی سی ٹی وی فوٹیجز کی وجہ سے ہی پہلے مقصود اور پھر ماجد اکرام کے ہتھے چڑھیں۔ وہ جو سلوک ان کے ساتھ کرتے رہے تھے، اس کی تفصیل بھی وڈیو بیان میں ریکارڈ ہوئی۔ یہ صرف اقبالی بیان ہی نہیں تھا جس سے اکثر مجرم عدالت میں مکر جاتے ہیں، اس میں کچھ ٹھوس ثبوت بھی موجود تھے۔

اسی اثنا میں مقصود احمد کی تشریف آوری بھی ہو گئی۔ شکل مومناں کرتوت کافراں والی ضرب المثل اس پر صادق

آتی تھی۔ بدبخت کا شریفانہ حلیہ اور بول چال دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس قسم کی بدکاریوں میں مصروف ہوگا۔ انسپکٹر زبیر راستے میں بھی اس کی تھوڑی بہت ''مزاج پرسی'' کر چکا تھا۔ اس کی ایک آنکھ نیلگوں نظر آرہی تھی۔ یہاں پہنچ کر جب اس نے اپنے سرجن دوست کی حالت زار دیکھی تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ کسی بھی وجہ سے ماجد اکرام کے پھنسنے کے سبب وہ بھی پھنس گیا ہے۔ جب اس نے آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ''معصوم'' صورت کی پروا کیے بغیر چند کرارے تھپڑ اسے جڑ دیے۔ میرے تیور بھانپ کر وہ ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔ جب میرے اشارے پر عمران اور انسپکٹر زبیر نے اسے چھت سے لٹکانے کا ارادہ کیا تو وہ سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا اور باقاعدہ رونے لگا۔ وہ پہلے بھی پوچھ گچھ کے مرحلے سے گزرا تھا مگر تب کی بات اور تھی۔ مجھے اور زبیر کو اس پر تھوڑی سی محنت مزید کرنا پڑی اور پھر اس نے اپنی ناک سے بہتا ہوا خون پونچھنے کے بعد سب کچھ اُگل دیا۔ وہ مان گیا کہ اس نے کسی کے کہنے پر فوٹیج جان بوجھ کر سامنے نہ آنے دی۔ پہلے تو اس نے کہا کہ اس نے فوٹیج ڈیلیٹ کر دی تھی مگر میرے چند مزید تھپڑ کھانے کے بعد وہ مان گیا کہ فوٹیج اس کے پاس موجود ہے۔

''تمہیں کس نے کہا تھا فوٹیج چھپانے کے لیے؟''

''اس کا مجھ سے رابطہ بس فون کے ذریعے ہوا تھا۔ میں اُسے جانتا نہیں ہوں۔ پتا نہیں اس نے کیا چکر چلایا ہوا تھا۔ موبائل پر اس کا فون نمبر بھی نہیں آرہا تھا۔ اس نے پیسے بھی مجھے آن لائن بھجوائے تھے اور کہا تھا کہ فوٹیج فوراً ڈیلیٹ کر دو۔''

''اور تم نے پھر بھی ڈیلیٹ نہ کی۔ حالانکہ کہتے ہیں، بے ایمانی کے کام بڑی ایمانداری سے کیے جاتے ہیں۔''

''وہ...... دراصل مجھے آدھی رقم بھیجی گئی تھی، آدھی ابھی تک آئی ہے، میں نے سوچا تھا، بعد میں ڈیلیٹ کروں گا۔''

''آن لائن رقم بھیجنے والے کا سراغ بینک کے ریکارڈ سے تو لگ ہی سکتا ہے۔''

''وہ کوئی اٹلی کے شہر کا اکاؤنٹ تھا۔''

''چلو یہ بھی پتا کرا لیتے ہیں۔ تم اس فوٹیج کے درشن کراؤ۔'' میں نے کہا۔

مقصود احمد کے پاس دو اسمارٹ فون تھے۔ ایک فون میں دسمبر کی اُس دُھندلی شام میں پیش آنے والے واقعے کی فوٹیج موجود تھی۔ پولیس ناکے پر پیش آنے والا وہی واقعہ جس نے ماہین کو سنگین دفعات کے تحت یخ بستہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا تھا اور میڈیا کی ساری بلاؤں کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔

میں نے اور عمران نے فوٹیج دیکھی۔ اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا مگر دُھند گہری ہونے کے سبب مکمل رات ہی معلوم ہوتی تھی۔ ایک طرف سے ماہین والی گاڑی نمودار ہوئی۔ ہیڈ لائٹس آن تھیں۔ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے۔ ناکے پر موجود اہلکاروں نے ''اسٹاپ'' والا سائن دکھا کر کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ رک رہی ہے مگر پھر رفتار بڑھا دی گئی۔ جب گاڑی ناکا کراس کر چکی تھی، دائیں جانب کے درختوں میں سے ایک فربہ اندام اہلکار تیزی سے نکل کر گاڑی کی طرف بڑھا وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔ اچانک اسے واضح طور پر کسی شے سے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ ماہین کی کار کے سامنے گرا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ شاید ماہر ڈرائیور بھی اسے بچا نہ سکتا۔ یہ سارا سیکنڈ کے شاید آدھے حصے کا کھیل تھا۔ پھر بھی چلانے والے نے پھرتی سے اسٹیئرنگ کو بائیں گھمایا تھا۔ گاڑی الٹتے الٹتے بچی لیکن اہلکار کے اوپر چڑھ گئی۔ اس کے بعد وہ دو مزید اہلکاروں سے ٹکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ بدقسمت اے ایس آئی دس پندرہ میٹر تک گاڑی کے نیچے ہی گھسٹنے کے بعد ایک کنارے پر لڑھک گیا۔ گاڑی لہراتی ہوئی سی آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد ناکے کی طرف سے ایک اہلکار فائر کرتا بھی نظر آیا۔

ہم نے چار پانچ بار اس فوٹیج کو چلا کر دیکھا۔ کئی جگہ اسے ''پاز'' بھی کیا۔ ہر بار ہمارے اس تاثر میں اضافہ ہوا کہ یہ سراسر ایک حادثہ ہے جو اس وجہ سے پیش آیا کہ ڈگمگاتا ہوا سا پولیس اہلکار ٹھوکر کھا کر گاڑی کے عین سامنے جا گرا۔

میں نے شریف صورت مقصود کی گُدی پر ایک جھانپڑ رسید کیا۔ ''تمہاری حرامزدگی کی وجہ سے یہ وڈیو غائب ہوئی اور یہ کیس اتنا سنگین بنا۔''

''مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں لالچ میں آ گیا تھا...... مم...... مگر یہ صرف لالچ نہیں تھا مجھے ڈرایا بھی گیا تھا۔''

''کون تھا وہ؟''

''مجھے پتا ہوتا تو ایک منٹ سے پہلے بتا دیتا۔''

عمران بولا۔ ''تم سب جانتے ہو، صرف گھنتے بنے ہوئے ہو۔ تمہیں ''گیدڑ کٹ'' کی ضرورت ہے۔''

یہاں سوچنے کی بات تھی کہ پولیس کے علاوہ وہ کون تھا جس کو اس فوٹیج کے اوجھل ہونے سے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط ہونے سے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

اگلے پانچ دس منٹ تک ہمارے اور مقصود کے درمیان زبردست کشمکش چلی۔ ماہین جیل میں تھی۔ اے ایس آئی کی موت کے ذمے دار کے خلاف میڈیا نے ایسی فضا بنا رکھی تھی کہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ ہم جلد از جلد اس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ عمران تو اس حوالے سے ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔ آخر مقصود کو اپنی زبان کا تالا کھولنا پڑا۔ کچھ مزید مار کھانے کے بعد اس نے بتا دیا کہ آن لائن ادائیگی اور اٹلی کے شہر کے اکاؤنٹ والی ساری بات ''بکواسیات'' کے زمرے میں آتی تھی۔ اسے فوٹیج چھپانے کے لیے مجبور کرنے والا وہی تھا جس نے سرجن ماجد اکرام سے پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط بنوائی تھی۔ یعنی وہی کرائم رپورٹر عدنان رفیع۔ اسے عدنان شاہ بھی کہا جاتا تھا۔

اس نئے کردار عدنان رفیع شاہ کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اسے اس کیس کو سنگین بنانے سے کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔ اس ہال کمرے کے ایک گوشے میں جا کر میں نے عمران سے ڈسکشن کی۔ عمران نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''ایسا لگتا ہے چاچو جان کہ اس کرائم رپورٹر کو کسی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ یہ فوٹیج منظرِ عام پر آگئی تو میرے حق میں جائے گی۔ لہٰذا اس نے اسے دبانے کی اسکیم بنائی۔ یہی کچھ اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے سلسلے میں کیا۔''

''یہ بات تو یقیناً سمجھ میں آتی ہے عمران، یہ کرائم رپورٹر عموماً تھانے کچہری کے اندر کی باتیں جان لیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ تمہارا دشمن کیوں تھا؟''

ایک دم عمران کی آنکھوں میں ایک نئی سوچ اُبھرتی دکھائی دی۔ ''چاچو! کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ فوٹیج وہ لوگ غائب کروانا چاہتے ہوں جو مجھے اغواکار اور قاتل ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میرا مطلب ہے ماہین کے چچا ثاقب اور ماموں وغیرہ۔''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو پھر میرا دھیان ماہین کے چچا اور ماموں کے بجائے کسی اور طرف جائے گا۔''

عمران نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''کہیں..... آپ..... حشام اور اُس کے والد کی بات تو نہیں کررہے؟''

''وہی کررہا ہوں۔ یہ سوچا جاسکتا ہے کہ کرائم رپورٹر عدنان رفیع کا ''لنک'' حشام اور اس کے والد سے ہو۔ اس لنک کی وجہ سے عدنان رفیع نے حشام کو بتا دیا ہو کہ فوٹیج سامنے آئی تو تمہارے رقیب کی گردن سے پھندا ڈھیلا ہو جائے گا اور حشام نے اس سے کہا ہو کہ وہ فوٹیج سامنے نہ آنے دے۔''

''مگر رپورٹر عدنان رفیع کو کیسے پتا چلا کہ فوٹیج میرے حق میں جائے گی؟''

''تمہیں بتایا ہے نا کہ ان کرائم رپورٹرز کے رابطے پولیس سے گہرے ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تاکے پر موجود اہلکاروں میں سے ہی کسی نے عدنان رفیع کو بتایا ہو کہ اے ایس آئی کا گاڑی کے نیچے آنا سراسر حادثہ تھا۔ اس کے بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ کے سلسلے میں بھی یہی چابکدستی دکھائی گئی ہو مگر فی الحال تو ہم ایک مفروضے پر ہی بات کررہے ہیں۔''

''کیا آپ کا شک کسی اور طرف بھی جاتا ہے؟'' عمران نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے عمران کا چہرہ دیکھا۔ حوالات میں حشام کے والد نے اس کے منہ پر جو تھپڑ مارا تھا، اس سے اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ یہ نشان اب بھی موجود تھا اور یہ نشان میرے سینے میں انگارے سے سلگا دیتا تھا مگر نجانے کیوں، فوٹیج غائب ہونے کے حوالے سے میرا دھیان حشام اور اس کے والد سے زیادہ کسی اور طرف جاتا تھا۔ وہی لوگ جنہوں نے میری وجہ سے پہلے بھی عمران کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے عمران کو اس سلسلے میں ابھی تک صرف اتنا بتایا تھا کہ میں جعلی دواؤں کے سلسلے میں تحقیقات کررہا ہوں اور مجھے شبہ ہے کہ جلو پارک میں جن لوگوں نے اسے اور ماہین کو ہراساں کیا ان کا تعلق اسی معاملے سے تھا۔

''آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟'' عمران نے کہا۔ ''کیا آپ کا شک کسی دوسری طرف بھی جاتا ہے؟''

''ہاں عمران! وہی پارٹی جو غیر قانونی میڈیسنز کا دھندا کررہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے تمہیں دوبارہ نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو۔''

عمران پُرسوچ انداز میں سر ہلاتا رہا، پھر گویا ہوا۔ ''اگر ایسا ہے تو پھر اس سلسلے میں وہی رپورٹر عدنان رفیع کچھ اُگل سکتا ہے۔ ڈاکٹر ماجد اور ملزم پارٹی کے درمیان ''مڈل

مین" تو وہی ہوا۔"

"لیکن وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ پھر فون نکال کر میں نے چوتھی مرتبہ انسپکٹر رائے سے رابطہ کیا۔ رائے نے اطلاع دی کہ عدنان رفیع کا کہیں پتا نہیں، لگتا ہے کہ وہ خطرہ سونگھ کر غائب ہو چکا ہے۔

اس اطلاع کے بعد میں اور عمران ایک بار پھر چربیلے جسم والے ڈاکٹر ماجد اور شریف صورت مقصود کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ وہ عدنان رفیع کے بارے میں کچھ بتا سکتے۔ ابھی انہیں دو، دو تھپڑ ہی پڑے تھے اور ماجد اکرام کو دوبارہ لٹکانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ میرے فون کی بیل ہوئی، دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اسکرین پر نمبر یا نام کے بجائے بس تین ہندسوں کا ایک فگر آ رہا تھا۔ ایک بھاری اور نہایت سرد آواز سنائی دی۔ "ڈپٹی تابش! تم باز نہیں آئے۔ اپنی ذلت و خواری کو خود آواز دی ہے تم نے...... بلکہ شاید موت کو بھی۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ "کون ہو تم؟"

"تمہارے پرستار۔ ہمارا محبت نامہ اور پارسل تمہیں مل گیا تھا۔ اس کے باوجود تم حرامزدگی سے باز نہیں آئے۔ تم نے ڈاکٹر پر ہاتھ ڈال کر اپنے عدم آباد کے ویزے پر پکی مہر لگوائی ہے۔"

یکایک مجھے احساس ہوا کہ قدرت کمالِ مہربانی سے میرا ہاتھ تھام رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے عمران سے جس شک کا اظہار کیا تھا۔ وہ انتہائی سرعت کے ساتھ یقین میں بدل رہا تھا۔ اس ڈاکٹر ماجد کے لیے ان لوگوں کی طرف سے کال آ گئی تھی جو ایبٹ آباد میں کہیں سات پردوں میں چھپے بیٹھے تھے اور جن کی تلاش میں ہم ایک سال سے سر پٹخ رہے تھے۔

تب اچانک مجھ پر حیرت کا ایک اور حملہ ہوا۔ دریائے راوی کے کنارے اس خالی کوٹھی میں ہم اتنی رازداری سے پہنچے تھے کہ متعلقہ افسران کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ نہ ہی ہم نے یہاں پر کسی کو اجازت دی تھی کہ وہ فون کو ہاتھ لگائے۔ مگر ہماری یہاں موجودگی ان لوگوں پر عیاں ہو چکی تھی۔ جمشید صاحب کی یہ بات درست ثابت ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر ماجد کے رابطے بااثر اور بدترین لوگوں سے ہیں۔

سرد آواز دوبارہ ابھری۔ "تمہیں ہماری پہنچ کا اندازہ ہو چکا ہوگا۔ زمین کی ساتویں تہ میں بھی اتر جاؤ گے تو اسی طرح ہمارے ریڈار پر رہو گے۔ اس وقت میرا ایک اشارہ تمہیں اور تمہارے اس باسٹرڈ بھتیجے کو خون میں نہلا سکتا ہے۔ صبح ہونے تک تمہارے لختی لواحقین تمہارے کفن دفن کی تیاری کر رہے ہوں گے لیکن میں تمہیں چیمپئن احمق مانتے ہوئے اب بھی ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ کیڑے مکوڑے مارنا مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔" وہ ڈرامائی لہجے میں بول رہا تھا۔

"زبان کو لگام دو...... اور بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سب انسپکٹر کو اشارہ کیا کہ وہ فون کر کے اس نامعلوم کالر کی لوکیشن معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

بھاری آواز گونجی۔ "تین چار دفعہ بھی پیدا ہو جاؤ گے تو ہمیں دھوکا نہیں دے پاؤ گے۔ یہ کال ٹریس نہیں ہو گی۔ حماقتیں چھوڑ کر کام کی بات سنو اور عمل کرو۔" سب کچھ کسی فلمی سین کی طرح لگنے لگا تھا۔

میں نے دیکھا، کچھ فاصلے پر بیٹھے نیم جان ڈاکٹر ماجد کے چہرے پر اب رونق نظر آنے لگی تھی۔ بند کمرے کے اندر سے دونوں لڑکیوں کے رونے کی آواز بھی آتی تھی۔

تھوڑے توقف کے بعد بے حد حتمی لہجے میں کہا گیا۔ "تم دونوں باسٹرڈز کے پاس صرف بیس منٹ کی مہلت ہے۔ تمہیں تین شرطیں ماننا ہوں گی، ان میں سے ایک فوری نوعیت کی ہے۔ ڈاکٹر ماجد اور اس کے ساتھی سے معافی مانگو اور انہیں بڑی عزت سے ان کے گھروں تک پہنچا دو۔ نمبر دو وعدہ کرو کہ دوبارہ بھی ان کے معاملے میں اپنی گندی ناک نہیں گھسیڑو گے۔ نمبر تین صدقِ دل سے توبہ کر لو کہ آئندہ ایبٹ آباد وغیرہ کی قاتل ٹھنڈ سے دور رہو گے اور تمہارے بڑے بھی دور رہیں گے۔"

میں نے فون کا اسپیکر آن کر رکھا تھا۔ عمران بھی یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ بولنے والے کے غیر معمولی اعتماد سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے یا کم از کم ہمارے بہت قریب موجود ہے جہاں سے بہ آسانی ہم کو ٹارگٹ کر سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ راوی کنارے کی اس کوٹھی کو گھیر لیا گیا ہو...... کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا...... سرد رات کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی اور بل کھا رہی تھی۔

سرد اور قاتل فضاؤں میں پنہاں اس قاتل قصے کا دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ پڑھیے

شب گزیدہ

اے۔آر۔راجپوت

بزرگوں کا کہنا ہے کہ شام ڈھلتے ہی اپنے گھروں کا رخ کرو... جو رات گئے آوارہ گردی کرتے ہیں... کسی نہ کسی وبال کا شکار ضرور ہوتے ہیں... بیوی کی جرح سے چڑ کر گھر سے نکلنے والے ایک ایسے ہی شوہر کی دردناک بپتا...
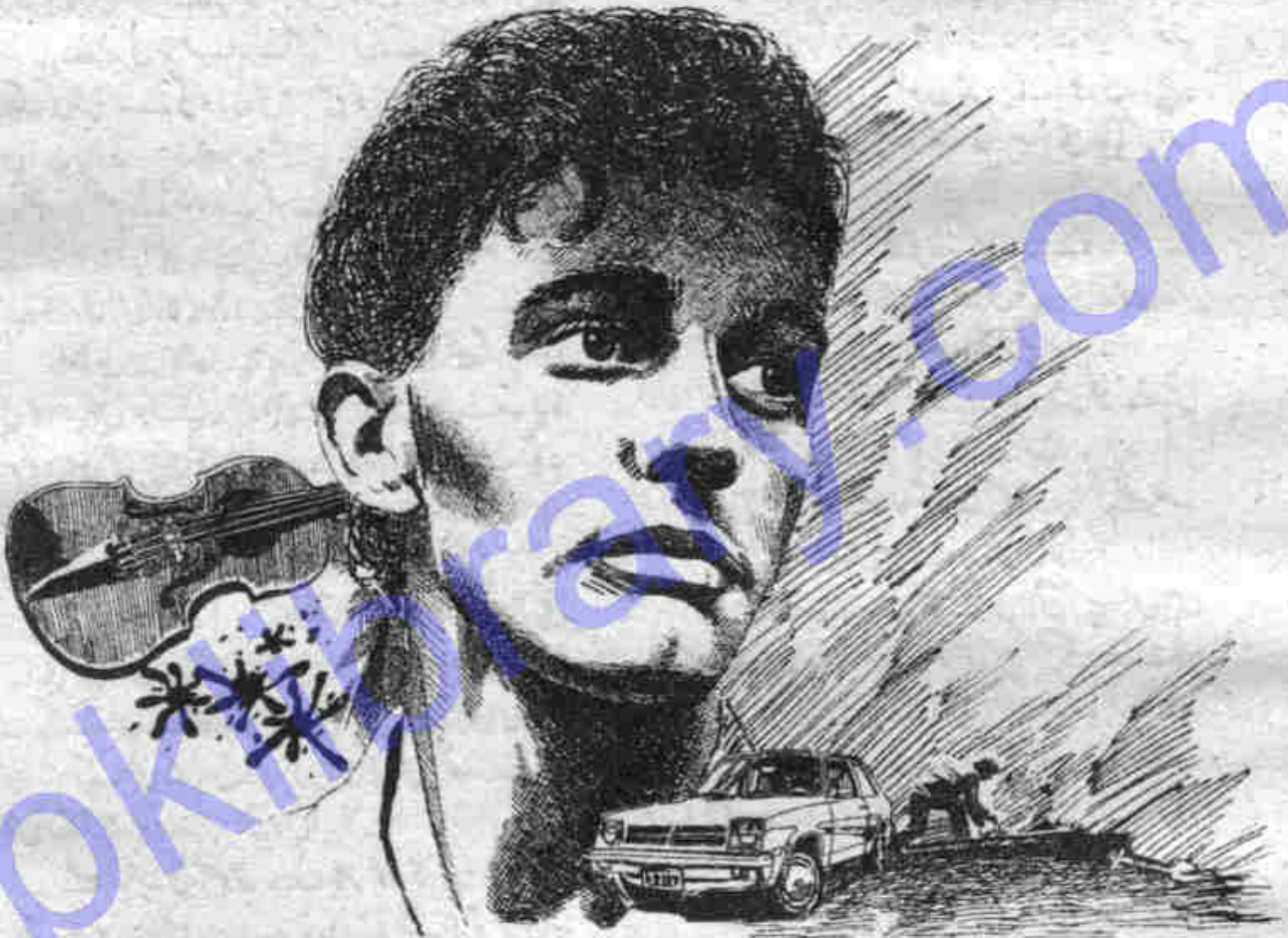
سنگین واردات میں الجھے ایک شب گزیدہ کا جوابی لائحہ عمل......

رات...... کے بارہ بجے کا وقت...... سخت سردی اور ٹھٹھرتا ہوا جاڑا مگر آکاش صاف، شفاف اور تاروں بھرا تھا۔ اگرچہ دور کہیں محاق کا چاند بھی جھکا جھکا شرمایا سا جھلک دکھاتا مگر تاروں کی فوج ظفر موج نے اردگرد کے ماحول کو مقدور بھر سہی، روشن کر رکھا تھا۔

دور ہوڑا برج کی روشنیاں بھی چمک رہی تھیں۔ میں اسی برج کی طرف جانے والی سنسان سڑک پر بڑبڑاتا ہوا جا رہا تھا۔

”یہ پچھی بھی دماغ خراب کردیتی ہے۔ بتاؤ بھلا، آدمی تھکا ہارا جائے اور...... گھر میں گھستے ہی سوالات کی بوچھاڑ...... ہونہہ...... اس سے تو اچھا میں باہر ہی یار دوستوں کے ساتھ صحیح تھا۔ اچھا ہے، گھر جانے سے پہلے میں اپنا فون بھی آف کر دیتا ہوں۔ اب پچھی کو بھی پتا چل جائے کہ میں اتنی رات گئے گھر آ کر دوبارہ بھی باہر جا سکتا ہوں۔ میرے دوستوں کے بازو میرے لیے ہر سمے کھلے رہتے ہیں۔“

اور پھر میں واقعی میں دوستوں کی طرف چل دیا تھا جہاں اب بھی تاش کھیلتے ہوئے رامو، گرکھ، دیال سنگھ اور جاوید چنگاری...... مجھے دیکھ کر خوش ہوں گے بلکہ ولایتی برانڈی سے میری خاطر مدارت بھی کریں گے۔ رات سونے کو جگہ بھی مل جائے گی، دیکھنا پھر پچھی کو میں کس طرح جلاتا ہوں آج رات...... اسے سزا ملنی چاہیے، تاکہ آئندہ وہ اس سے فضول قسم کے سوالات کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ ہونہہ...... ذرا ذرا سی بات پر روٹھ کر اپنی ماں کے گھر چلے جانے کا ڈراما بھی کرنا چھوڑ دے گی۔“

دفعتاً ہی میرا ہاتھ اپنے سر پر گیا اور وہاں مجھے گرم اونی ٹوپی کا احساس ہوا۔ یہ میری پتنی پچھی نے بڑی محبت اور چاؤ سے خود بنائی تھی۔ یہی نہیں اور بڑے پریم سے اس نے ایک اضافی رنگت کی اون سے میرے نام کے دو حروف بھی کاڑھ دیے تھے۔ ب۔ ن۔ یعنی بھولا ناتھ......

”رے بھولے......!“ دفعتاً رات کی ٹھٹھرتی تاریکی میں اپنی پتنی پچھی کی آواز سنائی دی۔ بے اختیار میرے قدم رک گئے۔ ”میں نے تجھ سے ایسا کیا پوچھ لیا رے؟ کیا میرا اتنا بھی...... ایک پتنی کے سمان مان بھی نہیں کہ میں تجھ سے پوچھ پاؤں کہ تو آج رات دیر سے کیوں آیا؟“

مجھے شرمندگی محسوس ہوئی پھر خود کلامیہ بڑبڑایا۔ ”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ بے چاری نے ایک ہی تو سوال کیا تھا، میں خود زیادہ بول گیا۔ چل بھولا ناتھ واپس چل گھر کو۔“

میں نے خود کو سمجھایا، میں بھی ذرا نشے کی پینک میں تھا لیکن نہیں...... اس سالی نے مزید بڑبڑ جو کی تھی، اور ایک روپیہ کا سکہ مجھے حقارت سے کھینچ مارا تھا کہ میری یہی اوقات ہے۔ وہ روپیہ شاید اسی لیے اس نے نجانے کب سے اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ رکھا تھا۔

’اچھا کیا میں نے بھی جو سکہ وہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا، اسے یہ کہہ کر مزید جلانے کے لیے کہ ”اور تو اسی ایک روپے والے آدمی کی پتنی ہے۔ اب ٹھیک ہے۔ ہاہا...... ہاہا......‘ میں نے بھی صحیح جواب دیا تھا سالی کو......“

اچانک سنسان سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں، یہی نہیں وہ تیزی سے میرے قریب آ کر رک بھی گئی۔ اس کے ٹائر رات کی سنسان پڑی سڑک پر چرچرائے تھے۔

وہ ایک نیلے رنگ کی کار تھی۔ اندر ایک ہی آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے کار کا شیشہ نیچے کر کے سر باہر نکال کر کہا۔ ”فارغ ہو تو میرا ایک کام کر دو گے؟“ ”میں تو سدا کا فارغ تھا۔ پر میں نے جھک کر غور سے کار سوار کو دیکھا، وہ ایک درمیانی عمر کا مرد تھا۔

”کون سا کام؟“ میں نے بھی پوچھ لیا۔ جواب میں کار سوار کا ایک ہاتھ باہر آیا۔ اس میں بڑا سا نوٹ دبا ہوا تھا۔ نوٹ دیکھ کر یکبارگی میری آنکھوں میں چمک اُبھری۔ اس نوٹ سے میں پورا ہفتہ عیاشی کر سکتا تھا۔ میرا جی چاہا کہ بس ’ہاں‘ کر دوں۔

”کام کے بدلے ملے گا۔“ کہتے ہوئے کار سوار نے نوٹ والا ہاتھ فوراً اندر کر لیا، جیسے ڈر ہو میں چھین ہی نہ لوں۔

”کام کیا ہے؟“ میں نے بھی بالآخر پوچھ لیا۔

”میرا ایک پالتو کتا مر گیا ہے۔ اسے دفن کرنے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ کار سوار نے کہا۔

”کیا؟ تو نے مجھے خاکروب سمجھا ہے؟“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”کسی کچرا کنڈی میں پھینک دیتا اُس کی لاش کو......“

”وہ میرے پیارے پالتو کتے کی لاش ہے، میں اس کی تذلیل نہیں کرنا چاہتا، تمہاری مرضی......“ کہتے ہوئے کار سوار نے شیشہ اوپر کیا تو میں نے لپک کر شیشہ بجایا مگر کار سوار نے شیشہ نیچے نہیں کیا، بلکہ شاید میرا شیشہ بجانے کا مطلب سمجھتے ہی عقبی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور یوں میں لپک کر کار میں سوار ہو گیا۔

”آپ کا پالتو کتا مرا کیسے؟“ عقبی سیٹ سنبھالتے ہی میں نے پوچھا۔

”میرا چوکیدار بندوق صاف کر رہا تھا کہ گولی چل گئی، جو کتے کو جا لگی۔“ کار سوار نے بتایا اور اس کے ساتھ ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ کار میں مدھم روشنی تھی۔

”او...... اچھا! پر صاحب! آپ تو ناراض ہی ہو گئے تھے اور ایسے نکلے جا رہے تھے، بھلا یہ کون سا مشکل کام ہے۔ پر وہ نوٹ...... پہلے میرے حوالے کرنا ہوگا۔“ میں نے خفت مٹاتے ہوئے مقصد کی بات بھی کر ڈالی۔

کار سوار نے بے پروائی سے نوٹ پیچھے اُچھال دیا، جسے میں نے فوراً جھپٹ لیا۔

کار اب سنسان سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ میں نے ڈیش بورڈ کی روشنی میں دیکھا کہ اس کا چہرہ کسی قدر چپٹا تھا اور آنکھیں عینک کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں، ساتھ ہی مجھے اس کے برابر والی سیٹ پر ایک وائلن بھی پڑا نظر آیا تھا۔ کار کا سفر تھوڑی دیر جاری رہا، پھر اس کے بعد کار ایک میدانی جنگل سے ویران علاقے میں داخل ہوکر قدرے آگے جاکر رک گئی۔

ہم دونوں کار سے نیچے اتر آئے۔ آدمی کے ہونٹ پتلے تھے۔ میں اس کی طرف بار بار دیکھ لیتا پھر پوچھا۔

''کتا کہاں ہے؟''

''ڈگی میں...... میں اسے کھولے دیتا ہوں۔'' آدمی کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ رقص کرگئی۔ اس نے گاڑی سے اتر کر ڈگی کھولی۔ فضا میں یکا یک موت کی سی بو پھیل گئی۔ اندر ایک پھولی ہوئی بوری رکھی ہوئی تھی، اس کے منہ پر رسی بندھی ہوئی تھی اور جگہ جگہ سرخ دھبے نظر آرہے تھے۔

میں نے ناگواری سے منہ بنایا۔ ہم دونوں نے بوری کو ڈگی سے اتارا اور درختوں کے پیچھے لے آئے۔ دور کسی لوکل ٹرین کی سیٹی سنائی دی مگر ہوا آواز کو اپنے ساتھ اڑا لے گئی۔

پانچ منٹ بعد بوری میں بند کتے کی لاش کے سامنے میں تنہا کھڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں چھوٹا سا پھاوڑا اور دوسرے ہاتھ میں وہی بڑا سا نوٹ دبا ہوا تھا۔ خون دیکھتے ہی اس آدمی کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ وہ ''اوغ...... اوغ......'' کرنے لگا تھا، جیسے ابکائیاں آرہی ہوں، ساتھ ہی اپنا سینہ یوں مسلنے لگا جیسے متلی پر قابو پانے کی ناکام کوشش کررہا ہو۔ لہٰذا میں نے اسے رخصت کردیا۔

''سالے یہ پیسے والے بھی نازک مزاج ہی ہوتے ہیں۔'' میں اس کے جانے کے بعد ٹھٹھا مار کے ہنستے ہوئے بڑبڑایا۔

یہ معمولی کام تھا جسے بڑی آسانی سے میں اکیلا ہی سر انجام دے سکتا تھا لہٰذا میں نے نوٹ جیب میں رکھا اور دونوں ہاتھوں سے پھاوڑا تھام کر زمین پر پل پڑا۔

ابھی میں نے دو فٹ گہرا گڑھا ہی کھودا تھا کہ پیچھے سے بھاری قدموں کی آواز سن کر میں نے ہاتھ روک لیے۔ اس وقت یہاں کون آسکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ بلا سے کوئی بھی ہو، میں نے سر جھٹکا اور دوبارہ زمین کھودنے کے لیے پھاوڑا سر سے بلند کیا۔

''یہ اس وقت تم یہاں کیا کررہے ہو؟'' معاً ہی میں نے ایک کرخت آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو پھاوڑا میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ وہ آدمی کیا تھا، پورا بن مانس تھا اور مجھے بڑی بڑی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

اس کے نتھنوں سے پھنکاریں سی نکل رہی تھیں۔ تب ہی میری نظر اس کے ہاتھ میں دبے سیاہ ڈنڈے اور کندھے سے لٹکی رائفل پر پڑی۔ میری سٹی گم ہوگئی۔ میرے سامنے گشتی پولیس کا حوالدار کھڑا تھا۔

''مم...... میں کتے کی لاش دفن کررہا ہوں۔'' میرے حلق سے بہ مشکل ہی الفاظ برآمد ہوئے تھے۔

''خاصے مسکین نظر آرہے ہو۔'' حوالدار نے طنز کیا اور ڈنڈے سے بوری کو ٹہوکا دینے لگا۔

''حوالدار صاحب!'' میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ''یہ...... یہ...... آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ......''

''بکواس بند کرو۔'' حوالدار گرجا پھر ٹارچ نکال کر اس کی روشنی بوری پر ڈالی اور اس کے منہ پر بندھی رسی کو چھیڑنے لگا۔ اس نے ایک جھٹکا دیا اور رسی نکل کر دور جا پڑی۔ میری ناک سے بدبو کا ایک بھبکا ٹکرایا۔ اس نے جھک کر بوری کو دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے کھلے منہ پر پڑ رہی تھی۔

''خبردار! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا بدمعاش!'' حوالدار غرایا اور ڈنڈا بیلٹ سے لٹکا کر رائفل اتارنے لگا۔

ادھر میرے جسم سے سرد پسینے پھوٹ پڑے اور میں ہونقوں کی طرح پلکیں جھپکانے لگا۔ یہ خواب نہیں تھا نہ میرا وہم تھا اور نہ ہی بوری میں کتا تھا۔ یوں اب میرا جسم یکا یک بید مجنوں کی طرح کپکپا رہا تھا۔ بوری میں سے ایک انسانی لاش...... جھانک رہی تھی۔ بے سر کی لاش......

''ح ح...... حوالدار صاحب جی!'' میں ہکلایا۔ ''وہ...... یہاں ایک آدمی نیلے رنگ کی کار میں آیا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں کتے کی لاش دفن کرنے میں اس کی مدد کروں۔ اس کے بدلے اس نے مجھے ہزار روپے دیے پھر وہ خود چلا گیا۔''

''تو تم بے قصور ہو؟'' حولدار نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں دھوکا دیا گیا ہے۔ ہے نا؟ کیا تم مجھے الو سمجھتے ہو؟''

میں نے بڑی مشکل سے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا۔

''مم...... میں سچ کہہ رہا ہوں حوالدار صاحب جی! میں...... مم...... میں بے قصور ہوں۔''

میں گڑگڑایا۔ ''اس نے مجھے ہزار کا نوٹ دیا تھا، یہ دیکھو......'' کہتے ہوئے میں نے نوٹ نکال کر سامنے کردیا۔

"اسے جیب میں رکھ لو، بے قصور کی دم! میں تم جیسے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ہائے، پچھی کی بددعا لگ گئی ہے مجھے......" میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"یہ پچھی کون ہے؟" حوالدار نے کڑک کر پوچھا۔

"میری پتنی ہے جی۔"

"ہمم......اب وہ تمہاری رہائی کی دعا کرے گی۔"

حوالدار کے طنز سے قطع نظر میرے ذہن میں یکا یک ایک جھماکا ہوا۔ دراصل میں پہلے ہی دو سال جیل کاٹ کر آیا تھا۔ اب میرے سامنے ایک لاش پڑی تھی۔ ایسی صورت میں کوئی بھی میری بات کا یقین نہیں کرسکتا تھا۔

یقینی طور پر میں بڑے خطرناک حالات میں گھر گیا تھا۔ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردینے کا مطلب خودکشی ہوسکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے بہ سرعت جھک کر پھاؤڑا اٹھایا اور حوالدار کے منہ پر دے مارا۔ حوالدار گھوم گیا، ساتھ ہی دوسرے وار کے طور پر پھاؤڑے کا ڈنڈا اس کے سر پر بھی بجانا ضروری سمجھا۔

حوالدار لڑکھڑایا اور اوندھے منہ لاش پر ڈھیر ہوگیا۔ لہٰذا میں نے پھاؤڑا پھینکا اور جھاڑیاں پھلانگتا، ریلوے لائن کی طرف بھاگ نکلا۔ دور کسی ٹرین کی سیٹی سنائی دی۔ اب میں لائن کے بیچ میں بھاگ رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے مجھے حوالدار کی دہاڑ سنائی دی۔ اس کم بخت بن مانس نے واقعی سنبھالا لینے میں مطلق دیر نہ لگائی تھی۔

تب ہی ایک گولی موت کی جھپک دیتی ہوئی میرے کان کے پاس سے نکل گئی۔ میں جلدی سے جھکا اور اپنی رفتار تیز کردی۔ ریل کی پٹریوں پر گھرگھراہٹ سنائی دینے لگی۔ میں لائن سے باہر آگیا۔

میں اب بے تکان بھاگ رہا تھا، لیکن اُدھر حوالدار بھی جیسے مجھے پکڑنے کا عہد کرچکا تھا۔ "دھائیں۔" ایک اور گولی سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئی۔

لائن پر انجن کی روشنی چمک اٹھی۔ ٹرین بڑی تیزی سے قریب آتی جارہی تھی، پھر عین وقت پر میں اُڑتا ہوا سا لائن کی دوسری جانب جا گرا۔ حوالدار دوسری طرف رہ گیا۔

یوں اب ہم دونوں کے درمیان ٹرین دھڑدھڑاتی، شور مچاتی گزر رہی تھی۔ گرنے کی وجہ سے میرے گھٹنوں میں شاید کنکر گھس گئے تھے، مگر زخم سہلانے کا یہ وقت کہاں تھا۔ بہرکیف...... میں اٹھا اور تیر کی طرح اونچی نیچی زمین پر پھلانگتا ہوا تاریکی میں گم ہوگیا۔

سرد ہوائیں میرے جسم میں کانٹوں کی طرح اتر رہی تھیں۔ کان کچھ زیادہ ہی یخ بستہ ہو رہے تھے۔ میں نے ٹوپی کانوں پر اتارنے کے لیے سر پر ہاتھ لگایا تو جیسے یکلخت میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ٹوپی میرے سر پر نہیں تھی۔

میں بُری طرح لرز اٹھا۔ بھاگتے ہوئے ٹوپی میرے سر سے گر گئی تھی اور یہ بے حد نقصان دہ بات تھی۔ ٹوپی کی مدد سے وہ میرا سراغ لگالیں گے۔ اس خیال سے میں لرز کر رہ گیا۔

اب ٹوپی کی تلاش میں جانا بھی تو ناممکن تھا۔ شاید حوالدار نے اپنی مدد کے لیے اور پولیس بلالی ہو۔ ممکن ہے فوٹوگرافر بھی پہنچ گئے ہوں، لوگ بھی اکٹھے ہوگئے ہوں اور جلد از جلد قاتل کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کررہے ہوں۔ پل کے پل ہی یہ سارے اندیشناک وسوسے میرے تھکے ہوئے ذہن میں ابھرے تھے۔

جب میں گاندھی اسٹریٹ پر پہنچا تو بارش شروع ہوگئی۔ سڑکوں پر ٹریفک کم سے کم ہوتا جارہا تھا۔ لوگ سکڑے ہوئے اپنے روشن اور گرم گھروں کی طرف لپکے جارہے تھے۔ میں ایک بند دروازے سے چپک کر کپکپاتا رہا۔

آج سے زیادہ مجھے پچھی کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یوں مجھے دکھ بھی ہو رہا تھا کہ میں نے پچھی سے بلاسبب لڑائی کیوں کی تھی۔ اس سے بھی زیادہ مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ میں گھر سے نکل آیا تھا اور پھر خواہ مخواہ ہی لائن کے ساتھ ساتھ چل دیا تھا۔ کیا قاتل بننے کے لیے......؟

اب مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا وہ جلدی کرنا تھا۔ پولیس کو پرانے قیدیوں کا ریکارڈ چیک کرنے میں بھلا کتنی دیر لگ سکتی تھی، ٹوپی پر کڑھے ہوئے حروف سے وہ فوراً ہی میرا پتا چلا لیں گے۔

ب۔ن، نام کے لوگ ہی کتنے ہوں گے؟ میں اس بات کا بہ خوبی ادراک کرسکتا تھا کہ اس نام کا میں اکیلا ہی قیدی تھا۔ وہ میرے بارے میں ترنت ہی جان جائیں گے اور پھر بڑی شدومد کے ساتھ میری ڈھنڈیا پڑ جائی تھی۔ میں آخر ان کی نظروں سے کب تک بچ سکتا تھا؟

میں اس وقت ناگ پاڑا میں آگیا۔ میرا گھر اس علاقے میں تھا۔ ایک چھوٹا سا بے رنگ وروغن، خستہ حال فلیٹ مگر اس میں پچھی تھی جس کی وجہ سے یہ میرے لیے دنیا کی حسین ترین جگہ تھی۔ مجھے پچھی سے بڑی محبت تھی۔ امید تو تھی کہ وہ بے چاری میرا انتظار کررہی ہوگی اور چائے کی کیتلی چولھے پر چڑھا رکھی ہوگی۔

"سالی پچھی بڑی ذہین عورت ہے۔" میں نے سوچا۔

”وہ ضرور مجھے اس جنجال سے نکال لے گی۔ وہ جانتی ہوگی کہ ایسے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

میں بیک وقت دو دو زینے پھلانگتا ہوا تیسری منزل پر آگیا۔ اس منزل کا دوسرا فلیٹ میرا ہی تھا۔

میں نے قفل میں چابی گھمائی، ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ فلیٹ میں تاریکی کا راج تھا، اچانک ہی اندر ایک اسرار بھری سی خاموشی محسوس کر کے مجھے گڑبڑ کا احساس ہونے لگا……

میں نے لائٹ جلائی اور چاروں طرف دیکھا۔ تکیے پر ایک پرچہ رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرے حلق سے ایک سرد سی ہمکاری خارج ہوگئی، کیونکہ میں اسے بغیر پڑھے ہی جان گیا کہ اس میں کیا لکھا ہوگا۔

ایک بار پھر پچھی مجھ سے روٹھ کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی تھی۔ وہ اس چھوٹے دو کمروں والے فلیٹ سے جس کی کوئی چیز سلامت نہیں تھی، تنگ بھی تو آچکی تھی، یوں میں بھی تو اس کی روز روز کی بک بک سے اکتا گیا تھا۔

پچھی کو بڑا مکان اور نیا فرنیچر چاہیے تھا، اچھے اچھے کپڑے درکار تھے، آخر میں یہ سب کہاں سے لاتا؟ اس کی انہی فرمائشوں سے تنگ آکر ہی تو میں نے زندگی میں پہلی بار چوری کی تھی اور پکڑا گیا تھا۔ چوری کے الزام میں نہ صرف مجھے جیل جانا پڑا تھا بلکہ اپنی بینک ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

اب میں ایک سُپر اسٹور پر ملازم تھا اور نہایت ایمان داری اور محنت سے کام کر رہا تھا۔ جو کچھ ملتا، وہ پچھی کے ہاتھ پر لاکر رکھ دیتا مگر وہ اتنا کب ہوتا کہ پچھی کی خواہشات پوری کر سکتا۔ وہ مجھے شام کی بھی ملازمت کرنے کا کہہ رہی تھی اور میں برابر کوشاں بھی تھا مگر اب فوری طور پر دوسری اچھی نوکری کہاں ملتی ہے؟ اور پچھی تھی کہ برابر شکوے کرتی رہتی لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ مجھ سے محبت بھی بہت کرتی تھی۔

اس سے پچھلی رات جھگڑا ہمارے درمیان نئے فون سیٹ پر ہوا تھا، کہتی تھی۔ ”بھولے! مجھے وہ ٹچ سسٹم والا موبائل لے دے۔“ میں نے چڑ کر کہا۔

”یہ عام سیٹ تو تجھے ابھی تک استعمال کرنا… نہ آیا، فون اٹینڈ کرتی ہے تو کٹ جاتی ہے کال، کبھی چارج کرنا بھول جاتی ہے، فون کرو تو آف ملتا ہے۔“ اس پر وہ بھنا گئی تھی۔ میرا بھی دماغ اڑ گیا تھا۔ سنا دی تھی میں نے بھی کھری کھری۔ کیا تھا، لے ہی دیتا سالی کو، دوستوں سے ادھار شدھار لے کر۔

بہرکیف…… جانتا تھا کہ پچھی کو واپس گھر لانا مشکل نہ تھا۔ میں اسے منٹوں میں منا سکتا تھا۔

”اسے وہیں رہنے دو۔“ میں خود سے بولا۔ ”تم نے اسے خاصے دکھ دیے ہیں۔ اب چند روز اسے آرام سے اپنی ماں کے ہاں رہ لینے دو۔“ یہ میرے اندر کوئی بولا تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی۔

اچانک میرے دل میں ایک خیال ابھرا، کیوں نا فون کرلوں۔ پر فون تو میں نے آف کر رکھا ہے۔ میں نے جلدی سے اسے آن کر دیا مگر افسوس پچھی کا نمبر نہ لگا، اکثر اس کی پچھی سے اس بات پر بھی لڑائی ہوتی تھی، وہ فون نہیں اٹھاتی تھی، کبھی کہتی، چارجر پر لگا ہے، اور کبھی آف جا رہا ہوتا، وہ بے پروا تھی فون کے سلسلے میں۔ سچی بات یہ تھی کہ خود میرے فون کی بیٹری بھی ”ڈسچارج“ ہونے والی تھی۔ دو ایک نقطے ہی رہ گئے تھے۔

بہرکیف میں اپنی چھوٹی سی خواب گاہ میں ٹہلتا رہا مگر سچی بات تھی کہ میں زیادہ دیر تک یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ پولیس آنے ہی والی ہوگی لیکن پچھی کو دیکھنے کے لیے میرا دل بری طرح تڑپ رہا تھا۔ میں اسے بانہوں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ اسے اپنے سینے سے لگا لینا چاہتا تھا، اسے کہنا چاہتا تھا۔

”ری پچھی! میں نے اُس آدمی کو قتل نہیں کیا ہے۔ اس کا سر غائب ہے۔ او پچھی! کیا بتاؤں، بڑی خوف ناک لاش تھی وہ…… لیکن تمہیں مجھ پر وشواس ہے نا۔ تم جانتی ہو نا کہ میں ایک اچھا آدمی ہوں۔ میں کسی کو قتل کر ہی نہیں سکتا۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا ہے۔ ہے نا پچھی؟ جواب میں وہ مجھے دلاسا دے گی۔ بڑے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے گی لیکن پولیس والے اِن باتوں کا کیا جواب دیں گے؟ کیا وہ بھی پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں گے؟

بہرحال…… پچھی چاہے مجھے کچھ بھی سمجھے، پولیس کی نظروں میں اب بہرحال میں ایک مفرور قاتل تھا۔ میں نے بتی بند کی اور نیچے آگیا۔ بارش رک گئی تھی مگر سردی اس قدر تھی کہ میں اپنے پتلے سے کوٹ میں کانپنے لگا۔ میں خود کو تنہا اور بے آسرا محسوس کر رہا تھا۔

میرے پاس جانے کے لیے نہ کوئی جگہ تھی نہ ملنے کے لیے کوئی آدمی۔ جو دوست تھے، وہ سب موقع پرست اور میرا مذاق اُڑانے والے۔ اچھے وقت میں وہ میرے ساتھ ضرور ہنستے کھیلتے، مگر آڑے وقت میں مجھ سے کنی کترا جاتے بلکہ مزید پریشان کرتے۔

میں نے تو بس نشے کی پینک میں اُن کی تعریف کر دی تھی، یا پھر پچھی کو جلانے کے لیے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اب بھی صرف پچھی میری ایک واحد دوست تھی جو مجھے دلاسا دیتی۔

اب لے دے کے اس پوری دنیا میں ایک بیوی تھی سو وہ بھی روٹھ کر اپنی ماں کے گھر جا بیٹھی تھی۔ میں فٹ پاتھ پر رک گیا۔ چلتے رہنے سے کیا فائدہ؟ اب ایک دو گھنٹے کی بات تھی پھر ساری پولیس پورے شہر میں میری تلاش میں سرگرداں ہو جائے گی۔ کتنے ہی پولیس والے ایسے ہوں گے جو میرے جسم میں چھٹانک بھر گرم گرم سیسہ اتارنے کو بے چین ہوں گے، شاید مجھے زندہ یا مردہ لانے والے کو انعام دینے کا اعلان بھی کر دیا جائے، کوئی بعید تو نہ تھا۔

میں نے سگریٹ جلانے کی کوشش چاہی مگر ہوا کا جھونکا اس آخری تیلی کو بھی بجھا گیا۔ میں نے سگریٹ کیلی فٹ پاتھ پر پھینکا اور جوتے سے رگڑ دیا۔ اگر کسی طرح میں اس شہر سے نکل جاؤں تو شاید میری جان بچ جائے مگر کیسے نکلوں؟ اور کہاں؟ اب تو شاید پولیس نے شہر سے جانے والی ٹرینوں اور لاریوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے ہوں۔ یہ بھی بعید نہ تھا کہ شہر کی تمام پولیس کو خبردار کر دیا گیا ہو، شاید وہ پچھی کے پاس بھی پہنچ گئے ہوں اور اس سے پوچھ گچھ کر رہے ہوں۔ اب تک شاید اس قتل کی خبر کو اخباری نمائندے بھی لے اُڑے ہوں۔ آخر میں چوہے بلی کا کھیل کب تک جاری رکھ سکتا تھا؟

میں نے سوچا کہ خود ہی ہیڈ کوارٹر چلا جاؤں، تھانے چلا جاؤں اور...... ساری بات سچ سچ کہہ ڈالوں مگر میرا یقین کون کرے گا؟ پولیس والے بڑے پیار سے میری زبانی یہ کہانی سنیں گے پھر قہقہوں میں اُڑا دیں گے۔ ان میں چند ایک سگریٹ سلگا کر دھواں اُگلنے لگیں گے اور کچھ منجھے ہوئے جاسوس نظر آنے کی کوشش میں مجھے غور غور سے گھوریں گے۔ پھر وہ کہیں گے۔ ”جانے دو میاں! تم بھی کیا داستان لے بیٹھے، کیوں اپنی اور ہماری رات برباد کر رہے ہو۔ آؤ اقرار نامہ لکھ دو۔ تاکہ ہم اپنے اپنے گھر جائیں اور تم...... تمہارے لیے سرکاری مہمان خانہ حاضر ہے۔“

میں بڑی شدت سے سگریٹ کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پان کی ایک دکان کھلی ہوئی تھی۔ اس کے برابر ہی ایک جنرل اسٹور تھا۔ پان کی دکان پر جا کر میں نے سو کا نوٹ دیا اور ایک سستے سے برانڈ کا سگریٹ اور ایک ماچس خرید لیا۔ ریزگاری جیب میں رکھ کر سگریٹ جلایا اور آگے بڑھ گیا۔

اسٹور پر کوئی گاہک نہیں تھا۔ اس کا مالک ہیٹر سامنے رکھے ہاتھ تاپ رہا تھا۔ میری نظر اسٹور کے کونے میں رکھے ٹیلی فون پر پڑی۔ اس کے اوپر ایک کارڈ بورڈ پر سرخ حروف میں پی سی او لکھا ہوا تھا، میں نے سوچا اپنا سیل فون استعمال کرنا بے وقوفی ہوگی، کیوں نا پی سی او کے فون کو آزمایا جائے اور پولیس کو نیلی کار والے کے بارے میں جو انسانی لاش کو کتے کی لاش بتا گیا تھا، اس کا اعتبار کر لیں اور اگر نہیں مانیں گے تو کیا فرق پڑے گا؟ میں ریسیور لٹکا کر چل دوں گا۔

لہٰذا میں نے اسٹور والے سے فون کرنے کا کہا۔ اس نے لکڑی کے کیبن کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں اندر گھس گیا۔ ریسیور اٹھا کر تھانے کے نمبر ڈائل کیے۔

”ہیلو انسپکٹر رتن کمار!“ دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”وہ، انسپکٹر صاحب! میں...... میں بھولا ناتھ بول رہا ہوں۔“ میں نے دبے لہجے میں کہا پھر چوبی کیبن کے شیشے کے پار اسٹور والے کی طرف دیکھا مگر وہ ہاتھ تاپنے میں مگن تھا۔ ”میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔“

”اوہ، بھولا ناتھ......“ دوسری جانب سے انسپکٹر رتن کمار نے نرمی سے کہا۔ ”ہمیں خوشی ہے کہ تم نے ہمیں فون کیا۔ ذرا ایک منٹ ہولڈ کرنا۔“

”ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب!“ میں نے دل میں کہا۔ ”لگ جاؤ دھندے سے۔ کر لو معلوم کہ میں کہاں سے فون کر رہا ہوں۔“

”ہاں، اب بتاؤ۔“ اس نے رتن کمار کی آواز سنی۔ ”تم کیا کہہ رہے تھے بھولا ناتھ؟“

”جی، وہ میں اُس قتل کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ دراصل مجھے پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں قاتل نہیں ہوں۔“

”بالکل، بالکل، کہتے رہو۔ میں توجہ سے سن رہا ہوں۔“

”میرا وشواش کریں جناب! میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”یقیناً بھولا ناتھ! کہتے رہو، میں سن رہا ہوں۔“

”ہاں، وہ یہی کہہ رہا ہے کہتے رہو، اور چند منٹوں میں سارا علاقہ پولیس سے بھر جائے گا۔“ میں نے ریسیور رکھا اور اسٹور سے باہر آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے سکتہ ہو گیا۔ میری نظریں پولیس کار پر گڑی ہوئی تھیں جو ابھی ایک بلاک دور

تھی۔ بڑے چالاک تھے یہ پولیس والے، انہوں نے کار کا سائرن بند کر رکھا تھا۔

میں اُچھلا اور کار کی مخالف سمت دوڑ کر ایک تاریک گلی میں گھس گیا۔ اس طرف دور تک بنگلے بنے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پھلانگ کر میں اندر کودا اور دوڑتا ہوا گیراج کی دیوار سے چپک گیا۔

چند لمحوں تک میں صرف اپنے دل کی دھڑکن سنتا رہا جو کسی ڈرم کی طرح میری پسلیوں میں بج رہا تھا۔ سڑک پر ایک کار رکی پھر گیلی سڑک پر بھاری قدموں کی آوازیں گونج اٹھیں۔ وہ اس علاقے کو گھیر رہے تھے۔ اگر میں یہیں چپکا کھڑا رہا تو دھر لیا جاؤں گا پھر کیا کروں؟ میں نے تیزی سے سوچا اور بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر جھکا جھکا بنگلے کی عقبی سمت بڑھا۔ ذرا ہی دیر بعد ایک تنگ سی سڑک پر تھا میں......

اچانک سڑک کے کنارے..... کچرے کا ایک ڈرم رکھا نظر آیا۔ میں تیزی سے اس کے پاس پہنچا اور ڈھکن اٹھا کر اس میں اتر گیا۔ ڈرم آدھا بھرا ہوا تھا۔ میں نے ڈھکن پکڑا اور اندر بیٹھ کر اسے ڈرم کے منہ پر رکھ دیا۔

تعفن کے مارے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ پیروں پر جانے کیسے کیسے حشرات رینگنے لگے تھے اگر کوئی چوہا ہوا تو؟ میں نے تھوک نگلا اور لرز کر رہ گیا۔ چوہے نے ڈر کر کاٹ لیا تو پھر ٹانگ کا اللہ ہی مالک ہے۔ کچھ دیر تک ڈرم کے چاروں طرف پولیس والوں کے بھاری بوٹوں کی آوازیں گونجتی رہیں، اس کے بعد اسرار بھرا سناٹا پھیل گیا۔

ڈرم سے باہر نکلا تو میرے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ میں انہیں سہلاتا جھٹکاتا ہوا چلتا رہا۔ ایک بلاک دور چوراہا تھا۔ میں نے پولیس کار کو گزرتے دیکھا اور جلدی سے ایک دروازے سے لگ گیا۔ وہ شکاری کتوں کی طرح میری تلاش میں تھے اور میں رات کا مارا پنچھی خوف زدہ ہرن کی طرح چھپتا پھر رہا تھا مگر کب تک؟

یوں میں سڑک کے کنارے تاریکی میں چلتا رہا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ پچھی کی پھر یاد آ گئی۔ کاش! ہمیشہ کی طرح آج بھی میں نے پچھی کی بڑبڑاہٹ سن لی ہوتی، اسے ڈانٹا نہ ہوتا، پھر جب وہ رونے لگی تھی تو گھر سے باہر آنے کے بجائے اسے منالیتا۔ اس کا قصور بھی کیا تھا؟ بس وہ دوسرے لوگوں کی طرح اچھے مکان میں رہنا چاہتی تھی، اچھا کھانا، پہننا چاہتی تھی، اگر وہ اپنے شوہر سے نہ کہتی تو اور کس سے کہتی؟ لیکن...... میں پچھی کو کیسے بتاتا کہ میں نے بے ایمانی سے اور حرام کمانے سے توبہ کر لی تھی۔ میں تو بس اب حق حلال کی، اپنی محنت کی کمائی کھانا چاہتا تھا۔ دنیا چاہے کچھ بھی کرے۔ مجھے غرض نہیں تھی مگر پچھی عورت، دنیا کی دیکھا دیکھی کرتی تھی۔

میں پھر چلنے لگا۔ میرا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور سرد ہوائیں میری حالت تباہ کیے دے رہی تھیں۔ میں ایک دوسری سڑک پر آ گیا۔ یہاں ایک پانچ منزلہ عمارت زیرِ تعمیر تھی۔

یہ رہائشی فلیٹس تھے اور ان میں دروازے کھڑکیاں نہیں لگے تھے۔ عمارت کے برآمدے میں چوکیدار چارپائی پر لیٹا خراٹے نشر کر رہا تھا۔ میں دبے قدموں اندر گھسا اور ایک کمرے کے کونے میں دبک گیا۔ پھر نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ جب آنکھ کھلی تو باہر دھوپ چمک رہی تھی اور کہیں سے ریڈیو بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس وقت ایک بجے کی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنی دیر تک کیسے سوتا رہا؟ کیا آج عمارت میں کام نہیں ہو رہا؟ پھر مجھے یاد آیا کہ آج تو اتوار کا دن تھا اور مزدور چھٹی پر تھے۔ میں نے جھانک کر باہر دیکھا۔ چوکیدار کہیں گیا ہوا تھا۔ میں سڑک پر آ گیا۔

باہر بڑی گہما گہمی تھی۔ ٹریفک کا شور اور لوگوں کی چہل پہل دیکھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی اور پیٹ میں درد ہونے لگا تھا، تب ہی مجھے یاد آیا کہ میں نے تو رات سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گھس گیا۔

خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور دو پیالی چائے پی کر کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔ اسی وقت ایک پولیس والا اندر آ گیا۔ میں یک دم منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پولیس والے نے میز پر بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا اور اُس قاتل کی باتیں کرنے لگا جو بے سر کی لاش...... چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور پولیس اب اسے سارے شہر میں تلاشتی پھر رہی تھی۔

”تیس روپے۔“ بیرے نے آواز لگائی اور میرے قریب آن کھڑا ہوا۔

”تیس روپے؟“

”جی صاحب! چائے دودھ پتی تھی۔“

”اوہ اچھا۔“ کہتے ہوئے میں نے تیس روپے نکال کر میز پر رکھ دیے اور جلدی سے ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ باہر آ کر میں نے گہری سانس لی اور ایک طرف چل پڑا۔ اچانک ایک موڑ سے دو پولیس والے نکل کر میری طرف آنے لگے۔

میں نے دیوار کی طرف منہ کر لیا اور وہاں لگا پوسٹر

پڑھنے لگا۔ پولیس والے باتیں کرتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے۔

”شکر ہے یہ بلا تو ٹلی۔“ میں بڑبڑایا اور پھر پوسٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ شہر میں پڑوسی ملک کی موسیقی کا ایک طائفہ آیا ہوا تھا۔ یہ ایک پاکستانی طائفہ تھا جو بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا اور حال ہی میں ہانگ کانگ اور سنگاپور کا دورہ کر کے آیا تھا۔ شہر میں اس کا پروگرام ایک ہفتے کا تھا پھر وہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک جانے والا تھا۔ وہ ویندرا آڈیٹوریم میں شو کر رہے تھے۔ نیچے ٹکٹوں کی قیمت لکھی ہوئی تھی۔ اشتہار کے چاروں طرف آلاتِ موسیقی کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

میری نظریں وائلن پر جا کر ٹھہر گئیں۔ میرا دل بھی بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اچانک میری یادداشت میں ایک زلزلہ سا آیا۔ میں نے شبِ گزشتہ میں اس نیلی کار والے آدمی کی سیٹ پر بھی ایک وائلن پڑا دیکھا تھا، تو کیا وہ آدمی......! میں سوچتا رہا۔

پولیس والے ہوٹل سے نکل رہے تھے۔ میں آگے بڑھ گیا مگر ذہن اُلجھ رہا تھا۔ کہیں وہ آدمی اس طائفے کا ہی رکن تو نہیں ہے؟ میں اب مسلسل سوچ رہا تھا پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں رات کو شو ضرور دیکھوں گا۔ شاید قسمت یاوری کر جائے اور میں قاتل کو شناخت کر لوں۔

مگر شو میں جانے کے لیے مجھے ڈھنگ کے لباس کی ضرورت تھی۔ میرے اپنے کپڑے تو اس قابل نہیں رہے تھے کہ کسی ایسی محفل میں جا سکتا۔ میں چوراہے پر آ گیا۔ ایک پولیس کار غراتی ہوئی میرے سامنے سے نکل گئی۔

”پولیس بڑی سرگرمی سے اس رات والے قاتل کی تلاش میں ہے۔“ دفعتاً ہی ایک ہاکر کی آواز آئی جو شام کا اخبار لہراتا ہوا ہانک لگا رہا تھا اور پھر وہ میرے قریب چیختا چلاتا گزر گیا۔ میں تو اچھل ہی پڑا تھا۔ اسی وقت سڑک کے پار کھڑا ہوا ایک پولیس مین چلایا اور میری جانب لپکا۔ خطرہ بھانپ کر میں بھاگا اور ایک بڑے اسٹور کے ہجوم میں جا گھسا اور گاہکوں کو دھکیلتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

سڑک کے دوسری طرف موہنی پلازا کی دس منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ میں عمارت کے ہال میں آ گیا اور اسی وقت ایک لفٹ آ کر رکی۔ اس کا دروازہ کھلا۔ یوں میں بھی دوسرے آدمیوں کے ساتھ لفٹ میں گھس گیا۔ لفٹ اوپر کی طرف چل پڑی۔ میں چوتھی منزل پر اتر گیا پھر عمارت کے آخری کنارے پر بنی سیڑھیوں سے اتر کر باہر آ گیا۔

سڑک پر سے ایک پولیس کار دوڑتی ہوئی دور نکل گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے پورے شہر میں میری ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی۔ میں گردن جھکائے چلتا رہا اور آخر ایک باربر شاپ میں آ گیا۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر پولیس کے ہاتھوں سے بچ گیا تو موسیقی کے شو میں ضرور جاؤں گا۔ میں بہرصورت...... قاتل کو پکڑنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ شیو بنوا کر باہر نکلا تو میری جیب میں ابھی کافی روپے تھے لہٰذا میں نے طوعاً و کرہاً ہی سہی اس ”رات والے“ قاتل کا دل ہی دل میں شکریہ بھی ادا کیا اگر اس نے ہزار کا نوٹ نہ دیا ہوتا تو نجانے میرا کیا حال ہوتا۔

اب مجھے لباس خریدنا تھا۔ شو میں جانے کے لیے مناسب حلیے میں ہونا ضروری تھا۔ ماحول پر شام کا دھندلکا اترتا جا رہا تھا۔ شیو کے ساتھ ساتھ میں نے بال بھی سنوار لیے تھے اور صورت خاصی بدل گئی تھی۔ میں لوگوں کے بیچ میں سے تیزی سے گزرتا رہا۔

میرا رخ لنڈا بازار کی طرف تھا۔ اس کی اگلی گلی میں تیندو پتوں کا ایک بازار تھا...... جو صبح چھ بجے کھلتا اور سرِ شام ہی بند ہو جاتا تھا۔ یہاں سناٹا تھا۔ میں نے ایک جگہ لباس بدلا اور پرانے کپڑے وہیں کہیں پھینک کر آگے چل دیا۔

اب میرا رخ خراماں خراماں ویندرا آڈیٹوریم کی طرف تھا۔ وہاں پہنچ کر میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے قطار میں جا کھڑا ہوا۔ اپنی باری آنے پر میں نے ٹکٹ خریدا اور اندر چلا گیا۔

پورا ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں لوگوں کی صورتیں دیکھتا ہوا ایک خالی سیٹ پر جا بیٹھا۔ سوچا نجانے وہ (قاتل) یہاں ہوگا بھی کہ نہیں مگر قسمت آزمانے میں کیا حرج تھا۔

یوں بھی میں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ پولیس میری تلاش میں باؤلی ہو رہی تھی اور اس کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ خود کو محفوظ سمجھ سکتا۔

ہال کی روشنی گُل ہو گئی۔ اسٹیج کے پردے دونوں جانب کھسکنے لگے۔ ہال میں سناٹا پھیل گیا۔ اسٹیج پر ایک ترتیب سے سارے موسیقار اپنے اپنے ساز سنبھالے ہوئے تھے، پھر وائلن بجانے والوں کی قطار میں مجھے اپنا مطلوبہ آدمی نظر آ ہی گیا......

وہی چپٹا سا چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ اور آنکھوں پر چشمہ۔ وہ اس قطار کا پہلا آدمی تھا۔ میرا دل بے اختیار زور زور سے دھڑدھڑانے لگا۔ جی چاہا کہ اسی وقت دوڑ کر اسٹیج پر

چڑھ جاؤں اور اس بدمعاش کو ٹائی سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا تھانے لے جاؤں، لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا، کسی بھی قسم کی عجلت آمیزی کام بگاڑ سکتی تھی۔

آرکسٹرا شروع ہو گیا پھر نہ جانے کون کون فن کار آتے رہے اور اپنی آواز کا نغماتی جادو جگاتے رہے۔ میرے ذہن میں بس ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا، کسی طرح اس آدمی کے بارے میں معلومات حاصل کرلوں اور اسے پولیس کے حوالے کردوں۔

وقفہ ہوا تو میں اٹھ کر آڈیٹوریم سے باہر آ گیا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس چھوٹے سے دروازے پر پہنچ گیا جو اسٹیج پر جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

دروازے پر ایک مجہول اور چھچی سا آدمی کھڑا تھا۔ میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگایا۔

''کیا حال ہیں دوست؟'' میں نے آدمی سے کہا۔

''آج بہت سردی ہے۔ لو سگریٹ پیو۔''

آدمی نے شکر گزار نظروں سے میری طرف دیکھا پھر پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ میں نے لائٹر سے اس کا سگریٹ سلگا دیا۔

''مجھے تم سے دو ایک باتیں پوچھنی ہیں۔ بدلے میں یہ رکھ لو تم......'' کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے دو سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''یہ وائلن والوں کی قطار میں پہلا آدمی جس نے چشمہ لگا رکھا ہے کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

آدمی سوچ میں پڑ گیا، یوں جیسے کچھ یاد کرنے لگا ہو پھر چونک کر بولا۔ ''اوہ...... آپ کا اشارہ شاید ساوک پال کی طرف ہے جناب!''

''ہاں، شاید یہی نام ہو اُس کا......''

''ارے جناب! اسے وائلن بجانا کہاں آتا ہے۔ وہ تو محض اس لیے پہلی سیٹ پر بیٹھا ہے کہ پیارے صاحب نہیں ہیں، بلاشبہ پیارے صاحب وائلن کے استاد ہیں۔''

''یہ پیارے صاحب کہاں گئے دوست؟'' میں نے اسی اخلاق اور ملائمت آمیزی سے دریافت کیا۔

''خدا جانے صاحب کہاں گئے؟ وہ اس طائفے کے دن نمبر وائلن نواز تھے۔ ان کا اپنی پتنی سے جھگڑا ہو گیا تھا، وہ طلاق مانگ رہی تھی پھر پیارے صاحب اچانک غائب ہو گئے۔''

''کہاں غائب ہو گئے؟''

''کسی کو علم نہیں جناب! اسی کارن منیجر نے اُن کی جگہ ساوک پال کو بٹھا رکھا ہے۔ وہ بس یونہی وائلن بجا لیتے ہیں۔ جبکہ پیارے صاحب کو تو غائب ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے اور وہ اپنی تنخواہ تک لینے نہیں آئے۔''

یہ سب سن کر میرے ذہن رسا میں ایک جھماکا ہوا۔ واقعات کی کڑیاں مل رہی تھیں۔ پیارے صاحب نے ملازمت سے کچھ زیادہ ہی کھو دیا تھا۔ شاید اپنی جان بھی...... یوں وہ کُتّا جو بوری میں بند تھا، وہ یقیناً انہی کی لاش تھی۔ دربان کا شکریہ ادا کر کے میں پارکنگ کی طرف آ گیا۔

نیلے رنگ کی وہ کار بھی مجھے کھڑی نظر آ گئی۔ میں نے دروازوں اور ڈگی پر زور آزمائی کی مگر سب مقفل تھے۔ اب انتظار کرنے کے علاوہ میں کیا کر سکتا تھا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ اس بدمعاش کے دیے ہوئے ہزار کے نوٹ میں سے فقط اب..... دو سو روپے ہی باقی بچے تھے۔

میں دوبارہ ہال میں آ گیا جہاں شو شروع ہو چکا تھا مگر میرا دماغ اس واردات کے تانے بانے جوڑنے میں مصروف تھا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ ساوک پال قاتل تھا اور شاید پیارے صاحب مقتول...... لیکن اس قتل کی وجہ کیا تھی؟ موسیقار پیشہ ورانہ رقابت کی وجہ سے ایک دوسرے کو اس بے دردی سے قتل تو نہیں کر دیتے۔ بات کچھ اور بھی ہو سکتی تھی اور بلکہ بہت ہی گہری بات تھی...... پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ اتنا واضح یا آسان ہونے والا نہیں جتنا کہ نظر آ رہا تھا مجھے......

گیارہ بجے شو ختم ہوا۔ میں جلدی سے ساوک پال کی کار کے قریب آ کر چھپ گیا۔ ساوک پال آیا اور دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھ گیا۔ میں کار اسٹارٹ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کار چل پڑی تو میں دوڑ کر اس کے پچھلے بمپر پر بیٹھ گیا۔

مجھے ڈر تھا کسی پولیس والے یا راہ گیر کی نظر نہ پڑ جائے، ورنہ وہ شور مچا سکتے تھے، پولیس تو کار کے پیچھے بھی لگ سکتی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو کار کے بمپر سے اکڑوں ہو کے چپکا رکھا تھا۔ شکر تھا کہ سڑک ہموار تھی، ورنہ دو چار جھٹکوں میں ہی نیچے ہوتا میں......

سردی کی وجہ سے سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ یہ بڑا لمبا سفر ثابت ہوا۔ میری انگلیاں تو برف کی طرح جم گئی تھیں۔ جوڑ جوڑ تک دکھنے لگا تھا اور پورے جسم پر ایک شدید

تناؤ کی سی کیفیت طاری تھی۔

بالآخر کار ایک پھاٹک میں مڑی اور ایک بنگلے کے سامنے ٹھہر گئی۔ میں جلدی سے اتر کر کار کے پیچھے دبک گیا۔ ساوک پال کار سے نکل کر تیز قدموں سے تاریک مکان کی طرف بڑھا۔

اس کے اندر جانے کے بعد میں بھی دبے قدموں مکان کی طرف بڑھا۔ زمین کے ساتھ ہی ایک کھڑکی کھلی ہوئی نظر آئی جو شاید تہ خانے کی تھی۔ میں کھڑکی کے ذریعے اندر اتر گیا، پھر دیوار ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ یوں میرا ہاتھ سوئچ بورڈ پر پڑا۔ میں نے بٹن دبا دیا اور تہ خانے میں روشنی پھیل گئی۔

دیوار کے سامنے دو میزیں رکھی ہوئی تھیں اور وسط میں ایک بڑی سی بھٹی تھی۔ ایک میز پر پرانے اخباروں کا ڈھیر تھا اور دوسری میز پر سرخ دھبے چمک رہے تھے۔ یہ شاید سرخ خون کے دھبے تھے یا پھر پیارے صاحب کے خون کے نشانات تھے۔ مجھے اسی شہادت کی ضرورت تھی۔

لہٰذا میں نے اپنی گردن سے پھانسی کا پھندا اتر کر ساوک پال کی گردن میں پڑتا محسوس کیا اور ساتھ ہی میرا تناؤ بھی کسی حد تک کم ہو گیا۔

ایک دو گھنٹوں کے اندر اندر میز پر پڑے ہوئے سرخ دھبوں کو بے سر کی لاش کے خون کے ساتھ چیک کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ خون کے یہ دھبے نیلی کار کی ڈگی میں بھی مل سکتے تھے لیکن یہ سارا کام پولیس اسپتال کی لیبارٹری میں ہی ہو سکتا تھا۔

اچانک ہی مجھے پولیس والے بہت اچھے لگنے لگے تھے۔ میں میزوں کے اوپر لگی الماریوں کو دیکھنے لگا۔ ایک الماری کے اوپر شیشے کی بڑی سی بوتل رکھی ہوئی تھی جس پر چپکی ہوئی کاغذ کی چٹ پر ''امونیا'' لکھا ہوا تھا۔ اسی سمے میں نے تہ خانے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔

''اچھی طرح تلاشی لے لی تم نے چوہے؟'' دفعتاً ہی میں نے ایک مانوس سی آواز سنی۔ میں تیزی سے مڑا۔ تہ خانے کے اوپری زینے پر ساوک پال کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوف ناک سیاہ پستول دبا ہوا تھا۔ اس کا رخ میری جانب تھا۔

''میرا نام چوہا نہیں بھولا ناتھ ہے خونی قاتل......!'' میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ''میں نے اتنا کچھ دیکھ لیا ہے کہ تمہیں آسانی سے پھانسی کے پھندے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔''

ساوک پال بڑی احتیاط سے ایک ایک زینہ اترنے لگا اور بولتا رہا۔ ''لیکن...... کتنے کی دکھ کی بات ہے بھولا ناتھ! کہ تم سب کچھ دیکھ لینے کے باوجود بھی کچھ نہیں کر سکو گے۔'' کہتے ہوئے پال کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ ''میں تو تمہیں ایک سیدھا سادہ آدمی سمجھتا تھا لیکن تم میری توقع سے بھی زیادہ ہوشیار نکلے مگر افسوس، تمہاری یہ ہوشیاری ذرا کام نہ آئی بلکہ الٹا اس نے تمہیں موت کے منہ میں دھکیل دیا۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے ہو بھولا ناتھ! تم اتنے بھولے نہیں ہو۔ ظاہر ہے کہ اب تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔'' وہ آخری قدمچہ اتر کر فرش پر آ گیا۔

''تم پولیس کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکو گے ساوک پال!''

''ہر مرنے والا یہی کہتا ہے۔ پولیس مجھ تک کبھی نہیں پہنچ سکے گی۔ میں تمہارا نشان تک نہیں چھوڑوں گا۔''

''کیا پیارے صاحب نے بھی ذبح ہونے سے پہلے یہی بات کہی تھی؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''اتنے سخت الفاظ استعمال مت کرو بھولا ناتھ۔ میں نے تو بڑے پیار سے اس کی گردن اتاری تھی تاکہ اگر لاش مل بھی جائے تو شناخت نہ ہو سکے۔'' ساوک پال اطمینان بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''پیارے صاحب ایک انتہائی احمق انسان تھا بھولا ناتھ! اور احمقوں کو اس دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

ایک بے رحم اور خونی قاتل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خبیث مجھے ایک خطرناک نفسیاتی مریض بھی لگا۔

''تو کیا تم نے اسے محض اس وجہ سے قتل کر دیا کہ وہ تم سے اچھا وائلن بجاتا تھا؟''

''نہیں بھولا ناتھ! تم بالکل غلط سمجھے ہو۔ تمہیں علم ہے کہ اس کی بیوی طلاق کا مطالبہ کر رہی تھی۔ وہ خاصا مال دار آدمی تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی پتنی اس کی ساری دولت چھین لے گی اور......''

''اور...... اس نے اپنی ساری دولت وغیرہ تمہارے نام کر دی۔'' میں نے اپنی دانست میں اس کا جملہ پورا کر دیا۔

''یہ کہی ہے تم نے ذہانت کی بات۔ قانونی طور پر میں اس کی ساری دولت اور جائداد کا مالک تھا اور طلاق کے بعد مجھے یہ سب کچھ اسے واپس کرنا تھا۔''

"اور تم نے دولت واپس کرنے کے بجائے اس کی گردن اتار لی تاکہ یہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے تمہارا ہو جائے۔"

"بالکل ٹھیک۔" ساوک پال تائید میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

"بات ہضم نہیں ہوئی، کیا پیارے صاحب اتنا ہی بودا انسان تھا کہ تم پر اس نے اتنا بڑا بھروسا کرلیا؟"

"اسے بودا کرنے میں ہمیں تھوڑی محنت کرنا پڑی تھی۔"

"ہمیں؟ تو اس کا مطلب ہے کہ اس قتل میں کوئی اور بھی تمہارا شریک کار ہے؟"

"ہاں۔"

"کون؟"

"پاروتی۔"

"یہ کون ہے؟"

"اب چونکہ تم بھی مرنے ہی والے ہو تو ساری جیون کتھا سن ہی لو۔ پاروتی، پیارے صاحب کی حسین وجمیل بیوی ہے۔ کم عمر مگر بلا کی چالاک...... میں اس پر مرمٹا تھا اور وہ پیارے صاحب کی دولت پر۔ بعد میں مجھ پر بھی مرنے لگی۔ میں ریاض کرنے ان کے بنگلے پر بھی جاتا تھا۔ وہ اسے پسند نہیں تھا، کچھ پیارے صاحب بھی ذرا رنگین مزاج واقع ہوئے تھے، دونوں کے بیچ لڑائی جھگڑا معمول کی بات ہونے لگی، اکثر ان دونوں میاں بیوی کے بیچ میرے سامنے بھی بحث ومباحثہ ہوجایا کرتا تھا اور یوں مجھے پاروتی کے ساتھ "ہمدردی" کی آڑ میں "لائن" لگانے کا موقع ملا، پھر جب حالات اس نہج پر آگئے تو میں نے درونِ خانہ پاروتی لیکن برونِ خانہ...... پیارے صاحب سے ہمدردی جتائی، وہ مجھ پر بھروسا کرنے لگے۔

"حقیقت یہ تھی کہ پیارے صاحب لاکھ رنگین مزاج صحیح مگر وہ پاروتی سے محبت بھی بہت کرتے تھے۔ جب پاروتی نے طلاق پر زور دیا، اس میں میرا ہی مشورہ کارفرما تھا، تو پیارے صاحب کو میں نے الگ مشورہ دیا کہ پاروتی کو طلاق لینے سے باز رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ آپ اسے دھمکانے کے لیے اپنی ساری دولت اور بنگلا میرے نام کر دیں۔

"پریشانی میں انسان جلد ہی جھانسے میں آجایا کرتا ہے، یوں وہ سب کچھ ہوگیا جو میں اور پاروتی چاہتے تھے۔" کہتے کہتے وہ رکا پھر بولا۔

"اب ایسا کرو بھولا ناتھ! تم اس بھٹی کو گرم کرلو۔"

میں اس کی بات سن کر اور آخری بات کا مطلب سمجھ کے اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا۔ یہ مورکھ پہلے میرے شریر میں دو گولیاں اتارے گا، اس کے بعد میری لاش کو بھٹی میں جلا کر راکھ کردے گا۔

"میں انتظار کر رہا ہوں بھولا ناتھ!" اس نے انتہائی سرد و سفاک لہجے میں اپنی بات دہرائی اور پستول سے بھٹی کی طرف اشارہ کیا۔

اچانک میرا دل پھمی کے لیے تڑپ اٹھا۔ مرنے سے پہلے میں اسے ایک بار اور دیکھ لینا چاہتا تھا۔ میں اس سے جھگڑا کرنے پر بُری طرح پچھتا رہا تھا۔

"بھولا ناتھ......!" ساوک پال کی پھنکار سن کر میں ایک دم خیالات کے بھنور سے ابھرا آیا پھر میں نے مٹھی بھر رسالے اور اخبارات اٹھا کے نچلے ڈھکن کو کھول کر اس میں ڈال دیے اوپر کوئلے جمے ہوئے تھے۔ میں نے مڑ کر ساوک پال کی طرف دیکھا، وہ سیاہ پستول کی خوف ناک نال میری طرف کیے زینے کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے تیلی جلا کر کاغذ کو دکھادی۔

میں عجیب مسحور سا کاغذوں کو جلتا دیکھتا رہا۔ آگ کی لپٹیں اوپر کی طرف اٹھ رہی تھیں، جیسے موت کا رقص کر رہی ہوں۔ میرا دل لرز اٹھا۔ مرنے کا یہ بھیانک اور ہولناک انداز بہت ڈراؤنا تھا میرے لیے۔ پہلے گولی کھانا پھر آگ میں جلنا۔ میں بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

آخر میں نے ایک فیصلہ کرلیا۔ ایک خطرناک فیصلہ...... جب مرنا ہی تھا تو کیوں نہ ایک آخری سی کوشش ہی کرکے دیکھ لوں کہ شاید مکتی مل جائے اس مورکھ سے......

میری آنکھیں بدستور بھڑکتی ہوئی آگ کو گھورتے ہوئے سرخ ہورہی تھیں۔ کوئلے سلگنے لگے تھے۔ میں اور کاغذ لینے کے بہانے...... سے میز کی طرف بڑھا پھر تیزی سے امونیا کی بوتل اٹھا کر ساوک پال کی طرف اچھال دی۔

تہ خانے کی محدود فضا میں پستول چلنے کا دھماکا ہوا۔ گولی دیوار سے جا ٹکرائی۔ امونیا کی بوتل پختہ فرش پر گری اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ امونیا فرش پر بہنے لگی۔ ساوک پال بُری طرح کھانسنے لگا۔ وہ لڑکھڑایا اور دیوانوں کی طرح اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی کو پونچھنے لگا۔

میں نے چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ چھلانگ لگائی اور اڑتا ہوا اس پر جا گرا۔ ہم دونوں نیچے گر پڑے۔ میں اس سے پستول چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ ساوک لڑھک گیا۔ پستول

والا ہاتھ اُس کے نیچے دب گیا۔ میں نے موقع تاک کر اس کے منہ پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کا چشمہ ٹوٹ کر دور جا گرا۔ اچانک ساوک نے نیچے سے ہاتھ نکالا اور پھر گولی چلا دی۔ میں اُچھلا اور کونے میں پڑے کوئلوں کے ڈرم کے پیچھے جا چھپا۔

دو زبردست دھماکے اور ہوئے مگر یہ گولیاں بھی دیوار کا پلستر اُدھیڑنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔

میں ڈرم کے پیچھے سے ساوک پال کو گھٹنوں کے بل گھسٹتے اور اندھوں کی طرح اپنا چشمہ تلاشتے دیکھتا رہا، لیکن پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور میرے محتاط اندازے کے مطابق پستول کے میگزین میں ابھی دو گولیاں موجود تھیں اور وہ کسی سنہری موقع کی تلاش میں تھا۔

میں نے دوبارہ ہاتھ میں کوئلے بھر لیے اور اس کی طرف اچھالے مگر میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی اٹھ گیا تھا۔ کوئلے تہ خانے کی چھت سے لٹکے بلب سے ٹکرائے اور تہ خانے میں اندھیرا پھیل گیا۔

ساوک پال بتدریج میرے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ بھٹی میں دہکتی آگ کے پس منظر میں بھی وہ کسی بھوت کی طرح نظر آ رہا تھا جو اپنے شکار کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں مجھے دیکھنے کے لیے سکڑی ہوئی تھیں۔ چشمے کے بغیر وہ بڑی دقت محسوس کر رہا تھا۔

اُدھر امونیا کی بُو بھی اس کے دماغ کو جھٹکے لگا رہی تھی۔ بھولا ناتھ نے ایک بار پھر کوئلوں کی مٹھی بھر کر اس پر ماری مگر وہ صاف بچ گیا۔ ساوک پال نے فوراً ہی گولی چلا دی مگر دہکتا ہوا سیسہ ڈرم میں دفن ہو گیا۔

اب اس کے پستول میں صرف ایک گولی رہ گئی تھی جس کا واضح مطلب تھا کہ اگر وہ یہ آخری گولی میرے شریر میں اتارنے میں کامیاب نہیں ہوا تو پھر خود اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔

میں نے پھر ہاتھ میں کوئلے دبائے اور ساوک پال کے منہ پر مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

اچانک اس کے پستول سے نارنجی شعلہ نکلا اور کوئی چیز مجھے اپنے سینے پر ہتھوڑے کی طرح پڑتی محسوس ہوئی اور میں الٹ کر پیچھے جا گرا۔ اب میں انتہائی بے چارگی و بے بسی کے عالم میں ساکت پڑا ساوک پال کو خالی پستول دباتا دیکھتا رہا۔ پستول سے کلک کلک کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں سنبھالا لے کر اُلجھا ہوا سا اٹھا۔ نہ جانے کیا چیز میرے سینے سے ٹکرائی تھی، پھر میں ساوک پال کی طرف اُچھلا۔ اس نے مجھے پستول کھینچ مارا لیکن میں جھکائی دے گیا۔ خالی پستول دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر گیا۔

تب ہی میرے دائیں گھونسے نے ساوک کو دوہرا کر دیا۔ میں نے دو گھونسے اور اس کے جبڑے پر رسید کیے۔ وہ دھم سے زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ وہ شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں اسے سیڑھیوں پر سے گھسیٹتا ہوا اوپر لے آیا اور ہال میں پڑی کرسی پر بٹھا دیا پھر میں نے سنک سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس بھرا اور اس کے منہ پر دے مارا۔

ساوک پال نے کراہتے ہوئے سر جھٹکا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کا دم خم ہوا ہو چکا تھا۔ وہ بارش میں بھیگی ہوئی بلی کی طرح لرز رہا تھا۔

میں اب بے فکری سے اپنا سیل فون... استعمال کر سکتا تھا، مجھے اب پی سی او جا کے فون کر کے پولیس کی منتیں کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ دوسری طرف بیل برابر جا رہی تھی مگر کوئی فون نہیں ریسیور کر رہا تھا۔

''دھت تیرے کی، سب ہی پھمی کی طرح ہیں، کال ہی نہیں ریسیور کر رہے ہیں، اپنے انسپکٹر رتن کمار...... تب ہی اچانک میری نظر... اپنے کوٹ میں سینے کے قریب ایک سوراخ پر پڑی۔

میں نے غور سے سوراخ کو دیکھا۔ اس کے کنارے جلے ہوئے تھے۔ میں جان گیا کہ یہ سوراخ ساوک پال کی گولی کا کارنامہ تھا۔ اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے ایک روپیہ کا سکہ نکالا۔ سکہ بُری طرح مڑ گیا تھا۔ قریب سے جس تیزی سے گولی میری طرف آئی تھی، وہ اسی تیزی کے ساتھ سکے سے اُچٹ کر کہیں پلٹ گئی تھی۔

ایسے میں بے اختیار مجھے پھمی پر پیار آ گیا۔ اسی نے مجھے یہ سکہ پھینک کر مارا تھا۔ جو میں نے اسے مزید جلانے کے لیے کھینچ کر کے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔ آج اسی سکے نے میری جان بچائی تھی۔ پھمی کا انعام تو بنتا تھا۔

یہ سوچ کر میں ساوک پال کی جانب بڑھا اور اُس کے لباس سے بٹوا نکال کر اس کے اندر سے خاصے روپے نکال کر اپنے کوٹ کی جیب میں منتقل کرتے ہوئے ساوک سے بولا۔

''یہ میری ان تمام پریشانیوں کا محنتانہ ہے، میرے خیال میں پھمی کا کچھ سسٹم والا فون ان پیسوں سے آ جائے گا اور سینڈل بھی۔''

اسی وقت میرا فون... گنگنایا۔ میں نے دیکھا۔ وہ انسپکٹر رتن کمار کی کال تھی۔ وہ کال بیک کر رہا تھا۔

اب مجھے اس کی کال اٹینڈ کرنے میں کوئی تردد نہ تھا۔

❖❖❖

رسمِ فتن

عکس فاطمہ

سماج... ثقافت اور روایت کسی بھی معاشرے کا اہم حصہ بنتے چلے جاتے ہیں... یہ سب انسانی ذہن کی اختراع ہوتی ہیں جو سینہ بہ سینہ اگلی نسل کو منتقل ہوتی ہیں... مشرق ہو یا مغرب دونوں دنیائیں اس خرافات سے خالی نہیں... مغرب کے ماحول سے موصول شدہ ایک ایسی ہی کہانی... جس کی فتنہ انگیز روایت دوسروں کو ناپسندیدہ زندگی گزارنے پر مجبور کررہی تھی...

شرلاک ہومز اور واٹسن کی شخصیت کا جادو جگاتی سراغرسی کی کہانی......

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ ڈاکٹر جان واٹسن یعنی میں نے طویل عرصے تک شرلاک ہومز کی معیت میں کام کیا ہے۔ وہ شرلاک کی پیشہ ورانہ زندگی کی شروعات تھی۔ کولیگ ہونے کے علاوہ شرلاک میرا ایک بے تکلف دوست بھی تھا اور میں اپنے دوست کی رگ رگ سے بہ خوبی واقف تھا۔

جو لوگ شرلاک سے مل چکے ہیں وہ اسے ایک سنجیدہ، بردبار اور انتہائی ذہین انسان سمجھتے ہیں اور اس میں کچھ غلط بھی نہیں ہے لیکن اپنی نجی خصوصاً گھریلو زندگی میں وہ جس

مزاج اور اطوار کا شخص تھا، اس بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میں نے اسے ذاتی زندگی میں ایک پھوہڑ، بدسلیقہ، بے قاعدہ اور بڑی حد تک سنکی پایا تھا، خاص طور پر پیپرز کے معاملے میں۔ وہ اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پرزہ بھی کہیں پھینکنے کا روادار نہیں تھا۔

''اس ردّی کو جمع کر کے تم کیا کرو گے شرلاک؟'' ایک روز میں نے اس سے پوچھ لیا۔

اس وقت وہ اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے مختلف کاغذات کو گتے کے ایک ڈبے میں بھر رہا تھا۔ اس کے گھر میں سب سے زیادہ نظر آنے والی ''چیز'' مختلف سائز اور میٹریل کے ڈبے ہی تھے جن میں اس نے پتا نہیں، کیا کیا الا بلا اور کاٹھ کباڑ ''محفوظ'' کر رکھا تھا۔

''مجھے جب بھی فرصت ہوتی ہے، میں ان کاغذات کو لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔'' اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ایک ایک کاغذ کو بہ غور پڑھتا ہوں کہ کہیں سے مجھے کوئی ایسا اشارہ مل جائے جو پیچیدہ کیسز کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو۔''

بس، وہ ایسا ہی مَن موجی اور اپنی دنیا میں، راجا کی حیثیت سے جینے والا ایک عبقری تھا۔

سردیوں کی ایک شام ہم دونوں اسی کے گھر میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ آتش دان روشن تھا جس کی مہربانی سے کمرے کا ماحول خاصا خوش گوار محسوس ہو رہا تھا۔ اس حرارت بخش فضا میں بیٹھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ باہر کس بلا کی ٹھنڈک ہے۔ بیرونی علاقے کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے چل رہا تھا۔

''ایک منٹ واٹسن......'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

قبل اس کے کہ میں اس سے سوال کرتا۔ ''یہ اچانک اسے کیا سوجھی۔'' وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہو چکا تھا۔

اس نے ایک منٹ کہا تھا اور اپنے کہے کے مطابق، وہ ایک منٹ سے بھی پہلے بیڈروم سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک درمیانے سائز کا کارٹن تھا۔

شرلاک واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھا اور مذکورہ کارٹن کو اپنے قدموں کے نزدیک قالین پر رکھ کر اسے کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے سردست اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں شرلاک کی عادات اور مزاج سے بہ خوبی واقف تھا۔ اس نوعیت کی ذہنی کیفیت میں وہ دوسروں کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے، اپنی دھن میں مگن رہتا تھا۔ میں بہ غور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔

کارٹن کی بالائی سطح پر مجھے ردی کاغذات کی ''ٹاپنگ'' دکھائی دی جو کسی دوا ساز کمپنی کی پروڈکٹس کے اشتہارات وغیرہ تھے۔ شرلاک ان کاغذات کو ہٹا ہی رہا تھا کہ میں نے ازراہِ مذاق پوچھ لیا۔

''شرلاک...... کیا تم اس کباڑ کو آتش دان میں پھینکنے والے ہو؟''

اس نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔ میں نے مزید کہا۔ ''یا اس کارٹن کے اندر تم کچھ اور بھی بھرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''واٹسن!'' وہ میری طرف دیکھے بغیر سپاٹ آواز میں بولا۔ ''اگر تمہیں پتا چل جائے کہ اس باکس کے اندر کون سا خزانہ چھپا ہوا ہے تو مجھے یقین ہے، تم پاگل ہو جاؤ گے۔''

''میرا پاگل ہونے کا بالکل ارادہ نہیں ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اور مجھے تمہارے اس باکس سے بھی کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں۔''

اس نے ایک بار پھر مجھے نظرانداز کر کے اپنا کام جاری رکھا۔ اس دوران میں اس نے کارٹن کی بالائی سطح پر موجود حفاظتی کاغذات کو ہٹا دیا تھا۔ میری نگاہ مذکورہ کارٹن کے اندر گئی تو میں نے وہاں مختلف رنگوں کے ربڑ میں بندھے ہوئے کاغذ کے کئی پیکٹس پڑے دیکھے۔ میرے لیے یہ اندازہ قائم کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا کہ ان پیکٹس میں کس قسم کا خزانہ ہو سکتا ہے۔

وہ پیکٹس کو اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے باکس کے نچلے حصے تک پہنچ گیا۔ میرا مطلب ہے، اب اس کے ہاتھ باکس کی زیریں سطح کو ٹٹول رہے تھے۔

''اس باکس کے اندر میرے ابتدائی کیسز کے ریکارڈز محفوظ ہیں۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''اگر یہ کیسز پبلش ہو کر منظرِ عام پر آ جائیں تو دنیا میں ایک تہلکہ مچ جائے گا واٹسن!''

''تم کہہ رہے ہو تو ماننا پڑے گا۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''کیونکہ اپنے فینز کی نگاہ میں تم ایک عبقری ہو۔ وہ تمہیں اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔''

''اور تم......؟'' وہ میری جانب دیکھے بغیر بول رہا تھا۔

''تم میرے دوست ہو شرلاک۔'' میں نے صاف

گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے زیادہ بڑا تمہارا قدرداں دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”لیکن فی الحال میں ان کیسز کو شائع کرانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔“ اس نے اٹل لہجے میں کہا۔ ”مجھے مناسب وقت کا انتظار ہے۔“

”تم اپنے معاملات کے بارے میں زیادہ بہتر جانتے ہو۔“ میں نے گول مول مگر منافقت سے پاک جواب دیا۔

”واٹسن! تم مجھے بہت عزیز ہو۔“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ”اس لیے میں آج تمہیں ان میں سے ایک کیس کے بارے میں بتاؤں گا۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”ہاں، کیوں نہیں......“

اس نے ہاتھ گھما کر باکس کے نچلے حصے میں سے پیلے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ نکال لیا پھر اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا۔

”یہ رہا میرا وہ پُراسرار اور سنسنی خیز کیس......!“

بادی النظر میں، میں یہی سمجھا کہ اس پیلے پیکٹ کے اندر کوئی نوٹ بک یا ڈائری ہوگی جس میں شرلاک نے اپنے کسی کیس کے یادداشتی نوٹس لکھ رکھے ہوں گے مگر جب میں نے اس پیکٹ کو اپنے ہاتھ میں لیا تو مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا۔ مذکورہ پیکٹ کے اندر کوئی ٹھوس شے موجود تھی جس کا اچھا خاصا وزن بھی تھا، کسی نوٹ بک یا ڈائری سے کہیں زیادہ!

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”شرلاک! یہ کس قسم کا کیس ہے؟“

”کھول کر دیکھ لو۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اس پیکٹ کا ربن کھولا تو اندر سے ایک عجیب و غریب دھاتی اوزار برآمد ہوا۔ کسی پلاس یا چمٹے کے مانند اس کے دو بازو تھے لیکن اس کا اگلا حصہ یعنی کہ منہ کسی حجام کی بال مونڈنے والی مشین کے جیسا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا اس پر جا بجا مجھے زنگ کے آثار نظر آئے۔ وہ کسی ڈائی میں بھی تیار نہیں کیا گیا تھا۔ میں اس کی حالت، ساخت اور شکل... دیکھ کر پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ زمانۂ قدیم میں کسی دیسی لوہار نے اپنے وزنی ہتھوڑے کی ضربات سے کوٹ کوٹ کر اسے تیار کیا ہوگا۔

میں نے مذکورہ ”اوزار“ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ”بس...... اتنا ہی؟“

شرلاک کی آنکھوں میں ایک دلچسپی بھری چمک نمودار ہوئی۔ چند لمحات تک وہ مجھے پُرمعنی نظر سے دیکھتا رہا پھر اعلان کرنے والے انداز میں گویا ہوا۔

”واٹسن! اس وقت تمہارے ہاتھوں میں ایک تاریخ ساز شے ہے۔ تم ”مسگریو ریچوئل“ کے سووینئر کو تھامے بیٹھے ہو۔ یہ سووینئر (یادگار) ایک شاہی خاندان کی خفیہ رسم سے تعلق رکھتا ہے۔ تم اسے اس شاہی خاندان کا ایک عظیم راز بھی کہہ سکتے ہو...... دی مسگریو ریچوئل!“

”میرے پلے تو اس وقت کچھ پڑے گا جب تم مجھے اس ریچوئل (رسم) کی تفصیلات سے آگاہ کرو گے۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”کہیں یہ نہ ہو کہ میں مسگریو کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نحوست مآب سووینئر کو اپنے سر پر دے ماروں۔“

پہلی مرتبہ مجھے شرلاک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دکھائی دی۔ چند لمحات تک وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے تکتا رہا، پھر معتدل انداز میں استفسار کیا۔

”تم نے مسگریو خاندان کا نام تو سُن رکھا ہے نا......؟“

”ہاں...... وہ بھی تمہارے ہی منہ سے۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ اس شاہی خاندان کا کوئی لڑکا تمہارا کلاس فیلو ہوا کرتا تھا......“

”ہاں ایسا ہی ہے مگر وہ میرے اسکول کے زمانے کا قصّہ ہے۔“ اس نے تصدیقی انداز میں کہا۔ ”اس لڑکے کا نام ریجینالڈ تھا لیکن ہم سب اسے ”ریجی“ کہا کرتے تھے۔ اسکول ختم ہوا تو ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ ریجی نے کس کالج اور یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بس، وہ ایک روز اچانک ہی مجھے مل گیا۔ وہ بہت زیادہ پریشان تھا......“

شرلاک نے تجسس بھرے موڑ پر بات ادھوری چھوڑ دی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”ریجی سے تمہاری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ اس کی پریشانی کا سبب کیا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے کہ رائل فیملی سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کی زندگی میں کوئی پریشانی بھی ہو سکتی ہے......“

”انسان کے دکھ اور سکھ کا تعلق امیری یا غریبی سے نہیں بلکہ اس کے نصیب سے ہوتا ہے واٹسن!“ وہ کسی فلسفی کے انداز میں بولا۔ ”وہ میری پیشہ ورانہ زندگی کا ابتدائی دور تھا۔ میں کلائنٹس کی تلاش میں اِدھر اُدھر سرگرداں رہتا تھا۔ ان دنوں میرا باقاعدہ کوئی آفس نہیں ہوتا تھا۔ میوزیم، پارک، یونیورسٹی اور سوسائٹی کلب جیسی بھری پڑی جگہیں ہی

میرا ٹارگٹ ہوا کرتی تھیں۔ ریجی اپنے کسی کام سے یونیورسٹی آیا ہوا تھا کہ میری اس سے ملاقات ہوگئی۔ تبھی مجھے پتا چلا کہ وہ اس وقت ایک عجیب وغریب پریشانی میں گھرا ہوا ہے۔"

"تم جتنی سنجیدگی سے ریجی کا ذکر کررہے ہو اس سے صاف لگ رہا ہے کہ تم مجھے اسی کے کیس کی کہانی سنانے والے ہو۔" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے واٹسن!" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "ریجی کی کہانی سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔"

"پاگل ہونے سے، دنگ رہ جانا میرے لیے قابلِ قبول ہوگا شرلاک۔" میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں ہمہ تن گوش ہوں۔ تم کہانی شروع کرو......"

"اسکول میں سب لوگ مجھے "پرابلم سولور" کہا کرتے تھے۔ کوئی بھی پرابلم پڑھائی سے متعلق ہو یا پھر کسی کی بھی زندگی کا کوئی معاملہ، میں چٹکی بجاتے میں اس مشکل کو "سولو" کر دیا کرتا تھا۔ جب ریجی کو میرے پیشے کے بارے میں پتا چلا تو اس نے منت ریز لہجے میں کہا۔" مجھے تمہاری مدد چاہیے شرلاک...... میرے بچپن کے دوست۔ میں اس وقت بڑے مشکل حالات سے دوچار ہوں۔"

"مجھے بتاؤ ریجی......" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔" آخر ہوا کیا ہے؟"

اس نے روہانسی آواز میں بتایا۔" میرا بکل...... اور میری شیلڈ اچانک کہیں غائب ہوگئے ہیں اور تمہیں آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے اسے ڈھونڈ نکالنا ہے کیونکہ میں اس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ مجھے زندگی میں قدم قدم پر اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔"

"واٹسن! ذرا اندازہ لگاؤ، ایک رئیس زادہ اپنی بیلٹ کے بکل اور اپنی ڈھال کے گم ہوجانے پر کس قدر بوکھلاہٹ کا شکار تھا اور انہیں تلاش کرنے کے لیے وہ باقاعدہ میری منت سماجت کررہا تھا۔" شرلاک نے ریجی کی کہانی کو روک کر مجھ سے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" میں نے خیال افروز انداز میں کہا۔ "بکلر اور شیلڈ سے ریجی کی مراد کوئی ایسا شخص تھا جو زندگی کے ہر معاملے میں اس کے کام آیا کرتا تھا جیسا کہ کوئی شاہی مشیر......"

"تم بالکل ٹھیک سمجھے واٹسن!" وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "شیلڈ اور بکلر کا استعارہ اس نے اپنے بٹلر کے لیے استعمال کیا تھا اس کا مشیر اور ملازمِ خاص برامپٹن۔"

"آگے بتاؤ......" میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔" برامپٹن اچانک کہاں غائب ہوگیا تھا اور...... کیا تم ریجی کے بٹلر کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے؟"

"ایسا تو ممکن نہیں کہ میں کوئی کیس اپنے ہاتھ میں لوں اور اس میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہو......" وہ مخصوص انداز میں بولا۔ "لیکن اگر تمہیں برامپٹن کے غیاب کی کہانی سننا ہے تو کافی صبر وتحمل سے کام لینا ہوگا اور وہ بھی بھرپور توجہ کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہوگیا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تم بولتے جاؤ۔ میں پورے انہماک اور اشتیاق سے سن رہا ہوں شرلاک۔"

وہ دوبارہ شروع ہوگیا۔" میں نے ریجی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔" مجھے اپنے گمشدہ بکلر اور شیلڈ کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ؟"

"میں ابھی تک غیر شادی شدہ ہوں شرلاک۔" ریجی میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں "ہرل اسٹونز" والے عالی شان گھر میں رہتا ہوں۔ میری رہائش گاہ کی وسعت کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہاں پر میری خدمت کے لیے درجنوں ملازمین موجود ہیں جن میں باورچی، مالی اور دیگر خدمت گار سب شامل ہیں لیکن میں ان میں سے، سب سے زیادہ بھروسا اپنے بٹلر برامپٹن پر کرتا ہوں اور میں نے اسی کے لیے "بکلر" اور "شیلڈ" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔"

"سمجھ گیا۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "آگے بولو۔"

"برامپٹن میرے لیے ایسا ہی ہے جیسے کسی اندھے کے لیے اس کی چھڑی۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "میں زندگی کے ہر معاملے میں اسی سے مشورہ کرتا ہوں اور اس اللہ کے بندے نے ہمیشہ مجھے ہر مشکل سے ایسے ہی نکالا ہے جیسے مکھن کی ٹکیا میں سے بال کو نکالا جاتا ہے۔ میں ایسے درجنوں واقعات تمہیں سنا سکتا ہوں جب برامپٹن نے میری مدد کی اور کئی دفعہ مجھے جیل جانے سے بھی بچایا......"

"تم نے کہا کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے تمہارے بٹلر کو تلاش کرنا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لہٰذا درجنوں واقعات سنا کر اپنا اور میرا وقت

برباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بس اتنا بتاؤ کہ اس وقت تم کس نوعیت کی مصیبت کا شکار ہو جو تمہیں برامپٹن کو ڈھونڈنے کی پڑی ہوئی ہے اور تمہیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ تمہارا مسئلہ حل کردے گا۔"

"بالکل...... مجھے یقین ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ برامپٹن کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ آج تک اس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں جس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہا ہوں، برامپٹن بھی وہیں سے پڑھا ہوا ہے۔ تمہیں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ برامپٹن کافی عرصے تک اسی یونیورسٹی میں پڑھاتا بھی رہا ہے۔"

"میں واقعی حیران ہوا رچی۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "کیا کسی یونیورسٹی کا پروفیسر ایک بٹلر کی پوسٹ کے لیے کچھ زیادہ کوالیفائڈ نہیں ہے؟"

"واقعی!" میں نے "کچھ" کا لفظ تکلفاً استعمال کیا تھا۔ شرلاک ایک بار پھر کہانی ...روک کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ رچی کا بیان مجھے بالکل ہضم نہیں ہوا تھا۔ ایک یونیورسٹی پروفیسر، بٹلر کی پوسٹ کے لیے کسی بھی طور فٹ اِن نہیں ہے۔"

"تو پھر رچی نے تمہیں کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے نہایت ہی سادگی سے بتایا...... "یہ برامپٹن کی اپنی چوائس ہے۔ وہ اپنی مرضی اور خواہش سے میرا بٹلر بنا ہے۔ وہ ذہین ہے اور مخلص و وفادار بھی اسی لیے میں اسے ایک پروفیسر کی آمدنی سے زیادہ نوازتا ہوں، کسی اسٹوڈنٹ سے زیادہ اس کا احترام کرتا ہوں اور دل سے اسے اپنا گرو، اپنا مینٹور سمجھتا ہوں۔ اس نے ہمیشہ ہر مشکل وقت میں مجھے سہارا دیا ہے لیکن......" اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن اس بار وہ میرا مسئلہ حل کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکا...... "ابھی تک" کے الفاظ میں نے اس لیے استعمال کیے ہیں کہ وہ میری مدد کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک غائب ہوگیا۔ شاید یہ اس کا نہیں، میری قسمت کا قصور ہے۔ میں برامپٹن کے لیے بہت زیادہ فکرمند ہوں شرلاک ۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ میری دشمن کی کسی سازش کا شکار نہ ہوگیا ہو۔"

"تمہاری دشمن کا نام کیا ہے؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"آنٹی اینجیلا......!" اس نے جواب دیا۔ "لیڈی اینجیلا ڈنکا سل فیس۔"

"اس لیڈی کی تم سے کیا دشمنی ہے رچی؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"دشمن کا لفظ میں نے اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے شرلاک۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ورنہ آنٹی اینجیلا اس وقت میری فیملی کی سربراہ اور مسگریو خاندان کی سب سے بڑی شخصیت ہیں۔"

"اوہ...... تو یہ بات ہے۔" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ "رچی! دوپہر ہو چکی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اب جلدی سے یہ بھی بتادو کہ آنٹی اینجیلا تم سے ایسی کون سی دشمنی کرنے والی ہیں جس سے بچاؤ کے لیے تمہیں برامپٹن کی مدد چاہیے؟"

"وہ آج شام میری منگنی کا اعلان کرنے والی ہیں۔" رچی نے خفگی بھرے مگر سراسیمہ لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا......!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر معتدل انداز میں کہا۔ "اور تم نے کوئی اور پروگرام بنا رکھا ہے۔ میرا مطلب ہے تم اپنے طور پر، اپنی پسند کی کسی لڑکی سے منگنی کا اعلان کرنے کا ارادہ رکھتے ہو...... یہی بات ہے نا؟"

"میرے ذہن میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے شرلاک۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ابھی شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔" وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "یہ سب آنٹی اینجیلا کے پروگرام کا حصہ ہے۔ انہوں نے مسگریو خاندان کے تمام افراد کو "ہرل اسٹونز" میں مدعو کررکھا ہے اور......"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میں نے کہا۔ "رچی! تم مجھے آنٹی اینجیلا کے منصوبے کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔"

"آنٹی اینجیلا مسگریو خاندان کی سب سے طاقتور اور بااختیار شخصیت ہیں۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "فیملی کا کوئی بھی ممبران کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ میں ان کی سختی اور خودپسندی سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن انہوں نے بڑی میٹھی زبان میں مجھے میری خاندانی ذمے داریوں کا احساس دلاتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس خاندان کا اگلا سربراہ مجھے ہی بننا ہے لہٰذا مجھے ہرل اسٹونز کے ہر معاملے میں دلچسپی لینا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میری زندگی مکمل ہوجائے یعنی میں

کنوارا نہ رہوں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے آج شام میری منگنی کی تقریب رکھی ہے اور اس کے لیے انہوں نے ایک خوب صورت لڑکی کا بندوبست بھی کرلیا ہے جس کا نام جولیا ٹریمین ہے۔ جولیا بھی میری طرح اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ سر لیونل ٹریمین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ آنٹی کے، سر لیونل کی فیملی سے گہرے تعلقات ہیں اور جولیا پوری طرح آنٹی کے قابو میں ہے، آنٹی ایمیلی شیطان کا دماغ رکھنے والی ایک شاطر بڑھیا ہے۔ اس نے جولیا اور اس کے باپ لیونل کو کچھ اس انداز سے اپنے شیشے میں اتارا ہے کہ وہ آنٹی کی غلط اور صحیح ہر بات پر صاد کرتے ہیں۔ دراصل آنٹی، جولیا نام کا پٹا میری گردن میں ڈال کر دونوں شاہی خاندانوں پر راج کرنے کا خواب دیکھ رہی ہیں۔''

''ریجی! اس مسئلے کا تو سیدھا سا حل موجود ہے۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''تم اس شادی...... میرا مطلب ہے، اس منگنی سے صاف انکار کردو۔''

''اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو میں کب کا انکار کرچکا ہوتا شرلاک......'' وہ کڑوے لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس ''انکار'' کے لیے کوئی مضبوط اور ناقابلِ تردید دلیل اپنے خاندان کے سامنے پیش کرنا ہوگی۔ منگنی کی رسم سے پہلے مجھے ایک اور خاندانی رسم میں بھی شرکت کرنا ہے جہاں مجھے متفقہ طور پر مسگریو خاندان کا اگلا سربراہ منتخب...... منتخب نہیں، بلکہ مقرر کردیا جائے گا۔ یہ سب تو ایک دن ہونا ہی تھا لیکن اس خاندانی قدیم رسم کے ساتھ آنٹی ایمیلی نے میری منگنی کے اعلان کا پھندنا بھی ٹانک دیا ہے تاکہ وہ جولیا ٹریمین کے ذریعے مجھے اپنے کنٹرول میں رکھے۔ میں آنٹی ایمیلی کو دل سے ناپسند کرتا ہوں شرلاک...... ان کے اشاروں پر ناچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ برامپٹن اس منحوس منگنی کو رکوانے کا کوئی معقول جواز تلاش کر ہی رہا تھا کہ وہ اچانک منظر سے غائب ہوگیا۔ میں نے ہرل اسٹونز کے ہر کونے کھدرے میں اسے تلاش کرلیا ہے مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ اسی کو ڈھونڈنے کے لیے میں یونیورسٹی آیا تھا۔ وہ یہاں بھی نہیں مل سکا مگر یہ حسین اتفاق ہے کہ کئی سال کے بعد، آج تم سے ملاقات ہوگئی۔ اسکول کے زمانے میں ہم سب تمہیں ''پرابلم سولور'' کہا کرتے تھے اور اب تو خیر سے تم نے سراغ رسانی کا پیشہ بھی اختیار کرلیا ہے۔ مجھے اُمید بلکہ یقین ہے کہ برامپٹن کو تلاش کرنے میں تم ضرور میری مدد کرو گے اور وہ بھی منگنی کی تقریب شروع ہونے سے پہلے......!''

''واٹسن!'' شرلاک نے ریجی کی کہانی کو ہولڈ پر ڈال کر مجھ سے کہا۔ ''ریجینالڈ مسگریو عرف ریجی نے مجھے بہت مشکل ٹاسک دے دیا تھا۔ برامپٹن کا سراغ لگانا اور وہ بھی چند گھنٹوں میں...... میرے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں تھا لیکن میں نے دو وجوہات کی بنا پر اس چیلنج کو دل و دماغ سے قبول کرلیا تھا۔''

''کون سی دو وجوہات شرلاک؟'' میں نے سوال کیا۔

''نمبر ایک......'' وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''یہ میری صلاحیت اور قابلیت کا امتحان تھا اور نمبر دو......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر بولا۔

''اس کیس کی فیس، دس کیسز سے ہونے والی آمدنی پر بھاری تھی کیونکہ یہ رائل فیملی کے چشم و چراغ ریجینالڈ مسگریو کی پرابلم تھی۔ ایسے کلائنٹس عطا کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے......''

''میں نے بادشاہوں کے بارے میں ایک اور بات بھی سن رکھی ہے شرلاک!'' میں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ جس کے کام سے خوش ہوجائیں اس کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیتے ہیں اور جس سے خفا ہوجائیں اس کا سر قلم کروانے یا کم از کم اسے زندان میں ڈلوانے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیتے۔''

شرلاک شاکی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''تم اس وقت زندہ سلامت میرے سامنے موجود ہو۔'' میں نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ تم نے ریجی کو مایوس نہیں کیا ہوگا اور اس نے تمہیں دل کھول کر نوازا ہوگا...... ہیں نا؟''

شرلاک نے میرے آخری دو الفاظ میں چھپے ہوئے سوال کا جواب نہیں دیا اور ریجی کی کہانی کو وہیں سے آگے بڑھانے میں مصروف ہوگیا جہاں اس نے توقف کیا تھا۔

''ریجی! تم نے آخری بار برامپٹن کو کب دیکھا تھا؟'' میں نے اپنے متمول بلکہ رئیس کلائنٹ سے ایک اہم سوال کیا۔

''گزشتہ روز سہ پہر کے وقت۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اگلی صبح یعنی آج صبح مجھے پتا چلا کہ برامپٹن اس طرح غائب ہوگیا ہے کہ اس نے اپنے پیچھے کوئی بھی ایسا سراغ نہیں چھوڑا جس کی مدد سے اسے تلاش کیا جاسکتا ہو یا اس کے چپ چاپ غائب ہوجانے کا سبب معلوم کیا جاسکتا ہو۔ میں صبح سے پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔''

لمحاتی توقف کر کے اس نے اُمید بھری نظر سے مجھے دیکھا پھر بولا۔

''شرلاک......!'' اس کی آواز میں منت ولجاجت کی واضح جھلک تھی۔ ''اب میری ساری توقعات تم ہی سے جڑی ہوئی ہیں۔ تم کسی بھی طرح برامپٹن کو تلاش کر کے مجھ تک پہنچا دو یا مجھے اس کے پاس لے چلو تاکہ میں آنٹی ایکیل کے منصوبے کا شکار ہونے سے بچ جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ برامپٹن ضرور کوئی ایسا راستہ نکال لے گا جس کے بعد آنٹی ایکیل کچھ کرنے کے قابل نہیں رہے گی۔ میں آنٹی کی شکست دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں جولیا ٹریمین سے منسوب ہو کر ساری زندگی آنٹی کی غلامی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''فکر نہ کرو رچی! میں تمہارے بٹلر کو منگنی والی پارٹی شروع ہونے سے پہلے ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں اپنے کلائنٹ سے کہا۔ ''لیکن اب میں تم سے جو بھی سوال کروں، تم نے اس کا چپّی پر چپّی جواب دینا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور معتدل انداز میں کہا۔ ''اس سے پہلے بھی میں نے تمہارے کسی سوال کے جواب میں ایک ذرا سی ملاوٹ نہیں کی شرلاک۔ میں چاہتا ہوں تم میری اس پرابلم کو چٹکی بجاتے میں سولو کر دو اس لیے کسی غلط بیانی کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا......''

''بہت خوب۔'' میں نے عملاً چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ''یقین رکھو کہ میں تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانے جا رہا ہوں......'' میں نے دانستہ توقف کر کے رچی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسار کیا۔

''اپنے ذہن پر زور دو اور اچھی طرح سوچ کر مجھے بتاؤ کہ تمہارے اور برامپٹن کے بیچ آخری گفتگو کیا ہوئی تھی۔ میں لفظ بہ لفظ جاننا چاہتا ہوں رچی...... یہ بہت ضروری ہے۔''

''ہمارے درمیان صبح ہی سے یہ گفتگو چل رہی تھی کہ کس طرح آنٹی ایکیل کی سازش کو ناکام بنایا جائے۔'' وہ مستحکم انداز میں بولا۔ ''میں نے برامپٹن کو پہلی مرتبہ الجھا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے اپنی زبان سے یہ اقرار بھی کیا کہ پہلے کبھی اسے کسی مسئلے کا حل ڈھونڈنے کے لیے اس قدر سوچ بچار نہیں کرنا پڑی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے کہ اب کی بار تم سچویشن کے سامنے گھٹنے ٹیک دو گے؟''

بوڑھی گھوڑی لال لگام

''نہیں ماسٹر!'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ وہ مجھے ''ماسٹر'' کہہ کر ہی مخاطب کرتا ہے۔ ''میں ہار نہیں مان سکتا۔ بس، مجھے آپ کا خصوصی تعاون چاہیے۔''

''میں اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے تم سے ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بولو، کیا چاہتے ہو؟'' میرے استفسار کے جواب میں اس نے ایک عجیب سی فرمائش کر دی تھی۔''

یہاں تک بتانے کے بعد رچی اچانک خاموش ہو گیا تو مجھے اس کے چہرے پر گہرا تذبذب دکھائی دیا۔ میں نے ٹھوس انداز میں سوال کیا۔ ''کیسی فرمائش رچی؟''

''اس نے ہمارے خاندانی ''عہد نامے'' کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔''

''خاندانی عہد نامہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''تم اسے عہد نامہ کہو یا حلف نامہ یا پھر قدیم خاندانی روایت جو صدیوں سے نسل در نسل چلی آ رہی ہے۔ یہ دراصل، چند سوالات اور ان کے جوابات پر مشتمل ایک تاریخی دستاویز ہے۔ جب خاندان کے کسی مرد کو اسٹیٹ کی ذمے داری سونپی جاتی ہے تو فیملی کے تمام افراد کی ایک میٹنگ بلائی جاتی ہے۔ اس اہم اجلاس کو ''مسگریو ریچوئل'' کہا جاتا

ہے۔ یہ شاہی رسم ہمارے باپ، دادا، پردادا اور ان کے باپ، دادا، پردادا سے چلی آرہی ہے۔ شاہی خاندان کا سربراہ مقرر کیے جانے والے مرد کو مخصوص لباس پہنایا جاتا ہے اور وہ حاضرین مجلس کے سامنے وہ دستاویز پڑھ کر سناتا ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا ہے لیکن مزے کی بات یہ کہ وہاں اس سے کوئی سوال کرنے والا موجود نہیں ہوتا۔ سوال اور جواب اسی شخص کو پڑھنا ہوتے ہیں جس پر خاندان کی ذمّے داری ڈالی جارہی ہوتی ہے۔''

''تم نے بتایا ہے کہ آج رات تم بھی اپنی خاندانی شاہی رسم ''مسگریو ریچوئل'' سے گزرنے والے ہو؟'' اس کی بات کے اختتام پر میں نے کہا۔

''ہاں، بالکل...... اور یہ رسم میرے لیے کوئی ایشو نہیں ہے شرلاک!'' اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''اصل مسئلہ تو آنٹی ایجیلی کی سازش کو ناکام بنانا ہے۔''

''یہ مسئلہ بھی حل ہوجائے گا ریجی!'' میں نے ہمت بندھانے والے انداز میں کہا۔ ''مجھ پر بھروسا رکھو اور بتاؤ، برامپٹن تمہاری اس خاندانی دستاویز کو کیوں دیکھنا چاہتا تھا؟''

''اس نے اس حوالے سے کوئی واضح بات تو نہیں کی تھی۔'' ریجی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن اس کا دعویٰ تھا کہ اس معما دستاویز میں سے کوئی ایسا اشارہ ضرور ملے گا جس کی مدد سے ہم آنٹی ایجیلی کو شکستِ فاش دے سکتے ہیں۔''

''تو کیا تم نے برامپٹن کو وہ اہم خاندانی دستاویز دکھا دی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے دعویٰ ہی ایسا کیا تھا کہ میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہوگیا۔'' وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ ''حالانکہ وہ دستاویز ہمارے شاہی خاندان کے لیے ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے جسے کسی غیر کو دکھایا نہیں جاسکتا لیکن میرے سر پر آنٹی ایجیلی کی جو تلوار لٹک رہی تھی اسے فی الفور ہٹانا ضروری تھا اور پھر برامپٹن پر میں اتنا زیادہ بھروسا کرتا ہوں کہ جتنا شاید خود پر بھی نہیں۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں برامپٹن کو اپنے ساتھ گھر کی لائبریری میں لے گیا کیونکہ مذکورہ شاہی عہدنامہ وہیں پر محفوظ تھا۔ ''دی مسگریو ریچوئل'' بھی اسی لائبریری کے ایک حصے میں ادا کی جاتی ہے۔ میں نے اسے دستاویز کی ایک کاپی دے دی...... بس، اس کے بعد ہماری ملاقات نہیں ہوسکی۔ میں نہیں جانتا کہ برامپٹن اس وقت کہاں ہوگا اور وہ دستاویز اس کے کسی کام بھی آئی ہوگی کہ نہیں۔ اس کی پُراسرار گمشدگی میرے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے شرلاک۔''

''تو اس قدیم دستاویز کی کاپی بھی برامپٹن کے ساتھ ہی غائب ہوچکی ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''لیکن اصل دستاویز لائبریری کے سیف میں لاکڈ ہے۔'' ریجی نے بتایا۔ ''میں نے اس کی ایک کاپی برامپٹن کو دی تھی اور دوسری کاپی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ کیا تم اسے دیکھنا پسند کرو گے شرلاک؟''

قبل اس کے کہ شرلاک مجھے یہ بتاتا کہ اس نے ریجی کی اس پیشکش کے جواب میں کیا ردِعمل ظاہر کیا تھا، میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''شرلاک! مجھے یقین ہے کہ تم نے وہ اہم دستاویز ضرور دیکھی ہوگی۔''

''دیکھی بھی، پڑھی بھی اور اپنے پاس محفوظ بھی کرلی تھی۔'' اس نے بڑے فخر سے جواب دیا اور پھر گتے کے باکس میں سے ایک، پیلے رنگ کی شیٹ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لو، تم بھی اسے پڑھ کر سناؤ مگر بہ آوازِ بلند۔ تم سناؤ گے اور میں سنوں گا۔''

میں نے شرلاک کے ہاتھ سے مذکورہ شیٹ لے لی۔ یہ وہی پیلا کاغذ تھا جس کے اندر شرلاک نے وہ عجیب الشکل اوزار لپیٹ رکھا تھا جسے اس نے مسگریو فیملی کے سووینیر کی حیثیت میں مجھ سے متعارف کرایا تھا۔ میں نے ربن سے بندھے ہوئے اس پیلے پیکٹ کو کھولنے کے بعد یہ کاغذ اسے واپس کردیا تھا۔ اس وقت میں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ اس کاغذ پر کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ میں اسے محض پیکنگ میٹریل ہی سمجھا تھا۔

''ٹھیک ہے شرلاک! میں اس تحریر کو بہ آوازِ بلند ہی پڑھ کر تمہیں سناؤں گا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ میں مسگریو خاندان کا اگلا ذمّے دار سربراہ بننے جارہا ہوں اور تم اس خاندان کے ایک سینئر ممبر ہو۔''

''ہاں، میں سمجھ سکتا ہوں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اس پیلے کاغذ پر نگاہ جمادی اور شرلاک کی ہدایت کے مطابق اسے بہ آوازِ بلند پڑھنے لگا۔

''وہ کون سا تھا؟''
''وہ آٹھواں تھا۔''
''اسے کس نے سیا تھا؟''
''وہ جو پہلا تھا۔''
''سورج کہاں سے نکلا؟''
''مغربی کھڑکی میں سے۔''
''اس نے کیا روشن کیا؟''
''گلابوں کے گلاب کو۔''
''ہتھیلیاں کیسے رکھی گئی تھیں؟''
''بائیں سے تین اور تین، نیچے سے دو اور دو، ایک سے اندر اور بس...... ہو گیا کام۔''
''اس سے ہم نے کیا حاصل کیا؟''
''وہ سب کچھ جو اس وقت ہمارے پاس ہے۔''
''ہمیں اتنی عزت کیوں دی گئی؟''
''ہمارے نام اور کام کی سچائی کے باعث۔''

میں نے وہ، کچھ میں نہ آنے والا ''سوال و جواب نامہ'' شرلاک کو لوٹاتے ہوئے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا اور دوٹوک انداز میں کہا۔

''میرے تو کچھ پلے نہیں پڑا۔ یہ ایک پیچیدہ پہیلی ہے۔''

''ریجی کی کیفیت بھی تم سے مختلف نہیں تھی واٹسن!'' وہ دوبارہ ریجینالڈ مسگریو کی کہانی پر آتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس نے واضح الفاظ میں مجھ سے کہہ دیا تھا۔''

''شرلاک! میں اس عہد نامے کے سوال و جواب کے پیچھے چھپی ہوئی مسٹری اور ہسٹری سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی میں اسے جاننے میں کوئی دلچسپی رکھتا ہوں۔''

''لیکن برامپٹن اس تحریر میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔'' میں نے ریجی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اور وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا...... مسگریو فیملی کے بعض بڑوں کی جان کاری سے بھی زیادہ......'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر ریجی سے پوچھا۔

''کیا تم مجھے اپنے گھر کی اس لائبریری میں لے کر جا سکتے ہو جہاں ''دی مسگریو ریچول'' ادا کی جاتی ہے؟''

''ہاں...... کیوں نہیں......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''تم ابھی چلو میرے ساتھ۔''

''اور میں اس کے ساتھ ہولیا...... واٹسن!''

''اوہ!'' شرلاک کی بات پر میں ایک حیرت بھری گہری سانس خارج کر کے رہ گیا اور جوشیلے انداز میں کہا۔

''تو تمہیں ویسٹ سسیکس میں واقع مسگریو خاندان کے محل ''ہرل اسٹونز'' میں جانے کا اعزاز حاصل ہوا اور وہ بھی ایک شاہی سراغ رساں کی حیثیت سے؟''

''واٹسن...... میرے دوست! کہاں کا شاہی محل اور کہاں کا شاہی سراغ رساں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''اب اس ''ہرل اسٹونز'' نامی محل کی وہ شان و شوکت باقی نہیں رہی جو ماضی میں اس کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ یا تو مسگریوز کی وہ پیڑھی انتہائی بے پروا، پھوہڑ اور غیر ذمے دار تھی اور یا پھر انہیں سست الوجود، نکمے اور حرام خور ملازمین ملے تھے۔ وہاں کی حالتِ زار پر مجھے رونا آیا۔ خیر......'' اس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''مذکورہ لائبریری کسی کنٹری چرچ کے سائز کی تھی مگر وہاں بھی جا بجا مجھے گرد جمی دکھائی دی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''ریجی! تم لوگ ایسی آلودہ جگہ پر اپنی خاندانی شاہی رسم ادا کرتے ہو؟''

''وہ چند منٹ کا پروگرام ہوتا ہے شرلاک!'' وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ''سب لوگ لائبریری کے ایک کونے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور خاندان کا اگلا ذمے دار وہ پرچہ پڑھ کر انہیں سنا دیتا ہے۔ بس......!''

ریجی کا ''بس'' میرے اطمینان کے لیے کافی نہیں تھا۔ میں نے لائبریری کی اس دیوار کی جانب اشارہ کیا جس میں مختلف سائز کے بک شیلف بنے ہوئے تھے پھر اس سے سوال کیا۔

''ان کتابوں کا کیا قصور ہے ریجی۔ یہ دھول مٹی میں کیوں اٹی ہوئی ہیں؟''

''شرلاک! میں تم سے غلط بیانی نہیں کروں گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ مسگریوز کو مطالعے کا شوق نہیں ہے اس لیے ہم میں سے کوئی ان کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔''

ریجی کا جواب میرے لیے ناقابلِ ہضم اور باعثِ حیرت بلکہ باعثِ خفگی تھا۔ اس پر بس میں اتنا ہی کہہ پایا ''گویا یہ کتابیں یا پھر تم لوگ ہاتھی کے دانتوں کے مانند ہیں۔''

میرے ان سخت ریمارکس پر ریجی نے کوئی بھی اچھا بُرا ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں اسے چھوڑ کر لائبریری کے جائزے میں مصروف ہو گیا۔

اس ہال نما کمرے کی صرف ایک دیوار میں ٹیک

شیلف بنے ہوئے تھے۔ باقی کی تین دیواریں چوبی پینلز سے سجائی گئی تھیں۔ وہ تینوں دیواریں بالکل سادہ تھیں تاہم دو دیواروں کو آپس میں ملانے والے مقامات پر نہایت ہی مہارت کے ساتھ مختلف پھول اور پتیاں کندہ کی گئی تھیں۔ یہ چوبی فن کا ایک عظیم شاہ کار تھا۔ کندہ کاری کے بعد ان پھولوں اور پتیوں میں باقاعدہ رنگ بھی بھرے گئے تھے۔ میں اس حسین نظارے میں جیسے کھو سا گیا تھا۔ ریجی کی اضطراری آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں چونک اٹھا۔

''شرلاک! ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ سورج نے ڈھلنا شروع کر دیا ہے......'' اس نے ایک کھڑکی کی سمت اشارہ کیا اور روہانسی آواز میں کہا۔ ''اگر تم نے کچھ نہیں کیا تو اس سورج کے ساتھ ہی آج میں بھی غروب ہو جاؤں گا۔''

میں نے ریجی کے توجہ دلانے پر مذکورہ کھڑکی کی جانب دیکھا۔ وہ کھڑکی لائبریری کی مغربی دیوار میں بنی ہوئی تھی اور اس کے راستے روشنی کی ایک موٹی سی مستطیل کرن اندر داخل ہو رہی تھی۔

''آہ......!'' میں نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ ''ریجی! ہم نے اس پہیلی کو حل کرنا شروع کر دیا ہے۔'' پھر میں نے شاہی عہدنامے کی چند سطور دہرادیں۔ ''سورج کہاں سے نکلا؟ مغربی کھڑکی میں سے۔ اس نے کیا روشن کیا؟''

میں لائبریری کی اس دیوار تک پہنچا جہاں سورج کی روشنی کی وہ مستطیل کرن پڑ رہی تھی۔ ریجی نے بھی میری تقلید کی۔ وہ بیم آف سن لائٹ مذکورہ دیوار کے اس حصے کو روشن کر رہا تھا جہاں نہایت ہی خوب صورت انداز میں پھول اور پتیاں کندہ کی گئی تھیں اور ان پھولوں کے مرکز میں بڑے سائز کا ایک ایسا پھول تھا جس کی شکل دوسرے پھولوں سے قدرے مختلف تھی۔ وہ تمام گلاب کے پھول تھے۔ بے ساختہ میری زبان پر آ گیا۔

''گلابوں کے گلاب کو......!''

''او مائی گاڈ......'' ریجی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔ ''مغربی کھڑکی کے راستے اندر آنے والی سورج کی روشنی نے اس بڑے گلاب کو روشن کر رکھا ہے۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''میں نے درجنوں بار اس شاہی عہدنامے کو پڑھا ہے شرلاک لیکن کبھی اس طرف میرا دھیان نہیں گیا۔''

''ان پھولوں کو غور سے دیکھو ریجی۔'' میں نے دیوار والے اس مخصوص پینل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب گلاب کے پھول ہیں...... ریڈ روزز...... مگر ان کے وسط میں پایا جانے والا سرخ گلاب اپنے سائز اور ساخت میں دوسروں سے مختلف ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے اور اس کی پانچ بڑی بڑی پتیاں ہیں۔ کیا تم اس قسم کے سرخ گلاب کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''مگر میں جانتا ہوں۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''اسے ٹیوڈر روز کہا جاتا ہے۔'' ٹیوڈر روز'' ہنری ٹیوڈر نے اپنے ہاتھ سے ڈیزائن کیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس نے ''ہنری ہفتم'' کی حیثیت سے برطانیہ کا تخت و تاج سنبھالا تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد جب اس نے ''بوز ورتھ'' کی جنگ جیتی تو ریڈ روز کی نمائندہ لنکاسٹر اور وہائٹ روز کی نمائندہ یارک کاؤنٹیز ایک ہو گئی تھیں۔ اس طرح سول وار (خانہ جنگی) کا خاتمہ ہو گیا تھا جس کے بعد یونائیٹڈ کنگڈم (سلطنتِ برطانیہ) میں امن و سکون قائم ہو گیا تھا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے۔'' وہ میری فراہم کردہ معلومات سے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے بیزاری سے بولا۔ ''لیکن اس شاہی عہدنامے میں ہتھیلیوں کا بھی ذکر ہے جو مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی ہیں۔ یہاں تو بس گلاب کے پھول ہیں اور ان کی ٹہنیاں اور پتیاں......!'' پھر اس نے مذکورہ دستاویز کی ایک لائن بھی دہرادی۔ ''ہتھیلیاں کیسے رکھی گئی تھیں؟''

''ایک منٹ ریجی......'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

اچانک میرے دماغ کی بتی جل اٹھی تھی۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے میگنیفائنگ گلاس (محدب عدسہ) برآمد کیا اور ان گلابوں کے اردگرد کے ایریا کو باریکی سے چیک کرنے لگا۔ جلد ہی مجھے میرے مطلب کی شے مل گئی۔ وہ کسی انسانی ہاتھ کے پرنٹس تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ ہینڈ پرنٹس ریجی کے بٹلر، براسپٹن کے ہوں گے۔ میں نے ریجی سے کہا۔

''بات بن گئی ہے۔ ہم نے اس پہیلی کو بوجھ لیا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''کچھ مجھے بھی تو بتاؤ شرلاک۔''

''میری بات دھیان سے سنو ریجی۔'' میں نے اپنی سوچ کو عملی تجربے سے گزارتے ہوئے گہری سنجیدگی سے

کہا۔ ’’سورج کہاں سے نکلا؟ مغربی کھڑکی میں سے۔ اس نے کیا روشن کیا؟ گلابوں کے گلاب کو۔‘‘ میں نے ٹیوڈر روز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ ’’ہتھیلیاں کیسے رکھی گئی تھیں؟ بائیں سے تین اور تین......‘‘ میں نے ٹیوڈر روز سے بائیں جانب تین+تین = چھ ہتھیلی کے برابر فاصلہ ناپا اور مزید کہا۔ ’’نیچے سے دو اور دو......‘‘ میں نے دو+دو = چار ہتھیلی کے برابر نیچے کی طرف فاصلہ ناپا اور ونگ اسٹروک لگاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ’’ایک سے اندر اور بس، ہوگیا کام......‘‘ اس کے ساتھ ہی میں نے اس پینل کو اپنے شمار کیے ہوئے پوائنٹ پر سے دبا دیا۔ اس مخصوص مقام پر میرے ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی پینل ایک جانب کو سرک گیا۔

ہم نے دیکھا، پینل کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کے باعث وہاں دیوار کے اندر ایک خفیہ خانہ نمودار ہو گیا تھا۔ اس خفیہ خانے میں مجھے ایک لیمپ اپنے اسٹینڈ کے ساتھ رکھا نظر آیا۔ میں نے فوراً اس لیمپ کو روشن کر دیا۔ اس لیمپ کی روشنی میں ہم نے خفیہ خانے کے پچھلے حصے میں ایک بیگ رکھا دیکھا۔ وہ کافی بڑے سائز کا بیگ تھا جیسا کہ اسپورٹس مین کی کٹ وغیرہ ہوتی ہے۔ میں نے مذکورہ بیگ کو کھینچ کر باہر نکالا اور فوراً سے پیش تر اسے کھول لیا۔

اس بیگ کا میٹریل اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ میری ’’کھولنے‘‘ کی کوشش نے بقول کسے، اسے کھول کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی بیگ کے اندر سے برآمد ہونے والا سامان لائبریری کے سنگی فرش پر، ایک مخصوص آواز کے ساتھ اِدھر اُدھر پھیل گیا۔ آہنی اشیا کے کسی پتھر سے ٹکرانے کی مخصوص آواز......

’’یہ تو ایک خزانہ ہے شرلاک......!‘‘ ریجی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

’’واٹسن......!‘‘ شرلاک، ریجی کی کتھا کو ایک بار پھر روک کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ’’وہ واقعتاً ایک خزانہ ہی تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں پلاس نما جو اوزار دکھایا تھا نا، وہ بھی اسی خزانے کا حصہ تھا جسے میں نے یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ دیگر ساز و سامان میں زمانۂ قدیم سے تعلق رکھنے والے آلاتِ جراحی تھے۔ اس خزانے کے ایک ایک اوزار پر جابجا زنگ نظر آ رہا تھا۔ ان میں مختلف سائز کے چاقو، قینچیاں، بلیڈز زخم کی سلائی کرنے والی سوئیاں، دھاگے، ایک بڑا سا پیالہ......وغیرہ۔ ان میں سے جو چیزیں دھاگے یا کپڑے کی بنی ہوئی تھیں وہ گل کر ختم ہو چکی تھیں۔ دھاتی اوزار پر زنگ نے ڈیرا جمایا ہوا تھا جس کے باعث وہ بدوضع ہو چکے تھے۔ انتہائی سادہ الفاظ میں اس تار تار بیگ کو کسی قدیم سرجن کی میڈیکل کِٹ کہا جا سکتا تھا۔‘‘

’’اس ساز و سامان کے حوالے سے ریجینالڈ مسگریو کے کیا تاثرات تھے؟‘‘ شرلاک سانس لینے کو رکا تو میں نے اس سے پوچھا۔

’’وہ اس خفیہ خزانے سے قطعی لاعلم تھا واٹسن!‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’میں نے ریجی سے کہا کہ اس کا بٹلر اسی خزانے کی کھوج میں تھا۔ میں نے ٹیوڈر روز والی اس دیوار پر برامپٹن کے ہینڈ پرنٹس دیکھے ہیں۔ وہ یہاں تک پہنچا تو تھا مگر اس قدیم خزانے تک اسے رسائی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ کہیں غائب ہو گیا۔‘‘

’’شرلاک......‘‘ ریجی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ’’مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ برامپٹن کسی مصیبت میں پھنس چکا ہے ورنہ وہ اتنی دیر تک مجھ سے دور نہیں رہتا۔ کچھ بھی کر کے ہمیں برامپٹن کو ڈھونڈ نکالنا ہوگا۔‘‘

’’ہم وہی تو کر رہے ہیں ریجی۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’ہم اس کے بہت نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ مجھے بتاؤ، کیا تمہاری آنٹی ایکیلی یہ بات جانتی ہے کہ تم اپنے ہر معاملے کے لیے برامپٹن سے مشورہ کرتے ہو؟‘‘

’’ہاں، آنٹی اچھی طرح جانتی ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ برامپٹن کی گمشدگی میں تمہاری آنٹی کا ہاتھ ہے۔‘‘ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ’’وہ نہیں چاہتی کہ برامپٹن تمہیں کوئی ایسی راہ سجھا دے جس پر چل کر تم آنٹی ایکیلی کے ہاتھ سے نکل جاؤ۔ تم اس بارے میں کیا کہو گے ریجی؟‘‘

’’یہ عین ممکن ہے شرلاک......‘‘ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’میں تمہاری سوچ سے اتفاق کرتا ہوں۔ آنٹی ایکیلی بہت طاقتور اور بااختیار ہے۔ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ برامپٹن کو غائب کرانا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔‘‘

’’اس سلسلے میں ڈائریکٹ آنٹی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’وہ کسی بھی صورت میں برامپٹن کی گمشدگی کو اپنے سر نہیں لے گی۔‘‘

’’تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو شرلاک!‘‘ وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

’’کیا کوئی اور ایسا انسان ہے جو آنٹی کے منصوبوں سے واقفیت رکھتا ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں......آنٹی ایکیلی کی میڈ۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’اس

کا نام ریشل ہوبز ہے۔ وہ ہر وقت آنٹی کے ساتھ رہتی ہے اور اس کی ہر بات سے واقف بھی...!"

"ہمیں فوراً ریشل ہوبز سے ملنا ہوگا ریجی!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم شاہانہ رعب داب سے بات کرنا۔ مجھے اُمید ہے، وہ زبان کھول دے گی۔ اگر ضرورت پڑے تو اس کی مٹھی پونڈز سے بھر دینا۔"

"سمجھ گیا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ پھر لائبریری کے فرش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "ان آلات واوزار کا کیا کرنا ہے شرلاک؟"

"انہیں فی الحال اسی خفیہ خانے میں بند کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ براملین کو تلاش کرنے کے بعد ہم اس خزانے پر بات کریں گے۔ یہ کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کا طریقہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔"

میری بات ریجی کی سمجھ میں آ گئی۔

"کیا ریجی کی بات ریشل ہوبز کی سمجھ میں بھی آئی کہ نہیں؟" شرلاک کے خاموش ہوتے ہی میں نے لقمہ دیا۔

"واٹسن...... مائی ڈیئر فرینڈ!" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "دھونس اور دولت دو ایسی چیزیں ہیں کہ جن کے سامنے پتھر بھی موم ہو جاتے ہیں۔ ریجی نے ان دونوں اشیا کا بہ یک وقت استعمال کیا تھا جس کے نتیجے میں ریشل ہوبز نے بتایا کہ گزشتہ شام آنٹی اینجلیل نے یہ کہہ کر براملین کو ہرل اسٹونز والی جھیل میں واقع چھوٹے جزیرے کی جانب بھیج دیا تھا کہ ریجی نے اسے وہاں بلایا ہے۔ وہ بے چارہ اپنے ماسٹر سے ملنے اس جزیرے پر چلا تو گیا مگر واپس نہ آ سکا۔"

"ایسی کیا مجبوری تھی اس کے ساتھ؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "جب ریجی اس جزیرے پر موجود ہی نہیں تھا تو براملین کو فوراً واپس آ جانا چاہیے تھا۔"

"درست کہہ رہے ہو واٹسن!" شرلاک کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تم نے براملین کی مجبوری کا ذکر کیا ہے نا...... تو سنو، اس کی مجبوری تھیں آنٹی اینجلیل!"

"مگر وہ عورت تو ہرل اسٹونز میں تھی؟" میں نے سوالیہ نظر سے شرلاک کی طرف دیکھا۔

"بے شک! وہ ہرل اسٹونز کے اندر تھی لیکن اس کے شاطر دماغ نے براملین کو جزیرے کی جانب روانہ کرنے کے بعد اس کے واپس نہ آنے کا شافی بندوبست کر دیا تھا، کم از کم ریجینالڈ مسگریو اور جولیا ٹریمین کی منگنی کا اعلان ہونے سے پہلے واپس نہ آنے کا بندوبست......!"

"شرلاک! تم کس بندوبست کا ذکر کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جس بوٹ سے براملین جزیرے کی طرف گیا تھا اس کو چلانے والے شخص کو تاکید کر دی گئی تھی کہ براملین جیسے ہی بوٹ سے نکل کر جزیرے کی زمین پر قدم رکھے، اس کو فوراً واپس آ جانا ہے۔ براملین چاہے جتنا بھی چیخے چلائے، اسے پلٹ کر نہیں دیکھنا۔"

"ریجینالڈ بالکل ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے پُرسوچ انداز میں اظہارِ خیال کیا۔ "وہ بڑھیا واقعی شیطان کی خالہ ہے۔"

"میں جب ریجی کے ساتھ بوٹ ہاؤس پہنچا تو وہاں کے نگران مسٹر میکنزی نے ہمیں بھی روکنے کی کوشش کی تھی۔" شرلاک ریجی کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔ "ریجی نے خاصے سخت لہجے میں میکنزی سے پوچھا۔

"میرے جزیرے کی طرف جانے سے تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ماسٹر!" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "میڈم اینجلیل کا حکم ہے کہ آج کوئی بھی موٹر اس جزیرے کی طرف نہیں جائے گی۔"

"تم میرا نمک کھاتے ہو یا اینجلیل کا؟" ریجی کے استفسار میں غصہ پایا جاتا تھا۔

"آپ کا ماسٹر!" میکنزی نے جواب دیا۔ "لیکن آپ بھی جانتے ہیں کہ میڈم کتنی خطرناک ہیں!"

"میں آنٹی کی ساری خطرناکی آج اس کی ناک کے راستے نکالنے والا ہوں لہٰذا اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" ریجی نے کہا اور دو سو پونڈز میکنزی کے ہاتھ پر رکھنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "میں جانتا ہوں، وہ لوگ میرے پیچھے آئیں گے۔ تم کسی بھی بہانے انہیں اس وقت تک روکنے کی کوشش کرنا جب تک میں براملین کے پاس نہیں پہنچ جاتا۔"

ریجی کی بات میکنزی کی سمجھ میں آ گئی اور ہم دونوں بوٹ پر سوار ہو کر اس جزیرے پر پہنچ گئے جہاں براملین اپنے ماسٹر ریجینالڈ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بعد ہمارے اندازے درست ثابت ہو گئے۔"

"ایک منٹ شرلاک!" میں بول اٹھا۔ "اس دلچسپ کہانی کو یوں جلدی میں لپیٹنے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارے کون سے اندازے درست ثابت ہوئے تھے؟"

"نمبر ایک......" اس نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔ "آنٹی اینجلیل، سر لیونل، ان کی بیٹی جولیا اور دیگر معزز

لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر اس جزیرے پر پہنچ گئی تھی۔ نمبر دو...... براسپٹن ہم سے پہلے اور ہم سے کہیں زیادہ ''دی مسگریو ریچوئل'' کے بارے میں جان چکا تھا۔ اس نے اپنے ماسٹر کو بچانے کے لیے مسگریوز کی عزت کا فالودہ بنا دیا تھا۔''

''وہ کیسے شرلاک......؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''مجھ پر نظر پڑتے ہی آنٹی اینکیل کے چہرے پر ناگواری اُبھر آئی تھی۔'' شرلاک نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس نے میری جانب انگلی اٹھا کر بڑی رعونت سے پوچھا۔

''تم شاہی خاندان سے نہیں ہو۔ مجھے بتاؤ، تم کون ہو اور یہاں ہماری پارٹی میں کس لیے موجود ہو؟''

''میرا نام شرلاک ہومز ہے اور میں ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹیو ہوں۔'' میں نے اس بڑھیا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ''مسٹر ریجینالڈ نے اپنے بٹلر براسپٹن کو تلاش کرنے کے لیے میری خدمت حاصل کی تھیں جسے تم نے اس جزیرے تک محدود کر دیا تھا تاکہ مسگریو فیملی کا ایک راز سر لیونل ٹریمین کے سامنے نہ آسکے اور وہ بے خبری میں اپنی بیٹی کو اس خاندان میں بیاہ دیں۔''

''فیملی سیکرٹ......!'' لیونل ٹریمین اس طرح اچھلا جیسے اس نے بے دھیانی میں بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر ڈیٹکٹیو! تم کس راز کی بات کر رہے ہو؟''

''سر! ان لوگوں نے آپ سے سنگین غلط بیانی کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ریجینالڈ مسگریو آپ کی بیٹی کے قابل نہیں ہے۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا؟'' لیونل الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''سر! براسپٹن آپ کو سب سمجھا دے گا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس بندۂ خدا نے ''دی مسگریو ریچوئل'' پر پی ایچ ڈی کر رکھا ہے!'' اپنی بات کے اختتام پر میں نے براسپٹن کی جانب اشارہ کر دیا۔

''تھینک یو ویری مچ مسٹر ڈیٹکٹیو۔'' براسپٹن نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد روئے سخن سر لیونل کی جانب موڑتے ہوئے دل پذیر انداز میں اپنی تقریر شروع کر دی۔ ''سر! میں آپ کے سامنے جو بھی سنسنی خیز انکشافات کرنے جارہا ہوں، اس کے ٹھوس ثبوت ہرل اسٹونز کی لائبریری کے ایک خفیہ مقام پر موجود ہیں۔ اسی لائبریری میں ''دی مسگریو ریچوئل'' کا انعقاد کیا جاتا ہے جو کہ ایک ڈھکوسلا ہے...... اپنی شان و شوکت کو قائم رکھنے کا ایک بھرم۔ میں آپ کے ساتھ لائبریری جاؤں گا اور شاہی عہد نامے کے علاوہ وہ سب کچھ بھی دکھاؤں گا جو مسگریو خاندان کی اصلیت کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے کافی ہوگا۔''

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر سر لیونل ٹریمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ صدیوں پہلے ہنری ہشتم کے دور کی بات ہے (وہ کون سا تھا؟ وہ آٹھواں تھا) اس زمانے میں سرجری کا کام باربر لوگ کیا کرتے تھے۔ ہنری ہشتم کے سر میں ایک خطرناک پھوڑا نکلا تھا جس کا آپریشن مسگریو خاندان کے ایک قابل حجام نے کیا تھا (اسے کس نے سیا تھا؟ وہ جو پہلا تھا) ہنری ہشتم نے صحت یاب ہونے کے بعد اس مسگریو شخص کو انعام و اکرام سے نوازا اور ہرل اسٹونز والی جاگیر اس کے نام کر دی (اس سے ہم نے کیا حاصل کیا؟ وہ سب کچھ جو اس وقت ہمارے پاس ہے) ہنری ہشتم جب تک زندہ رہا وہ مسگریو خاندان کے لیے بہت کچھ کرتا رہا (ہمیں اتنی عزت کیوں دی گئی؟ ہمارے نام اور کام کی سچائی کے باعث) ہنری ہشتم، ہنرمند افراد کی دل سے قدر کرتا تھا لیکن مسگریو خاندان نے اس کی نوازشات کا غلط استعمال کیا۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد ان لوگوں نے خود کو شاہی خاندان کہنا شروع کر دیا جبکہ ان کی اصلیت وہی ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کر دی ہے۔''

''نائیوں کا خاندان...... دھوکے باز لوگ......!'' لیونل نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ''میں یہاں نہیں رک سکتا۔''

جولیا نے منگنی کی انگوٹھی کو اتار کر جھیل میں پھینک دیا پھر اپنے باپ سے بولی۔ ''ڈیڈی! یہاں سے چلتے ہیں۔''

اسی دوران میں آنٹی اینکیل ڈکاسل کو اتنے زور کا چکر آیا کہ وہ تیورا کر زمین بوس ہو گئی۔ اس طرح میری مداخلت سے ''دی مسگریو ریچوئل'' کا کامیاب ''آپریشن'' ہو گیا۔ اس شام کے بعد، پھر اس خاندان میں کبھی کسی نے وہ رسم ادا نہیں کی۔''

''رسم نہیں...... رسمِ فتن کہو شرلاک!'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اس رسم کی وجہ سے کتنے فتنے جاگے اور کتنے امن سوئے، اس کا کوئی حساب ہے اور نہ ہی کتاب......!''

''میرا یہ باکس بہ یک وقت حساب بھی ہے اور کتاب بھی۔'' شرلاک نے عجیب سے لہجے میں کہا پھر اس باکس کو ری پیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔

❖❖❖

شعلہ زن

روبینہ رشید

وہ شعلہ زن تھی یا جوالا مُکھی... اس کے وجود میں ایک آتش فشاں دہک رہا تھا... اپنوں کی خودغرضی، دھوکے اور دل و جاں پر گزر جانے والی ناگہانی اس کے وجود کو تہ و بالا کردینے والے لاوے کے مانند رقصاں تھی... رسوائی کی موت کو اس کا انجام ٹھہرایا گیا مگر مقدر اسے اپنے ساتھ لے اڑا... اس کے راستے میں رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہمالیہ حائل تھے مگر وہ حاتم طائی کی طرح زندگی کی حسن آرا کے مشکل سوالات کے جواب تلاشتی رہی... ہر قیامت نے اس کے حوصلے کو مہمیز کیا... ہر اُفتاد اسے مضبوط بناتی گئی... پناہ اور بقا کی تلاش اسے مسلسل دوڑا رہی تھی... موت روپ بدل بدل کر اس کے تعاقب میں تھی... وہ اپنی طاقت سے خود ناآشنا تھی... راہ میں آنے والے ہر پتھر کو وہ اپنے راستے سے ہٹا رہی تھی... اس کے باوجود اس بار آنے والا طوفان شدید تھا... اس میں ناکامی قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی... ایک ایسی قیامت جو کروڑوں افراد کے قدموں سے زمین کھینچ لیتی ہے...

ایک سادہ و معصوم نازک اندام دوشیزہ کی سنسنی خیز داستاں

قسط :20

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں سارہ احمد چھوٹے سے گاؤں کی ایک نہایت عام سی لڑکی تھی جو تین بہنوں میں سب چھوٹی ہونے کی وجہ سے ماں باپ کا لاڈ پیار نہ ہونے کے برابر ہی ملا۔ گھر میں بھائی کی حکومت تھی۔ میرے پیروں سے گھر کی زمین اس وقت سرک گئی جب اسی بھائی نے غصے میں کسی کو قتل کردیا اور غیرت کے نام پر قتل کا بہانہ بنا کر سزا سے بچنے کے لیے مجھے بدنامی اور الزام کی کالک لگا کر موت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور میرے ماں باپ نے بیٹے کو بچانے کی خاطر اس فیصلے کو قبول کرلیا۔ اس شام میں نے گھر، گاؤں اور سب کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور ٹرین میں سوار ہوگئی۔ ٹرین میں ایک شیطان ملا۔ میں نے اس کا مقابلہ کیا اور کچھ پیسے لے کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوئی مگر اس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا، جان بچانے کی دوڑ میں، میں ایک کچی بستی میں پہنچی جہاں گندے نالے میں ایک چھوٹی بچی ڈوب رہی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اس بچی کو بچانے کے لیے نالے میں کود گئی۔ اس کی جان بچانے کے انعام کے طور پر مجھے اس کے گھر میں پناہ ملی۔ اس بستی میں منشیات کا دھندا زوروں پر تھا۔ مجھے پناہ تو ملی مگر میری تقدیر کی گردش میرے ساتھ تھی۔ پہلے مجھ پر اس بچی کے باپ کے قتل کا الزام لگا اور پھر وہاں پر خوف و ہراس پھیلاتی کالے جادو کی ماہر اماں سے میری جھڑپ ہوگئی۔ وہ اس بچی کے خون سے ایک خاص طاقت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ بچی کو بچانے کی کوشش میں وہ جادوگرنی جل کر مر گئی۔ جس کے بدلے بستی کے بڑے بدمعاش نے مجھے وہیں قتل کرنے کا حکم سنایا۔ علاقے کے دوسرے ڈان نے اچانک کارروائی کرکے مجھے بچالیا۔ اس نے مجھے اپنے اڈے پر قید کیا جہاں ہر طرف منشیات ہی منشیات تھی۔ میں اسے اس کے تمام تر برے ارادوں کے ساتھ ختم کرنے اور اس کے منشیات کے ذخیرے کو آگ لگا کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو رہی تھی کہ ایک افسر کے ہتھے چڑھ گئی۔ جہاں اس کے کرپٹ افسر نے مجھے آپاجی کے ہاتھوں فروخت کردیا۔ وہ آپاجی مجھے ٹرین میں ملی تھیں اور مجھے بہت اچھی لگی تھیں مگر درحقیقت آپاجی عصمتوں کی سوداگر تھیں۔ مجھے ان کے بنگلے پر ہر قسم کی تربیت فراہم کرکے امیروں کا دل خوش کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ آپاجی نے ایک رات مجھے ایک بارسوخ شخص کے محل پہنچا دیا۔ جہاں بڑی مشکلات اور جان لیوا کوشش کے بعد میں اسے چھری مار کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ میں جان بچانے کے لیے اندھا دھند دوڑ رہی تھی کہ بڑی سڑک پر دوڑ لگا دی جہاں سامنے سے آنے والی کار کی ٹکر نے مجھے بے ہوش کردیا۔ یہ حادثہ میرے لیے زندگی کی نوید بن گیا۔ وہ گاڑی ڈاکٹر علی چلا رہے تھے۔ جو مجھے پہلے اسپتال اور پھر بابا کے پاس لے گئے۔ بابا کے گھر آکر میری زندگی بدل گئی۔ ان پر ہونے والے قاتلانہ حملے میں میری کوشش اور بہادری نے ان کی جان بچانے میں
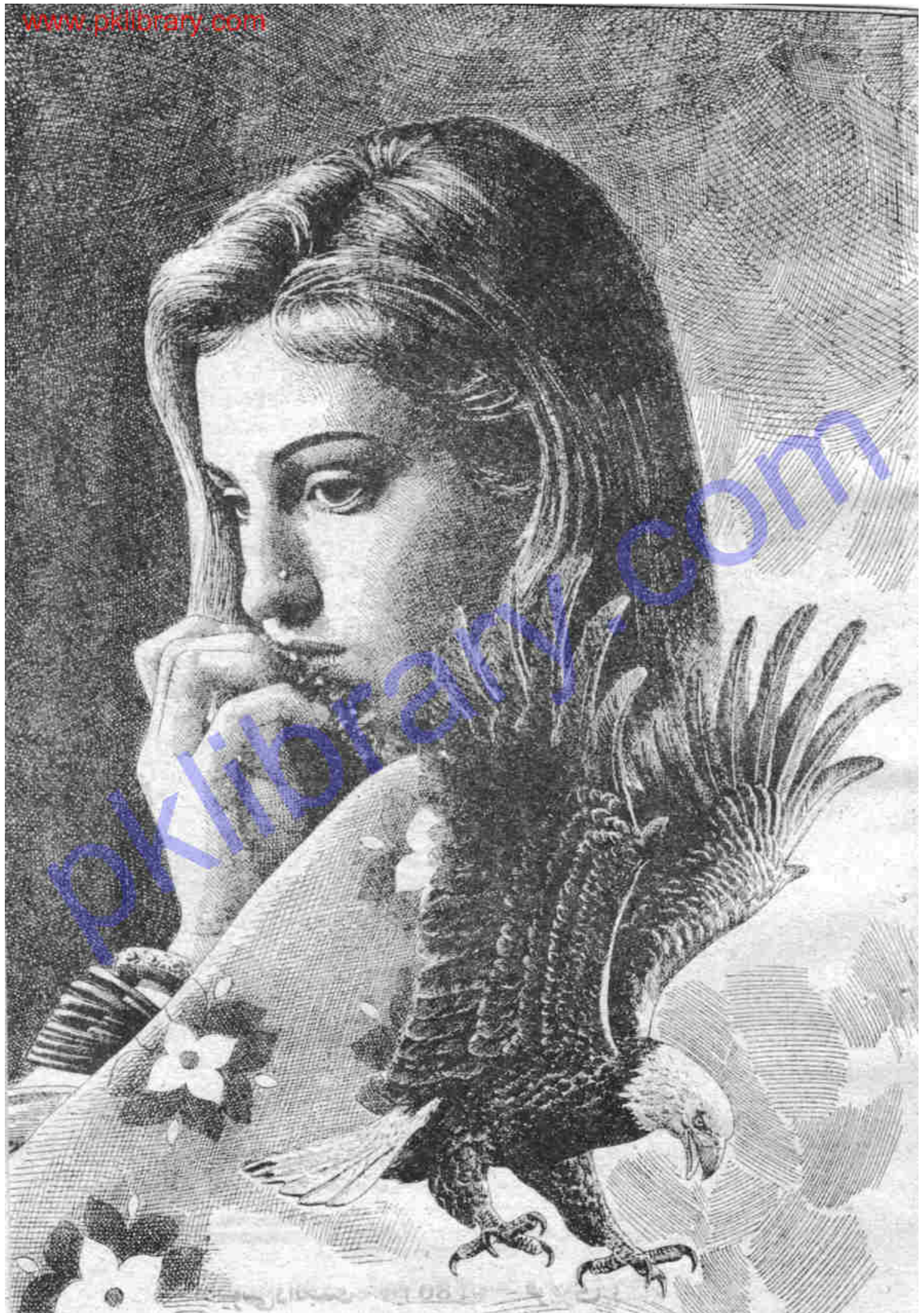
مدد کی۔ یہی ان سے میرا پہلا تعارف تھا جس کے بعد انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنالیا۔ ان کی زندگی کی کہانی مجھ سے کچھ عجیب نہیں تھی۔ لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران انہیں وہاں ایک کروڑ پتی یہودی ابراہام کی بیٹی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس محبت نے بالآخر شادی کا روپ دھارا۔ ابراہام مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کے نہ ماننے اور مسلسل دھمکیوں کی وجہ سے وہ دونوں پاکستان آ گئے۔ یہاں ان کی زندگی بہت شاندار اور خوشیوں سے بھرپور تھی۔ اللہ نے انہیں ایک بیٹی سونیا عطا کی مگر اسی دوران ابراہام کے غنڈے ان کے گھر پہنچ گئے۔ جہاں ان کی جان بچانے کی کوشش میں مریم نے اپنی جان دے دی اور وہ لوگ سونیا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بابا بمشکل اس غم سے کھڑے ہوئے اور اپنی بیٹی کی تلاش میں لندن پہنچے۔ کسی طرح وہ ابراہام کے محل میں گھسنے اور سونیا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اسے لے کر باہر آ گئے تھے مگر آخری لمحوں پر ابراہام اور اس کے لوگوں نے انہیں شدید زخمی کر کے سونیا کو ان سے چھین لیا۔ وہ ان کو مار ہی ڈالتے مگر ان کے دوست نے کسی طرح انہیں بچایا اور پاکستان بھیج دیا۔ ابراہام کے محل سے انہیں دو خفیہ فائلیں ملی تھیں جس سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ ابراہام کے پاس موجود تمام دولت مریم کی ماں کی ملکیت تھی اور اس نے اس دولت کو مریم یا اس کی اولاد کے نام کر رکھا تھا۔ سونیا کے 25 سال کی ہونے تک وہ اس کا ولی تھا مگر اسے یہ ثابت کرتے رہنا تھا کہ مریم یا سونیا میں سے کوئی ایک اس کے پاس موجود ہے ابراہام سونیا کو اسرائیل میں کسی نامعلوم مقام پر لے گیا مگر بابا سے اس کا جھگڑا جاری تھا۔ بابا نے مجھے تعلیم و تربیت سے نکھارا۔ وہاں ان کے علاوہ ڈاکٹر علی اور کریم موجود تھے۔ کریم ایک فلسطینی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے پورے خاندان کو یہودیوں نے مار ڈالا تھا اور بابا اسے کیمپ سے ساتھ لائے تھے۔ وہ فوج میں میجر رہا تھا۔ مارشل آرٹ کا ماہر تھا اور اب فوجی ٹریننگ کی ایجنسی چلا رہا تھا۔ ڈاکٹر علی بابا کے دوست کا بیٹا تھا۔ ماں باپ کے حادثے میں انتقال کے بعد اس کی ذمے داری بابا نے لے لی تھی۔ اب ان دونوں کے ساتھ میں بھی اس گھر کا فرد بن چکی تھی۔ ابراہام کے بابا کو ایک فون نے ہم سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے بابا کو بتایا کہ اب وہ جلد ہی پاکستان کو تباہ و برباد کرنے والا ہے اور یہ سب کرنے کے لیے اس نے ان کی بیٹی سونیا کو (جسے وہ مریم کہہ رہا تھا) تیار کیا ہے یہ سب وہی کرے گی۔ کریم اس معاملے کو فوراً مقتدر حلقوں تک لے گیا تھا انہی دنوں سڑک پر ایک بھکارن کے مشکوک انداز پر میں نے اس کا پیچھا کیا وہاں سے ملنے والا ایک سکہ مجھے فخر الدین کے دفتر لے گیا۔ وہ اور وہ بھکارن تاشی موساد کے لیے کام کر رہے تھے۔ ہم نے ان کے کئی منصوبے ناکام کیے۔ اس دوران تاشی نے زہریلی گیس کے ذریعے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی مگر آخری لمحے پر کریم اور علی نے مجھے بچالیا۔ پھر کریم کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب ہماری اُن سے کھلی جنگ تھی۔ فخر الدین پکڑا گیا مگر غضنفر نے دلاور کے ذریعے اس کو قتل کرا دیا۔ ہم تینوں کو اس معاملے سے ہٹانے کے لیے غضنفر نے بابا کو بیگو استاد کے ذریعے اغوا کروایا مگر ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ اور بابا کو چھڑا لیا گیا۔ اس دوران ہم نے ایک سراغ پر محنت کر کے تاشی کو پکڑ لیا اور اسے خفیہ ایجنسی کے دفتر پہنچا دیا۔ تب ہی مجھے معلوم ہوا کہ کریم بظاہر فوجی ٹریننگ ایجنسی چلا رہا ہے مگر وہ انڈر کور فوج ہے اور خصوصی خفیہ مشن پر کام کرتا ہے۔ تاشی کے غائب ہونے پر زورین اور غضنفر نے میرے اغوا کا فیصلہ کیا۔ ہمارے گھر کے باہر کیمرا لگایا گیا۔ اغوا کی اس کوشش میں وہ ناکام رہے اور سب کے سب کریم کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ ایک منصوبے کے تحت تاشی کو فرار ہونے میں مدد دی گئی۔ وہ ایک محلے سے لفٹ لے کر اس کے گھر پہنچی جہاں غضنفر نے اسے ختم کرنے کے لیے دلاور کو بھیجا۔ تاشی وہاں ماری گئی۔ مقامی ٹیم کی مسلسل ناکامی کی وجہ سے ابراہام نے سونیا کو پاکستان بھیجا۔ شینا ایٹمی ہتھیاروں کی جانکاری کے لیے وہاں کے ایک اعلیٰ ترین افسر سے دوستی کرتی ہے بالآخر پکڑی جاتی ہے۔ تلاشی کے دوران اس کا فون پھٹ جاتا ہے اور وہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ ابراہام کی ٹیم بھی جونز کی سرکردگی میں شہر میں موجود ہے وہ اس کی مدد سے پورٹ پر کیمیکل کے ذریعے سیکڑوں لوگوں کی موت کا باعث بنتے ہیں۔ اس پر ابراہام سے جھگڑے کے بعد سونیا گھر سے نکلی اور میری گاڑی سے اس کا حادثہ ہو گیا۔ میں اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے گئی۔ چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ وقتی طور پر یادداشت کھو چکی تھی۔ دوسری طرف ابراہام نے خفیہ ایجنسیوں کی وجہ سے اس کی تلاش رکوا دی اور پچھلی ٹیم نے تمام کام کرنے والوں کو گراؤنڈ کر دیا۔ دوسری جانب ابراہام کے لیے کام کرنے والا ڈیوڈ بابا جی بن کر ہزاروں افراد کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ انہوں نے 8 دہشت گردوں کی مدد سے بڑی فوجی چھاؤنی میں گھس کر اسلحہ خانہ، ائربیس پر قبضہ کر لیا اور اسٹاف کو یرغمال بنا کر ایٹمی ہتھیار حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ وہاں مجھے دلاور اور غضنفر نے اغوا کر لیا مگر اپنی خاص صلاحیت کی وجہ سے مجھے بہت جلد ہوش آ گیا اور میں غضنفر کو اٹھا لانے میں کامیاب رہی۔ فوجی چھاؤنی کے معاملے میں کریم کو بھی طلب کر لیا گیا تھا۔ کریم اور اس کی ٹیم بالآخر چھاؤنی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اسی اثنا میں ابراہام اپنی کارروائی کو تیز تر کر دیتا ہے۔ شہر میں بم بلاسٹ ہوتے ہیں اور کافی تعداد میں ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ میں اسی مقام پر پرویز نامی لڑکے کو گرفتار کروا دیتی ہوں۔ انسپکٹر شمشیر اسے گرفتار کر کے تفتیش کرتا ہے۔ اور اس کی نشاندہی پر ڈاکٹر نعمان اور جیمز کو گرفت میں لے لیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کار نہایت تیز رفتاری سے سیاہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

ہر منظر لمحے سے بھی کم وقت میں نظروں کی حد سے گزر کر اوجھل ہو رہا تھا۔ میں خالی الذہنی کے عالم میں سڑک کو گھور رہی تھی۔ میرے دل و دماغ ایک ہی نکتے پر جمے ہوئے تھے۔

''بابا......''

''نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟''

اُن تک یہ پریشان کن خبر کس نے اور کس انداز میں پہنچائی ہوگی؟

ان کا دل تو پہلے ہی بہت کمزور تھا۔ ڈاکٹرز نے تو خوشی کی کسی خبر کو بھی اچانک ان تک پہنچانے سے منع کیا ہوا تھا پھر دکھ کا تو بوجھ ہی الگ ہوتا ہے۔ وہ تو صحت مند دل سے بھی جینے کی امنگ چھین لینے کا ہنر جانتا ہے...... نہ جانے بابا نے کیا محسوس کیا ہوگا۔

انہیں اپنے اس گھر سے بہت پیار تھا...... یہ ہم سب جانتے تھے۔ وہ مادیت پسند نہیں تھے مگر بقول ان کے یہ گھر ان کی مکمل بائیوگرافی تھا۔ یہیں انہوں نے بچپن اور جوانی گزاری تھی۔ زندگی کے سب سے خوب صورت دن بتائے تھے اور یہیں ان خوشیوں کو خود سے چھنتے دیکھا تھا، اسی گھر میں کریم اور علی کا بچپن گزرا تھا اور خود میں نے بھی یہیں جینا سیکھا تھا۔

خطرہ تھا...... یہ ہم سب پہلے سے جانتے تھے اسی لیے کریم نے ہمیں اس گھر سے علی کے موروثی گھر میں منتقل ہونے پر مجبور کیا تھا مگر اس کے باوجود یہ سب اس طرح ہو جائے گا یہ کم از کم میں نے نہیں سوچا تھا۔

گھر کو اس طرح تباہ و برباد دیکھ کر خود میرا ذہن ماؤف ہو گیا تھا پھر اس پر بابا کی طبیعت کے بگڑ جانے کی خبر نے مجھ سے میرے ہوش و حواس ہی چھین لیے تھے تب ہی تو میں اپنی گاڑی تک کو وہاں بھول گئی اور ایک اجنبی کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی تھی۔

اس خیال کے آتے ہی جیسے میرے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ اب کار ایک قدرے ویران سی جگہ سے گزر رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک بھی برائے نام ہی تھا۔ یوں اگر یہ گنجان آباد علاقہ بھی ہوتا تب بھی کسی گڑبڑ کی صورت میں سیاہ شیشوں سے باہر کسی کو اس کا علم ہونے کے امکانات کم ہی تھے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے اس شخص کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے آپ کو بتایا تا کہ احمد صاحب کی طبیعت بگڑ گئی ہے اور انہیں کلینک لے جایا گیا ہے۔'' وہ اسی متانت سے بولا۔ ''وہ اب بس تھوڑا ہی دور ہے۔''

''مگر بابا تو کتابیں خریدنے گئے تھے۔ جو وہ کچھ ہی فاصلے پر موجود شاپنگ سینٹر میں موجود دکان سے لیتے ہیں پھر انہیں وہاں سے اتنے فاصلے پر کس کلینک میں لے جایا گیا ہے؟'' میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو میں نہیں جانتا۔'' وہ کندھا اچکاتے ہوئے بولا۔ ''مگر طبیعت خراب ہونے کے وقت وہ یہاں ایک شاپنگ مال میں موجود تھے۔''

''اچھا...... میں نے شاید آپ سے آپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔'' میں دل ہی دل میں اپنی بے وقوفی پر حیران تھی مگر اس وقت مجھے گھبراہٹ میں کچھ نہیں سوجھا تھا۔

''میرا نام......'' وہ مسکرایا۔ ''میرا نام فیروز ہے۔''

''تو فیروز صاحب آپ اتنی دور سے مجھے لینے آئے...... حیرت ہے کہ سکندر نے مجھے کال کیوں نہیں کی؟'' میں گویا خود کلامی کر رہی تھی۔

''کر رہے تھے مگر ملی نہیں...... یہاں کا پتا تو انہوں نے ہی بتایا......'' وہ سادگی سے بولا۔

مجھے سب کچھ گڑبڑ لگ رہا تھا۔ اب میں ذہنی صدمے اور اس جھٹکے سے باہر نکل آئی تھی۔ میرا بیگ میرے کندھے پر موجود تھا یعنی میرا موبائل میرے پاس ہی تھا۔ میں نے سوچا اور پھر بیگ گود میں رکھ کر موبائل باہر نکالا۔

''کال کر رہی ہیں آپ......؟'' اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا اور نمبر ملانے کے لیے موبائل کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

''ارے......'' وہ میری طرف دیکھ کر اچانک زور سے بولا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا، آنکھیں خوف سے پھیل سی گئی تھیں۔ ''یہ...... یہ آپ کے چہرے پر کیا ہو رہا ہے۔'' وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بمشکل بولا اور بریک پر پیر رکھ دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ جھٹکے سے میرے ہاتھ سے موبائل نکل کر نیچے جا گرا۔

''کک...... کیا ہوا ہے......؟'' اس کی سراسیمگی پر میں بھی پریشان ہو گئی۔

''آپ کا چہرہ...... یہ ہونٹوں کے اوپر......'' وہ خوف

زدہ انداز میں بولا۔

"کیا......؟" میں نے ہونٹوں کو چھونے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"رکیے...... پلیز...... رکیے......یوں ہاتھ مت لگایئے۔" وہ تقریباً اچھل پڑا۔ "یہ...... یہ لیجیے اس سے پونچھیے۔" اس نے جیب سے رومال نکال کر ڈرے ڈرے انداز میں میری جانب بڑھایا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"ایسا کیا ہو گیا ہے؟" میں نے رومال سے اپنی ناک اور ہونٹوں کو اچھی طرح پونچھتے ہوئے شیشے کو اپنی جانب گھمایا...... میرا چہرہ بالکل صحیح سلامت نظر آرہا تھا۔ "کچھ بھی تو نہیں ہوا ہے؟ کیا فضول ڈراما کر رہے ہیں آپ......؟ روکیے گاڑی...... مجھے یہیں اترنا ہے۔" میں نے بگڑ کر کہنا شروع کیا مگر آخری الفاظ تک آتے آتے میرا لہجہ، آواز سب ڈگمگانے لگے تھے، میں نے سر کو زور سے جھٹکا۔ "یہ...... یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟" میں اب بمشکل بول پا رہی تھی۔ "یہ کیا کیا ہے تم نے......؟" میں نے دھندلاتی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ میری طرف ہی متوجہ تھا۔ نظریں ملتے ہی وہ ویسی ہی سادگی سے مسکرایا۔ میں اس کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی مگر اس وقت میرے اندر خود اپنے ہاتھ کو حرکت دینے کی طاقت تک باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے خود پر قابو پانے کی آخری کوشش کی اور سیٹ کے نیچے گرے موبائل کی جانب دیکھا پھر اسی جگہ ڈھیر ہو گئی...... کریم کا خوف چوبیس گھنٹوں سے پہلے ہی سچ ثابت ہو گیا تھا۔ کار اب پھر ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔

☆☆☆

کریم آج صبح سے ہی بہت مصروف تھا۔

دو مسلسل میٹنگز کے بعد ابھی وہ ایک بریفنگ سے فارغ ہوا تھا۔ اسے آج اپنے گھر کی سیکیورٹی کے حوالے سے بھی کچھ خاص کام کرنے تھے جن کے لیے ابتدائی ہدایات وہ دے چکا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اب تک ضرورت کی تمام چیزوں، گیجٹس وغیرہ کا انتظام ہو چکا ہوگا اور اضافی نفری کے لیے بندے بھی چھانٹ لیے گئے ہوں گے...... وہ اس جانب سے ذرہ بھر بھی بے پروائی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ آخری میٹنگ میں اس نے ابراہام کی کال اور اس کی باتوں کو بھی شامل کر دیا تھا۔ اس کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج سے رہے تھے، اس کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی جس کی وجہ سے وہ خاصا پریشان تھا اور اسی لیے اس کی دھمکیوں کو وہ آن ریکارڈ بھی لے آیا تھا۔ وہ میٹنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں آیا۔ میز پر اس کا موبائل رکھا تھا۔ اس نے اسے آن کیا تو بیس سے زائد مس کالز دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ وہ ان کی تفصیل دیکھتا، اس سے قبل ہی اس کا اسسٹنٹ ارسلان آندھی طوفان کے مانند کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا بات ہے ارسلان؟" کریم نے اس کی جانب دیکھا۔

"سر...... وہ......" کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر غالباً صحیح الفاظ کا چناؤ مشکل ہو رہا تھا۔

"ارسلان کیا ہوا ہے......؟ صاف الفاظ میں بتاؤ۔" کریم نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"سر...... آپ کے بنگلے پر بم دھماکا ہوا ہے۔" اس کے یہ الفاظ کریم کی سماعت پر بم کے مانند گرے تھے۔

"کیا؟" وہ چلّا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "کیا بک رہے ہو تم؟ کب ہوا ہے یہ؟ میری فیملی خیریت سے ہے؟" وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

"نن...... نہیں سر...... اُس والے گھر پر نہیں...... آپ کے پرانے بنگلے پر......" اس بار ارسلان نے وضاحت سے کہا۔ "آپ کے بڑے بنگلے پر...... بم نہایت طاقتور بتایا جا رہا ہے، ارد گرد کے مکانات کو بھی نقصان پہنچا ہے مگر آپ کا گھر تقریباً تباہ ہو گیا ہے۔ دو گارڈز بھی جاں بحق ہوئے ہیں، باقی زخمی ہیں۔"

"اوہ......!" کریم اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ اس کا دل کسی ڈھول کی طرح بج رہا تھا مگر چہرے پر کوئی تاثر موجود نہ تھا۔ وہ ایک جانب اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ یہ دھماکا پرانے گھر میں ہوا تھا تو دوسری جانب گارڈز کی ہلاکت اور گھر کی تباہی کا شدید افسوس بھی تھا۔ وہ دو لمحے وہیں کھڑا رہا پھر موبائل اور چابیاں لے کر باہر کی سمت لپکا۔

"سر میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں پلیز......" ارسلان نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کو کسی کی ضرورت ہو۔"

"اوکے آجاؤ مگر باقیوں کو فوری کال کر کے الرٹ کر دو، کچھ لوگ گھر کی طرف جائیں اور سارے معاملات دیکھیں۔ جمشید سے کہو کہ وہ آپریشن سیفٹی پر تیزی سے عمل شروع کرے اور ہاں یہ خبر کتنی دیر پہلے ملی تھی؟"

"ابھی سر...... ہمیں ابھی معلوم ہوا ہے مگر یہ واقعہ غالباً آدھا گھنٹا پہلے پیش آیا ہے۔"

"اوکے ٹیم کو جلد بھجوا دو...... مجھے پہلے کچھ اور کام

نمٹانے ہیں پھر میں وہاں پہنچ رہا ہوں اور ہاں شمس کی ڈیوٹی گارڈز کے ساتھ اسپتال میں ہے۔ وہ فوری طور پر معلوم کرے کہ انہیں کہاں لے جایا گیا ہے، ان کے علاج میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔"

"جی سر...... میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے سر۔" وہ نمبر ملاتے ہوئے بولا۔

کریم کو بابا کی فکر ہو رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُن تک یہ خبر دہچکے والے انداز میں پہنچے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے علی کا نمبر ملایا، اس کا نمبر مصروف آرہا تھا پھر اس نے گھر کا نمبر ملایا۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں مگر کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ ہر گھنٹی کے ساتھ اس کے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"ہیلو......" بالآخر کال ریسیو ہو گئی۔

"صفیہ جی...... فون اتنی دیر سے بج رہا ہے...... سب لوگ کہاں ہیں؟ کال ریسیو ہونے میں اتنی دیر کیوں لگ گئی۔" اس نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

"بابا...... بابا کہاں ہیں؟" کریم نے پوچھا۔ "ان کے لیے کوئی بھی فون آئے یا گھر میں کسی اور کا فون بھی آئے تو ان سے بات مت کروانا...... سارہ بی بی سے کہیں کہ بابا کا موبائل فون بھی کچھ دیر کے لیے غائب کر دے اور مجھے کال کرے...... ویسے میں بس گھر آرہا ہوں۔"

"کریم بھائی بڑے صاحب تو گھر پر ہیں ہی نہیں...... اور اپنا موبائل تو وہ ساتھ لے کر گئے۔" صفیہ نے کہا۔

"اوہ...... بابا کہاں گئے ہیں؟" کریم نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو معلوم نہیں مگر کتابیں لائیں گے، یہ کہہ رہے تھے۔"

"کون کون گیا ہے؟" کار اب سڑک پر آچکی تھی۔

"بڑے صاحب، نئی والی بی بی صاحب اور سکندر گیا ہوا ہے ان کے ساتھ۔" صفیہ نے کہا۔

"کتنی دیر ہو گئی انہیں نکلے ہوئے؟" کریم نے پوچھا۔

"ایک گھنٹا تو ہو چکا ہے۔" وہ بولی۔ "اب آنے ہی والے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے سارہ بی بی اُن کے ساتھ نہیں گئیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، وہ آرام کرنا چاہ رہی تھیں۔"

"او کے...... میری اس سے بات کروا دیں پلیز......" کریم نے کہا، ارسلان پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، وہ مسلسل فون پر تھا۔

"مگر کریم بھائی سارہ بی بی بھی گھر پر نہیں ہیں۔"

"وہ کہاں گئی ہے؟"

"پتا نہیں صاحب، پر یہ معلوم ہے کہ ایک فون آیا تھا جس کے بعد وہ آندھی طوفان کی طرح گھر سے نکل گئیں۔"

"اوہ......" کریم نے اتنا کہہ کر کال کاٹ دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب سارہ کہاں گئی ہے؟ کس کا فون آیا تھا؟ اس نے علی کو کال ملانے سے قبل مس کالز پر نظر ڈالی...... سارہ کی دو کالیں موجود تھیں۔ اس نے تقریباً پینتیس منٹ قبل اسے کال کیا تھا۔ کریم نے سارہ کے نمبر پر کال کی...... وہاں مسلسل بیلز بج رہی تھیں اور پھر فون بند ہو گیا، دوسری کوشش میں بیلز کے بجائے رابطہ ممکن نہیں ہے کی ریکارڈنگ سنائی دینا شروع ہو گئی۔

"اوہ نو......" وہ بڑبڑایا۔ صورتِ حال ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گمبھیر ہوتی نظر آرہی تھی۔ پہلے وہ گھر پہنچنا چاہ رہا تھا مگر اب جبکہ گھر پر کوئی موجود ہی نہیں تھا، اس نے گاڑی کا رخ پرانے بنگلے کی جانب موڑ دیا۔ اب اس نے بابا کا نمبر ملایا۔

"جی بیٹا......" دوسری بیل پر بابا کی ہشاش بشاش آواز سن کر اسے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔

"آپ کہاں ہیں بابا......؟" اس نے پوچھا۔

"ہم بس گھر جا رہے ہیں کچھ کتابیں وغیرہ لینی تھیں، سونیا بھی عرصے سے باہر نہیں نکلی تو اس لیے بک اسٹور کا چکر لگایا...... تم کہاں ہو......؟" وہ بولے۔

"میں بھی گھر آرہا ہوں بابا...... سارہ کہاں گئی ہے؟ کیا آپ کے علم میں ہے؟" اس نے لہجے کو عام رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ پریشان ہوں۔

"وہ تو گھر پر ہے بیٹا...... اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے وہ ہمارے ساتھ بھی نہیں آئی۔"

"بابا وہ کہیں باہر گئی ہے...... اس صورتِ حال میں اس کا اکیلا جانا اور یہ پتا نہ ہونا کہ وہ کہاں ہے، تھوڑی تشویش میں ڈال رہا ہے۔" اس نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"میں اُسے کال کرتا ہوں......" بابا بولے۔

"کال نہیں لگ رہی ہے بابا...... آپ گھر پہنچیں... سونیا کا باہر نکلنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ کل ابراہام کی گفتگو

کے بعد زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... ہم بس گھر پہنچ رہے ہیں۔ یہ خیال میرے دل میں بھی آرہا تھا مگر سونیا نے ماسک لگالیا تھا تاکہ کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے بابا...... آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔" کریم نے کہا۔

بابا کے فون بند کرنے کے بعد اس نے دوبارہ علی کا نمبر ملایا۔ اب وہ بنگلے کے کافی قریب پہنچ گیا تھا۔

"لیس بگ برادر......" علی کی آواز سن کر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے گھر کی تباہی کے بارے میں ابھی علم نہیں ہوا تھا۔

"تم کہاں تھے؟ میں کال کررہا تھا۔"

"میں آپریشن تھیٹر میں تھا، ابھی باہر آیا ہوں...... سب خیر ہے نا؟" اس نے چوکنا سا ہوکر پوچھا۔

"علی اپنے گھر پر بم دھماکا ہوا ہے...... پرانے والے گھر پر......" کریم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اوہ......" علی بالکل چپ ہوگیا پھر بولا۔ "کیا ہوا ہے؟ وہاں گارڈز بھی تھے۔"

"ہاں میں وہیں جارہا ہوں، دو گارڈز جاں بحق ہوئے ہیں باقی زخمی ہیں۔ بتایا جارہا ہے کہ شدت بہت تھی اور گھر مکمل طور پر تباہ ہوگیا ہے۔" اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"اُف......" علی نے کہا۔ "بابا کو پتا چل گیا ہے؟"

"نہیں...... وہ اسٹور سے گھر جارہے ہیں، سونیا اور سکندر اُن کے ساتھ ہیں، میں یہاں آیا ہوں اگر تمہارے لیے ممکن ہے تو تم گھر چلے جاؤ، بابا کو احتیاط سے یہ سب بتاؤ...... اللہ انہیں صحت مند رکھے۔"

"میں گھر جارہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں یہاں سے وہیں آؤں گا...... سارہ کو کال کرنے کی کوشش کرتے رہنا، اس وقت اس کی کال نہیں لگ رہی۔"

"وہ کہاں گئی؟"

"مجھے علم نہیں ہے۔ صفیہ بی کے مطابق کسی فون کے بعد وہ گھر سے نکلی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید اسے گھر کی خبر مل گئی ہے وہ اسی وجہ سے نکلی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں گھر پر مجھے مل جائے۔" کریم نے کہا۔ "اس کی مس کال ہے۔ میں نے کل کہا بھی تھا کہ بہت محتاط رہنا ہے، خیر دیکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ہمت رکھیں بھائی...... مجھے یقین ہے کہ ہماری نارزن وہیں ہوگی۔ مکان دوبارہ بن جاتے ہیں، ہاں گارڈز کا بہت افسوس ہے۔" علی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اور یہ جس کا کام ہے اسے ہم جانتے ہیں...... اب اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

"بالکل۔" کریم نے مضبوط لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

وہ جانتا تھا کہ اس سب کے پیچھے ابراہام تھا، اس نے اپنا کھیل شروع کردیا تھا۔ اسے اس سب سے زیادہ سارہ کی فکر تھی۔ 'ایک تو یہ لڑکی کسی کی سنتی نہیں ہے۔' وہ بڑبڑایا۔ 'جو بھی تھا اسے گھر سے اس طرح نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بہادر کا مطلب حماقت ہرگز نہیں ہوتا۔' اسے امید تھی کہ سارہ وہیں گئی ہوگی مگر اس صورت میں اس کا فون نہ لگنا عجیب سی بات تھی۔ گھر کے سامنے پہنچ کر وہ بھی ایک منٹ کے لیے گم صم سا ہوکر رہ گیا تھا۔ وہاں اب گھر کے نام پر صرف کھنڈر سا ہی بچا تھا جس سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کی ٹیم کے لوگ بھی وہاں موجود تھے جو تمام معاملات کو سنبھال رہے تھے۔ کچھ آگے جاکر اسے سڑک کے کنارے پر سارہ کی کار نظر آئی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا مگر کار خالی تھی۔ سارہ کا اردگرد کہیں بھی نام ونشان تک نہیں تھا۔

"ارسلان تم معلوم کرو کہ کسی نے اس کار سے اترنے والی کسی لڑکی کو دیکھا ہے اور یہ کہ وہ کس طرف گئی ہے جو بھی معلومات مل سکیں حاصل کرو، ٹیم کے باقی لوگوں کو بھی اس کام پر لگاؤ۔"

سارہ یہاں آئی تھی، یہ تو معلوم ہوگیا تھا مگر یہاں سے وہ کہاں گئی، یہ ایک بڑا سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

کریم اور اس کے ساتھیوں نے نہ صرف اس سڑک بلکہ اردگرد کی گلیوں کو بھی چھان مارا، سارہ کا نہ تو کہیں پتا تھا اور نہ ہی کسی نے اسے دیکھا تھا۔ وہ سب موبائل پر اس کی تصویر دکھا کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ وہاں یوں بھی اتنی گڑبڑ تھی کہ کسی کو کسی کے بارے میں کچھ معلوم تھا نہ یاد آیا، آخر میں جب وہ انتہائی مایوس ہو چکے تو سڑک پر موجود ایک سپاہی نے اس کی تصویر کو پہچان لیا۔

"ہاں جی...... یہ بی بی آئی تھی...... میرے سامنے گڈی سے اتری اور یہاں سڑک پر آکر کھڑی ہوگئی۔ اس وقت آگ بجھائی جارہی تھی۔ کسی کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے یہ اسی لیے یاد رہ گئی کہ میرے بہت آواز دینے پر بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی۔ بہت پریشان تھی۔

اس سے پہلے کہ میں اس کو یہاں سے ہٹاتا وہ ایک دوسری گڈی میں بیٹھ کر چلی گئی جبکہ اس کی اپنی گڈی اِدھر ہی کھڑی رہ گئی...... زندگی صاحب جی ان امیروں کی ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''وہ گاڑی میرا مطلب ہے کہ گڈی کیسی تھی جس میں وہ بیٹھ کر گئی تھی؟'' کریم نے بے تابی سے پوچھا۔

''شاندار تھی جی...... بادشاہوں والی...... چمکدار......'' اس نے سر ہلایا۔

''تمہیں اس کا نمبر یاد ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''نہ جی، اس وقت یہاں اتنا مسئلہ تھا...... اس کا تو ہوش نہیں تھا کہ سب گڈیوں کے نمبر دیکھ کر یاد کرتا جی میں۔'' وہ بُرا مان کر بولا۔

''ظاہر ہے...... اچھا اس گاڑی کو کون چلا رہا تھا؟ اس سے کوئی نیچے اترا تھا؟ تم نے کسی کو دیکھا؟'' کریم نے پوچھا۔

''ہاں جی...... جوان آدمی تھا، اونچا لمبا...... شاندار گبرو......'' وہ بولا۔ ''تب ہی تو گئی ہوگی نا وہ...... آپ لوگ کون ہو جی...... اس لڑکی نے کیا کیا ہے؟ اس دھماکے میں تو شامل نہیں تھی، آج کل کسی کا کچھ پتا نہیں چلتا...... کون کیا کر جائے؟'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔

''وہ گاڑی کس طرف گئی تھی؟'' کریم نے اس کے سوالوں اور تبصروں کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ جی وہ اُس طرف نکلی تھی۔'' سپاہی نے مخالف سمت کی جانب اشارہ کیا۔ ''ایسے تیر کی طرح گئی گڈی...... لمحہ بھر میں غائب جیسے کوئی جہاز ہو۔'' کریم خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''یہ بتاؤ...... کیا تم اُس شخص کا حلیہ بتا سکتے ہو؟'' ارسلان نے اس سے پوچھا۔

''آپ لوگ کون ہو؟ یہ سوال تو پولیس کرتی ہے آپ پولیس سے سوال کیے جا رہے ہو؟'' اس بار اس نے مشکوک انداز میں انہیں دیکھا۔

''ہاں...... کیونکہ ہم خفیہ والے ہیں۔'' ارسلان نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کے الفاظ سن کر سپاہی نے باقاعدہ سیلوٹ جھاڑا۔ ''اب بتاؤ اس کا حلیہ صحیح سے بتا سکتے ہو؟''

''جج جی...... کوشش کر سکتا ہوں۔'' وہ مؤدب انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے ارسلان تم اِسے لے جاؤ اور اسکیچ بنوا لو۔'' کریم نے کہا۔ اس کے بدترین اندیشے سچ ثابت ہو گئے تھے۔ وہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا، اسے بدترین حالات میں بھی اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے قدم اٹھانے کی عادت تھی مگر اس وقت مایوسی، فکر، ٹینشن اور ذہنی دباؤ نے اسے گویا شکار کر لیا تھا۔ سارہ نہ جانے کہاں تھی؟ کس حال میں تھی؟ وہ سیاہ گاڑی والا کون تھا؟ اور وہ اسے کہاں لے گیا تھا؟ سوالات اسے اپنی گرفت میں جکڑتے جا رہے تھے اور اس کے پاس ان میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

شمشیر اپنے مشن پر لگا ہوا تھا۔ اسنوکر کلب میں فیروز سے ٹاکرے کے بعد اس نے فارم ہاؤس کی باقاعدہ نگرانی شروع کر دی تھی۔ جونز اور ڈاکٹر سلمان ابھی وہیں مقیم تھے۔ فارم ہاؤس میں موجود مخصوص ملازمین کے علاوہ علاقے کے بھی لوگ وہاں کام کر رہے تھے۔ دو دنوں کی نگرانی اور ریسرچ کے بعد اس نے ان میں سے اپنے لیے ایک مددگار حاصل کر لیا تھا۔ فرید نامی یہ بائیس تیئس سالہ لڑکا فیروز اور اس کے اہم ملازمین کی سختی اور بُرے رویے کا ستایا ہوا تھا۔ اسی لیے چند بڑے نوٹوں کے دیدار نے اس کی ڈھلمل ہوتی وفاداری کو شمشیر کی سمت کھینچ لیا تھا۔ اس کے مطابق وہ دونوں کل شام ملک سے باہر جانے والے تھے۔

''کیا تمہیں یقین ہے؟'' اس نے پوچھا۔ وہ اس وقت فارم ہاؤس سے کچھ فاصلے پر موجود ڈھابے پر موجود تھا۔

''سو فیصد یقین ہے۔'' وہ بولا۔ ''وہ دونوں ملک سے باہر چلے جائیں گے۔''

''مجھے ان کی ایک چیز اُن سے واپس لینی ہے۔ اگر وہ چلے گئے تو پھر ان سے ملنا ناممکن ہوگا۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''کیا تم میرے فارم ہاؤس میں داخلے کا کوئی راستہ نکال سکتے ہو۔''

''جی ہاں کر سکتا ہوں مگر اس میں سارا کام آپ کو کرنا ہوگا...... میں دن میں وہاں ہوتا ہوں کل صبح میں اندر جانے کے بعد آپ کے لیے مخصوص پچھلا چھوٹا دروازہ تھوڑی دیر کے لیے کھلا چھوڑ دوں گا۔ آپ کو اس سے اندر آنا ہے اور اندر موجود کمروں تک جانا ہے، دوسرا اور تیسرا کمرا ان کے پاس ہے۔''

''فارم ہاؤس میں ان کے علاوہ کون ہے؟''

''کوئی اور مہمان نہیں ہے اور فیروز صاحب بھی نہیں ہیں یہاں...... جب وہ یہاں ہوتے ہیں تب ان کے ذاتی ملازم اور عملہ بھی آجاتا ہے۔ فی الحال تو گارڈز اور یہیں کے

ملازم ہیں۔ یہ سب ملا کر سات لوگ ہیں۔"

"او کے...... یہ بتاؤ کہ وہاں کتنی گاڑیاں ہیں؟"

"دو ہیں، ایک چھوٹی کار ملازمین استعمال کرتے ہیں اور دوسری بڑی گاڑی مہمانوں کے لیے ہے۔ یہ مہمان تو جب سے آئے ہیں کہیں باہر نہیں نکلے اب کل ائرپورٹ جائیں گے۔"

"تم صبح کتنے بجے وہاں جاؤ گے؟"

"صبح آٹھ بجے۔" اس نے کہا۔ "وہ دروازہ تھوڑی دیر ہی کھلا رہ سکے گا لہٰذا آپ بھی آٹھ تک پہنچ جایئے گا...... میرا نام تو نہیں آئے گا نا کسی بات میں......؟"

"نہیں، تم بس اپنا منہ بند رکھنا، میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔" شمشیر بولا اور جیب سے چند بڑے نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیے۔

"بہت شکریہ سر......" وہ نوٹ دیکھ کر نہال ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی شمشیر اس ڈھابے پر بیٹھا رہا تھا۔

فارم ہاؤس میں اس طرح گھسنا خطرناک تھا مگر اس سے زیادہ ناقابلِ برداشت ان دونوں کا اس طرح بہ آسانی ملک سے باہر نکل جانا تھا، ان کے ہاتھ بے شمار بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ ان بم دھماکوں سے قبل بھی نہ جانے وہ کتنی وارداتیں کر چکے تھے اور اب اس طرح مکھن سے بال کے مانند ان کا اپنے گھروں کو لوٹ جانا ان سب کے ساتھ زیادتی تھی۔

"وہ جائیں گے...... ضرور جائیں گے مگر ائرپورٹ نہیں...... کہیں اور......" وہ بڑبڑایا اور میز پر رکھے چائے کے کپ کو ہونٹوں سے لگا لیا، اسے اب صبح ہونے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

فیروز نہایت اطمینان سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

اس نے ایک نظر پسنجر سیٹ پر موجود سارہ پر ڈالی۔ وہ اسی طرح بے ہوش تھی۔ اس نے جس رومال سے اپنے چہرے کو اچھی طرح پونچھا تھا، اس پر موجود بے ہوشی کی انتہائی زود اثر دوا اسے مزید کئی گھنٹے دنیا و مافیہا سے بے نیاز رکھنے کے لیے کافی تھی۔ اس دوا کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں کسی طرح کی بو موجود نہیں تھی۔ ابراہام نے اس لڑکی کے حوالے سے اسے بہت کچھ بتایا تھا مگر فیروز کے لیے تو اسے ساتھ لے آنا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا شاید اس کی وجہ حالات تھے مگر بہرحال اس کا مشن کامیاب رہا تھا۔ اس نے طمانیت سے سوچا۔ انسان کو رشتے ہی سب سے زیادہ کمزور بناتے ہیں۔ اسی لیے وہ کسی رشتے کا روادار نہیں تھا۔ اس نے سارہ کو سیٹ پر بٹھا کر سیٹ بیلٹ لگا دی تھی جس سے اسے چوٹ پہنچنے کا خطرہ بھی ختم ہو گیا تھا اور دیکھنے سے یہی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ سو رہی ہو۔

پہلے اس نے اسے فارم ہاؤس لے جانے کا فیصلہ کیا تھا مگر چند لمحے پہلے اس نے اس فیصلے کو خود ہی مسترد کر دیا تھا۔ وہاں جونز اور سلمان وغیرہ موجود تھے اور ان کی موجودگی میں وہ اسے وہاں لے جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ دوسری وجہ وہ پولیس افسر تھا۔ فارم ہاؤس سے کچھ ہی فاصلے پر اس کا ایک بنگلا موجود تھا۔ اس نے اسی کا رخ کیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بنگلے پر تھا۔ اسے اس طرح اچانک وہاں دیکھ کر چوکیدار اور گارڈ سب مستعد ہو گئے تھے۔ اس کی گاڑی کے اندر داخل ہونے کے بعد گیٹ بند ہو گیا۔

"جمشید کہاں ہے؟" اس نے گاڑی سے اترتے ہی اس جگہ کے انچارج کے بارے میں پوچھا۔

"پہنچ رہے ہیں باس......" گارڈ کے ساتھ موجود شخص نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ اتنے میں ایک درمیانی عمر کا شخص تقریباً دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔

"سلام باس......" اس نے آتے ہی کہا۔ "جمشید یہاں موجود میرے کمرے کو کھلواؤ اور کسی کو بھیج کے کسی عورت کو بلوا لو یہاں ایک مہمان چند دن ٹھہرے گا۔"

"جی بہتر سر...... وہ ابھی پہنچنے والے ہیں۔"

"وہ پہنچ گئی ہے...... کمرا کھلواؤ......" وہ مڑ کر سرد لہجے میں بولا اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر سارہ کو بازوؤں پر اٹھا لیا اور خود ہی اسے اس کمرے تک لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کئی گھنٹوں تک ہوش نہیں آئے گا مگر وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے اسے لٹانے کے بعد اس نے الماری سے ہتھکڑی نما ایک گیجٹ نکالا اور اسے اس کی کلائی میں پہنا کر دوسرے حصے کو مسہری کے ساتھ منسلک کر دیا۔ اس گیجٹ کا چھوٹا سا ریموٹ کنٹرول اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس کی مدد سے بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے قابو میں رکھا جا سکتا تھا۔ اول تو اسے کھول کر بستر سے بھاگنا ممکن نہیں تھا اور اگر کسی طور یہ ہو بھی جاتا تو وہ صرف ایک بٹن دبا کر بجلی کے جھٹکے یا کرنٹ لگا کر اسے روک سکتا تھا۔ کرنٹ کی یہ شدت معمولی سے شروع ہو کر نو ڈیجیٹ تک تھی۔ نو ڈیجیٹ کا مطلب برقی موت تھی کیونکہ اتنی شدت کا کرنٹ انسان کی برداشت سے بہت

زیادہ ہوتا ہے۔

اس انتظام سے فراغت پاکر وہ بستر کے ایک جانب موجود آرام دہ کرسی پر دراز ہو گیا۔ ابراہام کی بتائی ہوئی تفصیل کے بعد اس نے اس آپریشن کو خود کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اب اسے دیکھ کر اپنے فیصلے پر خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے ذہن میں آنے والا پہلا خیال ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مزید واضح ہوتا جارہا تھا۔

وہ خوب صورت تھی...... نہایت خوب صورت اور خطرناک بھی...... اسے یہ دونوں خصوصیات پسند تھیں۔ اس کی نگاہیں سارہ کے چہرے پر جمی تھیں اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی جبکہ اس کا ذہن آنے والے دنوں کے حوالے سے ایک پلان تراش رہا تھا۔

☆☆☆

شمشیر ابھی ڈھابے پر موجود تھا۔ یہاں سے اس کے لیے فارم ہاؤس جانے والے رستے کی نگرانی کرنا آسان تھا۔ یہیں پر اسے فرید ملا تھا۔ اس وقت اس کا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ شلوار قمیص کے ساتھ چادر کی بُکل مارے وہ وہاں موجود افراد سے بہت زیادہ مختلف نظر نہیں آرہا تھا اور یہی اس کا مقصد بھی تھا۔

جم سے واپسی کے بعد وہ کپڑے تبدیل کر کے سیدھا یہاں آیا تھا۔ فرید کے جانے کے بعد اس نے کھانے کا آرڈر دیا...... کل صبح اسے کم از کم اس کیس کا ڈراپ سین تو کرنا ہی تھا۔ وہ یہ تو جان گیا تھا کہ یہ کھیل بہت لمبا تھا اور ان خونی قاتلوں کے پیچھے بہت مضبوط ہاتھ موجود تھے۔ وہ ایک اعلیٰ افسر ہونے اور تمام ثبوتوں کے باوجود ان کا بال تک بیکا نہیں کر پایا تھا۔ ان لوگوں کی ڈوریاں کون ہلا رہا تھا؟ انہیں یہ سب کرنے کا ایجنڈا کس نے دیا تھا؟ اس کے لیے پیسہ کون فراہم کر رہا تھا؟ فی الحال اس کے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ پہلے اس نے اس حوالے سے جونز وغیرہ کو ٹارگٹ کرنے کا سوچا تھا مگر اب اس کا وقت نہیں تھا۔

''صاب جی...... اور چائے لاؤں؟'' ڈھابے والے لڑکے کی آواز سن کر وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔

''ہاں لے آؤ اور کچھ کھانے کو بھی لاؤ۔'' وہ کچھ دیر مزید بیٹھنا چاہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے صاب......'' لڑکا مؤدبانہ انداز میں کہہ کر مڑ گیا، اس وقت کھانے کے وقت کی وجہ سے ڈھابے پر تھوڑا بہت رش تھا ورنہ عام طور پر لوگ آتے جاتے رہتے تھے خصوصاً فارم ہاؤسز میں تفریح کے لیے آنے والے رک کر چائے اور کھانا وغیرہ لیتے جو کہ ان کی اصل کمائی تھی۔

''فیروز......'' اس کی سوچ اس نام کے گرد گھوم رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ نہایت بارسوخ انسان تھا، پیسے کی بالکل کمی نہیں تھی مگر اسے یقین تھا کہ اس سارے کھیل کا بنیادی کھلاڑی وہ بھی نہیں تھا۔

وہ یہی سب سوچ رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے سے آتی سیاہ قیمتی کار پر پڑی۔ یہاں اس قسم کی قیمتی گاڑیوں کی تھوڑی تھوڑی دیر بعد آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ اصل چیز جس نے اس کو متوجہ کیا تھا وہ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود فیروز تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ پر کوئی خاتون موجود تھی، وہ اسے زیادہ دیکھ نہیں پایا مگر نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے اسے کہیں دیکھ رکھا ہو۔

فیروز کے اس طرف آنے کا مطلب اس کے پلان کے لیے خطرہ نہیں تو بھی مشکلات میں اضافہ تو لازمی طور پر تھا جیسا کہ فرید نے بتایا تھا کہ فیروز کی آمد کے بعد حفاظتی انتظامات نہایت سخت ہو جاتے تھے اور اس کا اپنا اسٹاف بھی وہاں پہنچ جاتا تھا جس کی وجہ سے فارم ہاؤس میں نفری بسا اوقات دگنی ہو جاتی تھی۔ ایسے میں وہاں داخل ہونا اور کوئی کارروائی کر پانا قدرے مشکل ہو جاتا مگر وہ کار اس کے سامنے سے گزر کر فارم ہاؤس کی جانب بڑھنے کے بجائے سیدھی نکلتی چلی گئی۔

شمشیر نے صرف ایک لمحے سوچا اور پھر میز پر پانچ سو کا نوٹ ڈال کر تیزی سے اپنی کرولا کی جانب لپکا...... کچھ ہی دیر میں اسے وہ سیاہ کار نظر آ گئی تھی۔ وہ خاصے فاصلے سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر کار سیدھے ہاتھ پر مڑی اور وہاں موجود ایک بڑے بنگلے کے سامنے رکی۔ چند لمحوں بعد بنگلے کا دروازہ کھل گیا تھا جس نے اس سیاہ کار کو نگل لیا...... اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گیٹ بند ہو گیا۔ شمشیر غور سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ ڈھابے پر اس کا بیٹھنا رائگاں نہیں گیا تھا، اسے اس پُراسرار شخص کے ایک اور ٹھکانے کا سراغ مل گیا تھا۔

☆☆☆

''آخر وہ اس طرح کہاں غائب ہو سکتی ہے؟'' علی انتہائی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ''اس کی جان کو خطرہ ہے، ہمیں فوری طور پر کچھ کرنا چاہیے۔''

''ہاں...... سارے سراغ گھر کے پاس پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ وہاں پہنچی تھی۔ یقیناً کسی نے اسے اس سب

کی اطلاع دی...... صفیہ بی کے مطابق کوئی فون کال آئی تھی جس کے بعد ہی وہ گھر سے نکلی...... میں نے گھر کے فون اور سارہ کے موبائل کا ریکارڈ نکلوایا ہے، وہ کچھ دیر میں ہمیں مل جائے گا۔ جس سے معلوم ہو سکے گا کہ کس کی کال پر وہ گھر سے نکلی جب وہ وہاں پہنچی تو کسی اور خبر یا بات کر کے وہاں سے لے جایا گیا۔" کریم بولا۔

"خبر یا بات......؟" سونیا نے اس کی بات کو دہرایا۔

"ہاں...... یا تو اُسے بابا کے بارے میں کچھ بتایا گیا ہوگا یا ہمارے گھر اور ہم میں سے کسی کے بارے میں، تب ہی تو وہ اپنی کار کو چھوڑ کر اس کار میں بیٹھ گئی۔ اس کے سوا کوئی اور طریق کار نہیں ہو سکتا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" سونیا نے پوچھا۔

"اس پر قابو پانا آسان کام نہیں ہے...... مسلح شخص کو وہ خالی ہاتھ پیروں سے زمین پر ڈھیر کر سکتی ہے۔" کریم کے لہجے میں فخر سا تھا۔ "پھر وہاں اس وقت اتنے لوگ اور اتنی پولیس موجود تھی وہاں سے زبردستی کسی کو لے جایا جانا ممکن نہیں تھا۔"

"نہ جانے میری بچی کہاں ہوگی؟" بابا نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ سب میری وجہ سے ہی ہے، ابراہام کی دشمنی مجھ سے ہے میرے بچوں کو اس کا ہی نقصان پہنچ رہا ہے...... یہ سب میری وجہ سے ہی ہو رہا ہے بیٹا...... میں اس کے لیے خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں بابا...... آپ کے بچے کوئی چھوئی موئی کا درخت تو ہیں نہیں پھر ہمارا تو کام ہی ہے مشکلات سے ٹکرانا...... سارہ کو کچھ نہیں ہوگا...... آپ فکر نہ کریں جس طرح وہ غضنفر کو لے کر آئی تھی، اس بار ہو سکتا ہے کہ وہ اس سارے چکر کو ختم کر ڈالے۔" علی ان کی طبیعت کو بگڑتا دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں علی...... اس سب کی وجہ میں ہوں...... میری وجہ سے وہ تم لوگوں کو کبھی چین سے جینے نہیں دے گا، اس نے کہا تھا نا کہ دوسری بیٹی کی...... میرے منہ میں خاک......"

"کچھ نہیں ہوگا بابا...... آپ خود کو سنبھالیں۔" کریم ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"میں یہاں ان کے کچھ لوگوں کو جانتی ہوں مگر اب ان میں سے کوئی بھی فیلڈ میں نہیں ہے...... غضنفر گرفتار ہے، اسے یہاں کے یونٹ کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے شاید وہ کچھ بتا سکے۔" سونیا سوچتے ہوئے بولی۔

"ہاں، غضنفر سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔" کریم نے کہا۔ "فی الحال تم کو بھی لو پروفائل رہنا ہے، اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم بابا کے پاس پہنچ گئی ہو۔"

"ہاں، میں سمجھتی ہوں مگر ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی تو نہیں بیٹھ سکتے۔"

"بالکل...... وہ جلد مل جائے گی۔" کریم نے کہا اور واش روم کی جانب بڑھا۔ اس کے پُرسکون اور پُرحوصلہ چہرے اور باتوں کے پیچھے کس قدر خوف تھا، وہ صرف وہی جانتا تھا۔ کسی بھی خطرناک سے خطرناک مہم میں کود جانا یا کسی جان لیوا جنگ میں کود پڑنا بھی اتنا تکلیف دہ اور دہشت زدہ کر دینے والا نہیں ہوتا جتنا اپنے کسی پیارے کو اس طرح خود سے دور محسوس کرنا، خطرے میں گھرا دیکھنا اور خود کچھ نہ کر پانا انسان کو اندر سے توڑ ڈالتا ہے۔

"بابا......" علی کی قدرے تیز آواز نے کریم کے قدم روک لیے۔ "بابا...... آپ ٹھیک ہیں...... سونیا پلیز میرے کمرے سے میرا بیگ لاؤ...... بھائی، بابا بہتر نہیں ہیں۔" وہ زور سے بولا۔

"بابا......" کریم بھی تیزی سے اُن کے قریب پہنچا مگر وہ اس دوران بے ہوش ہو چکے تھے۔ ان کی رنگت سفید ہو رہی تھی۔

"گاڑی نکلوائیں بھائی، بابا کو اسپتال لے جانا ہوگا۔" علی نے کہا۔

"سکندر......" کریم دوڑتا ہوا پورچ میں پہنچا تھا۔

"بابا......" سونیا اُن کا ہاتھ سہلا رہی تھی۔ "کیا ہوا ہے علی؟ بابا ٹھیک ہو جائیں گے نا؟"

"سب ٹھیک ہوگا ان شاء اللہ۔" علی نے کہا اور بابا کو گود میں اٹھا کر کار کی طرف بڑھا۔

"سونیا تم یہیں رکو......" علی نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" کریم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اسے ساتھ لے چلو، شاید بابا اس سے بات کرنا چاہیں دوسرے یہاں اسے اکیلا چھوڑنا بھی مناسب نہیں ہے۔"

سونیا ان سب باتوں سے بے نیاز بابا کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ شاید اسے خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ ایک ماہر ایجنٹ ہے۔ موساد کی تنظیم کی... پروجیکٹ چیف...... مارشل آرٹ کی ماہر، بہترین نشانچی...... اس وقت وہ صرف ایک پریشان اور خوف زدہ

بیٹی تھی جس کی نگاہیں باپ کے بے ہوش چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اگلے لمحے ان کی کار سڑک پر تھی۔ سکندر مشاقی اور تیزی سے انہیں اسپتال کی طرف لے جارہا تھا۔ اسپتال پہنچتے ہی بابا کو انتہائی نگہداشت میں لے جایا گیا تھا، علی ان کے ساتھ تھا۔ سونیا اور کریم آئی سی یو کے دروازے کے باہر کھڑے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

علی آدھے گھنٹے بعد آئی سی یو سے باہر نکلا...... سونیا اور کریم دونوں ہی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے دل اندیشوں سے بھرے ہوئے تھے۔ علی ان کی جانب دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرایا اور کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

"بابا...... بابا کیسے ہیں؟" سونیا نے پوچھا۔

"بہتر ہیں اب......" وہ بولا۔ "انہیں مائنر ہارٹ اٹیک (ہلکا سا دل کا دورہ) ہوا تھا۔ شکر ہے کہ ہم انہیں بروقت اسپتال لے آئے...... اب وہ قدرے بہتر ہیں مگر آج رات انہیں آئی سی یو میں ہی رکھا جائے گا۔"

"شکر ہے اللہ کا۔" کریم بولا۔ "مجھے یہی خطرہ تھا کہ بعد دیگرے کچھ نہ کچھ ہوئے ہی جارہا تھا، آخر ان کا دل یہ سب کتنا سہارے گا۔"

"شکر ہے۔" سونیا بولی۔ "اب وہ خطرے سے باہر ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، شکر ہے، اللہ کرے کہ کل ہم انہیں روم میں شفٹ کر سکیں۔" علی بولا۔ "درمیان میں انہیں ہلکا سا ہوش آیا تھا تب بھی وہ سارہ اور سونیا کا نام لے رہے تھے۔ انہوں نے اس سب کی بہت ٹینشن لے رکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ سب کچھ ہے بھی بہت پریشان کن۔"

"تم ان کا خیال رکھو علی...... جب انہیں ہوش آئے تو انہیں بتانا کہ کریم، سارہ کو لے کر آئے گا...... اس وقت ہماری پہلی ترجیح سارہ ہے...... سارہ کے واپس آنے کے بعد ہمیں اس سارے معاملے کو دیکھنا ہوگا، اس چکر کو ختم کیے بغیر اُلجھنیں ختم نہیں ہوں گی نہ ملک کے لیے اور نہ ہی ہمارے لیے۔" کریم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔" سونیا نے کہا۔ "اس کے فوراً بعد ہمیں کوئی اسٹریٹجی بنانی ہوگی۔"

"بالکل...... سونیا اگر تم یہاں رک رہی ہو تو تمہیں ماسک لینا ہوگا۔" علی نے کہا۔ "فی الحال ہمیں کوئی نیا خطرہ مول نہیں لینا ہے۔"

"بالکل میں ماسک لے لیتی ہوں۔" وہ بولی اور اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔

"تم یہیں رکو، ماسک میں لارہا ہوں۔" کریم نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ دفتر کی جانب گامزن تھا۔ اسے کسی بھی طرح سارہ کا پتا لگانا تھا، اسے واپس لانا تھا اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کسی بھی حد تک جاسکتا تھا۔

☆☆☆

سارہ کو ہوش آیا تو وہ ایک آرام دہ بستر پر تھی۔

یہ جگہ نہ تو اس کا کمرا تھا اور نہ ہی گھر...... اس کا سر چکرا رہا تھا۔ منہ کا ذائقہ سخت کڑوا محسوس ہو رہا تھا اور دل گھبرا رہا تھا۔

اس نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا مگر اس کا سر پتھر کے مانند بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تب ہی اسے اپنا بایاں بازو کھنچتا ہوا محسوس ہوا...... اس کے ہاتھ میں ایک کڑا نما ہتھکڑی سی موجود تھی جس کا سرا بیڈ میں کہیں پیوست تھا۔ کڑے کے ساتھ موجود زنجیر اتنی طویل تھی کہ وہ آرام سے اٹھ کر بیٹھ سکتی تھی مگر بیڈ سے دور نہیں جاسکتی تھی۔ یعنی وہ کسی کی قید میں تھی۔

مگر کس کی؟

وہ یہاں کیسے پہنچی......؟ یہ کون سی جگہ تھی؟ اور یہ سب ہو کیا رہا تھا؟ سوالات اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کیں پھر کھولیں۔ پھر اپنے بے ہوش ہونے سے قبل کی آخری یادوں کو دہرانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کامیاب ثابت ہوئی۔ اس کے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا۔ گھر کا بم سے اُڑ جانا، گھر پر آنے والا فون، پھر اس کا وہاں جانا...... اس شخص کا بابا کی طبیعت خراب ہونے کی خبر دینا اور اس کا اس کی گاڑی میں بیٹھنا اسے سب یاد آ گیا تھا پھر گاڑی میں نہ جانے کیا ہوا تھا کہ وہ اپنے ہوش کھو بیٹھی تھی۔ "وہ رومال" اس نے سوچا۔ اس میں ہی کچھ تھا۔ یقینی طور پر اس میں کچھ تھا جسے اس نے خود ہی اپنی ناک پر لگا لیا تھا۔ یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ سب باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے کیا گیا تھا اور اسے اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔

"بابا، کریم، علی اور سونیا، نہ جانے وہ سب کیسے تھے؟" اس کے تصور میں اُن کے چہرے گھوم رہے تھے۔

اب تک انہیں اس کے غائب ہونے کی اطلاع تو مل گئی ہوگی مگر یقیناً انہیں بالکل اندازہ نہیں ہوگا کہ وہ خود کسی کی گاڑی میں بیٹھنے کا خطرہ مول لینے کی حماقت کر چکی ہوگی۔

وہ شخص کون تھا؟ وہ تو اسے جانتی بھی نہیں تھی۔

کیا وہ ابراہام کا آدمی ہوگا؟ کیا وہ ابراہام کی قید میں تھی؟ وہ کس جگہ تھی؟ اور کب سے تھی؟ ان سارے سوالوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

اُس نے چاروں جانب دیکھا، یہ ایک بڑا، پُرآسائش بیڈ روم تھا جہاں ضرورت کی تمام اشیا موجود تھیں۔ فرنیچر نہایت اعلیٰ اور جدید انداز کا تھا۔

''ہیلو۔'' اس نے زور سے آواز دی۔ ''یہاں کوئی ہے؟ یہاں کوئی ہے؟'' وہ زور سے چلّائی۔ ''کیا کوئی مجھے سن سکتا ہے؟''

دو تین بار آواز دینے کے بعد دروازہ کھلا تھا اور ایک ادھیڑ عمر خاتون اس کے سامنے آئی تھی۔

''جی میڈم...... آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟'' اس نے ملائمت آمیز لہجے میں نرمی سے پوچھا۔

''مجھے اپنے گھر جانا ہے، کیا آپ یہ کر سکتی ہیں؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''معاف کیجیے گا اس میں، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔'' اس نے اسی نرمی سے کہا۔ ''مگر میں آپ کو بہترین کھانا، پانی اور ضرورت کی اشیا فراہم کر سکتی ہوں۔''

''مجھے پانی پینا ہے۔'' پانی کا لفظ سن کر اسے یاد آیا کہ اسے سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔

''جی میں پانی دیتی ہوں آپ کو......'' اس نے کمرے میں موجود چھوٹے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں پانی ڈال کر میری جانب بڑھایا۔ میں گلاس میں موجود سارا پانی غٹاغٹ پی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں مشکل میں ہوں اور اس سے نکلنے کے لیے مجھے اپنی قوت کو مجتمع کرنا تھا۔ پانی پی کر مجھے بہتر محسوس ہوا تھا۔

''مجھے یہاں کون لایا ہے اور کیوں؟'' میں نے گلاس واپس کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی میڈم، جب آپ کو بھوک لگے تو مجھے بتائیے گا اور ہاں، اس کے لیے آپ کو چیخنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ آپ کے تکیے کے پاس جو سوئچ ہے آپ اسے دبا دیجیے گا، مجھے اطلاع مل جائے گی۔''

''میں یہاں کھانے پینے نہیں آئی ہوں، مجھے یہاں سے باہر جانا ہے۔'' میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''یقیناً ایسا ہوگا مگر میں اس میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔'' وہ مسکرائی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

یہ عجیب وغریب فائیو اسٹار قید تھی۔ میں نے سوچا پھر اس کے بتائے ہوئے سوئچ کو دبایا۔ اگلے ہی لمحے چراغ کے جن کے مانند وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''جی میڈم......'' اس نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھا۔

''میرا موبائل فون کہاں ہے؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا علم سر کو ہوگا میڈم...... وہ کچھ دیر میں آپ سے ملیں گے، آپ ان سے یہ پوچھ لیجیے گا۔''

''انہیں بلائیے فوراً......'' میں نے کہا۔

''میں انہیں بلا نہیں سکتی، وہ خود تھوڑی دیر میں آئیں گے۔ آپ برائے کرم تھوڑا انتظار کر لیں۔ اگر میں اس سلسلے میں کچھ کر سکتی تو یقیناً کرتی مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی نہ ہی کچھ کر سکتی ہوں۔ مجھے یہاں آپ کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے، بس میں وہی کر سکتی ہوں۔'' اس نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

''اچھا۔'' میں نے کہا پھر چند لمحے بعد بولی۔ ''پلیز مجھے اٹھ کر بیٹھنے میں مدد کر دیجیے، مجھے خاصے چکر سے آ رہے ہیں۔''

میری اس بات پر وہ میری جانب بڑھی اور مجھے سہارا دے کر بٹھانے لگی۔ میں اٹھ کر بیٹھی اور میں نے اس کے ساتھ ہی اپنے آزاد ہاتھ سے اس کی گردن کو بازو کے لاک میں پھنسالیا۔

''اوغ...... اوں...... مجھے چھوڑو......'' وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی تھی مگر یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھوں کو پکڑ رکھا تھا اور اس کی ہر حرکت پر دباؤ میں ہلکا سا اضافہ کر رہی تھی۔

''مم مجھے چھوڑ دو...... پلیز......'' وہ بمشکل بولی۔

''چھوڑ دوں گی...... میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے، مجھے یہاں سے نکلنا ہے بس تم میری مدد کر دو اس کام میں......''

''مم...... کیسے......؟'' اس نے کہا اور ساتھ ہی میرے پیٹ میں مُکّا مارنے کی کوشش کی۔

''اس طرح تو بالکل نہیں۔'' میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔ ''مجھے بتاؤ کہ میں یہاں سے کیسے نکل سکتی

ہوں۔'' میں غرائی۔ ''اس ہتھکڑی کی چابی ہوگی تمہارے پاس...... اسے کھولنا ہوگا تمہیں ورنہ میں تمہاری گردن توڑ دوں گی۔''

''مم، میرے پاس چابی نہیں ہے۔'' وہ بمشکل بولی۔

''ماننے والی بات نہیں ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مان لو کہ مجھے باتھ روم جانا ہو تو کیا یہ بستر میرے ساتھ جائے گا؟ جھوٹ مت بولو......''

''مم، میں سچ بول رہی ہوں۔'' وہ اپنی گردن چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں مجھے بھی چوٹیں لگ رہی تھیں مگر میری گرفت پر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

''لگتا ہے کہ تمہیں اپنی گردن تڑوانے کا بہت شوق ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی چابی کہاں ہے؟''

''چابی میرے پاس ہے۔'' اس آواز نے ایک لمحے کے لیے مجھے چونکا دیا۔ سامنے کھلے دروازے میں وہی کھڑا تھا جو بابا کی بیماری کی خبر دے کر مجھے یہاں لانے کا ذمے دار تھا۔

''مجھے وہ چابی چاہیے...... اور میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں اگر ایسا نہ ہوا تو میں اس کی گردن توڑ دوں گی۔'' میں نے کہا اگرچہ یہ کہتے ہوئے مجھے خود اندازہ تھا کہ نہ تو یہ دھمکی کوئی خاص کارگر ہو سکتی تھی اور نہ ہی فوری طور پر مجھے کامیابی ملتی نظر آ رہی تھی۔

''توڑ دیجیے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے مگر آپ کو اس سے فائدہ نہیں ہوگا۔'' وہ متانت سے بولا۔ ''ہاں اگر آپ اسے چھوڑ کر انسانوں کی طرح تہذیب کے ساتھ مجھ سے کہیں تو میں یہ کام کر سکتا ہوں۔''

''یعنی آپ مجھے یہ بتا رہے ہیں کہ آپ جھوٹ بول کر پوری منصوبہ بندی سے میرے اغوا کے بعد مجھے اس طرح آسانی سے یہاں سے جانے دیں گے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کیا میں آپ کو اتنی بے وقوف لگتی ہوں کہ آپ کی بات پر یقین کر لوں گی۔''

''نہیں...... میرا مطلب یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں آپ کو یہاں سے جانے دوں گا...... مشکل یا آسانی تو بعد کی بات ہے، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں اس کڑے کو بیڈ سے کھول دوں گا تاکہ آپ چل پھر سکیں۔''

میں نے چند لمحے اس کی بات پر غور کیا، سچ تو یہی تھا کہ ملازمہ پر قابو پانے کا اس وقت مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا، خاص طور پر کہ جب وہ خود سامنے موجود تھا۔ اگر کہیں وہ واقعی کڑے کو کھول دیتا تو میں موقع پا کر اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں نے اپنی گرفت کو ڈھیلا کیا اور پھر اسے چھوڑ دیا۔

میری گرفت سے نکلتے ہی وہ سیدھی کھڑی ہوئی اور گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اپنی گردن کو دونوں ہاتھوں سے دباتی رہی پھر اس کے اشارے پر وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

میں اسے نہیں پہچان پا رہی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ یہ سب ابراہام کے اشارے پر ہی ہو رہا تھا۔ ابراہام سے متعلق کسی شخص سے کہی ہوئی بات کو پورا کرنے کی توقع لگانا ہی غلط تھا۔ اس ساری کارروائی میں میرے سر کے چکر رفع دفع ہو گئے تھے اور اب میں خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، کھٹ کی ہلکی سی آواز آئی۔ میں نے اپنے بائیں بازو کو اپنی طرف کھینچا تو وہ آسانی سے آگے آتا چلا گیا۔ وہ کڑا میرے ہاتھ میں موجود تھا مگر اس کا دوسرا حصہ جو کہ بیڈ سے پیوست تھا، وہ کھل گیا تھا۔ یعنی اب میں چل پھر سکتی تھی مگر ہاتھ میں موجود ہتھکڑی میرے ساتھ ہی تھی۔ میں نے غور سے اس کی جانب دیکھا، اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ریموٹ تھا۔ مجھ سے نظر ملتے ہی وہ مسکرایا اور پھر بیڈ کے سامنے موجود صوفے پر بیٹھ گیا۔

''مجھے یہاں اس طرح کیوں لایا گیا ہے؟'' میں نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''میں جانتی ہوں کہ اس کے پیچھے وہی ہے جس نے ہمارا گھر تباہ کیا ہے۔'' میں نے نفرت سے کہا۔ ''وہ ہم سب کا دشمن ہے مگر افسوس ہے کہ کچھ لوگ ذاتی مفاد کے لیے سب کچھ بیچ دیتے ہیں، اپنا ملک اور اپنے لوگ بھی......''

''کون ہے وہ؟ کیا آپ اُسے جانتی ہیں؟''

''ظاہر ہے کہ جانتی ہوں۔''

''مجھے بھی بتایئے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''کمال ہے آپ کو اپنے مالک کا نام معلوم نہیں۔'' میں نے حقارت سے کہا۔ میرے انداز پر اس کے چہرے کے تاثر ایک لمحے کو بدلا تھا پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''میرا خیال ہے کہ اس وقت آپ گفتگو کرنا نہیں چاہتیں، ویسے تو میں ہر کام اپنی مرضی سے کرنے کا قائل ہوں مگر آپ کے معاملے میں کچھ فراخ دل ہو گیا ہوں۔ اب آپ واش روم وغیرہ استعمال کر سکتی ہیں۔ اگر آپ

چاہتی ہیں کہ یہاں آپ کو سہولیات ملتی رہیں تو دوبارہ اس قسم کی کوئی حرکت مت کیجیے گا۔ یہ آپ کی پہلی غلطی تھی اس لیے معاف کرتا ہوں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا اور صوفے سے کھڑا ہو گیا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ یہی اس کی غلطی ثابت ہوئی۔ اس کے مڑتے ہی میں تیر کے مانند لپکی اور اس کی پیٹھ پر زوردار فلائنگ کک رسید کی۔ میری کک سے وہ لڑکھڑایا اور دروازے کے قریب پہنچ کر زمین بوس ہوا مگر گرتے ہی فوراً کھڑا ہو گیا۔ میں اتنی دیر میں اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ میری کہنی کی زوردار اسٹرائیک سے اسے دوبارہ زمین چاٹنی پڑی تھی۔ اس بار وہ اٹھا تو اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ میری دوسری فلائنگ کک سے اس نے خود کو ماہرانہ انداز میں بچایا اور گھوم کر کک ماری، اس کے انداز سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا مقابلہ کسی اناڑی سے نہیں تھا۔ میں نے اس کی کک سے تو خود کو بچا لیا مگر ہاتھ میں بندھی لمبی زنجیر میرے پیروں میں آ گئی جس کی وجہ سے میں الٹ کر گری اور اس نے میری گردن میں بازو ڈال کر لاک لگا دیا، یہ وہی وار تھا جس کے ذریعے میں نے اس عورت کو بے بس کیا تھا۔ اب میں خود اس کا شکار ہو گئی تھی۔ میں نے سانس لینے کی خاص تکنیک سے خود کو بچانے کی کوشش کی، ساتھ میں اس کے بازو کو خود سے الگ کرنے کی بھی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی مگر میرے ہر وار کے ساتھ اس کا دباؤ بڑھ جاتا تھا۔ وہ بالکل وہی کچھ کر رہا تھا جو میں نے کچھ دیر پہلے کیا تھا۔ میری سانس رک رہی تھی۔ میں نے خود کو نڈھال ظاہر کرتے ہوئے مزاحمت بند کی اور جیسے ہی اس نے لاک ہٹایا میں نے مڑ کر اسے کک مارنے کی کوشش کی مگر وہ اس کے لیے تیار تھا اس نے میری کک کو اپنے ہاتھوں پر روکا اسی لمحے گھوم کر میری پنڈلی پر کک ماری جس سے میرا پیر رپٹا...... میں منہ کے بل گرتی مگر اس نے مجھے کمر سے پکڑا اور پھر گھما کر بیڈ پر ڈال دیا۔

"بس...... آج کے لیے اتنی مار اماری کافی ہے۔" وہ بولا تو اس کی آواز حیران کن حد تک پُرسکون تھی۔ "ایک بات ثابت ہو گئی ہے کہ آپ پر اعتماد میری صحت کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔"

"بالکل ہو سکتا ہے اور اس سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ مجھے یہاں سے جانے دیں، میں یہ سب بھول جاؤں گی، میرا آپ سے تو کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اس پر ہم بات کریں گے مگر جو وارننگ آپ کو دی ہے، اسے یاد رکھیے...... ورنہ آپ اس کمرے کے بجائے کسی اندھیری کوٹھری میں بھی ہو سکتی ہیں اور شاید آپ کو معلوم ہو کہ چوہے کراٹے، مارشل آرٹ وغیرہ نہیں سمجھتے اس لیے پلیز اپنے لیے مزید مشکلات کھڑی نہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ میرے قریب آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک لمحے کے لیے ڈر گئی مگر اس نے کڑے کی زنجیر سے لٹکتے دوسرے کڑے کو بیڈ میں لگا کر اسے لاک کر دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں بے بسی سے اُسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ پہلا موقع میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب مجھے دوسرے موقع کی تلاش تھی۔

☆☆☆

کریم اپنے دفتر میں تھا، اب تک سارہ کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی تھیں۔ سی سی ٹی وی کیمرا فوٹیج سے مدد کی امید تھی مگر معلوم ہوا تھا کہ اس سڑک پر بڑے اہتمام سے لگایا گیا وہ کیمرا خراب تھا۔

اس وقت اس کے سامنے اس کے دو افسران موجود تھے انہیں سارہ کے فون کی تفصیل کا انتظار تھا۔

"سر...... اس صبح آپ کے گھر کے فون پر جو کال آئی تھی وہ ڈی ٹیکٹ ہو گئی ہے، وہ ایک موبائل سے آئی تھی اور وہ موبائل وحید الدین کے نام پر رجسٹر ہے، یہ کال واردات والی جگہ سے ہی آئی تھی۔"

"اوکے...... میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ اسے گھر کے بم دھماکے کی خبر دی گئی تھی۔ وحید تو ہمارا ایک گارڈ بھی ہے، شاید اس نے کیا ہو تم وہ نمبر دو، میں کال کر کے دیکھتا ہوں۔" کریم نے کہا۔ وہ نمبر واقعی گارڈ کا ہی تھا۔ کریم سے بات کرتے ہوئے وہ رو پڑا تھا، اس نے ہی گھر پر دھماکے کی خبر دی تھی۔

"بی بی نے فون اٹھایا تھا۔ بڑے صاب کو خبر دینے سے منع کیا تھا ویسے بھی میرے پاس نمبر نہیں تھا۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے وحید......" کریم نے بات مختصر کر کے کال کاٹ دی۔ "موبائل نمبر کی لوکیشن یا کچھ معلوم ہو پا رہا ہے؟" اس نے احمد سے پوچھا۔

"موبائل آف ہے، اگر وہ آن ہوتا ہے تو اسے فوری طور پر ٹریس کر لیا جائے گا۔ اس کا انتظام کر لیا گیا ہے مگر آف کی صورت میں لوکیشن معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس کی آخری لوکیشن ہائی وے کی ہے جس کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔"

"ہائی وے......" کریم نے کچھ سوچتے ہوئے اس لفظ کو دہرایا۔

"کیا تمہیں یہ خدشہ ہے کہ سارہ کو شہر سے باہر لے جایا گیا ہے؟" اس نے گویا اپنے آپ سے پوچھا۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔" احمد نے کہا۔ "ہائی وے کے آس پاس اور ہائی وے پر بھی بہت آبادی ہے، وہ اس لوکیشن پر بھی انہیں رکھ سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں شہر کے باہر بھی لے جایا جا سکتا ہے۔"

"اگر صرف وہ سی سی ٹی وی کیمرا ٹھیک ہوتا تو ہمیں گاڑی نظر آجاتی پھر اس گاڑی کو اس وقت کے حساب سے ہائی وے پر موجود کیمروں سے شناخت کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح اس کے روٹ کا کچھ بلکہ کافی کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔" سلمان نے کہا۔

"وہ تو خراب ہے اور اس میں کچھ ریکارڈ نہیں ہوا مگر مجھے یاد ہے کہ اس گلی میں تقریباً تمام گھروں کے باہر کیمرے لگے ہوئے ہیں، اگر ہم ان سے بات کریں تو شاید کسی کیمرے کی ریکارڈنگ میں وہ کار اور سارہ نظر آ سکے۔" کریم نے کہا۔

"یہ کوشش کر کے دیکھتے ہیں سر۔" ارسلان بولا۔ "یہ واقعی ممکن ہے...... ہم ابھی یہ کام ہی کرتے ہیں۔"

"بالکل...... آپ لوگ یہ کریں۔" کریم نے کہا۔ "وہ فوری طور پر پولیس اور دیگر تمام محکموں کو الرٹ کر چکا تھا اس لیے اسے امید تھی کہ سارہ کو شہر سے باہر نہیں لے جایا گیا ہوگا۔" اس کے ساتھ ہی کسی کی ڈیوٹی لگائیں جس علاقے میں آخری بار سارہ کے فون کی لوکیشن ملی ہے، اسے میپ آؤٹ کریں تاکہ وہاں بھی کام کیا جا سکے۔"

"اوکے سر۔" وہ دونوں بولے اور کمرے سے نکل گئے۔

اُن کے جانے کے بعد کریم اسی پوزیشن میں بیٹھا دیوار کو گھورتا رہا تھا۔ 'سارہ کہاں ہو تم......؟' اس کی نظریں سامنے موجود موبائل کی اسکرین پر جمی تھیں۔ وہ اس اسکرین پر سارہ کے نام کو چمکتا دیکھنا چاہتا تھا، کاش وہ ایک بار فون کر لے۔ اس نے سوچا۔ کبھی کبھی جو کچھ ہمارے پاس ہوتا ہے، ہم اسے فار گرانٹڈ لیتے رہتے ہیں۔ اس کی اصل اہمیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ہم سے دور ہو جاتا ہے۔ سارہ تو اس کے لیے ہمیشہ سے اہم تھی مگر اس سے قبل بھی اس نے اس کے فون کال کے لیے اتنی آرزو نہیں کی تھی۔

اس کا دل صرف ایک ہی تمنا کر رہا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہو، وہ جانتا تھا کہ وہ فائٹر ہے، آسانی سے اُسے ہرایا نہیں جا سکتا اور وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لینے کی ماہر ہے۔ اس سب کے باوجود اندیشوں، وسوسوں کے سانپ بار بار اس کے دل و دماغ کو زخمی کر رہے تھے۔ ہر بار وہ انہیں خود سے دور کرتا مگر اگلا ہی لمحہ ایک اور وسوسہ یا بُرا خیال بن کر اسے لرزا رہا تھا۔

☆☆☆

شمشیر پونے آٹھ بجے کے قریب ڈھابے پر پہنچ گیا تھا۔ فرید وہیں سے گزر کر فارم ہاؤس پر جاتا تھا۔ ان کے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ فرید کے وہاں سے گزرتے ہی شمشیر بھی چل پڑے گا۔ وہ اندر جاتے ہوئے چھوٹا دروازہ بند نہیں کرے گا اور شمشیر اس سے اندر داخل ہو جائے گا۔ فرید نے اسے اندر ان کے کمروں کا محل وقوع سمجھا دیا تھا۔ وہاں سے شمشیر کو اپنا کام کر کے اسی دروازے سے باہر نکل جانا تھا۔ اس سب کے دوران اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ کسی کی نظر میں نہیں آئے۔

"میں غریب آدمی ہوں اگر خدانخواستہ کوئی مشکل پڑ جائے تو اس سے آپ کو خود ہی نمٹنا ہوگا، میں اس میں آپ کی مدد نہیں کر سکوں گا اور نہ ہی آپ میرا نام لیں گے۔" اس نے پہلے ہی صورت حال شمشیر پر واضح کر دی تھی۔

"تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں تمہیں نہیں جانتا، تمہارا نام کبھی کہیں نہیں آئے گا۔" شمشیر نے اسے یقین دہانی کرا دی تھی۔

آٹھ بج کر پانچ منٹ پر فرید ڈھابے کے سامنے سے گزرا، شمشیر اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا، اس کے آگے نکلتے ہی وہ بھی ڈھابے سے باہر آگیا۔ اس کے اور فرید کے درمیان پندرہ بیس قدم کا فاصلہ تھا، اس کے سامنے وہ فارم ہاؤس کے چھوٹے دروازے سے اندر گیا اور دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا۔ شمشیر اس کے چند لمحوں بعد وہاں پہنچا۔ اندر جا کر اس نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے رہائشی حصے کی جانب بڑھا وہاں کئی کمرے موجود تھے۔ فرید کے مطابق پہلا اور دوسرا کمرا جونز اور ڈاکٹر سلمان کے زیرِ استعمال تھے۔ شمشیر نے شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ اس بار چادر اس نے سر پر سے اوڑھ کر بکل بنائی تھی جس کی وجہ سے اسے فوری طور پر پہچاننا تھوڑا مشکل تھا۔

کمرا نمبر ایک کے سامنے پہنچ کر اس نے ناب گھمایا مگر وہ اندر سے مقفل محسوس ہوا پھر اسے فرید کی بات یاد آگئی جو اس نے خاص طور پر اسے بتائی تھی۔

''یہاں تمام کمروں کے دروازے کھولنے کے لیے ناب کو الٹا گھمانا ہوتا ہے، یہ حفاظتی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔''

یہ یاد آتے ہی اس نے ناب کو الٹا گھمایا جس سے دروازہ کھل گیا۔

''چائے لے آئے تم......؟'' جونز کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ شاید باتھ روم میں تھا۔

''جی صاب......'' وہ بولا اور دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔

جونز باتھ روم سے باہر آیا تو وہ اس کے استقبال کے لیے تیار تھا۔

''تت...... تم کون ہو؟ میرے کمرے میں کیا کررہے ہو؟ اگر چائے لائے ہو تو رکھ کر باہر نکلو۔'' جونز اسے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

''اور اگر کسی کو آپ سے ملنا ہو، بات کرنی ہو صاب......'' وہ آہستگی سے بولا۔

''کیا...... کیا کہہ رہے ہو، اونچا بولو تھوڑا۔''

''کمال ہے...... لگتا ہے کہ آپ اونچا سننے لگے ہیں۔ مجھے آپ سے ملنا ہے۔'' شمشیر اس بار زور سے بولا۔

''تو مل تو لیے اور میں تمہیں نہیں جانتا نہ ہی میرے پاس اتنا فضول وقت ہے کہ ہر آتے جاتے سے ملتا پھروں۔'' وہ متکبرانہ انداز میں بولا۔

''آپ مجھے نہیں جانتے؟'' شمشیر نے کہا اور سر سے چادر اتار کر اس کی جانب دیکھا۔ ''اب دیکھیں شاید آپ مجھے پہچان لیں۔''

''ششم...... شم...... شمشیر......'' اس کی اسے دیکھ کر باقاعدہ گھگی سی بندھ گئی تھی۔ ''مم، مجھے کچھ مت کرنا...... ہم تو یوں بھی جا ہی رہے ہیں۔''

''یہی تو پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ کہاں جارہے ہو؟ یہاں جو کچھ کیا ہے، اس کا حساب دیے بغیر......'' وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہا تھا۔

''یہاں سے جارہا ہوں، واپس نہیں آؤں گا۔''

''وہ تو طے ہے کہ اب تم واپس نہیں آؤ گے۔'' شمشیر نے کہا۔ ''مگر تمہیں یاد ہے کہ یہاں تم نے کتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے؟''

شمشیر کے سوال پر جونز بالکل چپ ہوگیا تھا۔

''بم دھماکوں میں کتنے لوگ کتنی تکلیف سے مرجاتے ہیں کبھی سوچا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''جو بچ جاتے ہیں وہ کتنی تکلیفوں سے جیتے ہیں، اُن کے خاندان کس طرح تباہ ہو جاتے ہیں۔''

''مجھے افسوس ہے......'' وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ غیر محسوس انداز میں وہاں موجود بیل کی جانب بڑھ رہا تھا۔

''وہیں رک جاؤ جونز...... آج تمہاری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو پائے گی۔'' شمشیر غرایا۔ ''تم کو جو کچھ کرنا تھا کرلیا...... اب سزا کے لیے تیار ہوجاؤ۔''

''کک، کیسی سزا......؟'' وہ بولا۔

''جونز تمہیں تعزیراتِ پاکستان کے مطابق قتل عمد اور سیکڑوں افراد کے قتل کے الزام میں جسے تم خود ایک بار قبول کرچکے ہو اور جو تم پر ثابت ہو چکا ہے، موت کی سزا سنائی جاتی ہے۔'' شمشیر نے کہا اور اپنا ہاتھ بلند کیا جس میں ایک سیاہ پسٹل دبا ہوا تھا۔ ریوالور کی نال پر سائیلنسر موجود تھا۔

''نن، نہیں...... پلیز مجھے معاف کردو...... بچاؤ...... بچاؤ......'' اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر شمشیر اس سے قبل ہی ٹریگر دبا چکا تھا۔ پسٹل کی نال سے نکلا شعلہ اس کے سر میں جا گزیں ہوا تھا اور وہ کٹے ہوئے درخت کے مانند زمین پر ڈھے گیا۔ شمشیر چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے پسٹل کو ہولسٹر میں ڈالا اور دروازے کی جانب مڑا۔ باہر نکلنے سے قبل اس نے اندر سے لاک کے بٹن کو دبایا اور باہر نکل کر دروازہ بند کرلیا۔ اب دروازے کو باہر سے کھولنا ممکن نہیں تھا۔ شمشیر نے یہ اس لیے کیا تھا کہ کوئی اچانک اندر جا کر اسے وقت سے پہلے دریافت نہ کرلے۔ اب اس کا رخ کمرا نمبر دو کی طرف تھا۔ چند لمحوں میں وہ کمرے کے اندر تھا۔

ڈاکٹر سلمان بستر پر نیم دراز تھا، اسے دیکھ کر کسمسایا۔

''کیوں آئے ہو، میں ابھی کچھ دیر سونا چاہتا ہوں...... تم چائے واپس لے جاؤ اور ہاں اندر آنے سے قبل دستک دیا کرو...... اِل مینرڈ (بدتمیز)۔'' وہ نیند میں ڈوبی آواز میں بولا۔

''ڈاکٹر صاحب سونا تو بندے کو ہے ہی...... زندگی میں جاگنا بہتر ہوتا ہے۔'' شمشیر نے کہا۔

''کیا......؟ کیا کہہ رہے ہو تم......؟'' وہ اس کی بات سن کر اٹھ بیٹھا۔ ''زبان چلا رہے ہو مجھ سے؟ کہاں ہے تمہارا منیجر...... بلاؤ اُسے......'' وہ غصے میں لال پیلا ہو رہا تھا۔

''میں نے تو صرف ایک حقیقت بتائی ہے ڈاکٹر صاحب...... ویسے جب آپ لوگوں کو موت کے منہ میں بھیجتے ہیں مختلف انجکشن لگا کر دیوانہ قاتل بناتے ہیں تب آپ نے

"کبھی اُن کے بارے میں سوچا ہے۔" اس نے نہایت متانت سے پوچھا۔
"تت، تم کون ہو؟" اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ "یہاں کیوں آئے ہو؟"
"میں کون ہوں، یہ جان کر ویسے تمہیں نہ تو فائدہ ہوگا اور نہ ہی خوشی مگر میں پھر بھی اسے تمہاری آخری خواہش سمجھ کر پوری کر دیتا ہوں۔" شمشیر نے منہ پر لپٹی چادر کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ یوں بھی فرید اسے بتا چکا تھا کہ مہمانوں کے کمروں کے اندر کیمرے نہیں ہیں۔ باہر کے حصوں اور ڈرائنگ روم وغیرہ میں کیمرے تھے۔
"تت...... تم...... تم...... اندر کیسے آ گئے؟" وہ بستر پر ہی کھسکتا ہوا کونے سے جا لگا۔ خوف سے اس کی بُری حالت تھی۔ "م مجھے معاف کر دو...... مجھے تو جونز نے یہ سب کرنے کو کہا تھا...... مجھ سے غلطی ہو گئی پلیز......"
"کیا کسی کی جان لینے والے قاتل کی سوری پر اس کا گناہ معاف کیا جاتا ہے؟ تم تو پھر سیکڑوں افراد کی جان لینے والے قاتل ہو...... تمہیں کیوں لگتا ہے کہ تمہیں معافی مل جائے گی۔ کیا تم اس بات کے قابل ہو......؟ خود ہی سوچو...... ایمان داری سے سوچو گے تو تمہارا ضمیر بھی تمہارے خلاف ہی ووٹ دے گا۔"
"صرف ایک بار...... ایک موقع دے دو......" وہ گھگیایا۔
شمشیر نے اس کی جانب دیکھا اور پھر ہاتھ بلند کیا اس میں وہی سیاہ پسٹل موجود تھا۔
"ڈاکٹر سلمان تمہیں تعزیراتِ پاکستان کے تحت قتلِ عمد اور سیکڑوں افراد کے قتل کے الزام میں جسے تم خود ایک بار قبول کر چکے ہو اور جو تم پر ثابت ہو چکا ہے، موت کی سزا سنائی جاتی ہے۔" اس نے ان الفاظ کے ساتھ ہی ٹریگر دبا دیا۔ موت کی آگ پسٹل کے بطن سے برآمد ہوئی اور اس نے ڈاکٹر کے سینے کو چھلنی کر دیا...... شمشیر اسے غور سے دیکھتا رہا پھر پسٹل کو چادر کے اندر موجود ہولسٹر میں ڈال کر چادر سر پر ڈال کر بُکل سی بنائی اور کمرے سے باہر نکل گیا، نکلتے ہوئے یہ دروازہ بھی اس نے اندر سے لاک کر دیا تھا۔
وہ تیز تیز قدم اٹھاتا باہر کی جانب جا رہا تھا۔ دروازے سے وہ صرف چند قدم دور تھا جب کسی نے اسے آواز دی۔
"بیٹا ذرا بات سنو......"
شمشیر ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا پھر وہ مڑا، اس سے کچھ فاصلے پر ایک عمر رسیدہ شخص موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑیوں کا گٹھڑ تھا۔
"بیٹا یہ ذرا گٹھڑ میرے سر پر رکھ دو، وزن کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔" اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "اٹھا کر اوپر رکھ نہیں پا رہا ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔" شمشیر نے کہا اور آگے بڑھ کر گٹھڑ اٹھایا اور ان کے سر پر رکھوا دیا۔
"جیتے رہو...... خوش رہو......" وہ بولے۔ شمشیر سر کے اشارے سے جواب دیتا ہوا لپک کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا ڈھابے کے پاس آیا، راستے میں اس نے چادر کی بُکل کو سر پر سے کھول لیا تھا۔ ڈھابے سے ذرا پہلے اس کی کار موجود تھی۔ اس نے اطمینان سے کار کا دروازہ کھولا۔ سیٹ پر بیٹھ کر اگنیشن میں چابی گھمائی، کار خاموشی سے آگے بڑھی اور سیاہ کولتار کی سڑک پر پھسلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ شمشیر کا دل مطمئن تھا۔ آج بہت سارے آنسوؤں کا حساب بے باق ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"بابا کی حالت اب قدرے بہتر تھی مگر ہوش میں آتے ہی انہوں نے پہلا سوال سارہ کے متعلق کیا تھا۔
"بابا وہ آ جائے گی جلد......" کریم نے کہا۔ "اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے، میں اُسے لے کر آؤں گا آپ کے پاس...... اور یہ بھی یقین رکھیں کہ وہ جیت کر آئے گی، وہ آپ کی بیٹی ہے اور آپ کو اس کے آنے تک پورا صحت مند ہو جانا ہے۔"
"میں جانتا ہوں بیٹا بس دل پریشان کر رہا ہے ہر طرح سے، وہ دشمنوں کے گھیرے میں ہے مگر مضبوط ہے...... کہنے کو ذرّہ ہے مگر میں جانتا ہوں کہ میری بیٹی لوہے کا چھرا ہے مگر پھر بھی بُرے وسوسے اور خیال آتے ہیں۔" وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولے۔ "مجھے ایک بیٹی ملی تو دوسری کھو گئی...... نہ جانے کیسے نصیب پائے ہیں میں نے......؟"
"میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میں وعدہ نبھاتا ہوں۔" کریم نے اُن کا ہاتھ تھام کر کہا۔
"ہاں...... یہی دعا ہے، اللہ جلد دکھائے مجھے اُسے......"
"انشاء اللہ!" کریم نے دل کی گہرائی سے کہا۔
"کریم میں تم سے ایک مشورہ لینا چاہتا ہوں، کیا مجھے

ابراہام سے بات کرنا چاہیے؟ کیا اس سے سارہ کے بارے میں کچھ کہنا مناسب ہوگا؟"

"بالکل نہیں بابا...... اُس سے کوئی بات نہ کریں، میرا خیال یہ ہے کہ اگر اس نے یہ سب کیا ہے تو وہ ایک دو روز میں خود آپ کو کال کرے گا، اب تک اس کا یہی معمول رہا ہے۔ وہ نقصان پہنچا کر کریڈٹ بھی لینے کی کوشش کرتا ہے تو ہمیں اس کی طرف سے رابطے کا انتظار کرنا چاہیے۔ یوں بھی اس سے منت کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ سوچنا ہی بیکار ہے کہ ہمیں اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔" کریم نے قطعی انداز میں کہا۔

"یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا مگر سارہ کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں، اپنی انا، خودداری بھی ایک طرف رکھ سکتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں بابا، ہم سب یہ کرنے کو تیار ہیں مگر اس کی جانب سے کسی بہتر جواب کی امید رکھنا بیکار ہے۔ یہ بھی تو جانتے ہیں ہم...... پلیز بابا...... آپ بس دعا کریں آپ کی دعائیں اس کے لیے راستہ بنائیں گی۔" کریم نے انہیں تسلی دی۔

"میں اب ٹھیک ہوں کریم...... علی آجائے تو اس سے بات کرتا ہوں، اب میں گھر جانا چاہتا ہوں۔" وہ بولے۔

"ٹھیک ہے بابا، اس سے ڈسکس کر لیں، اس کے بعد یہی کیا جائے گا۔ ویسے آپ مجھے پہلے سے بہتر لگ رہے ہیں۔" کریم پھیکے سے انداز میں مسکرایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

فیروز کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کیسے ممکن ہے؟" وہ دہاڑا۔ "میں ابھی پہنچ رہا ہوں وہاں...... فی الحال کسی چیز کو مت چھیڑنا......" اس نے کال کاٹی اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

جو کچھ اُس نے ابھی سنا تھا، وہ اس پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ ایسا کس طرح ممکن تھا کہ اس کے فارم ہاؤس میں گھس کر کوئی قتل کر کے غائب ہو جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو...... مگر یہ ہو گیا تھا، اس کے دونوں مہمان اپنے کمروں میں مردہ پائے گئے تھے۔ انہیں باقاعدہ گولیاں ماری گئی تھیں مگر فارم ہاؤس پر کسی کو علم نہیں ہو پایا تھا۔

"شاویز...... میری گاڑی نکالو۔" وہ سامنے کھڑے شخص پر غرایا۔ "ساجد کو میرے پاس بھیجو۔"

"جی صاحب......" ساجد اگلے لمحے چراغ کے جن کے مانند اس کے سامنے تھا۔

"ساجد میں فارم ہاؤس تک جا رہا ہوں، یہاں جو مہمان ہے اس کا خیال رکھنا ہے تمہیں، صنوبر بھی اسی کام کے لیے یہاں موجود ہے۔ اسے الیکٹرک گیجٹ میں رکھا ہے۔ ضرورت کے وقت بستر والا نکالا جائے گا جیسا کہ تم جانتے ہو، وہ خطرناک ہے بہت اس لیے صنوبر اور تم دونوں محتاط رہنا...... ضرورت پڑے تو سب سے کم لیول کا ایک شاک دے دینا تاکہ وہ بھی سمجھ جائے...... اس کا تمہیں خیال رکھنا ہے مگر کوئی بدتمیزی نہیں ہونی چاہیے...... سمجھ گئے ہو نا......؟" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"جی سر...... میں اس ذمّے داری کو اچھی طرح پوری کروں گا...... آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

"اچھا ہے کہ ایسا ہی ہو...... ورنہ پھر تم مجھ سے شکایت مت کرنا۔" وہ اسے ریموٹ دیتے ہوئے بولا۔ "ویسے میں فارم ہاؤس پر ہی ہوں، تم رابطہ کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے صاب......" اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

اس سے گفتگو کے بعد فیروز آندھی طوفان کے مانند وہاں سے نکلا اور فارم ہاؤس کی جانب روانہ ہوا، اس کا دماغ بہت اُلجھا ہوا تھا، ایک تو اتنے بڑے واقعے کا ہو جانا اور دوسرا اسے ابراہام کو بھی اس سب سے آگاہ کرنا تھا۔ ایک طرح سے یہ اس کی ناکامی تھی کہ وہ ان دونوں کی حفاظت نہیں کر پایا۔

وہ فارم ہاؤس پہنچا تو وہاں بالکل خاموشی طاری تھی۔ اس نے سب سے پہلے ان دونوں کی حالت دیکھی پھر وہ باہر آیا اور سیکیورٹی انچارج کو طلب کیا۔ یہ ایک بھاری جثے کا صحت مند شخص تھا اور اس کے پاس دس سال سے کام کر رہا تھا۔

"اشفاق یہ سب کیا ہے؟" وہ غرایا۔ "کیا تم لوگوں نے میری عزت کا جنازہ نکالنے کی پوری تیاری کر لی ہے...... میرے فارم ہاؤس میں اتنے سانڈوں کی موجودگی میں میرے مہمان قتل ہو جائیں تو اس کا ذمّے دار کس کو قرار دیا جانا چاہیے؟"

"سر...... آپ کو پتا ہے میں اپنی ڈیوٹی بہت اچھی طرح کرتا ہوں، میں اس سب پر خود بہت پریشان ہوں، آج تو صبح سے کوئی باہر کا آدمی آیا ہی نہیں پھر یہ کیسے

ہوا......؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"سمجھ میں نہ آنے کی کیا بات ہے۔ اگر باہر کا آدمی اندر نہیں آیا تو پھر یہ کسی اندر والے کا ہی کمال ہو سکتا ہے جسے باہر والے نے استعمال کیا ہو...... سیدھی سی بات ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں...... سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کون کر سکتا ہے سر...... ہمارے تو سارے بندے پرانے وفادار ہیں۔"

"یہ مجھ سے مت پوچھو...... مجھے بتاؤ کہ یہ کس نے کیا ہے...... یہ تمہاری ذمّے داری ہے اور ہاں یہ خبر باہر نہیں نکلنی چاہیے...... ایک ایک کو اچھی طرح سمجھا دو ورنہ دوسری صورت میں لاشوں کی تعداد زیادہ ہو جائے گی۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"آپ بے فکر رہیں سر...... یہ تو میں نے سب سے پہلے کہہ دیا ہے کہ کسی نے بھی اس بارے میں اپنے گھر میں بھی بات کی تو وہ نہیں بچے گا۔" وہ سفاکی سے بولا۔

"مجھے کل تک رپورٹ چاہیے...... اب تم امجد کو بلاؤ اور خود بھی واپس آؤ۔"

جب وہ دونوں واپس آئے تو فیروز گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ پانچ منٹ بعد اس نے مڑ کر انہیں دیکھا اور آگے آنے کا اشارہ کیا۔

"آ گئے تو بتایا کیوں نہیں؟" وہ بولا۔ "اس مسئلے کو ابھی حل کرنا ہے۔ ان بندوں کو زمین میں گاڑ دو اور کمروں کی صفائی کرا دو...... یاد رکھو کہ یہ دونوں ائرپورٹ پہنچا دیے گئے تھے اب وہ اندر سے کہاں گئے اس بارے میں تم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا...... آئی سمجھ میں بات......؟" اس نے کہا۔

"جی صاب...... جیسا آپ کہیں...... یہی درست رہے گا ورنہ پولیس کا جھمیلا پڑے گا اور کافی دنوں تک چکر چلتا رہے گا۔" امجد بولا۔ "اور کوئی اخبار والا پیچھے پڑ گیا تو پھر اور مصیبت......"

"بات تو ٹھیک ہے مگر اس سب کے بارے میں جاننا اور خیال رکھنا کس کی ذمّے داری ہے امجد......؟" اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"میری ذمّے داری ہے صاب...... میں گناہ گار ہوں مگر قسم لے لیجیے جو میں نے کوئی کوتاہی کی ہو، کوئی بھی فارم ہاؤس میں آتا ہے پہلی خبر مجھے ملتی ہے۔ آج تو تمام دن

کوئی بھی نہیں آیا، ہمارے سارے بندے اعتماد کے ہیں۔ البتہ......'' وہ کچھ سوچ کر رکا۔

''البتہ کیا......؟'' فیروز نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''کچھ کاموں کے لیے خصوصاً صفائی اور کچن کے کاموں کے لیے ہم نے بستی کے تین چار لوگوں کو بھی کام دے رکھا ہے۔ وہ صبح آتے اور شام میں واپس جاتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''باہر کے آدمیوں کو یہاں داخل نہیں ہونا چاہیے امجد......'' فیروز غرایا۔ ''ان کو اس سانحے کا علم ہے؟''

''نہیں سر...... یہ تو صرف ہم چار پانچ لوگوں کو معلوم ہے، شکر ہے کہ ان کے کمروں میں راشد گیا تھا۔ دروازے اندر سے بند تھے اس نے مجھے بتایا...... پھر میں نے چابیوں سے دروازے کھولے تو اندر یہ حال تھا۔ اس کے بعد میں نے آپ کو کال کی اور کمروں کو لاک کر دیا۔ راشد کو پھر بھی میں نے تنبیہ کر دی تھی۔''

''بس تو رات کے وقت جب باہر کا کوئی شخص نہ ہو انہیں پیچھے دفن کرا دو۔''

''ٹھیک ہے سر۔''

''دوسری بات یہ ہے کہ باہر کے لوگوں کو روانہ کرو اور اپنے لوگوں میں سے کسی کی ڈیوٹی یہاں لگاؤ...... یاد رکھو میں اس حادثے کا ذمے دار تم دونوں کو سمجھتا ہوں مگر تم اتنے عرصے سے میرے ساتھ ہو کہ تمہاری نیتوں پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں تمہیں موقع دے رہا ہوں کہ غلطی اور غلط شخص دونوں کو پکڑ و اور میرے سامنے لاؤ۔''

''ایسا ہی ہوگا باس......'' امجد اس کے جملوں پر واضح طور پر کانپ رہا تھا۔

''مجھے امید ہے کہ اب کوئی غلطی نہیں ہوگی؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل سر...... بالکل نہیں ہوگی۔ میں روز کا کام کرنے والوں کو جواب دے دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ایک بات یاد رکھو اب سے آگے انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے لہٰذا ہر پیغام دیکھیں، ہر ایک پر نظر رکھیں کیونکہ کسی نہ کسی نے یہ قتل کروائے ہیں اور ان کے ذریعے مجھے یہ پیغام بھیجا ہے کہ میں کتنا غیر محفوظ ہوں۔''

''نہیں سر...... ہم آپ پر آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔'' وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر یہ جو ہوا ہے ایسا ہمارے ساتھ کبھی نہیں ہوا۔'' اس نے صفائی سے کہا۔ ''یہ ساری کارروائی مکمل کر کے مجھے اطلاع کر دی جائے آج کے بعد سوائے تم دونوں کے...... یہ بات میں کسی اور سے نہیں سننا چاہتا اس بات کو ان دونوں کے ساتھ دفن ہو جانا چاہیے۔'' اس کے لہجے میں سفاکیت بھری قطعیت تھی۔

''ایسا ہی ہوگا سر......'' وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

فیروز اس کے بعد وہاں رکا نہیں...... وہاں سے نکلا تو اس کے ساتھ شاویز تھا جو اس کی گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا رخ اب اپنے گھر کی جانب تھا۔ اسے ابراہام کے سامنے اس سارے معاملے کو بالکل معمول کے مطابق لینا تھا اور اسے اپنے بیان پر قائل کرنا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے یہ کس طرح کرنا ہے۔

☆☆☆

مجھے اس جگہ آئے دوسرا دن تھا۔

میں یہاں سے نکلنے کے کتنے ہی منصوبے بنا کر رد کر چکی تھی۔ وہ شخص پہلے روز کے بعد نظر نہیں آیا تھا۔ اس دوران میرا پورا خیال رکھا جا رہا تھا۔ آج صبح وہ عورت میرے لیے میرے ناپ کا ایک اچھا لباس بھی لائی تھی اور نیا ٹوتھ برش، ہیئر برش وغیرہ بھی...... بس وہ اب میرے قریب آنے سے گریز کرتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ مجھ سے خوف زدہ تھی۔ آج دن میں دو تین بار باتھ روم تک جانے کے لیے مجھے پلنگ سے آزاد کیا گیا تھا مگر اس دوران صنوبر کے علاوہ دو ہٹے کٹے بدمعاش بھی کمرے میں موجود تھے۔ میں بھی اب سب کچھ سمجھ کر کوئی کارروائی کرنا چاہ رہی تھی۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ اب تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر یہ لوگ کون ہیں؟ اب تو ابراہام والی تھیوری بھی مجھے کمزور پڑتی نظر آ رہی تھی۔ اس جیسا شخص کسی جیت پر اتنی خاموشی اور اتنی دریا دلی کے ساتھ تواضع نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آنے کا مطلب سیدھی سیدھی میری موت تھی جو کہ وہ فون پر کہہ بھی چکا تھا۔ اس الجھن نے مجھے پریشان کیا ہوا تھا۔ اس وقت بھی میں یہی سب سوچ رہی تھی...... کچھ سوچ کر میں نے کال بیل دبائی۔ چند لمحوں بعد صنوبر کمرے میں داخل ہوئی۔

''مجھے باتھ روم تک جانا ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''ٹھیک ہے میں ساجد صاحب کو بتاتی ہوں۔'' وہ بولی اور واپس پلٹ گئی۔ یہ عجیب سی شرمناک صورتِ حال

تھی۔

تین چار منٹ بعد وہ ساجد نامی شخص کے ساتھ واپس آئی تھی۔ میری ہتھکڑی کا ریموٹ اب اس کے پاس تھا، اس نے ریموٹ کے ذریعے بستر والے کڑے کو کھولا اور میں باتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔ یہ عجیب سا باتھ روم تھا جس میں کوئی روشندان یا ہوا کی نکاسی کے لیے ذرا سی جگہ بھی نہیں چھوڑی گئی تھی جہاں سے میں جھانک کر اندازہ کر پاتی کہ آخر میں ہوں کس جگہ...... کچھ دیر بعد بالآخر مجھے باہر آنا پڑا تھا۔

''میں چند لمحے ٹہل سکتی ہوں؟'' میں نے ملتجیانہ انداز میں اس شخص سے پوچھا۔

''جی بالکل۔'' اس نے سر ہلایا۔

''میں کہاں ہوں؟'' میں نے ٹہلتے ٹہلتے اس سے پوچھا۔ جواب میں وہ خاموش رہا تھا۔

''مجھے یہاں کون لایا ہے...... میرا مطلب ہے کہ اس کا نام کیا ہے؟ مجھے یہاں لانے کا مقصد کیا ہے؟''

''دیکھیے میڈم! ہم میں سے کوئی بھی آپ کے ان سوالوں کے جواب نہیں دے پائے گا۔ ہمیں آپ کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہم اس کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کس نے حکم دیا ہے؟'' میں نے پلٹ کر پوچھا۔ میں اسے غصہ دلانا چاہتی تھی شاید اس صورت میں وہ کچھ بول جاتا۔

''میڈم! اگر آپ ٹہل چکی ہوں تو آرام سے بستر پر بیٹھ جائیں تاکہ میں بھی واپس جاسکوں۔''

''اور اگر میں بستر پر بیٹھنے سے انکار کر دوں تو......؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں اس طرح کھونٹے سے بندھنا نہیں چاہتی، میں آپ میں سے کسی کو تنگ نہیں کروں گی، پلیز مجھے سکون سے بیٹھنے اور لیٹنے دیجیے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''فی الحال میں تو اس حوالے سے کچھ نہیں کر سکتا، آپ صاحب سے بات کر لیجیے گا۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔

''کیا تم لوگوں کو اپنے جرم کا اندازہ نہیں ہے، کسی کو اغوا کر کے حبس بے جا میں رکھنا جرم ہے، میں نے کیا بگاڑا ہے تم لوگوں کا؟'' میں نے کہا۔ میں آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر اس کے قریب جا رہی تھی۔ اس وقت وہ اور وہ عورت موجود تھے، ان کے ساتھ آنے والا باڈی گارڈ اس وقت ان کے ساتھ نہیں تھا اگر میں ان دونوں پر قابو پا لیتی تو وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہونے کی امید کر سکتی تھی۔

''میڈم غالباً آپ میری بات سمجھ نہیں پا رہی ہیں یا میں سمجھا نہیں پا رہا ہوں۔ بہرحال اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ اس بار بگڑ کر بولا۔

الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ میں نے گھوم کر ایک فلائنگ کک اس کے سینے پر ماری اور پھر اسے لکس پر رکھ لیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر زیادہ مضبوط نہیں تھا پھر بھی وہ بچنے کی پوری کوشش کر رہا تھا کیونکہ یہ سب کچھ بند دروازے کے عین سامنے ہو رہا تھا اس لیے صنوبر دور کھڑی کانپ رہی تھی۔

''صنوبر......'' وہ چلّایا۔ ''کال بیل دباؤ احمق......'' اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے اس کے منہ پر کک ماری جس سے وہ الٹ کر پیچھے گرا اور ساکت ہو گیا تھا اب میرا رخ صنوبر کی جانب تھا جو اب تک کال بیل سے قدرے دور تھی۔ مجھے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ مزید پیچھے دبک گئی۔ ان دونوں سے نمٹنے کے بعد مجھے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لینا تھا۔ میں صنوبر کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اچانک زسس کی عجیب سی آواز کے ساتھ میرے جسم کو زوردار کرنٹ محسوس ہوا، خوف اور تکلیف سے میرے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ یہ بالکل بجلی کے کرنٹ جیسا تھا مگر میرے قریب بھی کوئی بجلی کی چیز موجود نہیں تھی۔ میں نے دوبارہ قدم بڑھایا مگر اس بار کرنٹ کی شدت اور دورانیہ پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ میں تڑپ کر زمین پر جا گری، چند لمحوں بعد میں نے اٹھنے کی کوشش کی، اس بار کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے کھڑی ہوئی۔

''میڈم میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے اس حد تک جانے پر مجبور نہ کریں۔'' وہ غرایا۔ ''اب یہ بات اپنے بھیجے میں بٹھا لیں...... آپ کا کوئی بھی قدم آپ کو اس تکلیف سے گزار سکتا ہے، بار بار الیکٹرک کرنٹ آپ کے تمام آرگنز (جسم کے حصے) کو متاثر کر سکتا ہے اگر آپ خودکشی کرنا نہیں چاہتی ہیں تو اب کسی پر حملہ نہیں کریں گی ورنہ یہ کرنٹ آپ کو موقع پر ہلاک بھی کر سکتا ہے اور وہ جو آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ کہتے ہیں سیلف پروٹیکشن (اپنی حفاظت) کے لیے کیے گئے قتل کی بھی سزا نہیں ہوتی۔''

''اغوا کرنے والے کو بھی سیلف پروٹیکشن کی

ضرورت ہوتی ہے؟'' میں نے بمشکل کہا۔

''آج اندازہ ہوا کہ ہوتی ہے۔'' وہ اپنا منہ سہلاتے ہوئے بولا۔ ''صنوبر میڈم کو بستر پر لٹاؤ اور ان کا کڑا بستر سے جوڑ دو، اب تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، میڈم اب حملہ نہیں کریں گی۔'' اس نے کہا کچھ دیر بعد وہ دونوں کمرے سے چلے گئے تھے۔

میں بہت عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ نہایت شدید کمزوری کے احساس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ عجیب سا کرنٹ تھا جس نے میری جان نکال دی تھی۔ میں خاموشی سے بستر پر پڑی چھت کو گھور رہی تھی۔ میں کس چکرویو میں پھنس گئی تھی اس سے میں کیسے اور کب نکل پاؤں گی؟ یہ معلوم نہیں تھا۔ اتنی بے بسی میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ مجھ میں اب ہلنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور کچھ ہی دیر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

☆☆☆

شمشیر دو دن سے تمام اخبارات چیک کر رہا تھا۔ نیوز چینلز اور ان کی خبروں پر باقاعدہ نظر رکھ رہا تھا مگر کسی فارم ہاؤس پر قتل ہونے والے افراد کے بارے میں کچھ بھی پڑھنے اور دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ بالآخر اس نے اپنے ساتھی ایس پی محفوظ سے گپ شپ کی ٹھانی۔ باتوں باتوں میں وہ اس حوالے سے بھی کچھ معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

محفوظ نے پہلی بیل پر ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

''کہاں ہیں سر جی! کیسے ہیں؟ بہت عرصے بعد یاد کیا؟ سنا ہے کہ خوب چھٹیاں منا رہے ہیں۔'' اس نے کال اٹھاتے ہی کہا۔

''ویسے ہی ہوں، یار تم سوالوں کی بمباری کرنا مت بھولنا...... ٹھیک ہوں تم سناؤ۔'' شمشیر نے کہا۔

''میں بھی...... ویسے یہاں ڈپارٹمنٹ میں ٹھیک رہنا زیادہ آسان نہیں ہے۔''

''کیوں......؟'' شمشیر نے ہنس کر پوچھا۔ ''کس سے جھگڑا ہو گیا؟''

''کسی سے نہیں۔'' وہ بولا۔

''کیا بہت کیس آ رہے ہیں؟ سنا ہے کہ کوئی غیر ملکی بھی ہلاک ہوا ہے کہیں؟'' شمشیر نے سرسری انداز میں کہا۔

''نہیں...... ایسی تو کوئی خبر نہیں ہے...... کہاں کی خبر ہے؟ میرے علم میں نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''اوہ اچھا...... میں نے اصل میں سنا تھا سوچا تم سے کنفرم کر لوں کیونکہ اگر ایسی کوئی خبر ہوتی تو بریکنگ نیوز کا طوفان کھڑا ہو جاتا۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''ہاں یہ تو ہے...... یہاں ویسے ہی مسائل کم ہیں کیا؟ آج کل تو ایک اغوا پر بہت کام ہو رہا ہے...... بہت پریشر ہے مگر اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔''

''کوئی بچہ ہے؟'' شمشیر نے بات برائے بات پوچھا۔

''نہیں...... نہیں جوان لڑکی ہے۔'' وہ بولا۔

''اوہ یہ بہت ہو رہا ہے شہر میں...... کوئی بڑا ریکٹ کام کر رہا ہے ان وارداتوں میں......'' شمشیر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بسا اوقات ایسے اغوا، اغوا نہیں ہوتے۔''

''نہیں، یہ اس طرح کا معاملہ نہیں ہے۔ یاد ہے دو تین دن پہلے ایک بنگلا بم سے اُڑا دیا گیا تھا، یہ لڑکی وہیں رہتی تھی، اسے وہیں سے کسی نے اغوا کیا ہے، مجھے تو یہ کوئی ذاتی دشمنی کا چکر لگ رہا ہے مگر پریشر اتنا شدید ہے کہ مت پوچھو، پورے شہر کی پولیس بھاگ دوڑ میں لگی ہے مگر لڑکی کا کوئی پتا نہیں چل رہا......'' وہ بیزاری سے کہہ رہا تھا۔

''اچھا...... خدا کرے مل جائے۔'' شمشیر نے کہا۔

''میں تمہیں بھی تصویر بھیج دیتا ہوں...... تمہاری قسمت بہت اچھی ہے شاید تمہارے حوالے ہی سے یہ مسئلہ ہو سکے۔'' محفوظ نے کہا۔

''ارے مجھے بھیجنے کا کیا فائدہ...... میں ویسے بھی جبراً چھٹیوں پر ہوں۔'' شمشیر نے کہا۔

''یہ سب مجھے نہیں معلوم...... مجھے تو یہ یاد ہے کہ ''ونس اے پولیس مین فار ایور پولیس مین'' (ایک بار پولیس والا مطلب ساری عمر پولیس والا)...... یاد آیا کچھ......'' وہ ہنسا۔

''ہاں آ گیا...... ویسے یہ میں نے تو نہیں کہا بس تم تک پہنچایا ہے، سچ بھی یہ ہے کہ آپ کسی بھی شعبے میں کیوں نہ ہوں اگر ایمانداری اور محبت سے اپنا کام کریں تو وہ آپ کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے۔''

''درست ہے...... تم آؤ نا میری طرف......'' وہ بولا۔

''آؤں گا......'' شمشیر نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ کال کٹنے کے بعد اسے ٹرک کی ہلکی سی آواز نے بتا دیا تھا کہ محفوظ نے تصویر بالآخر بھیج دی ہے۔

''یہ محفوظ بھی عجیب ہی رہے گا۔'' وہ بڑبڑایا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ ان دونوں کی ہلاکت کی کہیں رپورٹ نہیں کرائی گئی تھی۔ غالباً فیروز نے اس معاملے کو دبا دیا تھا یعنی خس کم جہاں پاک..... اس نے سوچا..... یہی کرما کہلاتا ہے..... انسان جیسے کام کرتا ہے وہ بالآخر اس کی جانب لوٹ کر آتے ہیں۔ خون کو پانی سمجھ کر بہانے والے کی موت بھی عبرت ناک تھی اور اس کے بعد انجام بھی۔

آج کئی دنوں کے بعد وہ سکون سے تھا۔ اسے جو تیج لگا تھا وہ کر گزرا تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ سوچوں کی لے تھی جو خیالوں کی کشتی میں سوار ذہن کے سمندر میں ہلکورے سے لے رہی تھی۔ کلک کی ہلکی سی آواز اسے دوبارہ حال میں لائی۔ یہ اس کی اماں کا پیغام تھا۔ وہ اس کی بہن کے پاس پیرس گئی ہوئی تھیں مگر وہاں سے اسے ہر کھانے اور خصوصاً رات کے کھانے کے بارے میں پوچھنا نہیں بھولتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ کچھ دیر ان سے پیغامات پر گفتگو کر کے اسے خاصا بہتر محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے محفوظ کا واٹس ایپ کھولا، اس نے وہاں ایک تصویر بھیجی ہوئی تھی۔ نیٹ اس وقت قدرے سست ہوا تھا۔ دو منٹ بعد نیٹ درست ہوا تو تصویر واضح ہو گئی۔ شمشیر نے سرسری طور پر تصویر پر نظر ڈالی اور پھر اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے تصویر کو انلارج کر کے دیکھا۔

یہ تو وہی تھی۔ دھماکے والے روز اس لڑکے کو روکنے والی، پھر اسے اس کی حفاظت پر اکسانے والی..... اس نے اسے تلاش کرنے کے بارے میں کئی بار سوچا تھا مگر اس کا کوئی اتا پتا اس کے علم میں ہی نہیں تھا اور آج وہ خود ہی لاپتا ہو گئی تھی۔

شمشیر کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا پھر اس نے محفوظ کا نمبر ملایا۔ اس بار کال ریسیو کرنے میں کچھ دیر لگ گئی تھی۔

''یس باس.....'' اس کی آواز سنائی دی۔

''محفوظ اس لڑکی کے بارے میں کچھ معلومات موجود ہیں؟ اس کا پروفائل اور ایڈریس، کس سے رابطہ کرنا چاہیے، مجھ سے شیئر کر سکتے ہو؟''

''بالکل کر سکتا ہوں باس..... ابھی کر دیتا ہوں، کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟ کوئی معلومات ہیں اس کے بارے میں؟''

''نہیں فی الحال نہیں ہے مگر مجھے خود بھی اس کی تلاش ہے۔''

''تلاش.....؟'' اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''لمبی کہانی ہے یار..... تم فی الحال معلومات بھیجو..... میں بتاتا ہوں تمہیں.....'' شمشیر بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔

کچھ دیر بعد ہی اس کی تمام تر تفصیلات شمشیر کے سامنے تھیں۔

''سارہ احمد.....'' اس نے اس کا نام دہرایا۔ اس تفصیل میں اس دن کی معلومات بھی شامل تھیں جس دن وہ گم ہوئی تھی اور ان کے بم دھماکے میں تباہ ہونے والے بنگلے کی تصویریں بھی موجود تھیں۔ وہ کافی دیر تک ان سب کو دیکھتا رہا۔ اس کی تصویر کے ساتھ اس کی گمشدگی والے دن کی تاریخ بھی جگمگا رہی تھی۔ بم دھماکا بھی اسی تاریخ پر ہوا تھا۔

اچانک اُس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا، یہ وہی دن تھا جب وہ فرید سے معاملات طے کرنے کے لیے ڈھابے پر موجود تھا اور فیروز کی کار کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے دوسرے ٹھکانے تک پہنچا تھا۔ اُس روز اس کی برابر والی سیٹ پر کوئی موجود تھا۔ وہ چلتی گاڑی میں اس کی صرف سرسری سی جھلک ہی دیکھ پایا تھا مگر تب بھی اسے یہ محسوس ہوا تھا کہ اس نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں کسی حد تک یقین سا تھا کہ سارہ احمد کی گمشدگی کے پیچھے فیروز کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ وہ بھی اس بم دھماکے کے متعلق کافی کچھ جان گئی۔ اگرچہ اس تصویر میں وہ صرف ایک خوب صورت چہرہ نظر آرہی تھی مگر شمشیر کو اس کی اس لڑکے سے جنگ اور پھر اس کے حوالے سے اس کا تجزیہ یاد تھا۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اسی لیے اس کا اس طرح غائب ہو جانا بھی کوئی عام واقعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے پاس دو راستے تھے کہ وہ اس کے گھر والوں سے مل کر اُن تک اپنے اندیشوں اور شبہات کو پہنچائے یا پھر پہلے خود اس معاملے کو دیکھے۔ اگر جو اسے محسوس ہو رہا ہے، معاملہ ایسا ہی ہے تو پھر وہ مضبوطی کے ساتھ فیروز کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ جس قدر اثر و رسوخ کا مالک تھا، اسے دیکھتے ہوئے اور خود اپنے تجربے سے گزرنے کے بعد اب وہ اس معاملے کے نتیجہ خیز ہو پانے کے بارے میں پُرامید نہیں رہا تھا مگر وہ سارہ کو اس کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش بہرحال کر سکتا تھا اور یہ اس کو کرنا ہی تھا۔ اس نے دوسرے

آپشن کے انتخاب کا فیصلہ کیا، اس کام کے لیے اس کو کچھ ضروری تیاریاں کرنی تھیں اور اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔

☆☆☆

فیروز اب ابراہام سے بات کرنے کے لیے تیار تھا۔ جونز اور سلمان جس فلائٹ سے روانہ ہونے والے تھے۔ وہ درمیان میں ایک مختصر اسٹے لے کر جس وقت منزل پر پہنچتی، وہ وقت گزر چکا تھا۔ اس نے خصوصی نمبر پر فون کرنے کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ اتنی دیر میں وہ فون خود ہی بج اٹھا۔ اسکرین پر ابراہام کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے چند گھنٹیاں بجنے دیں پھر کال ریسیو کرلی۔

''ہیلو سر، میں آپ کو کال کرنے ہی والا تھا۔ جونز وغیرہ وہاں پہنچ گئے ہوں گے؟'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''مجھے اس کی اطلاع نہیں ہے۔ وہ پہنچ کر خود رابطہ کر لیں گے۔'' ابراہام نے متکبرانہ انداز میں کہا۔ ''میں اس لڑکی اور اس پروجیکٹ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، کیا تم اس تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے؟''

''میں......'' اس نے کچھ سوچنے کے بعد مختصر سا وقفہ لیا اور پھر گویا نتیجے پر پہنچ کر بولا۔ ''وہ گھر بم کے دھماکے سے اُڑا دیا گیا ہے، اب وہاں کچھ باقی نہیں رہا۔ میں اس کی تصاویر اور میڈیا کوریج آپ کو بھجوا رہا ہوں...... باقی اس لڑکی والے معاملے پر میں بذاتِ خود کام کر رہا ہوں، جلد ہی آپ کو اچھی خبر ملے گی۔''

''مجھے اس خبر کا انتظار ہے جس کے بعد تمہیں میرا ایک ذاتی کام کرنا ہے، اگر تم نے یہ دو کام بہترین طریقے سے کر دیے تو تمہارا مقام بہت بلند ہو جائے گا۔''

''میں ہر صورت کروں گا سر۔'' وہ بولا۔ اس کے جواب کے ساتھ ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

اس نے پہلے یہ طے کیا تھا کہ وہ ابراہام کو اس لڑکی کے ہاتھ میں آجانے کی خبر دے گا مگر پھر حالات کے مطابق اس نے فی الحال اسے یہ خبر پہنچنے نہیں دی تھی۔ جونز وغیرہ کے معاملے کے نمٹنے تک وہ اس خبر کو چھپانا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

کریم دو راتوں سے بالکل نہیں سو پایا تھا۔

گھر میں سب کا یہی حال تھا۔ اب تک سارہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو پایا تھا۔ وہ گویا دائرے کا سفر کر رہے تھے اور کہیں بھی نہ پہنچنے کی تکلیف انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اس کے سامنے ایک خوب رو شخص کا اسکیچ تھا جو اس سپاہی کے بیان کے مطابق تیار کیا تھا مگر اس چہرے کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ملا تھا یعنی وہ ایک بار پھر اندھیری گلی میں ہی کھڑے تھے۔ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ سلمان کمرے میں داخل ہوا، اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا وہ اس قدر خوش تھا جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

''ہاں سلمان! کیا کہنا چاہتے ہو؟'' کریم نے اس کی جانب ایک نظر ڈالنے کے بعد نیچے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سر...... اچھی خبر لایا ہوں۔'' وہ قریب آ کر بولا۔

''کیسی اچھی خبر......؟''

''سڑک کے اسی جانب موجود دوسرے بڑے بنگلے کے باہر ایک طاقتور کیمرا موجود تھا۔ انہوں نے نہ صرف ہمیں اس روز اس وقت کی ویڈیو دی ہے بلکہ اپنے مکمل تعاون کا بھی یقین دلایا ہے۔'' وہ بولا۔

''اچھا، کیا وہ ویڈیو کسی کام کی ہے؟'' کریم نے پوچھا۔

''بالکل ہے سر...... میں اسے ابھی ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔ اس میں سارہ میڈم کو ایک سیاہ کار میں بیٹھتے دیکھا جا سکتا ہے اگرچہ کار کا نمبر واضح نہیں ہے مگر اب ہم ان اوقات میں ہائی وے اور اس جانب جانے والی سڑک پر موجود تمام سی سی ٹی وی کیمروں کا ریکارڈ جمع کر رہے ہیں۔ یہ ریکارڈ ہمیں ان تک لے جائے گا سر......'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

کریم غور سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔'' چند لمحوں بعد وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''بالکل سر...... اس میں کوئی شک نہیں۔'' سلمان نے جواب دیا۔

''میں وہ ویڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' کریم کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے صرف ایک کھرا درکار تھا۔ اس کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح سارہ کو کھوج سکتا تھا اور وہ نشان اسے مل گیا تھا۔ ''وہ سارہ کو ڈھونڈ لائے گا...... صحیح سلامت۔'' اس نے گویا اپنے دل کو یقین دلایا اور سلمان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

میں...

عمران قریشی

تنہا رہنا آسان نہیں... یہ تنہائی انسان کو مار دیتی ہے... ہر زندہ شخص کو کسی دوسرے کے ساتھ اور رفاقت کی طلب بے چین و بے کل رکھتی ہے... تنہا زندگی کے دن گزارنے والے ایک ایسے ہی شخص کی رُوداد... اسے کسی ہمنوا کی شدت سے ضرورت تھی...

بیش قیمت وقت دینے والے ایک بے فیض کی فیاضی......

اُس کے چاروں جانب سفید بادلوں کی دبیز دیوار تنی ہوئی تھی لیکن ہر وجود سیاہ رنگ کے ہیولے کے مانند دکھائی دیتا تھا۔ چند دنوں سے اُس کے دماغ پر بھی سفید دُھند کی چادر تننے لگی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔ جب وہ صحت مند تھا تو کوئی بھی کھیل ایسا نہیں تھا جو اس نے نہ کھیلا ہو۔ فٹ بال، ہاکی، کرکٹ یا پھر بیڈمنٹن وہ ہر کھیل میں دوسروں پر سبقت حاصل کر لیا کرتا تھا۔ کالج کے دور میں لانگ جمپ کا چیمپئن تھا۔ نوکری ملی تو شام کو جم جانے لگا۔ اس

کا جسم کسرتی اور قد لمبا تھا۔ چہرے کے نقوش جاذبِ نظر اور پُرکشش تھے۔ لڑکیاں اس پر مرمٹ جایا کرتی تھیں۔ وہ ان پر توجہ نہیں دیتا تھا اور آج اس کے چاروں جانب دودھیا بادل تن گئے تھے۔ زندگی مفلوج تو نہیں ہوئی تھی، تھم کر رہ گئی تھی۔ پچھلے دنوں اسے مونی نے ہیڈ فون لا دیا تھا اور وہ تمام دن ایف ایم سنتا رہتا تھا۔ اب اس سے بھی بور ہونے لگا تھا۔ اس کے رویّے میں جھنجلاہٹ پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بات بات پر لڑنے بھڑنے لگا تھا۔ مونی دوپہر کا کھانا ہاٹ پاٹ میں رکھ دیا کرتی تھی۔ اکثر وبیشتر گرم ہی رہا کرتا تھا لیکن اس دن شدید سردی تھی۔ اس لیے ٹھنڈا ہو گیا۔ دو نوالے کھانے کے بعد اس نے تمام کھانا کچن میں واپس رکھ دیا۔ رات کو جب مونی کام سے واپس آئی تو کھانا ہاٹ پاٹ میں ویسا ہی پڑا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ پھر تڑپ کر آریان کی طرف چلی آئی اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بے چین لہجے میں بولی۔ ''تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا، میں گرم کر کے گئی تھی۔''

آریان پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولا۔ ''وہ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اسے چبانا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے ایک سائڈ پر رکھ دیا۔''

مونی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس سے اپنے چھوٹے بھائی کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ نہ صرف اکلوتا تھا بلکہ لاڈلا بھی تھا۔ اس رات مونی نے کھانے پر خوب اہتمام کیا۔ اس کی پسند کی ہر ڈش تیار کی اور دوسرے دن ہاٹ پاٹ کو تبدیل کر کے نیا لے آئی۔ لیکن بات کھانا گرم ہونے یا پھر ٹھنڈا ہونے کی نہیں تھی۔ بات تو فلیٹ میں پھیلی ہوئی تنہائی کی تھی۔ آریان کسی سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے اوپر گزرے ہوئے سانحے کے متعلق بتانا چاہتا تھا۔ مونی بڑی بہن ہونے کے ناتے اس کی کیفیت سے باخبر تھی۔ اس لیے اس نے چند دن سوچ بچار کے بعد تین پُتلے کمرے میں لا کر رکھ دیے۔ وہ آریان سے بات چیت نہیں کر سکتے تھے لیکن تنہائی کا احساس دور کرنے میں معاون ضرور ثابت ہو سکتے تھے۔ آریان ان پُتلوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تاہم مونی نے ان کی ہیت کے مطابق جو کچھ بتایا، اس نے اس کے مطابق ان تینوں کے نام رکھ دیے۔ پہلے پُتلے کے سر پر ہیٹ اور انگلیوں میں سگار تھا۔ آریان نے اس کا نام مسٹر جیم رکھ دیا۔ دوسرے کا جسم بے ڈھنگا اور ڈانواں ڈول تھا اس لیے وہ اسے مسٹر ڈمیلو کہہ کر پکارنے لگا۔ تیسرا پُتلا لمبا تڑنگا اور کافی حد تک کمزور تھا۔ آریان نے اس کا نام مسٹر لم سم رکھ دیا۔ پہلے پہل وہ ان تینوں سے بات چیت کر لیا کرتا تھا پھر جلد ہی اُکتا گیا۔ مونی اس کے لیے اس سے زیادہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ صبح نو بجے این جی او جاتی تو اس کی واپسی مغرب کے بعد ہوتی تھی۔ وہ آریان کی تنہائی دور نہیں کر سکتی تھی۔ آریان کی آنکھوں کا آپریشن کروانے کے لیے پانچ لاکھ روپے کی خطیر رقم درکار تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ این جی او سے اُسے اچھی خاصی تنخواہ اور مراعات ملتی تھیں لیکن پانچ لاکھ جمع کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے اور ابھی آریان کے ساتھ ہونے والے حادثے کو صرف دو ماہ گزرے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال نہیں سکا تھا۔

چند دنوں سے ایک لڑکی نے فلیٹ میں آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنا نام نہیں بتاتی تھی۔ دروازہ کھولنے پر جب آریان نام کے متعلق پوچھتا تھا، تب وہ کہتی تھی۔ ''میں ہوں'' آریان نے اس کے متعلق مونی کو بتایا تو مونی نے اس کا نام ''میں'' رکھ دیا۔

آریان اور اس کی پہلی ملاقات بہت دلچسپ تھی۔ یہ پندرہ دسمبر کی بات تھی۔ گزشتہ رات آریان کی مونی سے دوبارہ لڑائی ہوئی۔ وہ این جی او جانے سے پہلے اس کا موبائل چارج کرنا بھول گئی۔ آریان نے ہیڈ فون کانوں سے لگایا تو موبائل بند ہو گیا۔ وہ دھک سے رہ گیا۔ اس کی زندگی میں روشنی کی ہلکی سی کرن ایف ایم کے ذریعے پیدا ہوتی تھی۔ موبائل بند ہونے کے بعد وہ تمام دن صوفے پر بُت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے پتلوں کو مونی کی غفلت کے متعلق بتایا۔ کپڑے کے پُتلے چپ رہے تو آریان نے غصے کے عالم میں انہیں مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کا غصہ پھر بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور تین بجے کے بعد وہ خودکشی کے متعلق سنجیدگی سے ساتھ غور کرنے لگا۔ مونی کو اس بات کا خدشہ چند دنوں سے ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے چاقو، چھری اور بلیڈ وغیرہ کو فلیٹ سے ہٹا دیا تھا۔ کھڑکیوں کے آگے سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس لیے اسے ان کی جانب سے خطرہ نہیں تھا۔ تین بجے کے بعد آریان کسی بھوت کے مانند فلیٹ کے کمروں میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہا تھا لیکن اسے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ تب بیڈ روم میں آ کر تکیے میں منہ چھپانے کے بعد خوب رویا۔ اس نے اتنے آنسو بہائے کہ تکیہ گیلا ہو گیا اور پھر وہ تھک ہار کر سو گیا۔ رات کو مونی معمول کی نسبت کچھ دیر سے فلیٹ آئی۔ آریان صوفے پر بُت بنا بیٹھا تھا۔ پُتلے اِدھر اُدھر گرے ہوئے تھے۔ مونی کو حالات کے متعلق کچھ اندازہ ہو گیا اور اس نے ڈرتے ڈرتے آریان سے کھانے کے متعلق

پوچھا۔ تو وہ پھٹ پڑا۔ گالیوں کا طوفان اس کے منہ سے برآمد ہونے لگا۔ موتی کو معلوم ہوگیا کہ اس سے کیا خطا سرزد ہوئی تھی۔ موبائل کا چارجر اس نے صفائی کے دوران الماری کے اوپر رکھ دیا تھا اور آواز کے بغیر آریان کی زندگی کسی قید سے کم نہیں تھی۔ اس کا دل اپنے چھوٹے بھائی کے لیے پسیج کر رہ گیا۔ اس نے تڑپ کر آریان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور غلطی پر شرمندہ ہونے کے بعد معافی مانگنے لگی۔ لیکن آریان آپے سے باہر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ تلخ کلامی سے جب اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تب اس نے جذبات کی رو میں بہہ کر موتی کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آریان کو غلطی کا احساس ہوا۔ اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ غصے کی حالت میں اس سے جو گناہ سرزد ہوگیا تھا، اس کی تلافی کے لیے آریان کے پاس کوئی الفاظ نہیں تھے۔ موتی اس کے لیے وہ سب کچھ کر رہی تھی جو شاید ایک ماں بھی اپنے بچّے کے لیے نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ دیر روتے رہنے کے بعد وہ چپ ہوگئی اور اٹھ کر کھانا بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ اس رات آریان نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ دوبارہ موتی کو تنگ نہیں کرے گا۔

دوسری صبح ناشتا کرنے کے دوران آریان نے موتی کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور روتے ہوئے اپنے رویّے پر شرمندگی کا اظہار کرنے لگا۔ موتی نے اسے گلے سے لگا لیا اور دلاسا دیتے ہوئے بتایا کہ وہ جلد ہی رقم کا انتظام کر لے گی۔ اس کے بعد آریان پہلے کی طرح سب کچھ دیکھ پائے گا۔ آریان جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کے پاس لے دے کر صرف پچاس ہزار کی معمولی رقم تھی۔ اس رقم میں آپریشن نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم اس نے کوئی بات چیت نہیں کی۔ موتی نو بجے فلیٹ سے نکل گئی اور حسبِ معمول آریان نے کچھ دیر پتلوں سے بات چیت کی پھر ایف ایم پر پروگرام سننے لگا۔ گیارہ بجے کے قریب فلیٹ کی گھنٹی بجی۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا اس لیے وہ چونک کر صوفے سے نیچے اتر آیا اور صوفے کو تھامتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس دفعہ گھنٹی بجانے والے نے بٹن پر سے ہاتھ اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ آریان غصے سے چلّایا۔

''صبر کرو، میں آ رہا ہوں۔ قیامت آنے میں ابھی بہت وقت باقی ہے۔'' گھنٹی بجنا بند ہوگئی۔ اس نے دروازے کے پاس پہنچنے کے بعد اونچی آواز میں پوچھا۔

''کون؟''

باہر سے کسی لڑکی کی سُریلی اور لوچ دار آواز سنائی دی۔ ''میں ہوں۔''

آریان غصیلے لہجے میں بولا۔ ''میں کون؟ اپنا نام بتاؤ۔''

آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''مرد ہو کر ایک لڑکی سے ڈرتے ہو۔ دروازہ کھولو، میں نچلے فلیٹ کی رہائشی ہوں۔ تمہاری خیریت معلوم کرنے آئی ہوں۔''

آریان نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آگئی۔ مہنگے پرفیوم کے جھونکے نے اسے بے خود کیا اور نرم گرم وجود اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ آریان نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کو موتی سے ملنا ہے تو وہ فلیٹ میں نہیں ہے۔ آپ شام کو آجایئے گا۔''

لڑکی بولی۔ ''میں نے بتایا ہے نا کہ میں موتی سے نہیں بلکہ تمہاری خیریت معلوم کرنے آئی ہوں۔ اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟''

آریان کشش و پیچ میں مبتلا ہو گیا۔ موتی نے اسے سختی کے ساتھ تاکید کی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں کسی کو بھی فلیٹ میں داخل نہ ہونے دے لیکن وہ اندر داخل ہو چکی تھی۔ ابھی وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے ہی والا تھا کہ لڑکی نے اچانک ہی اس کا ہاتھ تھام لیا اور اندر کی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد واپس چلی جاؤں گی۔'' اس نے جھٹکے کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ آریان بھی ڈورے بندھا اس کے پیچھے چلتا ہوا سٹنگ روم میں آ گیا۔

لڑکی نے اسے صوفے پر بٹھا دیا پھر حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''یہ پُتلے کتنے خوب صورت اور قیمتی ہیں۔ میرے خیال میں تمہاری بہن نے تنہائی دور کرنے کے لیے انہیں یہاں کھڑا کیا ہے۔ کیا تم ان سے بات چیت کرتے ہو؟''

آریان نے اثبات میں سر ہلایا۔

لڑکی بولی۔ ''یہ ہیٹ والا بہت اسمارٹ ہے، اس کے کپڑے کتنے فینسی ہیں۔''

آریان نے بتایا۔ ''اس کا نام مسٹر جیم ہے اور اس کی قیمت آٹھ ہزار روپے ہے۔''

لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''اچھا نام ہے اور دوسرے دونوں کے نام کیا ہیں؟''

''مسٹر ڈومیلو اور لم سم……!''

اسے دوبارہ لڑکی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی مترنم آواز سنائی دی۔

آریان نے پوچھا۔ ”اور تمہارا نام کیا ہے؟“

”مسٹر جیم، ڈومیلو اور لم سم کی طرح کچھ بھی رکھ لو۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا اور اگر سچ پوچھو تو میں بتانا نہیں چاہتی ہوں۔ میرا تعلق ایک باپردہ گھرانے سے ہے اور میں اس پردے کو ہمیشہ قائم رکھنا چاہتی ہوں۔“

آریان طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”ایک باپردہ گھرانے کی لڑکی ایک نامحرم کے فلیٹ میں ہنستی کھلکھلاتی پھر رہی ہے۔ کیا یہ بے پردگی نہیں ہے؟“

لڑکی بولی۔ ”اگر تمہاری آنکھیں ہوتیں تو میں کبھی یہاں نہ آتی۔ ہمارے درمیان پردہ بینائی نہ ہونے کی بدولت ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو...... تم مجھے اس حادثے کے متعلق بتاؤ جس کے بعد تمہاری بینائی چلی گئی۔“

آریان نے سرد آہ بھرتے ہوئے بتایا۔ ”دو ماہ قبل گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور بینائی چلی گئی۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ آپریشن کے ذریعے بینائی واپس آسکتی ہے لیکن آپریشن پر پانچ لاکھ کی خطیر رقم لگ سکتی ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔“

لڑکی نے پوچھا۔ ”وہ جو روزانہ صبح بس پر شہر جاتی ہے، تمہاری بہن ہے۔ میری اُس سے سلام دعا ہے۔ بہت اچھی عورت ہے۔“ اس نے عورت پر خاص طور پر زور دیا۔

آریان نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر وہ نہ ہوتی تو شاید میں اب تک خودکشی کر چکا ہوتا۔ اس کا وجود میرے لیے کسی فرشتے سے کم نہیں۔ وہ آپریشن کے لیے رقم جمع کر رہی ہے۔ مجھے اُس پر ترس بھی آتا ہے، اس کی شادی کی عمر گزرتی جا رہی ہے لیکن میری وجہ سے وہ قربانی دینے سے پیچھے نہیں ہٹ رہی۔“

لڑکی بولی۔ ”میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں، کچن کس طرف ہے؟“

آریان نے ہاتھ سے اشارہ کر دیا اور اس کے قدموں کی چاپ سننے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا نہ جانے کون لڑکی ہے، کہیں قریبی فلیٹ والی ثمینہ تو نہیں تھی یا پھر دوسری منزل والے فلیٹ میں رہائش پذیر عارفہ تھی۔ جب وہ صحت مند تھا تو یہ دونوں لڑکیاں اسے پسند کرتی تھیں۔ ثمینہ نے تو اظہار بھی کیا تھا۔ تاہم عارفہ اسے چھپ چھپ کر دیکھا کرتی تھی۔ وہ ان کی آوازوں سے آشنا تھا۔ ثمینہ کی آواز بھاری تھی جبکہ عارفہ کی سرگوشی جیسی تھی۔ کچن میں چائے بنانے والی لڑکی کی آواز ان دونوں سے مختلف تھی۔ کالج میں چند لڑکیاں ایسی تھیں جن کی آواز اس لڑکی کی آواز سے مشابہت رکھتی تھی لیکن انہیں آریان کے فلیٹ کا ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ اس دوران لڑکی چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے کپ آریان کے ہاتھوں میں تھما دیا پھر بولی۔

میری فرینڈز خصوصی طور پر اتوار کے دن چائے پینے کے لیے فلیٹ پر آتی ہیں۔ انہیں میرے ہاتھوں کی چائے بہت پسند ہے۔“

آریان نے چسکی لی اور تعریفی لہجے میں بولا۔ ”واقعی مزے دار ہے۔ کیا اب بھی تم اپنا تعارف نہیں کرواؤ گی؟“

”نہیں، اور دوبارہ اس کے متعلق پوچھنا بھی نہیں۔ میں یہاں صرف تمہاری عیادت کے لیے آئی ہوں۔ عیادت کر کے واپس چلی جاؤں گی۔“ اس کے لہجے کی سرد مہری کو محسوس کر کے آریان چپ ہو کر رہ گیا۔

لڑکی دوبارہ بولی۔ ”کچھ دن قبل میری سہیلی نے تمہارے متعلق بتایا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے تمہیں فلیٹ میں آتے جاتے ہوئے کئی دفعہ دیکھا ہے۔ مجھے تمہاری بینائی جانے کا دکھ اتنا ہوا جتنا شاید تمہیں ہوا ہوگا۔ آج صبح اپنے آپ کو روک نہ سکی اور یہاں آگئی۔“

آریان بولا۔ ”میری بینائی چند دنوں کے بعد واپس آجائے گی تو پھر افسوس کی کیا ضرورت ہے۔ میں اب بھی مطمئن ہوں۔“

لڑکی چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”جب تک بینائی نہیں ہے۔ میں تمہاری تنہائیوں کی ساتھی بننا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت تمہیں تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہوگی۔ تم کسی سے بات چیت کرنا چاہتے ہوگے۔ یہ تینوں پُتلے تمہارے احساسات کے گواہ ہیں۔ میں اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت تمہیں دے سکتی ہوں۔“

آریان نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا۔ اسے واقعی کسی ایسے سہارے کی ضرورت تھی جو اس کی تنہائیوں کو ختم کر سکے۔ مونی رات کو آٹھ بجے سے پہلے نہیں آتی تھی اور وہ ایف ایم سن سن کر بیزار ہو چکا تھا۔ اگر لڑکی اس سے بات چیت کر لیتی تو وقت اچھا گزر جاتا۔ اس دن وہ پُراسرار لڑکی پانچ بجے تک اس کے ساتھ رہی۔ دوپہر کا کھانا ان دونوں نے مل کر کھایا۔ شام کی چائے اس نے کچن میں جا کر بنائی اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد رخصت ہوگئی۔ اس کے جانے کے بعد آریان کے اردگرد اداسی کی دُھند طاری ہوگئی۔ مونی کے واپس آنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے اور تین گھنٹے کی یہ اذیت ناک موت اسے بہت بھاری

محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے لڑکی کی منتیں کی تھیں کہ وہ آٹھ بجے تک فلیٹ میں ٹھہر جائے۔ اس کی بہن کے آنے کے بعد وہ بے شک چلی جائے لیکن لڑکی نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''میری چند مجبوریاں ہیں۔ گھر بار ہے۔ فیملی کے افراد ہیں۔ مجھے انہیں بھی وقت دینا ہے۔ تمہیں کل تک میرا انتظار کرنا ہوگا۔'' وہ بیدردی سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر چلی گئی اور آریان کے چاروں جانب قبر کی سی تاریکی پھیل گئی۔ اس نے ہیڈ فون اٹھایا اور ایف ایم سننے لگا لیکن جلد ہی اکتا کر ہیڈ فون کو اتار دیا۔ پھر لڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کا وجود آریان کی سمجھ سے باہر تھا۔ فلیٹوں کی تمام لڑکیوں کو وہ جانتا تھا۔ وہ اُن میں سے نہیں تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کسی قریبی علاقے کی رہائشی ہو لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ صبح سے شام تک آریان کے ساتھ فلیٹ میں رہی تھی۔ لیکن اس کے گھر والوں نے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہ کس حال میں تھی اور کہاں تھی۔ ایک جوان لڑکی کا گھر سے باہر نکلنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس نے تو آدھا دن فلیٹ میں گزار دیا تھا۔

آریان نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چاروں جانب اندھیرا چھا گیا۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جب وہ آنکھیں کھولتا تھا تو سفید بادل آنکھوں کے آگے آجاتے تھے۔ اسے اپنے اردگرد حرکت کرتے ہوئے وجود کسی سیاہ ہیولے کے مانند دکھائی دیتے تھے۔ لڑکی کا ہیولا مناسب قدوقامت پر مشتمل تھا۔ آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ نہایت خوب صورت اور جوان لڑکی تھی۔ اس کی عمر بمشکل بیس سال سے کچھ اوپر رہی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تیس کے درمیان ہو۔ وہ صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔ مہنگے پرفیوم کی بدولت اس کے اچھے ذوق کا پتا چلتا تھا۔ آریان نے اپنے دماغ کے کمپیوٹر پر اس کی تصویر بنائی تو ایک مشرقی حسن کا مجموعہ ابھر کر سامنے آگیا۔ بال کمر تک لمبے اور کالے سیاہ...... آنکھیں بڑی بڑی...... ناک لمبی اور ہونٹ مناسب...... اس نے تصویر کو ڈیلیٹ کر دیا۔ جب وہ اسے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا تو پھر اس کی خوب صورتی اور بدصورتی کا اندازہ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔

وہ صوفے پر لیٹ گیا۔ اُس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں لیکن وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ سو جاتا تو اسے رات کو نیند نہ آتی اور اس وقت اس سے بات کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ مونی بستر پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگتی تھی۔ وہ تمام دن محنت مشقت کے بعد تھک کر ادھ موئی ہو چکی ہوتی تھی۔ آریان کو اس پر بہت ترس آتا تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب ہونے والی تھی۔ لیکن اس نے آریان کی وجہ سے شادی نہیں کی تھی اور اس حادثے کے بعد اس نے شادی نہ کرنے کا پکا تہیہ کر لیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو آریان کی خوشیوں تک محدود کر لیا تھا۔ وہ اسے ہنستا بولتا اور کھیلتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی اور اس خوشی کو پانے کے لیے رقم جمع کر رہی تھی۔ پانچ لاکھ کافی بڑی رقم تھی۔ لیکن اس کے مقابلے میں مونی کے حوصلے جواں تھے۔

چند دن پہلے این جی او کے ڈائریکٹر نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور پانچ لاکھ کی رقم اس کے سامنے رکھتے ہوئے شادی کی آفر کی۔ ڈائریکٹر کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور وہ دوسری شادی کا خواہش مند تھا۔ مونی نے اسے سوچ کر جواب دینے کا کہا اور فلیٹ آگئی۔ اگر اسے مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی اس بڈھے کھوسٹ سے شادی نہ کرتی۔

اگلے دن اس نے آریان سے بات کی۔ وہ مشتعل ہو گیا اور اس نے مونی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس نے ڈائریکٹر سے شادی کرنے کی ہامی بھری تو وہ آپریشن نہیں کروائے گا۔ مونی نے ڈائریکٹر کو انکار نہیں کیا۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچنے میں مصروف تھی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔ اب تک اسے کوئی تدبیر سجھائی نہیں دی تھی۔ بہرحال اس رات مونی فلیٹ میں دیر سے آئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آریان کے موڈ کا جائزہ لیا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا موڈ بہتر تھا۔ مونی کو آج تنخواہ ملی تھی اور وہ اپنے ساتھ پزا لے کر آئی تھی۔ جو آریان کو بہت پسند تھا۔ اس کے ساتھ کولڈ ڈرنکس بھی تھی۔ پزا کھاتے ہوئے آریان نے مونی کو پُراسرار لڑکی کے متعلق بتایا۔ مونی ہکا بکا رہ گئی۔ پھر اس نے سرزنش کرنے والے لہجے میں کہا۔

''میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ میری غیر موجودگی کے دوران کسی کے لیے دروازہ نہ کھولنا۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچاتی تو میں اپنے آپ کو تمام زندگی معاف نہ کر پاتی۔''

آریان بولا۔ ''وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ نیچے کے فلیٹوں میں کہیں رہتی ہے۔ میں نے اُس کا نام پوچھا تو اس نے نہیں بتایا۔''

مونی غصیلے لہجے میں بولی۔ ''اگر اُس نے تمہیں نام نہیں بتایا تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ آئندہ تم اس کے لیے دروازہ نہیں کھولو گے۔''

آریان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بستر پر لیٹتے ہی مونی حسبِ معمول خراٹے لینے لگی۔
آریان کو نیند دیر سے آئی۔ وہ لڑکی کی شبیہہ کو دماغ میں بناتا اور پھر بگاڑ دیتا۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ تاخیر سے کھلی بلکہ مونی نے اسے جھنجوڑ کر جگایا۔ ورنہ وہ ابھی مزید سونا چاہتا تھا۔ ناشتا تیار تھا۔ دونوں نے عجلت کے دوران کیا۔ مونی نو بجے سے کچھ پہلے فلیٹ سے نکل جایا کرتی تھی اور ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اس نے برتن سمیٹے پھر آریان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولی۔

"میں جلد ہی رقم کا انتظام کرلوں گی پھر تم سب کچھ دیکھ اور پرکھ سکو گے۔ اس لڑکی کو بھی...... جو میرے جانے کے بعد فلیٹ میں آتی ہے۔ اگر اس کے ارادے بہتر ہوتے تو وہ میری موجودگی کے دوران آتی۔ آج تم اس کے لیے دروازہ نہیں کھولو گے۔"

آریان نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ فلیٹ سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد آریان نے ہیڈ فون کانوں سے لگایا اور گانے سننے لگا۔ ایف ایم کے علاوہ مونی نے اسے چند گانے بھی ڈاؤن لوڈ کردیے تھے۔ آج پہلی دفعہ اسے وہ اچھے لگے اور وہ بلند آواز میں ان کے بول دہرانے لگا۔ گیارہ بجنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ گھنٹی کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ ہیڈ فون کو کانوں سے اتارا اور صوفے کو تھامتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ صوفے کے آگے دیوار تھی۔ دیوار کو تھامتے ہوئے وہ گیلری میں آگیا۔ اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

لڑکی کی آواز سنائی دی۔ "میں......!"

آریان نے دروازہ کھول دیا۔ وہ خوب صورت ہیولے کے مانند سٹنگ روم میں آگئی۔ آریان نے دروازہ بند کردیا اور لڑکی کو مونی کے ردعمل سے آگاہ کرنے لگا۔ یقیناً اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا ہوئے ہوں گے۔ جنہیں آریان دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تاہم توقع ضرور کرسکتا تھا۔

لڑکی کی آواز سنائی دی۔ "تو پھر تم نے دروازہ کیوں کھولا اسے بند رہنے دیتے؟"

"میں تنہائی سے خوف زدہ ہوگیا ہوں۔ صبح سے شام تک کمرے میں اکیلے رہنا کوئی آسان بات نہیں۔ مجھے کسی ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو میرے ساتھ بات چیت کر سکے۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر دوبارہ گویا ہوا۔

"مونی کے رویے سے ناراض نہیں ہونا۔ اگر اُس کی جگہ تمہاری بہن ہوتی اور میری جگہ تم ہوتیں۔ تب تمہاری بہن بھی یہی کرتی۔" آریان کو پرفیوم کا جھونکا اپنے قریب سے گزرتا ہوا محسوس ہوا، وہ کچن میں چلی گئی تھی۔ اسے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ چائے بنارہی تھی۔ اسے چائے کی حاجت نہیں تھی لیکن شاید لڑکی کو تھی اس لیے آریان چپ رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اونچی آواز میں بولا۔

"مجھے تنہائیوں کو جھیلنے کی عادت ڈال لینی چاہیے کیونکہ تمہارے ہونے کے باوجود بھی میں کمرے میں تنہا بیٹھا ہوں۔"

لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "میں نے صبح سے ناشتا نہیں کیا۔ اور جب تک دو کپ چائے نہ پی لوں میری آنکھیں نہیں کھلتیں۔" جلد ہی وہ چائے کی ٹرے لے کر سٹنگ روم میں آگئی۔

آریان کافی حد تک آوازیں سن کر اندازہ لگا لیتا تھا کہ اس کے سامنے کیا سین چل رہا ہے۔ لڑکی نے چائے کا کپ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور اپنا کپ لے کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

آریان بولا۔ "ہوسکتا ہے جلد میرا آپریشن ہوجائے اور میں سب کچھ دیکھنے لگوں۔ تب میری پہلی خواہش ہوگی کہ میں تمہیں قریب سے دیکھوں۔"

لڑکی سرد لہجے میں بولی۔ "میں شاید تمہیں پہلے بتا چکی ہوں میری اور تمہاری دوستی اس معذوری تک محدود ہے۔ اگر معذوری ختم ہوگئی تو ہماری دوستی بھی ختم ہوجائے گی۔ تاہم میں خود غرض نہیں ہوں اس لیے صدقِ دل سے دعا کرتی ہوں کہ خدا تمہیں جلد آنکھوں کی نعمت سے ہمکنار کردے اور تم اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار سکو۔"

آریان شوخی بھرے لہجے میں بولا۔ "اور اگر میں یہ زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

دوسری جانب گمبھیر خاموشی طاری ہوگئی۔ لڑکی نے چائے پینا بھی ترک کردی تھی، کچھ دیر انتظار کرتے رہنے کے بعد آریان اونچی آواز میں بولا۔ "کوئی ہے یا پھر میں فلیٹ میں اکیلا ہوں۔ ایک اندھے لڑکے سے کون شادی کرے گا۔ تمہارے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہوگی۔"

اسے لڑکی کی سرگوشی سنائی دی۔ "آج ہماری دوسری ملاقات ہے اور تم نے بات شادی تک پہنچا دی۔ چھپے رستم ہو۔ تمہاری بہن ٹھیک کہتی تھی۔ میں تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتی

ہوں۔‘‘ اس نے آریان کے ہاتھوں پر چٹکی کاٹ لی۔

آریان اس کی باتوں پر توجہ دیے بغیر بولا۔ ’’کوئی ایسا طریقہ نہیں ہوسکتا کہ میں تمہیں آنکھوں کے بغیر ہی دیکھ سکوں؟‘‘

لڑکی نے اچانک ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ ’’تم مجھے آنکھوں کے بغیر بھی بہ آسانی دیکھ سکتے ہو، اپنے ہاتھوں کی پوروں سے۔ اپنے احساسات کو بیدار کرلو۔ میں تمہارے بالکل سامنے ہوں۔‘‘

آریان نے انگلیوں کو سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کے سر پر رکھ دیا۔ بال نہایت ریشمی اور ملائم تھے۔ اس نے ہاتھ کو نیچے کھینچا۔ ماتھا کشادہ تھا۔ تاہم اس پر چند جھریاں بھی تھیں۔ اسے اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہیں آئی کہ وہ آریان کی اس حرکت سے مطمئن نہیں تھی۔ اس لیے سوچ کی لکیریں ماتھے پر نمودار ہوگئی تھیں۔ اس نے ہاتھ کو اور نیچے کیا۔ اس کے دماغ کے پردے پر بھونرے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی دو آنکھیں نمودار ہوگئیں۔ کالی سیاہ اور بڑی بڑی آنکھیں۔ جن کو پھولوں کی پنکھڑیوں کے مانند گھنیری پلکوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ غزالی آنکھوں نے لڑکی کے ابھرتے ہوئے حسن کو دوبالا کردیا۔ لیکن تصویر ابھی نامکمل تھی۔ اس نے ہاتھوں کی پوروں کو اور نیچے کیا۔ ہاتھ لڑکی کی ستواں ناک پر آگیا جس کے درمیان کوکا پہنا ہوا تھا۔ آریان کو کوکا پسند نہیں تھا اور ستواں ناک میں تو بالکل بھی نہیں۔ چپٹی ناک اس کے لیے بہتر تھی۔ ناک کے نیچے سیب کی کاشوں کے مانند کپکپاتے ہوئے ہونٹ تھے جن میں کچھ گیلاہٹ بھی تھی۔ شاید گیلاہٹ سرخی کی وجہ سے تھی۔ تصویر کافی حد تک مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن آخری حصہ ابھی باقی تھا۔ اس نے ہونٹوں سے نیچے ٹھوڑی کو محسوس کیا۔ نازک اور پتلی ٹھوڑی ...... اور اس کے نیچے صراحی دار گردن ...... وہ دل تھام کر رہ گیا۔ اس کے دماغ میں چلنے والی فلم میں جو تصویر نمودار ہوئی، وہ نہایت خوب صورت اور پُرکشش لڑکی کی تھی۔ جس کی عمر بیس سے پچیس سال کی تھی اور لچکتی ہوئی ڈال کی طرح پتلی دبلی تھی۔ وہ اس کے ہیولے سے اندازہ لگا سکتا تھا۔ پتلی گردن میں زنجیر لٹک رہی تھی جو شاید سونے کی تھی۔ اس سے نیچے ہاتھ لے جانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے آریان نے ہاتھ ہٹا لیا۔ تصویر اس کے دماغ پر نقش ہوگئی اور وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ’’تم بہت خوب صورت ہو۔ میرے خیال میں تمہیں ماڈلنگ کرنی چاہیے، ضرور کامیاب ہوگی۔‘‘

لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ’’تم نے میری دکھتی ...... رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ میں ماڈل تو نہیں ڈراما آرٹسٹ بننا چاہتی تھی۔ لیکن گھر کا ماحول بہت سخت تھا۔ اس لیے والد صاحب نے کام نہیں کرنے دیا۔ تاہم انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اگر شادی کے بعد میرے شوہر نے اجازت دی تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن میں اتنی بے صبری ہو رہی تھی کہ میں نے شادی تک انتظار کرنے کے بجائے مختلف پروڈکشنز کو اپنی تصاویر بھجوادیں۔ ان کی طرف سے جواب مجھے تب موصول ہوئے جب والد صاحب کی موت ہوگئی اور پھر میں نے ڈراموں میں کام کیا۔ بعد میں فلم لائن کی طرف آگئی۔ لیکن دونوں لائنوں میں ناکام رہی۔ ہاں ان کاموں سے میں نے دولت خوب کمائی۔ اس کے باوجود بھی نام منظرِ عام پر آنے کے بعد اپنی پہچان نہیں بنا سکی۔‘‘

آریان نے دماغ میں چبھتا ہوا سوال پوچھا۔ ’’تم باپردہ گھرانے کی فرد ہونے کے باوجود بھی ڈرامے اور فلم میں کام کر رہی ہو، والد کی وفات کے بعد تمہیں کسی نے منع نہیں کیا؟‘‘

’’سب نے منع کیا اور آخرکار میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شوبز کی دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ اب تو ڈراموں میں کام کیے ہوئے بھی ایک عرصہ گزر گیا ہے۔‘‘ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی پھر اس کی مسکراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

’’فلیٹ میں سامان بکھرا ہوا ہے۔ میں سمیٹ دیتی ہوں۔ تمہاری بہن اگر ناراض رہی تو ہماری دوستی پنپنے نہیں پائے گی۔ مجھے حکمتِ عملی کے طور پر کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔‘‘

آریان لڑکی کی عقلمندی کا گرویدہ ہوگیا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ ان دونوں کی دوستی کے لیے مونی کی حمایت بہت ضروری تھی۔ وہ اپنی بہن کی رضامندی کے بغیر کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ اس نے مونی کے منع کرنے کے باوجود بھی لڑکی کو فلیٹ میں بلالیا تھا۔ لیکن مونی نے اسے منع صرف حفظِ ماتقدم کے طور پر کیا تھا اور وہ اپنا دفاع بہ خوبی کر سکتا تھا۔ اسے لڑکی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس دن لڑکی نے کھانا بھی خود بنایا۔ اس دوران بات چیت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ پھر شام کو پانچ بجے چائے پینے کے بعد وہ رخصت ہو گئی۔ آریان اداس ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ لڑکی مونی کے آنے تک فلیٹ میں ہی رہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اتنا ہی کافی تھا کہ وہ آدھے سے زیادہ دن اس کے ساتھ گزارتی تھی اور آج تو اس نے حد ہی کردی تھی۔ ایک ڈراما آرٹسٹ ہونے کے باوجود اس نے کھانا تیار کیا تھا۔ مونی کو اس کا ممنون ہونا

چاہیے تھا۔ تاہم اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ ممنونیت تجسس کے مارے کو ہوا نہ دے دے۔ موئی تجسس کی بنا پر لڑکی کو فلیٹوں میں بہ آسانی تلاش کر سکتی تھی۔ آریان ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا خواہش مند تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے لڑکی کے متعلق کوئی اور بتائے۔ چاہے وہ موئی ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے ہیڈ فون اور موبائل کو ایک سائڈ پر رکھ دیا۔ پھر لڑکی کے اس خاکے پر نظر ثانی کرنے لگا جو اس نے ترتیب دیا تھا۔ ریشمی بال، کشادہ پیشانی، ستواں ناک اور پتلے ہونٹ...... وہ اتنی خوب صورت تھی تو اس نے اتنی عجز و انکساری کے ساتھ کھانا کیوں بنایا۔ اس کی ہمدردی حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھی۔ کہیں اس میں کوئی مفاد تو پوشیدہ نہیں تھا۔ فلیٹ میں کسی بھی قسم کا کوئی قیمتی سامان موجود نہیں تھا۔ پھر وہ کیا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اسی سوچ کے دوران اس کی کچھ دیر کے لیے آنکھ لگ گئی۔ سو کر اٹھا تو آٹھ بجنے والے تھے اور موئی واپس آ گئی تھی۔ اسے فوراً احساس ہو گیا کہ اس کی غیر موجودگی میں کھانا بنایا گیا تھا۔ وہ چونک گئی۔ آریان صوفے پر بیٹھا سیب کھا رہا تھا۔ وہ اس کی طرف آ گئی اور غصیلے لہجے میں لڑکی کے متعلق پوچھنے لگی۔

”میں، آئی تھی؟“ آریان نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں نے منع کیا تھا کہ اس کے لیے دروازہ نہیں کھولنا۔ وہ تمہیں قتل بھی کر سکتی ہے۔“

آریان نے سیب کی بچ جانے والی ڈنٹھل میز کے کنارے پر رکھ دی اور نرم لہجے میں بولا۔ ”لیکن اس نے مجھے قتل نہیں کیا۔ نہ جانے تمہیں اس کی ذات سے اتنی عداوت کیوں ہے۔ وہ ایک بے ضرر سی لڑکی ہے۔ ان دونوں کے دوران اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

موئی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”تم معصوم اور بھولے بھالے ہو، ایسے لوگ پہلے اپنا اعتماد قائم کرتے ہیں، اس کے بعد حتمی وار کر کے سب کچھ ختم کر دیتے ہیں۔ تم ان کی چالوں سے واقف نہیں ہو۔ کل اس کے لیے دروازہ نہیں کھولنا۔“

آریان پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولا۔ ”تو ٹھیک ہے میں خودکشی کر لیتا ہوں۔ تنہائی کا زہر ویسے بھی میرے جسم میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اگر وقت سے پہلے مر جاؤں تو شاید تمہاری جان جلد چھوٹ جائے گی۔“

موئی سرد آہ بھر کر چپ ہو گئی لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ”میں“ آریان کے حواسوں پر طاری ہو چکی تھی اور وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں تھی۔ این جی او کے اوقات بہت سخت تھے۔ لڑکی گیارہ بجے فلیٹ میں آتی تھی اور گیارہ بجے موئی کے آفس ٹائمنگ عروج پر ہوتی تھی۔ اسے پانچ بجے تک ملنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ آدھا گھنٹا کھانے کی چھٹی ہوتی تھی اور اس آدھے گھنٹے کے دوران وہ فلیٹ آ کر واپس نہیں جا سکتی تھی۔ تاہم اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ جلد از جلد آریان کی آنکھوں کا آپریشن کروانے کی کوشش کرے گی۔ اس کے پاس یہی ایک صورت تھی ورنہ..... کچھ بعید نہیں تھی کہ ”میں“ کسی دن آریان کو فلیٹ سے لے کر فرار ہو جاتی اور وہ ہاتھ ملتی رہ جاتی پھر وہ خود ہی مسکرا دی۔ اس نے نامعلوم لڑکی کا نام ”میں“ رکھ دیا تھا اور اس سے بہتر اس کا کوئی نام ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

صبح این جی او کے لیے تیار ہوتے ہوئے موئی نے آریان کو مخاطب کرتے ہوئے دوبارہ تنبیہ کی۔ ”اس سے زیادہ بات چیت نہ کرنا اور اسے کچن میں جانے سے بھی منع کر دینا، دوستی اگر دوستی کی حد تک محدود رہے تو بہتر ہو گا۔ میں جلد تمہارا آپریشن کروا دوں گی۔ اس کے بعد این جی او میں تمہیں بہ آسانی نوکری مل جائے گی۔ پھر تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہو گی۔ جس پر ہاتھ رکھو گے میں اسے تمہارے لیے مانگ لوں گی۔“

آریان چپ رہا۔ موئی نے اپنا بیگ اٹھایا اور فلیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

آریان نے سوچا یہ بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی۔ موئی لڑکی کی دشمن بن گئی تھی۔ وہ اسے اس کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دینا چاہتی تھی لیکن آریان نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ پُراسرار لڑکی سے شادی کرے یا نہ کرے، اس سے ملنا ترک نہیں کرے گا۔ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ حالانکہ ان دونوں کی تیسری ملاقات تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں صدیوں سے ملتے چلے آ رہے ہوں۔ اس کے علاوہ وہ اس کا احسان مند بھی تھا۔ وہ اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر اس کی تنہائی دور کرنے کے لیے فلیٹ میں آتی تھی۔ وہ اسے بالکل بھی ٹھکرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس دن گیارہ بج گئے لیکن دروازے کی گھنٹی نہیں بجی۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اس کی حالت غیر ہونے لگی اور اسے اندازہ ہوا کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہا تھا۔ کل کو اگر وہ لڑکی کسی وجہ سے فلیٹ میں آنا چھوڑ دیتی تب اس کا کیا حال ہوتا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سے فلیٹ میں رہتی تھی اور تھی بھی کہ نہیں۔ پونے بارہ بجے کے قریب جب وہ تقریباً ناامید ہو گیا، تب

دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے سامنے تپائی پڑی تھی۔ اس کا پاؤں تپائی سے ٹکرایا اور وہ درد کی شدت سے بلبلا کر رہ گیا لیکن رکا نہیں۔ وہ واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے لمبے لمبے سانس لے کر اپنے حواسوں کو بحال کیا اور اس دفعہ احتیاط کے ساتھ چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس کے ساتھ ہی پائل کی جھنکار بھی سنائی دی۔

آریان نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“ باہر سے آواز سنائی دی۔

”میں۔“ اس نے دروازہ کھول دیا۔

لڑکی بولی۔ ”تم نے دروازہ کھولنے میں بہت دیر لگا دی۔ مجھ سے اکتا تو نہیں گئے؟“

آریان سرد لہجے میں بولا۔ ”دیر میں نے نہیں بلکہ تم نے کی ہے۔ تم ایک گھنٹا لیٹ ہو۔“ دروازے کے قریب خاموشی طاری ہوگئی پھر لڑکی حیرت میں ڈوبی آواز میں بولی۔ ”تم دیکھ نہیں سکتے ہو، پھر تمہیں وقت کے متعلق کیسے معلوم ہوا؟“

آریان نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی اُس کے سامنے کردی۔ اس کا شیشہ اوپر کرنے کے بعد انگلیوں کے لمس سے وقت کے متعلق بہ آسانی معلوم کیا جاسکتا تھا۔

لڑکی اندر آگئی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بازار سے پائل خریدی ہے۔ اب میں فلیٹ میں جہاں بھی جاؤں گی تمہارے ہاتھ میں بندھی ہوئی گھڑی کی طرح میری موجودگی کو ظاہر کردیا کرے گی۔“

آریان غصیلے لہجے میں بولا۔ ”تمہاری موجودگی کے متعلق معلوم کرنے کے لیے مجھے کسی پائل کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے میرے حواس خمسہ ہی کافی ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں آنے میں دیر کیوں ہوئی؟“

”میں پائل خریدنے بازار گئی تھی اور وہاں ایک اور چیز مجھے مل گئی۔ اس کے متعلق میں تمہیں بتاؤں گی نہیں بلکہ تمہیں محسوس کرنا ہوگا۔“

آریان چپ رہا۔ اُس کا موڈ لڑکی کے دیر سے آنے کی وجہ سے خراب ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک سیکنڈ آریان کے لیے نہایت قیمتی تھا اور لڑکی نے نہایت بیدردی کے ساتھ ایک گھنٹا برباد کردیا تھا۔ اس کے احساسات سے بے خبر لڑکی نے آریان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھاما اور ماتھے کے پاس رکھتے ہوئے بولی۔ ”محسوس کرو، کل اور آج میں کیا فرق ہے؟“

کرامات

ایک پیر صاحب اپنے مریدوں کے سامنے اپنی کرامت کا ذکر کررہے تھے کہ میں صحرا میں جارہا تھا چلتے چلتے دو دن گزر گئے تھے۔ بھوک لگتی تو ہاتھ بڑھا کر اڑتا ہوا کوئی پرندہ پکڑ لیتا اور سورج کی روشنی پر بھون کر کھاتا۔ خدا کا شکر ادا کر کے آگے چل پڑتا۔ نماز کا خیال آیا تو پانی ختم ہوچکا تھا۔ میں نے ایک جھاڑی دیکھی اس کے پاس جاکر زمین سے مٹھی بھر ریت اٹھائی تو اس کے نیچے سے پانی کا چشمہ نکل آیا میں پینے لگا تو خیال آیا کہ یہ جھاڑی پیاسی ہے پہلے اسے پانی پلاؤں۔ چلو بھر پانی اس کی جڑ میں ڈالا تو وہ درخت بن گئی۔ اس کے سائے میں نماز ادا کرنے کا سوچا وضو کے لیے چلو میں پانی لیکر کلی کی تو جہاں جہاں پانی گرا گلاب کے پھول کھل گئے۔

چہرے پر پانی ڈالا تو پانی کے قطرے زمین پر گرنے کے بجائے ہر قطرہ ایک کالے رنگ کا طوطا بن کر درخت کی ٹہنی پر بیٹھ گیا اور میرے مریدوں کے لیے دعا کرنے لگا۔

مرید جو جھوم جھوم کر سن رہے تھے ان میں سے ایک مرید بولا

پیر صاحب کالے رنگ کا طوطا......؟

پیر صاحب نے غضب ناک انداز میں اس کی طرف دیکھا تو ساتھ بیٹھے دوسرے مرید نے کہا؛

چپ کراوئے یہاں باقی کام بڑا سائنس کے اصول کے مطابق ہورہے ہیں، جو تجھے کالے طوطے پہ شک ہے......

حیدرآباد سے حمیرا اقبال کے پیر کی کرامات

آریان زہرخند لہجے میں بولا۔ ''کم از کم ماتھے میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' پھر اس نے ہاتھ کو نیچے کیا۔ غزالی آنکھوں کے گرد مسکارے کی تہ تھی۔ یعنی وہ اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر آئی تھی اور پھر آنکھوں کے نیچے ستواں ناک کی طرف ہاتھ لے جاتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ وہاں کوکے کے بجائے نتھنی موجود تھی۔ اسے یاد آیا کہ گزشتہ روز اس نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے نتھنی کی تعریف کی تھی۔ وہ آج کوکا بدل کر نتھنی پہن کر آئی تھی۔ آریان کو اپنے رویے پر شرمندگی کا احساس ہوا اور اس نے بے اختیار ہو کر لڑکی کی نتھنی کو چومنے کی کوشش کی تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی اور سرگوشی بھرے لہجے میں بولی۔ ''حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کرو، تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''

آریان جذبات سے رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے اب کسی کی پروا نہیں۔ یوں سمجھو میرے دماغ میں حدود کا تعین بھی نہیں رہا۔'' اس نے آگے بڑھ کر لڑکی کو بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ چکنی مچھلی کی طرح مچل کر اور پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اسے لڑکی کے جسم سے اٹھنے والی مہک نے مشتعل کر دیا اور وہ جذبات کی رو میں بہکنے لگا۔ اسے لڑکی کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ آگ میں دہکتا ہوا ہیولا...... وہ اس میں جل کر پگھل جانا چاہتا تھا۔ اسے محسوس کرنا چاہتا تھا۔ آریان نے جھپٹ کر باز کی طرح اسے قابو میں کر لیا اور اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بہت چیخی چلائی۔ اس نے منتیں بھی کیں، لیکن آریان پر جنون طاری ہو گیا تھا۔ آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھ کر رہ گئی تھی۔ دل و دماغ میں طوفان تھا جو آتش فشاں کے مانند پھٹ کر بکھرنے کے لیے بے چین ہوئے جا رہا تھا۔ اور آخرکار لڑکی نے بے بس چڑیا کی طرح ہار مان لی۔ پھر طوفان گزر گیا۔ جذبات کی کیفیت معمول پر آنے لگی۔ شرمندگی اور تاسف کے بادل آریان کے چہرے پر چھا گئے۔ لڑکی نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹا اور پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولی۔

''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ تم اتنے کمزور انسان ہو تو میں کبھی بھی تم سے ملنے فلیٹ میں نہ آتی۔ میں جا رہی ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ خدا تمہیں بینائی جیسی نعمت سے ہمکنار نہ کرے۔ جس دن مجھے لگا کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے۔ میں آخری ملاقات کے لیے تمہارے پاس ضرور آؤں گی اور تم سے پوچھوں گی کہ اب تمہارے احساسات کیا ہیں؟'' وہ پیر پٹختے ہوئے فلیٹ سے باہر چلی گئی۔ جو بھی ہوا تھا، غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ اس میں مرضی کا عمل دخل نہیں تھا۔ آریان نے تینوں پُتلوں کو اٹھا کر گیلری میں پھینک دیا اب اسے تنہا رہنے کی عادت کو اپنانا تھا کیونکہ اس کے فلیٹ میں اب دوبارہ کوئی نہیں آنے والا تھا۔

☆☆☆

موفی عام دنوں کی نسبت اُس شام جلدی آگئی۔ تینوں پُتلے گیلری میں گرے ہوئے تھے۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ حالات غیر معمولی ہیں لیکن اس نے زیادہ محسوس نہیں کیا۔ وہ آج بہت خوش تھی۔ آریان کی آنکھوں کا آپریشن کروانے کے لیے رقم کا بندوبست ہو گیا تھا اور یہ سب این جی او کے اسٹاف نے مل جل کر کیا تھا۔ انہوں نے پانچ لاکھ کی رقم کو آپس میں تقسیم کر کے اپنی تنخواہوں میں سے رقم نکال کر موفی کے حوالے کر دی تھی۔ اب موفی کو قسطوں کی صورت میں یہ رقم اسٹاف کو واپس کرنا تھی جو اس کے لیے مشکل نہیں تھی۔ وہ آریان کے پاس آگئی۔ وہ بُت بنا صوفے پر بیٹھا تھا۔ موفی نے اسے خوش خبری سنائی۔ تب بھی اس پر کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ اسے ایک مظلوم لڑکی کی بددعا نے جیتے جی مار دیا تھا۔ وہ سانس لے رہا تھا لیکن اس کے جسم سے جان نکل چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب آپریشن بھی اسے بینائی جیسی نعمت سے ہمکنار نہ کر پائے گا۔ اگر آپریشن کامیاب ہو بھی گیا تب اسے تمام زندگی یہ سرزنش اور کسک چین نہیں لینے دے گی کہ اگر راہ چلتے لڑکی سے سامنا ہو گیا تب وہ اس سے آنکھیں کیسے ملائے گا۔ تاہم اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ شادی اسی لڑکی سے ہی کرے گا۔ اس سے سرزد ہونے والی غلطی کا یہی ازالہ تھا۔

موفی کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھنے کے بعد کھانا بنانے کچن میں چلی گئی۔ اس رات آریان کو نیند نہیں آئی۔ دماغ میں موجود گناہ کے احساس نے اسے سونے نہیں دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو سر میں سخت درد محسوس ہو رہا تھا۔ موفی نے اسے گولی دی اور ڈاکٹرز سے بات چیت کے لیے فلیٹ سے باہر نکل گئی۔ وہ تمام دن بات چیت میں گزر گیا۔ ڈاکٹرز نے اسے یقین دلایا کہ آپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔ اب تک اس نوعیت کے کیے جانے والے آپریشنز میں سے صرف پانچ فیصد ناکام ہوئے تھے۔ اس میں بھی قصور ڈاکٹرز کا نہیں تھا۔ وہ مریض کی اپنی غفلت کی وجہ سے ناکام ہوئے تھے۔ موفی مطمئن ہو گئی اور آپریشن کا وقت لینے کے بعد فلیٹ آگئی۔ ڈاکٹرز نے دو دن بعد کی تاریخ اسے دے دی۔ لیکن آریان کو اگلے دن اسپتال ایڈمٹ

کر دیا گیا تھا۔ چند ٹیسٹ تھے جو ہونے ضروری تھے اور کچھ حفاظتی تدابیر تھیں۔ جن کے استعمال کے لیے مریض کا ڈاکٹرز سے رابطہ ہونا ضروری تھا اور یہ سب اسپتال کے ماحول میں ہی ہوسکتا تھا۔ سونی نے این جی او سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی اور تندہی سے آریان کی خدمت کرنے لگی۔ ٹیسٹ مکمل ہونے کے بعد ڈاکٹرز نے آپریشن کے وقت کی تصدیق کردی۔ اس دوران پُراسرار لڑکی کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں تھی۔ سونی اور آریان اس کے چہرے سے ناواقف تھے۔ اگر وہ اسپتال آئی بھی تھی تو انہیں معلوم نہیں ہوا۔ پھر آپریشن کا دن آگیا اور اسے آپریشن تھیٹر منتقل کر دیا گیا۔ سونی صبح سے مصلے پر بیٹھی اپنے بھائی کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد دیکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جیسے ہی اس کی بینائی واپس آئی، وہ ''میں'' کی تلاش میں فلیٹ سے باہر نکل جائے گا۔ یہی بات تو تھی کہ اب سونی بھی ''میں'' سے ملاقات کرنے کی خواہش مند تھی۔ وہ جیسی بھی تھی، اس نے آریان کا بہت خیال رکھا تھا۔

آپریشن میں زیادہ دیر نہیں لگی اور آریان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ پٹی دو دن کے بعد کھلنی تھی اور یہ دو دن آریان پر پہاڑ بن کر گزرنے والے تھے۔ تاہم اس نے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ فلیٹ میں منتقل ہونے کے فوراً بعد وہ پُراسرار لڑکی کا پتا لگائے گا اور پھر سائے کے مانند اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ اسے یقین تھا کہ آخرکار وہ اسے موم کر ہی لے گا۔ دو دن اس نے یہی سوچتے ہوئے گزار دیے کہ وہ اس کے متعلق کس طریقے سے معلومات کرے گا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس منزل پر واقع فلیٹ میں رہتی تھی۔ یہی ایک طریقہ اس کے پاس تھا کہ وہ خود اس سے ملنے کے لیے فلیٹ آئے اور یہ اس صورت میں ممکن تھا جب اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ دیکھ نہیں سکتا یا پھر اس کا آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ وہ بہ آسانی یہ خبر فلیٹوں میں پھیلا سکتا تھا کہ اس کا آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ اور وہ اب بھی اندھا ہے لیکن یہ تو تب کی بات تھی جب اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کی بینائی واپس آگئی ہے۔ وہ پٹی کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اور پھر وہ دن بھی آگیا۔ ان دو دنوں کے دوران اس نے متعدد بار سونی سے لڑکی کے متعلق پوچھا۔ وہ اس کی شکل کے متعلق نہیں جانتا تھا لیکن اپنے دماغ میں موجود شبیہ کو مدنظر رکھ کر جو حلیہ بیان کرسکتا تھا وہ بیان کر کے سونی کو وارڈ سے باہر بھجوا دیا کرتا تھا۔ سونی پاگلوں کی طرح اسے اسپتال میں ڈھونڈتی تھی۔ وہاں متعدد لڑکیاں گھوم پھر رہی ہوتی تھیں لیکن کوئی بھی آریان کے بتائے ہوئے حلیے پر پوری نہیں اترتی تھی۔ وہ واپس وارڈ میں آنے کے بعد آریان کو بتا دیتی تھی کہ وہ اسپتال نہیں آئی۔

☆☆☆

پھر آریان کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی اور ڈاکٹر نے اسے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کے لیے کہا۔ اس نے آنکھیں کھولنا شروع کیں۔ روشنی نے آنکھوں کا محاصرہ کیا۔ کمرے میں اس بات کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا کہ روشنی براہِ راست آنکھوں کے پردے سے نہ ٹکرا سکے اس لیے تمام بلب آریان کی کمر کے پیچھے والی دیوار پر لگے تھے۔ دودھیا سفید بادل چاروں طرف پھیلنے لگے۔ اس نے تھوڑی سی آنکھیں مزید کھول دیں۔ اس سفیدی میں آہستہ آہستہ چہرہ نمودار ہوا۔ وہ ڈاکٹر کا چہرہ تھا۔ جس پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس کے پاس نرس کھڑی تھی اور اس کے پیچھے سونی موجود تھی۔ آریان کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پیدا ہوئے اور وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے لیکن کچھ دھندلاہٹ اب بھی موجود ہے۔''

ڈاکٹر سونی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ ڈراپس لکھ کر دے رہا ہوں۔ قریبی میڈیکل اسٹور سے لے آیئے۔ دھندلاہٹ ختم ہو جائے گی۔''

سونی ڈاکٹر کی پرچی لے کر باہر جانے لگی تو آریان نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ''میری بات سن لو۔ فلیٹ والوں کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔''

سونی کے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوئے۔

آریان نے بتایا۔ ''اگر ''میں'' کو پتا چل گیا کہ میری بینائی واپس آگئی ہے تو وہ مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آئے گی۔''

سونی بولی۔ ''ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو۔ مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔'' وہ ڈراپس لینے کے لیے وارڈ سے باہر چلی گئی۔ تین گھنٹے کے بعد آریان کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اور وہ فلیٹ پر آگیا۔ سونی نے تمام فلیٹ والوں کو بتا دیا کہ آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ چند قریبی فلیٹ والے تعزیت کے لیے بھی آئے۔ سونی انہیں بھگتتی رہی۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ دوسرے دن اسے این جی او جانا تھا۔ اس لیے رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں سونے کے لیے

لیٹ گئے۔ صبح مونی کی آنکھ کچھ تاخیر سے کھلی، اس نے عجلت کے عالم میں ناشتا تیار کیا اور آریان کو ناشتا کروانے کے بعد فلیٹ سے باہر نکل گئی۔

مونی کے جانے کے بعد آریان غسل کرنے کے لیے باتھ روم میں آ گیا۔ اس کے لیے آج کا دن عید سے کم نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ مونی کو فلیٹ سے باہر جاتا ہوا دیکھنے کے بعد پُراسرار لڑکی فلیٹ پر ضرور آئے گی۔ اس کے آنے سے پہلے وہ نہا دھو کر تیار ہو جانا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ آپریشن کی ناکامی کا سننے کے بعد پُراسرار لڑکی غیر محتاط ہو جائے گی۔ اس کی غیر محتاطی کے دوران آریان اس کی حیثیت کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتا تھا۔ غسل کرنے کے بعد اس نے کپڑے استری کیے اور پرفیوم کی پوری شیشی کپڑوں پر انڈیلنے کے بعد سٹنگ روم میں آ گیا۔

صبح کے ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ اس نے ٹی وی آن کیا لیکن یہ احتیاط ضرور کی کہ اس کی آواز کم کر دی۔ وہ ان دنوں کے متعلق سوچ کر محظوظ ہو رہا تھا جب مونی کے جانے کے بعد وہ مجبوراً چار صوفے پر بیٹھا ایف ایم سنتا رہتا تھا اور آج ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وقت سست رفتاری کے ساتھ گزرنے لگا۔ بارہ بجے کے قریب جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کے بعد چھلکنے لگا۔ تب دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا دروازے کی طرف آ گیا پھر مدھم لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

باہر سے مترنم آواز سنائی دی۔ ”میں۔“

اس کا دل جھوم اٹھا۔ حقیقت سے پردہ آشکار ہونے والا تھا۔ اس نے فرطِ انبساط سے مغلوب ہوتے ہوئے جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ وہ بالکل سامنے کھڑی تھی۔ آریان نے بے صبری کے ساتھ اس کے چہرے کو دیکھا اور دل تھام کر رہ گیا۔ بال لمبے اور سلکی تھے لیکن ان میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ ماتھا کشادہ تھا اور اس پر چند جھریاں تھیں۔ آنکھیں بے شک بڑی بڑی تھیں۔ تاہم ان کی روشنی ماند پڑنے لگی تھی۔ ستواں ناک میں تھنی پہنی ہوئی تھی۔ لیکن ناک کے گرد تلوں کی بہتات تھی۔ ہونٹ سیب کی قاشوں کے مانند پتلے تھے لیکن سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے اور ان کا رنگ سیاہ تھا۔ وہ پتلی دبلی اور لمبی تھی۔ لیکن اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی۔ آریان کو یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنی جانب دیکھنے پر اسے شک گزرا کہ اس کی بینائی واپس آ چکی ہے۔ اس لیے چیخ مار کر سیڑھیوں سے نیچے بھاگ گئی۔ آریان نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ سب سے نچلی منزل کے فلیٹ میں گھس کر کسی بھوت کے مانند غائب ہو گئی اور آریان اپنے دل کو تھام کر رہ گیا۔ وہ اپنے آپ کو ان تین پتلوں کے مانند محسوس کر رہا تھا جو بے جان وجود لیے اس کے فلیٹ میں صوفوں کے پاس کھڑے تھے۔ وہ سست قدموں سے چلتا ہوا فلیٹ پر واپس آ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی بینائی دوبارہ چلی گئی ہو اور ساتھ میں دل کی دھڑکن کو بھی لے گئی ہو۔ وہ تمام دن صوفے پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ شام کو مونی جلدی واپس آ گئی۔ اس وقت تک آریان کافی حد تک اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ اس نے مونی کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ سب کچھ سنتی رہی پھر تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

آریان نے اسے بتایا۔ ”وہ نچلی منزل کے فلیٹ میں مقیم ہے۔ تم وہاں جاؤ، اور اس کے متعلق معلومات کر کے واپس آؤ۔“

مونی چپ رہی۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ بھی کہنا سننا فضول ہے۔ اس کے بھائی نے جو فیصلہ کر لیا ہے، وہ اس پر عمل پیرا ہو کر رہے گا۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ اٹھ کر فلیٹ سے باہر نکل گئی۔ وقت ایک دفعہ پھر تھم کر رہ گیا۔ آریان نے ہیڈ فون کان سے لگایا اور ایف ایم سننے لگا۔ وہ اپنے آپ کو دوبارہ معذور محسوس کر رہا تھا۔ نو بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی بجی۔ آریان نے دروازہ کھول دیا۔ حسبِ توقع مونی سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات تھے۔ وہ کوئی بھی بات کیے بغیر آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی سٹنگ روم کے صوفے پر آ بیٹھی۔ پھر بولی۔

”اس کا نام عافیہ ہے۔ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ جن کی عمریں پندرہ سے بیس کے درمیان ہیں۔ شوہر بہت بڑے شوروم کا مالک ہے۔ میں ملاقات کے بہانے ان سب سے مل کر آئی ہوں۔ میں نے عافیہ سے تمہارے متعلق بات چیت کی لیکن اس نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ تم بھی اسے ایک بھیانک خواب جان کر بھول جاؤ۔ میں جلد تمہاری شادی کر دوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم خوش رہو گے۔“

آریان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب دینے کے لیے اس کے پاس کوئی الفاظ نہیں تھے۔ بات صرف عمر زیادہ ہونے کی حد تک محدود ہوتی تو الگ بات تھی۔ لیکن وہ دو بچوں کی ماں بھی تھی اور یہی بات قابلِ ہضم نہیں تھی۔

❖❖❖

تن اور دھن

احمد جعفری

آرام دہ زندگی ہر ایک کا خواب ہوتی ہے... اسے اپنے خوابوں کی تعبیر سامنے نظر آرہی تھی... مگر انتہائی درجے کی مشقت خیز زندگی کے ہمراہ... کاروبار کی پریشانیوں اور الجھنوں سے نمٹنا آسان ہے... مگر سفاک تر موسم کی سختیاں برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں... سہانے مستقبل اور شاندار حال کے لیے اس نے سرد ترین موسم سے لڑنا قبول کرلیا تھا...

رنگین تتلیوں میں گھری زندگی کے خوبصورت پیراہن
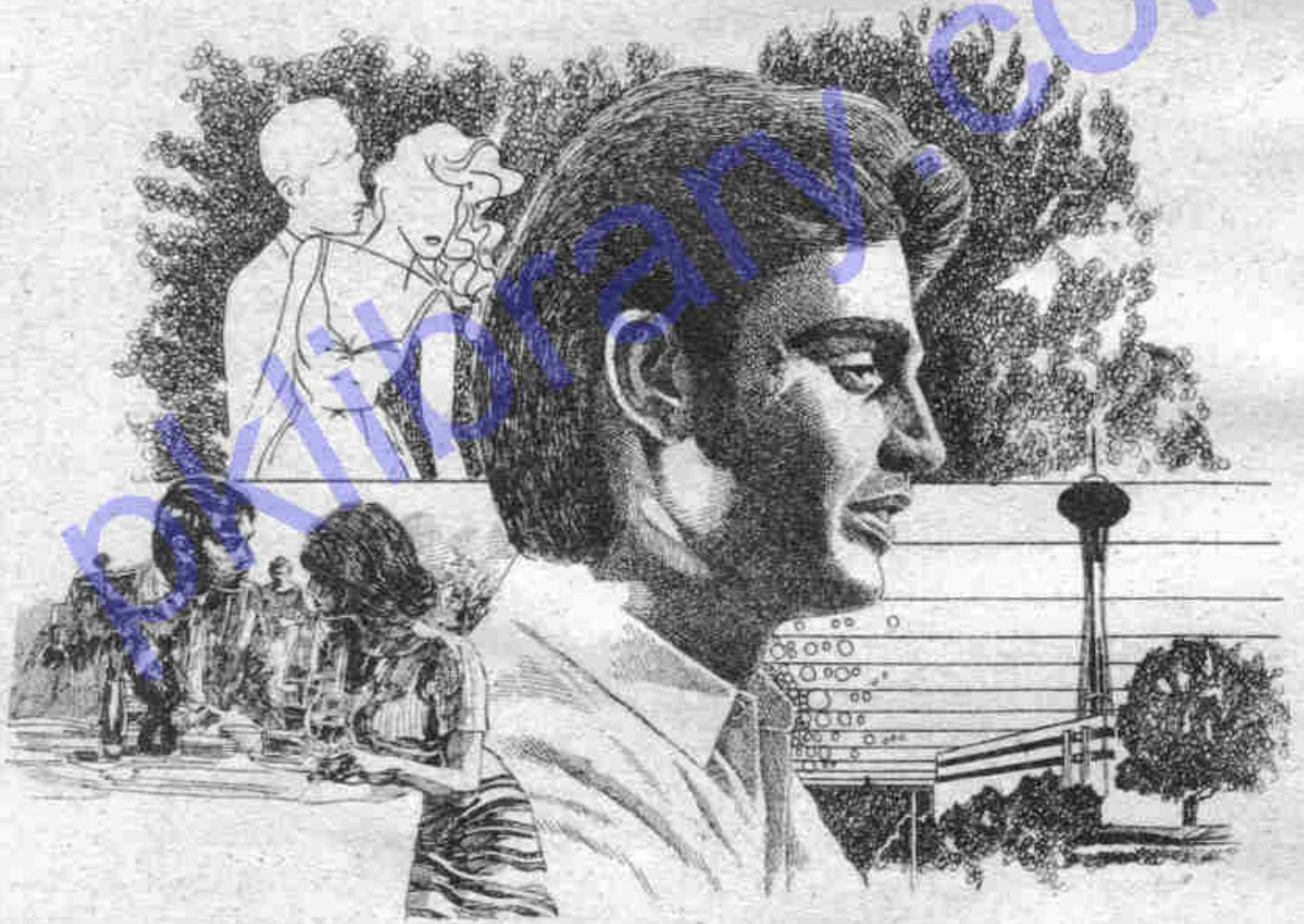
میرا نام وکٹر شرما ہے، آبائی تعلق بھارتی مقبوضہ ریاست گوا سے ہے۔ کسی زمانے میں، انڈیا کے ساحل پر واقع یہ چھوٹی سی ریاست پُرتگال کی کالونی ہوا کرتی تھی جب برِصغیر کو آزادی ملی تو بھارت نے گوا پر فوج کشی کی اور زبردستی اس ریاست کو انڈین یونین میں شامل کرلیا۔ ہمارا خاندان نسلی طور پر پرتگیزی ہے۔ ہم مذہب کے لحاظ سے کرسچن ہیں۔

میری عمر اس وقت تقریباً چوبیس سال تھی۔ لمبا قد، رنگ گہرا سانولا، مضبوط جسم اور چہرے کے نقش و نگار جاذبِ نظر

تھے۔ اعلیٰ یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں گریجویٹ کر چکا تھا۔ خاص دلچسپی سوفٹ ویئر پروگرامنگ میں تھی۔ یہاں روزگار کے مواقع بہت کم ہیں۔ جاب لیس تھا البتہ کمپیوٹر پروگرامنگ کے چھوٹے چھوٹے ٹھیکے لے کر گزارے لائق کچھ پیسے کما لیتا تھا۔

میرے ماموں جوزف شرما جن سے مجھے خاص لگاؤ ہے، عرصہ دس سال سے کینیڈا کے شہری ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ٹورنٹو میں ایک بہت بڑی این جی او کینیڈا فیملی افیئرز اور گنائزیشن کے اکاؤنٹ ڈویژن کے چیف ہیں۔

میں تقریباً روزانہ اسکائپ پر ان سے بات چیت کرتا رہتا تھا۔ وہ اکثر کہتے۔ ”وکٹر وہاں چھوٹی سی جگہ پر اپنے آپ کو کیوں ضائع کر رہے ہو۔ وزٹ ویزا پر یہاں آجاؤ اور دنیا دیکھو۔ موقع ملے تو یہیں ایڈجسٹ ہو جاؤ۔“

ایک دن انہوں نے میرے لیے انوی ٹیشن لیٹر بھیج دیا۔ کینیڈا میں ان کی این جی او کی بڑی قدر ہے اور ماموں بھی این جی او میں اونچی پوزیشن کے حامل تھے اس لیے ویزا ملنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی اور مجھے بغیر انٹرویو کے وزٹ ویزا ایشو کر دیا گیا اور میں کینیڈا کے لیے فلائی کر گیا۔

یہاں آکر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میلوں لمبے چھ چھ لین والے ہائی ویز، ہر دو ٹاؤن کے درمیان چھوٹے چھوٹے جنگلات، کھلے کھلے شہر۔ ٹاؤن۔ پولوشن کا نام و نشان نہیں۔ ماموں کا گھر مین ٹورنٹو سے بیس میل کے فاصلے پر آجیکس ٹاؤن میں تھا۔ چھوٹا سا بہت خوب صورت، بیسمنٹ پلس ٹو والا مکان۔ ماموں کے دو چھوٹے بچے، عمر آٹھ سال، دس سال مجھ سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے۔ میری ممانی بھی بہت محبت کرنے والی عورت تھیں۔

ہفتہ دس دن خوب سیر سپاٹے میں گزرے۔ ماموں کے پاس جیپ ٹائپ کی بڑی گاڑی تھی۔ ہم مشہور زمانہ نیاگرا فال دیکھنے گئے۔ سہ پہر سے دوسرے دن دوپہر تک وہیں رہے۔ رات کو نیاگرا کا نائٹ شو ہوا۔ میں تو اس کی چکا چوند دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

ایک مہینا اسی طرح گھومتے پھرتے گزر گیا۔

ایک رات ڈنر کے بعد ماموں نے پوچھا۔ ”ہاں بھئی گوا کے جوان، بتاؤ کینیڈا کیسا لگا؟“

”شاندار، انتہائی شاندار۔ ماموں یہ تو ہماری دنیا سے بالکل مختلف دنیا ہے۔ میں تو یہاں مستقل رہنا چاہتا ہوں۔ کوئی طریقہ ہے ماموں؟“

”ہاں دو طریقے ہیں۔ کوئی کالی، گوری کینیڈین لڑکی کو پھانسو، اس سے شادی کر لو۔ وہ تمہیں شہریت دلا دے گی۔“

”یہ تو ناممکن ہے آپ بھی جانتے ہیں ممانی بھی واقف ہیں کہ بچپن ہی میں میری منگنی خالہ زاد سے ہو گئی تھی۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ دوسرا طریقہ کیا ہے ماموں؟“

”دوسرا طریقہ بہت کٹھن ہے اس کے لیے حوصلہ چاہیے۔ صبر چاہیے، ہمت و طاقت چاہیے۔“

میں ہنس پڑا۔ ”ماموں کسی سے لڑنا ہے یا کسی لڑکی کو اغوا کرنا ہے؟“

ماموں ہنس دیے۔ ”دیکھو وکٹر یہاں کینیڈا میں ایک علاقہ ہے۔ انتہائی شمال مشرق میں۔ اس کے بعد کوئن الزبتھ آئی لینڈز کے نام سے درجنوں جزیرے ہیں۔ ان جزیروں کے بعد بحرِ آرکٹک ہے اور اس کے بعد نارتھ پول کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ نارتھ پول سے کچھ پہلے اسکیموز لینڈ ہے۔ اسکیمو کے کچھ خاندان اب بھی وہاں رہتے ہیں۔ اس ریاست میں چند شہر ہیں، آبادی بہت کم ہے۔ یہاں پیٹرول کے کنوئیں ہیں، ریفائنریز ہیں۔ شہروں میں ہوٹل، ریسٹورنٹ، شاپنگ مالز، کارخانے وغیرہ ہیں۔ اس علاقے کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں سرما کی رات بہت طویل ہوتی ہے، کم از کم پانچ ماہ کی مسلسل تاریک رات۔ سورج نکلتا ہے مگر صرف دو منٹ کے لیے پھر غائب ہو جاتا ہے۔ گرما میں سورج مسلسل چھ ماہ تک آسمان پر چمکتا ہے۔ روشنی ہلکی ہلکی پھیکی پھیکی سی۔ سرما میں درجۂ حرارت منفی 25 اور منفی 30 کے درمیان۔ ونٹر میں درجۂ حرارت منفی 40 اور منفی 45 کے درمیان۔“

میں منہ کھولے حیرت سے ماموں کی باتیں سن رہا تھا۔ ممانی گرم گرم کافی کے دو مگ رکھ کر بچوں کو سلانے چلی گئی تھیں۔

ماموں نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔ ”اصل بات تو میں تمہیں اب بتاتا ہوں۔ اس قدر شدید موسم کی وجہ سے وہاں رہنے کے لیے بہت کم لوگ آمادہ ہوتے ہیں۔ وہاں ہر قسم کے ورکرز کی ہر وقت ڈیمانڈ رہتی ہے۔ اس لیے یہاں کی حکومت نے ایک قانون بنایا ہوا ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے سے آیا ہوا کوئی بھی شخص گیارہ مہینے مسلسل، بلاتعطل وہاں رہائش رکھے تو وہ کینیڈا کی شہریت کا حق دار ہو جاتا ہے۔ حکومت اسے فوراً شہریت دے دیتی ہے۔ وہاں ذرا سی بداحتیاطی کا مطلب موت ہے۔ ڈیتھ بائی فریزنگ بڑی پرسکون اور میٹھی موت ہوتی ہے۔ اب بتاؤ، تم وہاں کہ شدید موسم میں مسلسل گیارہ مہینے رہ سکتے ہو؟“

میں سکتے میں آگیا، مسلسل سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔ ”رہ لوں گا ماموں مگر وہاں کروں گا کیا۔ گیارہ

مہینے کے اخراجات کہاں سے پورے کروں گا؟"

"واہ بھئی واہ میرا بھانجا تو بڑی ہمت والا ہے۔ وہاں جابز بہت ہیں۔ میں تمہارا داخلہ ایک کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں کرا دوں گا۔ ایک سمسٹر کی فیس بھی جمع کرا دوں گا۔ ایک بڑے اسٹور میں جاب بھی دلوا دوں گا اور کسی اچھی جگہ تمہاری رہائش بطور پے نگ گیسٹ کا انتظام بھی کرا دوں گا مگر میری ایک کڑی شرط ہے۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے ماموں کی طرف دیکھا انہوں نے کہا۔ "وکٹر تم اپنے پپا ماما کو وہاں کے ہولناک ونٹر کے حالات تفصیل سے بتاؤ گے۔ خطرات سے آگاہ کرو گے اگر وہ اجازت دیتے ہیں تو ویل اینڈ گڈ...... اگر وہ اجازت نہیں دیتے تو ونٹر کی مدت تک یہاں رہو۔ گھومو پھرو۔ انجوائے کرو اور گوا واپس چلے جاؤ۔ بیک ٹو دی پویلین، کیا سمجھے؟"

دوسرے دن ہی میں نے ماموں کے سامنے فون کا اسپیکر آن کر کے ماما پپا سے بات کی۔ ماما جی بہت ہچکچا رہی تھیں۔ پپا بھی ڈبل مائنڈ ہو رہے تھے۔ بہر حال مجھے اجازت مل گئی۔

☆☆☆

اجازت ملتے ہی میں نے ماموں کے ساتھ مل کر تیاریاں شروع کر دیں۔ ماموں نے میرا داخلہ فوراً ہی کروا دیا۔ مینا گیسٹ ہاؤس اینڈ ریسٹورنٹ میں میری رہائش کا انتظام بھی ہو گیا۔

ماموں نے بڑی لمبی چوڑی خریداری کی۔ ایک جیکٹ لومڑی کی کھال کی ٹوپی پلس، ریچھ کی کھال کا کوٹ پلس دبیز رین کم اوور کوٹ، موٹے گرم کپڑے کی پتلونیں۔ موزے، لانگ بوٹس اور پاؤں کے پنجے سے شروع ہو کر کمر تک آئے ہوئے انڈر گارمنٹس۔ میں ساز و سامان سے پوری طرح لیس ہو کر محاذ پر جانے کے لیے تیار تھا۔

میں نے بچوں کو گلے لگایا۔ پیار کیا۔ ممانی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ دعائیں پڑھیں۔ ماموں نے گلے لگا کر رخصت کیا۔

میں دس گھنٹے بس کا سفر کر کے اوڑگون شہر پہنچا۔ وہاں سے ٹرین کے ذریعے تھائی اسٹیشن پر اترا۔ یہ بڑا طویل سفر تھا۔ 20 گھنٹے سے زیادہ۔ جس اسٹیشن پر ٹرین نے آخری اسٹاپ کیا وہاں قریب ہی ایک چھوٹا سا ائرپورٹ تھا جہاں کئی چھوٹے چھوٹے جہاز کھڑے تھے۔ میں ایک جہاز میں سوار ہوا اور ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد بھیفیلو نیرو پہنچ گیا۔ یہی میری آخری منزل تھی۔

ٹیکسی نے آدھے گھنٹے میں مینا ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچا دیا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ یہ ٹاؤن بھیفیلو نیرو کے نام سے مشہور ہے اور چاروں طرف سے چھوٹی بڑی میٹھے پانی کی جھیلوں سے گھرا ہوا ہے۔

ٹیکسی رکتے ہی ریسٹورنٹ سے نکل کر ایک لڑکی ہماری طرف آئی۔ لڑکی تقریباً میری ہم عمر تھی۔ قد چھوٹا تھا مگر جسم صحت مند اور بھرا بھرا تھا۔ کالی کالی بڑی آنکھوں میں سحر تھا۔ اس میں بڑی دلکشی تھی۔

چھوٹے قد کی لڑکیاں میری کمزوری ہیں۔ میری منگیتر کا قد بھی چھوٹا ہے۔ میں اسے چھیڑتا ہوں۔ پورٹیبل منگیتر۔ وہ آنکھیں دکھاتی ہے اور میرا منہ چڑا کر بھاگ جاتی ہے۔ زندگی کا یہ دور بھی خوب ہوتا ہے۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر آنے والی لڑکی نے ٹیکسی میں جھانکا۔ "کیا آپ ہی وکٹر شرما ہیں؟" میرے سر ہلانے پر اس نے کہا۔ "آپ ہمارے گیسٹ ہیں۔ آیئے میرے ساتھ۔"

میں نے ٹوپی دوبارہ سر پر جمائی اور ٹیکسی سے اتر گیا۔ باہر بہت سرد ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی اور میں سامان اٹھا کر ریسٹورنٹ سے بالکل ملحق ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہوئے۔ مکان میں ہیٹنگ بہت اچھی تھی۔ مکان کی چھت کھپریل کی تھی۔ چھت پر کہیں کہیں برف جمی ہوئی تھی۔

مکان میں داخل ہوتے ہی وسیع سٹنگ ایریا تھا جہاں کئی صوفے پڑے تھے۔ ایک کونے میں چھوٹا سا اوپن کچن تھا۔ اس کے قریب ڈائننگ ٹیبل اور ایک بڑا فریج تھا۔

لڑکی سامان کے ساتھ میرے لیے مخصوص کیے بیڈ روم میں داخل ہوئی جہاں صاف ستھرا بیڈ تھا۔ لڑکی نے ملحقہ باتھ روم کھول کر لائٹ جلائی۔ باتھ روم ٹائل والا نیٹ اینڈ کلین تھا۔ کمرے میں بڑی اسکرین والا ٹی وی بھی تھا۔

لڑکی نے کہا۔ "میرا نام مینا ہے یہاں کل تین بیڈ روم ہیں۔ ایک میرا، ایک میری ماما کا اور تیسرے میں اب آپ ہیں۔ ساتھ والا ریسٹورنٹ بھی ہمارا ہے جس کو ماما اور میں مل کر سنبھالتے ہیں۔ آپ فریش ہو کر سٹنگ روم میں آجائیں، میں آپ کو ریفریشمنٹ پیش کرتی ہوں۔"

لڑکی نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہونے لگی۔ میں نے کہا۔ "مینا کماری تمہارا ہاتھ بہت گرم اور گداز ہے۔"

لڑکی جاتے جاتے رک گئی۔ "آپ نے مجھے کماری کہا اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کا مطلب ہے۔ خوب صورت کوئین کی حسین و جمیل، جوان اور زندگی سے بھرپور بیٹی۔"

لڑکی شرما کر ہنسی اور تھینک یو کہہ کر باہر چلی گئی۔

میں نے کپڑے چینج کیے اور منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل کر ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا۔ مینا کچن میں بجلی کے چولھے پر کچھ بنا رہی تھی۔ اس نے میرے سامنے گرما گرم کافی کا مگ رکھا۔ ساتھ میں خستہ اور گرم کوکیز کی پلیٹ تھی۔ وہ بھی اپنا مگ لے کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ ''مینا، یہ ٹاؤن تو خاصا بارونق ہے۔ راستے میں، میں نے کئی شاپنگ مال، سینما ہاؤس اور دکانیں دیکھی ہیں۔ گھر میں ہیٹنگ بھی بہت اچھی ہے۔''

''ڈکٹر یہاں پیٹرول، گیس اور بجلی بہت سستی ہے۔ ہم کوکنگ بجلی کے چولھے پر ہی کرتے ہیں۔ یہاں آس پاس بے شمار جھیلیں ہیں۔ سمر میں لوگ ان جھیلوں میں مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ یہاں کی مچھلی بہت لذیذ ہوتی ہے۔ ونٹر میں جھیلوں کی سطح پر چھ فٹ موٹی ٹھوس برف جم جاتی ہے۔ اس پر سے کاریں وغیرہ گزرتی رہتی ہیں۔ ڈکٹر یہ علاقہ بہت خوب صورت ہے۔ صحت مند، صاف ستھری آب و ہوا لیکن یہاں کا ونٹر بہت ہولناک ہوتا ہے۔ اس سال 20 اکتوبر سے ونٹر شروع ہو جائے گا۔ ونٹر میں ہمارا سونا جاگنا، جاب پر جانا سب گھڑی کے وقت کے مطابق ہوتا ہے۔ سورج تو پانچ مہینے کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔''

میں نے اپنا سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ''میں یہاں سگریٹ پی سکتا ہوں؟''

''آپ یہاں سگریٹ پی سکتے ہیں بلکہ مجھے بھی پلایئے... مگر ریسٹورنٹ اور پبلک پلیس پر سگریٹ نوشی منع ہے۔''

رات کو ڈنر میں نے ریسٹورنٹ میں کیا۔ وہاں مینا کی ماما سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ بھی چھوٹے قد کی صحت مند اور خوش مزاج خاتون تھیں۔

ڈنر کے بعد میں اور مینا سٹنگ روم میں آ گئے اور سگریٹ پینے لگے۔ مینا میرے بارے میں سوالات کرنے لگی۔ میں نے اپنی پوری ہسٹری اس کے سامنے کھول کر رکھ دی پھر میں نے کہا۔ ''مینا! تم بھی تو اپنے بارے میں بتاؤ؟''

''ڈکٹر! ہمارا اصل تعلق اسکیمولینڈ سے ہے جو نارتھ پول سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں کی لائف بڑی ٹف ہے۔ چھ مہینے کا دن چھ مہینے کی رات۔ میرے نانا نے اپنے اور کچھ دوسرے خاندانوں کے ساتھ وہاں سے ہجرت کی اور یہاں آ کر بس گئے۔ میں یہیں پیدا ہوئی۔ جب پندرہ سال کی ہوئی تو میری شادی یہاں رہنے والے اسکیمو نوجوان سے کر دی گئی جو مجھ سے دس سال بڑا تھا۔ وہ چار سال تک میرے ساتھ انجوائے کرتا رہا پھر وہ کمینہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ شاید اسکیمو لینڈ واپس چلا گیا ہو۔'' مینا خاموش ہو گئی۔

''مینا مجھے اسکیموز سے بہت دلچسپی ہے۔ تم وہاں کے پورے حالات مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

''ڈکٹر جب میں چھوٹی سی بچی تھی تو رات کو نانا کے پاس بیٹھ کر اسکیمولینڈ کے حالات بڑے شوق سے سنتی تھی۔ وہ بتاتے تھے کہ وہاں برف کی سلیں کاٹ کاٹ کر چھوٹے چھوٹے مکان بناتے تھے۔ مکان میں ریچھ کی چربی سے دیا جلاتے تھے جس سے روشنی بھی ہوتی تھی اور گھر بھی گرم ہو جاتا ہے۔ وہاں رات کو سونے کے لیے کپڑے اتارنا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا تھا۔ کپڑے سردی کی وجہ سے اکڑ جاتے تھے۔ سب لوگ برفانی لومڑیوں کی کھالوں سے بنے لباس پہنتے تھے۔ وہاں درخت اور لکڑیاں نہیں ہوتیں اس لیے آگ بھی نہیں ہوتی۔ لوگ شکار کردہ جانوروں کا کچا گوشت کھاتے تھے۔ کچا گوشت بہت طاقتور ہوتا ہے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''کچا گوشت، وہ کیسے کھاتے تھے؟''

''ڈکٹر ایسا منہ مت بناؤ۔ کچا ماس بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ بشرطیکہ گرم ہو اور زندہ ہو۔ آج تمہیں کھلاؤں گی۔'' مینا نے کھلکھلا کر کہا۔

میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔

''اور سنو ڈکٹر! اسکیموز کرنسی سے واقف نہیں ہیں، وہ لومڑیوں اور برفانی ریچھوں کی کھالیں جمع کرتے رہتے ہیں۔ سمر میں مہذب دنیا سے تاجر وہاں پہنچتے ہیں اور بارٹر سسٹم کے تحت چیزوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ کھالوں کے بدلے میں ان کو شکاری بندوقیں، پستول، کارتوس، کلہاڑیاں، برتن وغیرہ دیتے تھے۔ کچھ تاجر خاموشی سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس سونا ہو تو دے دو تمہیں اس کے بدلے میں اور چیزیں دیں گے۔ وہاں کے لوگ ہنستے تھے کہ دیکھو کتنے بے وقوف لوگ ہیں سونے جیسی بے کار دھات مانگتے ہیں اس سے نہ ہتھیار بن سکتے ہیں نہ ہی کوئی اوزار۔''

میں بڑی دلچسپی سے اُس کی باتیں سُن رہا تھا۔ یکایک میری نظر گھڑی پر پڑی۔ رات کے دس بج گئے تھے، میں نے کہا۔ ''تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ میں بڑا لمبا سفر کر کے آیا ہوں۔ اب آرام کروں گا۔''

''سنو ڈکٹر آج فرائیڈے نائٹ ہے کل سٹرڈے ہے یعنی ویک اینڈ شروع ہو رہا ہے یہاں سیر و تفریح کے اور مواقع

تو ہیں نہیں۔ ٹی وی والے رات کو دس بج کر تیس منٹ پر کچھ خاص موویز دکھاتے ہیں۔"

میں اس کی بات سن کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ کپڑے تبدیل کیے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ٹھیک دس بج کر تیس منٹ پر میں نے چینل 69 لگایا۔ فوراً ہی اسکرین پر دو بچوں کی اسٹل تصویریں آئیں۔ دونوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ڈھانپ رکھی تھیں۔ مطلب یہ بتانا تھا کہ یہ موویز بچوں کے لیے نہیں ہیں۔ یہ تصویریں تین منٹ تک اسکرین پر رہیں پھر خاص مووی شروع ہو گئی۔ میرے تو پانچ منٹ میں ہی پسینے چھوٹ گئے۔

دس منٹ کے بعد بینا میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے مردانہ قمیص پہنی ہوئی تھی اور چھوٹا سا اسکرٹ۔ اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر میں جھینپ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ڈکٹر ہٹو... مجھے جگہ دو کیا، عورتوں کی طرح شرما رہے ہو۔" یہ کہہ کر وہ میرے برابر میں لیٹ گئی۔ مووی میں کیا دکھایا جا رہا تھا کچھ پتا نہ تھا۔ ہم دونوں آپس میں مشغول رہے۔ بینا نے کہا۔ "کہو کیا اور گرم ماس کیسا لگا؟"

"مگر بینا یہ نہیں ہونا چاہیے تھا اگر تمہاری ماما اندر جھانک لیتیں تو بہت بُرا ہوتا۔"

"کیا بُرا ہوتا۔ وہ کہتیں۔ سوری ٹو ڈسٹرب یو۔"

میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

مجھے پتا ہی نہ چلا کہ میں کب سو گیا۔ صبح دس بجے آنکھ کھلی۔ ٹی وی بند تھا۔ بینا جا چکی تھی۔ میں باتھ روم میں گھس کر بہت دیر تک نہاتا رہا۔ تیار ہو کر بیڈ روم سے باہر آیا۔ بینا کچن میں مشغول تھی۔ اس نے میرے سامنے مالٹے کا خالص جوس کا گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ "ڈکٹر مجھے معلوم تھا کہ تم دیر سے اٹھو گے تمہارے لیے خاص بریک فاسٹ بنا رہی ہوں۔ ڈکٹر تم انعام کے حق دار ہو۔ اگلے ویک اینڈ پر میں اپنی دوست کو انوائٹ کر رہی ہوں وہ تمہارا انعام ہوگی۔"

میں سوچ رہا تھا کہ میں کہاں پھنس گیا۔ میں تو گاؤں کا سیدھا سادہ لڑکا تھا، یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

میں نے ناشتا کرتے ہوئے پوچھا۔ "بینا! یہ بتاؤ کہ مہینے میں گیسٹ چارجز کتنے ڈالرز ادا کرنے ہوتے ہیں؟"

"دو سو ڈالرز ماہانہ، اس میں صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا شامل ہے۔ چھٹی والے دن تینوں میلز بالکل فری۔ اور اس میں وہ بھی شامل ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ "تمہارے تین ماہ کے چارجز ایڈوانس میں ماما کو مل چکے ہیں۔"

"منڈے کی صبح مجھے کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ کے لیے نکلنا ہے۔ کئی اور جگہ بھی جانا ہے۔ یہ بتاؤ یہاں ٹرانسپورٹ کی کیا صورتِ حال ہے؟"

"یہاں پیٹرول بہت سستا ہے لہٰذا ٹرانسپورٹ بھی بہت سستی ہے۔ ٹاؤن میں کہیں بھی جاؤ ٹیکسی کا کرایہ ایک ہی ہے۔ یعنی صرف دو ڈالرز۔ بسیں تو بہت ہی سستی ہیں۔ ڈرائیور کے پاس رکھے ہوئے باکس میں کوارٹر ڈالر کا سکہ ڈالو اور جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ، اگر راستے میں کہیں روٹ چینج کرنا ہو تو ڈرائیور تمہیں ٹکٹ سلپ دے گا، اس کے کوئی چارجز نہیں ہوتے۔ وہ سلپ دکھا کر دوسرے روٹ کی بس میں سوار ہو سکتے ہو۔ بسوں کے روٹس کا میپ ہر دکان پر ملتا ہے۔"

☆☆☆

منڈے کی صبح میں اپنے تمام ڈاکومنٹ لے کر نکلا اور ٹیکسی کے ذریعے کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ پہنچ گیا۔ وہاں صرف آدھے گھنٹے میں میرا ایڈمیشن ہو گیا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ایڈمن منیجر نے میرا اسٹوڈنٹ ورک پرمٹ بھی بنا دیا۔ میں روزانہ پانچ گھنٹے کی جاب کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں اس شاپنگ مال گیا جہاں میری جاب کی بات ماموں نے طے کی ہوئی تھی وہ بہت بڑا مال تھا۔ وہاں پارٹ ٹائم جاب مل گئی۔ مجھے روزانہ دوپہر دو بجے سے شام سات بجے تک کام کرنا تھا۔ وہاں سے سیدھا ٹاؤن ہال پہنچا جہاں امیگریشن کے حکام بھی بیٹھتے تھے۔ انہوں نے مجھے رجسٹر کیا۔ میرا گیارہ مہینے کا رہائشی پیریڈ 8 اکتوبر سے باضابطہ طور پر شروع ہو گیا۔

شاپنگ مال پر میرا معاوضہ 30 ڈالرز فی گھنٹا طے ہوا تھا جو میرے لیے کافی تھا۔ اس کے علاوہ سوفٹ ویئر کے ٹھیکوں سے بھی میری انکم اچھی خاصی تھی۔ میں اس پوزیشن میں تھا کہ اپنے اخراجات بشمول گیسٹ روم رینٹ، کمپیوٹر انسٹی ٹیوشن کی سمسٹر فیس، ٹرانسپورٹ، لنچ وغیرہ کے اخراجات ادا کرنے کے بعد بھی کافی سیونگ کر سکتا تھا۔

آفیشلی ونٹر ڈکلیئر ہو گیا تھا۔ یعنی پانچ مہینے کی طویل رات شروع ہو گئی تھی۔ سورج صرف چند منٹ کے لیے نکلتا تھا۔

اسکائپ پر ماما پاپا اور ماموں کے ساتھ بات ہوتی رہتی تھی۔ میں نے یہاں کے موسم کے مطابق کپڑے پہن کر تصویریں اپنے ماموں کو سینڈ کیں جن کو دیکھ کر ان کے بچوں نے کہا۔

"ڈکٹر بھیا بھالو بن گئے ہیں۔"

دسمبر میں موسم بہت ہولناک ہو گیا۔ ایک دن برفانی سائیکلون ٹائپ کے طوفان کی فورکاسٹ کی گئی۔ ہوا کی رفتار کا

ڈھائی سو سے تین سو میل فی گھنٹے کا اندازہ لگایا گیا۔ ریڈ وارننگ ایشو کر دی گئی۔ تمام ادارے دو دن کے لیے بند کر دیے گئے۔

رات کو جاب سے فارغ ہو کر گیسٹ ہاؤس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مینا اور ماما کھڑکیوں پر لکڑی کے تختے کیلوں سے ٹھونک رہی تھیں۔ میں بھی چینج کر کے ان کی مدد کرنے لگا۔ مینا نے کہا۔ ”ڈکٹر یہ بہت ضروری ہے۔ ہوا کو اندر آنے کا ذرا سا بھی راستہ مل گیا تو وہ گھر کی چھت اڑا دے گی۔ ریسٹورنٹ کو ہم پہلے ہی اچھی طرح محفوظ کر چکے ہیں۔ ایسے طوفان یہاں آتے رہتے ہیں اس لیے ہم تختے وغیرہ تیار رکھتے ہیں۔“

جب ہوا میں تیزی آنی شروع ہوئی تو ہم تینوں سٹنگ روم میں ایک جگہ بیٹھ گئے، قریب ہی ایمرجنسی لائٹ اور گیس پورٹیبل ہیٹر بھی رکھا ہوا تھا جس کے نیچے ٹینکی میں گیس بھری ہوئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد طوفان میں تیزی آ گئی۔ ہوا سیٹی کی آوازیں نکالتی ہوئی چل رہی تھی۔ چھت پر کبھی بارش کبھی اولے گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہوا کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ پورا مکان لرزتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد طوفان یکا یک ختم ہو گیا۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ سکون ہو گیا۔ مینا نے کہا۔ ”ڈکٹر ابھی طوفان کا آدھا حصہ گزرا ہے۔ طوفان کے مرکز میں سکون ہوتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد طوفان کا دوسرا حصہ گزرے گا۔“

مینا کی ماما بہت سہمی ہوئی تھیں اور منہ ہی منہ میں دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ میں بھی بہت سہما ہوا تھا۔ باہر سے ایمبولینس گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پندرہ منٹ کے سکوت کے بعد طوفان کا دوسرا حصہ گزرنے لگا۔ شدت پہلے جیسی ہو گئی۔ ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی چلنے لگی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد طوفان کی شدت کم ہونا شروع ہو گئی پھر خاموشی چھا گئی۔ پاس رکھے ہوئے ریڈیو پر اعلان ہوا کہ طوفان گزر چکا ہے، لوگ احتیاط سے باہر نکل سکتے ہیں۔

ہم نے ایک کھڑکی پر لگایا ہوا تختہ ہٹایا پھر کھڑکی کھولی۔ رات کی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر یکا یک تمام اسٹریٹ لائٹس روشن ہو گئیں۔ سڑک اور مکانوں کی چھتوں اور دروازوں کے سامنے برف کے ڈھیر لگے ہوئے، سڑک پر جا بجا مرے ہوئے پرندے پڑے ہوئے تھے۔

ٹی وی کی نشریات آنا شروع ہو گئیں۔ ہم ٹی وی پر امدادی کارروائیاں دیکھنے لگے۔ سڑکوں پر ہیلی کاپٹر سے نمک کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا تاکہ برف پگھل کر نالیوں میں بہہ جائے۔ ٹریکٹرز مکانوں کے دروازوں کے سامنے سے برف ہٹا رہے تھے، کچھ مکانوں کی چھتیں اڑ گئی تھیں۔

اس طوفان نے تو میری سٹی گم کر دی۔ میں نے دل میں کہا۔ ڈکٹر میاں اپنا سامان پیک کرو اور اس منحوس جگہ سے نکل جاؤ، بھاڑ میں گئی کینیڈا کی شہریت۔ پھر مینا اور اس کی ماما کا خیال آیا کہ یہ چھوٹے قد کی عورتیں بھی تو یہاں رہ رہی ہیں۔ ان کی ہمت دیکھو، دو دن کے لیے تمام ادارے بند تھے پھر سٹرڈے اور سنڈے گویا لونگ ویک اینڈ تھا۔ سٹرڈے کو مینا کی دوست تاجی بھی آ گئی۔ وہ بھی اسکیمو لڑکی تھی۔ چھوٹے قد کی نہایت صحت مند اور خوب صورت۔

میں اپنے ساتھ آم، لیموں اور مرچ کے اچار کی بڑی بوتلیں لے کر آیا تھا۔ اچار مینا اور اس کی ماما نے بہت پسند کیا۔ اچار کے علاوہ میں کباب کے تیس عدد پیکٹ بھی لایا تھا جو ڈی فریزر میں رکھے ہوئے تھے۔

باہر تاریکی تھی مگر گھڑی کے مطابق لنچ ٹائم ہونے والا تھا۔ میں نے کچن سے ایک تھالی اور بڑا چمچہ اٹھایا اور تھالی بجاتے ہوئے اعلان کرنے لگا۔ ”بیوٹی فل لیڈیز متوجہ ہوں۔ آج لنچ پر آپ تینوں مینا، ماما اور تاجی میری مہمان ہیں۔ آج لنچ میں بناؤں گا اور میں ہی سرو کروں گا۔“ تینوں نے تالیاں بجائیں۔

میں نے کبابوں کے پیکٹ کھولے اور کبابوں کو بجلی کے چولھے کی بڑی گول سلیٹ پر رکھ کر گرم کرنے لگا۔ چاروں طرف کبابوں کی خوشبو پھیل گئی۔

سب نے چٹ پٹے کباب ڈبل روٹی کے سلائس کے ساتھ خوب مزے سے پیٹ بھر کر کھائے۔ لڑکیاں تو آم کے اچار کی عاشق ہو گئیں۔ اس کی پھانکیں آنکھ میچ میچ کر چوس رہی تھیں۔

رات کو ساڑھے دس بجے کے قریب میں اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ میں کپڑے بدل کر شارٹ اور بنیان پہن کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ ٹی وی پر وہی بے ہودہ موویز آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مینا بھی اپنی دوست تاجی کو لے کر آ گئی۔ دونوں مختصر لباس میں تھیں۔ دونوں بیڈ پر میرے قریب آ گئیں۔ لڑکیاں پکچر کے سین پر ایسے ایسے کمنٹس کر رہی تھیں کہ مجھے شرم آ رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد مینا نے کہا۔ ”ڈکٹر میں تو چلی۔ میری یہ دوست تاجی تمہاری مہمان ہے۔ اس کی اچھی خاطر کرنا۔“ پھر وہ گڈ نائٹ کہہ کر چلی گئی۔

☆☆☆

اسٹور کی تنخواہ اور سوفٹ ویئر کے ٹھیکوں کی وجہ سے میری انکم میری ضروریات سے بہت زیادہ تھی۔ بہت اچھی سیونگ ہو رہی تھی۔ میں ہر مہینے مینا کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ سونے کے

زیور کی شکل میں خریدتا تھا۔ مینا بہت خوش تھی۔ ماتا پتا کو ہر ماہ معقول رقم بھیجتا تھا۔

میں چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ یہاں ویک اینڈ پر میری راتیں جس طرح گزر رہی تھیں، وہ میرے نزدیک مہاپاپ تھیں مگر ان سے بچنے کا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر صبر کرلیا کہ چلو گیارہ مہینے کی بات ہے جیسی گزر رہی ہے، گزارلوں۔ نیشنلٹی ملتے ہی یہاں سے ٹورنٹو بھاگ جاؤں گا۔

کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ اور اسٹور میں جاب پر جاتے وقت کچھ راستہ پیدل چلنا پڑتا تھا، وہ بہت تکلیف دہ تھا۔ میرے لونگ بوٹس برف میں ایک ایک فٹ دھنس جاتے تھے۔ میرے لباس کا وزن بھی دس کلو سے کم نہ تھا۔ دس منٹ کا راستہ آدھے گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔

اتوار کی ایک صبح میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا مینا کے ساتھ کافی پی رہا تھا کہ ایک اور طوفان آگیا۔ یہ مختلف طوفان تھا۔ دروازہ کھول کر ایک لمبا چوڑا مرد ایک نوجوان عورت کو ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی مینا اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”کیوں آیا ہے ٹوٹو، یہاں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے فوراً یہاں سے دفع ہوجاؤ۔“

”مینا میں اب بھی تمہارا شوہر ہوں۔ میرا حق ہے تم پر۔ یہ عورت میری دوسری بیوی ہے، اس کو میں اسکیمو لینڈ سے لایا ہوں، میں اب یہیں رہوں گا اپنی دو بیویوں کے ساتھ۔“

”اچھا تم نے دوسری شادی کرلی ہے۔ جانتے ہو تم نے کتنا سنگین جرم کیا ہے۔ کینیڈا کے قانون کے مطابق تمہیں تین سال کی جیل ہوجائے گی۔ میں تم سے علیحدگی کے کاغذات پہلے ہی سٹی عدالت میں جمع کراچکی ہوں۔ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ نکلو یہاں سے ورنہ میں پولیس کو بلالوں گی۔“

”مینا میں مکّے مار مار کر تمہارا چہرہ بگاڑ دوں گا اور یہ لڑکا جسے تم اپنا گیسٹ کہتی ہو، اس کی ٹانگیں توڑ کر اس کا سامان باہر پھینک دوں گا۔“

”ٹوٹو، تم نے کھلی دھمکی دی ہے، میں تمہارا حشر خراب کر دوں گی۔“ یہ کہہ کر مینا نے اپنا سیل فون نکالا اور نائن ون ون کو کال کر دی۔ ”میں مینا بول رہی ہوں۔ مینا ریسٹورنٹ کی مالک۔ میرا سابقہ شوہر چار سال غائب رہنے کے بعد اندر گھس آیا ہے۔ وہ مجھے اور میرے گیسٹ کو جان سے مارنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ فوراً پہنچو۔“ یہ کہہ کر مینا نے اپنے موبائل سے دونوں کی کئی تصویریں بنالیں۔

پولیس کا سُن کر ٹوٹو اور اس کی بیوی دونوں گھبرا گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس پٹرولنگ کے ہوٹر کی آواز آنے لگی۔ سائرن کی آواز سنتے ہی دونوں بھاگے۔ جاتے جاتے ٹوٹو نے میری طرف دیکھا۔ ”تجھے تو میں چھوڑوں گا نہیں، میرا انتظار کرنا۔“

دونوں باہر نکل کر تاریکی میں غائب ہوگئے۔ پانچ منٹ کے بعد پولیس کی پٹرول کار سامنے آکر رکی۔ کار سے اُتر کر ایک مرد اور ایک لڑکی پولیس یونیفارم پہنے اندر داخل ہوئے۔ دونوں ینگ اور اسمارٹ تھے۔ مینا نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور پوری بات مع ان کی دھمکیوں کے ان کو بتائی۔ پولیس وومین نے کہا۔ ”ینگ لیڈی آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ ہم ان کو جلد ہی گرفتار کرلیں گے۔ یہاں پٹرولنگ بھی بڑھادیں گے اگر آپ کے پاس ان کی کوئی تصویر ہوتو ہمیں دے دیں۔“

مینا نے اپنے موبائل سے کھینچی ہوئی تصویریں ان کے سامنے کر دیں۔ پولیس وومین نے انہیں اپنے سیل فون میں منتقل کرلیا۔ ”مس مینا دس منٹ میں ہی تصویریں ہر پٹرول کار اور ہر پولیس والے کے سیل پر موجود ہوں گی۔ ہم جلد ہی ان کو قابو میں کرکے لاک اپ کردیں گے۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں، گڈ بائے۔“

پولیس کے جانے کے بعد میں نے بہت دیر سے روکا ہوا سانس خارج کیا۔ ”مینا میں تو بہت پریشان ہوگیا ہوں، مجھے ایک گرما گرم کافی اور پلاؤ دو پلیز۔“

☆☆☆

مئی کا مہینا شروع ہوگیا تھا۔ سورج اب تین چار گھنٹے آسمان پر موجود رہتا تھا۔ درجۂ حرارت میں بھی بہتری آگئی تھی۔

میں نے اگست میں اپنی سی وی کمپنیوں اور بینکوں کو بھیجنی شروع کردی تھی۔ ہر سی وی میں یہ ضرور لکھتا تھا کہ میں نومبر کے وسط میں جاب کے لیے مہیا ہوں گا۔

سات ستمبر کو میرے گیارہ مہینے پورے ہوئے۔ دوسرے دن میں اپنے تمام ڈاکیومنٹس لے کر ٹاؤن ہال پہنچ گیا۔ یہاں امیگریشن حکام کا کاؤنٹر بھی تھا۔ انہوں نے میرے کاغذات کا بغور معائنہ کیا اور میری فائل بنا کر اپنے ہیڈ آفس اوٹاوا بھیج دی۔

ایک ہفتے بعد میری فائل منظوری کے بعد واپس آگئی۔ میں اب کینیڈا کا شہری تھا۔ ٹاؤن مجسٹریٹ کے سامنے میں نے

حلف بھی اٹھالیا۔ مجھے شہریت کا کارڈ اور سرٹیفکیٹ ایشو کر دیے گئے۔

میں اب ٹورنٹو واپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ میرے پاس کئی کمپنیوں اور ایک بینک سے جاب کی آفر آچکی تھی لیکن پہلے میں ٹورنٹو جا کر ماموں سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

میرے واپس جانے پر بینا افسردہ تھی۔ بینا نے مجھے بتایا کہ ایک خاندان ابھی حال ہی میں اسکیمولینڈ سے یہاں آیا ہے، ان کے پاس کافی مقدار میں سونا ہے وہ خاندان خوف زدہ ہے کہ اتنا سونا یہاں لانے پر وہ کسی قانونی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے، وہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ”اگر تم چاہو تو میں سونا رعایتی ریٹ پر تمہیں دلوا سکتی ہوں۔“

مجھے دلچسپی تھی اور میرے پاس کافی سیونگ تھی۔ بینا نے وہ تمام سونا کافی کم ریٹ پر مجھے دلوا دیا۔ میں نے اس کو جیولری شاپ میں دے کر دس دس گرام کی پانچ گنیاں حاصل کر لیں۔ اس کے علاوہ چار چوڑیاں بنوائیں۔ دو بینا کو دیں اور دو اس کی ماما کو۔ دونوں خوش تھیں۔ دو گنیاں اپنی ممانی کے لیے اور دو اپنی چھوٹی بہن کے لیے تھیں اور ایک گنی میں نے شادی کے موقع پر اپنی بیوی کو منہ دکھائی میں دینے کے لیے رکھ لی۔

اتوار کو واپسی کے لیے میرا پروگرام سیٹ تھا۔ بینا پوری رات میرے پاس رہی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ڈکٹر تم نے مجھے اتنے قیمتی تحفے دیے ہیں، سوچتی ہوں تمہیں کیا تحفہ دوں؟“

”بینا تم مجھے پہلے ہی ہر ویک اینڈ پر بہترین تحفے دے رہی ہو۔“

بینا ہنس دی۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ”ڈکٹر تم مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے۔ کبھی کبھی فون ہی کر لیا کرنا۔“

”بینا تم بھولنے والی چیز نہیں ہو۔“

وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

☆☆☆

اگلے چوبیس گھنٹوں کے بعد میں ٹورنٹو میں تھا۔ ماموں، ممانی اور بچے مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بچوں کو تحفے دیے۔ ممانی کے ہاتھ پر بڑے ادب سے دو گنیاں رکھیں۔ ”ممانی ان سے آپ اپنی پسند کے زیورات بنوائیں۔“

دو گنیاں ماموں کو دے کر کہا کہ ان کو کسی کے ہاتھ میری ماتا کو بھجوا دیں۔ یہ میری چھوٹی بہن کے لیے ہیں۔

اتوار کو میری لمبی میٹنگ ماموں کے ساتھ ہوئی۔ میں نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ میرے پاس تین جاب کی آفرز تھیں۔ ایک ٹورنٹو کی، ایک مانٹریال کی اور ہیوسٹن میں ایک بینک کی۔ میم یونائٹڈ بینک لمیٹڈ۔ میں نے ماموں سے مشورہ مانگا۔

ماموں نے تمام آفرز غور سے دیکھیں اور سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے سگار سلگایا۔ ”دیکھو ڈکٹر میرا مشورہ تو یہ ہے کہ سب سے پہلے تم میم یونائٹڈ بینک کو لکھ دو کہ تم ایک سال کے بعد ان کا بینک جوائن کرو گے اگر وہ انتظار کر سکتے ہیں تو ویل اینڈ گڈ۔ تم فوری طور پر ٹورنٹو کی آفر قبول کر لو، ایک سال تک یہاں جاب کرو۔ اس دوران تمہارا کینیڈا کا پاسپورٹ بھی بن جائے گا۔ کینیڈین پاسپورٹ کی بڑی قدر ہے۔ ایک سال کے بعد امریکا چلے جاؤ اگر اس وقت میم بینک کی آفر ویلڈ رہتی ہے تو ہیوسٹن میں وہ بینک جوائن کر لو۔ ہیوسٹن کا موسم زیادہ شدید نہیں ہے۔ امریکا بڑا ملک ہے۔ محنتی آدمی کے لیے وہاں بڑا اسکوپ ہے۔ امید ہے کہ تمہیں امریکا کی شہریت آسانی سے مل جائے گی وہاں ایک سال کام کرنے کے بعد چھٹیوں پر گوا چلے جاؤ۔ ماتا پتا سے ملو۔ شادی کرو اور اپنی وائف کو لے کر ہیوسٹن آجاؤ۔ کہو کیسا رہا، میں نے تمہارا پورا شیڈول بنا دیا ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ”ٹھیک ہے ماموں، میں ایسے ہی کروں گا۔ میں کل ہی ٹورنٹو والی فرم سے رابطہ کرتا ہوں۔“

ٹورنٹو والی جاب میرے مزاج کی تھی۔ پے پیکیج بھی بہت اچھا تھا۔ میں بہت مطمئن تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ مجھے کینیڈین پاسپورٹ مل چکا تھا۔ میں نے ٹورنٹو والی جاب کو خیر باد کہا اور ورک پرمٹ پر میم یونائٹڈ بینک کی جاب جوائن کرنے کے لیے ہیوسٹن روانہ ہو گیا۔ میم یونائٹڈ بینک ایک بڑا بینک تھا۔ اس کا ہیڈ آفس ہیوسٹن میں تھا۔ اس کی برانچیں پورے امریکا اور بیرونِ امریکا میں تھیں۔ خاص طور پر مڈل ایسٹ میں اس کا نیٹ ورک کافی وسیع تھا۔ بینک نے مجھے سوفٹ ویئر سیکشن میں متعین کیا۔ سوفٹ ویئر کا تو میں چیتا تھا۔ میں بینک کی ریکوائرمنٹ کے مطابق سوفٹ ویئر پروگرامز بناتا رہتا تھا۔ بینک مینجمنٹ میرے کام سے مطمئن تھی اور میں بھی بہت خوش تھا کیونکہ پے پیکیج بہت اچھا تھا۔

میری عارضی رہائش ایک ہوسٹل میں تھی۔ میرا پروگرام تھا کہ جب مجھے امریکن نیشنلٹی مل جائے گی اور شادی کے لیے گوا جاؤں گا تب مکان یا اپارٹمنٹ لوں گا ابھی تو میں ورک پرمٹ پر کام کر رہا تھا۔ امریکی شہریت حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنے بینک کے توسط سے کوششیں شروع کر دی تھیں۔

☆☆☆

میں روزانہ کام سے فارغ ہو کر ہوسٹل جاتے ہوئے راستے میں ایک بار میں ایک جام پینے کے لیے رکتا تھا۔ اس بار میں ایک میکسیکن لڑکی بھی اکثر آتی تھی۔ عمر تقریباً بیس اکیس سال، چھوٹا قد، سرخی مائل ہلکا سانولا رنگ اور بڑی بڑی خوشنما کالی آنکھیں، ایک دن میں بار میں ایک ٹیبل پر بیٹھا وسکی کے جام اور ڈرائی فروٹ سے شغل کر رہا تھا کہ وہ میکسیکن لڑکی بار میں داخل ہوئی۔ بار میں اس وقت بہت رش تھا۔ لڑکی نے اپنا نام لے کر خالی جگہ کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ میری میز کے سامنے والی کرسی خالی تھی۔ وہ میری ٹیبل کی طرف آئی۔ مجھے مسکرا کر ہیلو کہا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہم نے باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اپنا پورا تعارف کرایا۔ اس نے بھی اپنے متعلق بتایا۔ اس کا نام شیرن تھا۔ پیشے کے لحاظ سے ایک بڑے اسپتال میں نرس تھی۔ دو تین ملاقاتوں کے بعد اس سے میری دوستی ہوگئی۔ جلد ہی یہ دوستی خاص دوستی میں بدل گئی۔ ہم ڈیٹ پر جانے لگے۔ مہینے میں دو تین راتیں ہم کسی نہ کسی ہوٹل کے کمرے میں گزارتے تھے۔ شیرن بہت خوش تھی۔

ایک ایسی ہی رات شیرن نے کہا۔ ”وکٹر تمہارے لیے ایک مشورہ ہے۔ تم ہوسٹل میں رہ رہے ہو۔ میرے پاس ایک تین بیڈروم والا بڑا اپارٹمنٹ ہے جو میری ماما نے مجھے گفٹ کیا تھا۔ میرے ساتھ میری چھوٹی بہن جینفر رہتی ہے۔ عمر تقریباً اٹھارہ سال۔ ہائی اسکول کے آخری سال میں ہے۔ بہت ذہین ہے۔ میرا یقین ہے کہ وہ اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی خاص تجربات سے گزر چکی ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟ میری اس سے زیادہ نہیں بنتی۔ ماما بھی اس سے خوش نہیں تھیں۔ ہمارا ایک بیڈروم خالی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس بیڈ روم میں شفٹ ہو جاؤ۔ تمہیں گھر جیسا آرام ملے گا۔ اگر تم چاہتے ہو تو اس کا رینٹ دے دینا۔ میری کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ امریکا میں یہ عام بات ہے۔ میں شیرن کو بہت پہلے ہی بتا چکا تھا کہ میری منگیتر گوا میں ہے۔ ایک سال بعد جب مجھے امریکا کی شہریت مل جائے گی تو چھٹیوں پر گوا جاؤں گا اور اس سے شادی کر کے یہاں لے آؤں گا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ ہم نے رینٹ اور دوسری باتیں طے کیں اور میں ویک اینڈ کی چھٹیوں میں، اپنے دو سوٹ کیس اور لیپ ٹاپ اپنی کار میں رکھ کر شیرن کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گیا۔ اپارٹمنٹ بہت اچھا تھا۔ میرے بیڈ روم کے ساتھ اٹیچڈ باتھ تھا۔ شیرن کی چھوٹی بہن جینفر، جینی سے بھی ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی چھوٹے قد کی تھی اور شیرن کی طرح خوب صورت تھی۔ اس سے باتیں کر کے میں نے دو باتوں کا اندازہ لگایا۔ ایک یہ کہ لڑکی بہت ذہین ہے، دوسرے اپنی بڑی بہن سے شدید نفرت کرتی ہے۔

رات کو ڈنر کے بعد شیرن میرے بیڈ روم میں آ گئی۔ ابتدائی شغل کے بعد شیرن بتانے لگی۔ ”وکٹر یہ اپارٹمنٹ میری ماما نے مرتے وقت مجھے گفٹ کیا تھا۔ جینی کے لیے بھی انہوں نے دو لاکھ ڈالرز سیکیورٹی بانڈ کی شکل میں چھوڑے ہیں جنہیں جینی 21 سال کی عمر کے بعد کیش کرا سکے گی۔ ماما، جینی کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے ناخوش تھیں۔ جینی بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی غلط راہوں پر چل پڑی تھی۔ ویسے وہ تعلیم کے معاملے میں بہت ذہین ہے۔ ہم دونوں بہنوں کا باپ، ماما کا بوائے فرینڈ تھا جو پانچ سال میں ماما کو دو بچیوں کا تحفہ دے کر کہیں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد ماما نے دوسرے بوائے فرینڈ تلاش کر لیے لیکن اولاد کے معاملے میں بہت محتاط ہو گئیں۔ وکٹر یہ امریکا کا کلچر بن چکا ہے۔ جینی کا تمام خرچہ میں برداشت کرتی ہوں، اس کے باوجود وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ وکٹر ایک خاص بات بھی تمہیں بتاتی ہے جب اسپتال میں میری نائٹ ڈیوٹی ہو اس رات اپنا بیڈروم اندر سے لاک کر کے سونا۔ جینی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ رات کو وہ تمہارے پاس آ سکتی ہے۔“

☆☆☆

میرا ایمپلائر یونائٹڈ بینک بہت تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ اس نے امریکا کے کئی کمزور بینک خرید لیے اور انہیں منافع بخش بنایا۔ مڈل ایسٹ کے ہر ملک میں اس کی شاخیں تھیں۔ ہر برانچ منافع میں جا رہی تھی۔ بینک کے پاس ڈپازٹس بہت تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے۔ بینک ہر سال بھاری منافع ڈکلیئر کرتا تھا۔

چھ ماہ کے بعد میری ترقی ہوگئی۔ مجھے سوفٹ ویئر سیکشن کا انچارج بنا دیا گیا اور دس ہزار ڈالرز سالانہ کا انکریمنٹ دیا گیا۔ میں بینک کے توسط سے اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ مجھے امریکا کی شہریت مل جائے تاکہ گوا جا کر اپنی منگیتر آسیہ کو بیاہ کر یہاں لے آؤں۔

ایک رات جب ڈنر کے بعد شیرن فل نائٹ ڈیوٹی پر اسپتال چلی گئی، میں اپنے بیڈ روم میں آیا۔ دروازے کو اندر سے لاک کر کے لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ ویک اینڈ نائٹ تھی۔ میرا دیر تک کام کرنے کا ارادہ تھا۔

رات گیارہ بجے میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ جینی اندر داخل ہوئی اور دروازے کو لاک کر کے اس سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے ایک گھٹنا موڑ کر دروازے پر پاؤں رکھا۔ منی

اسکرٹ پہنے ہوئے تھی، چھوٹی سی قمیص کے اوپری بٹن کھلے ہوئے تھے۔ بڑا دلکش مگر پریشان کن منظر تھا۔ میں ہکا بکا اسے تک رہا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”شیرن بے وقوف سمجھتی ہے کہ میرے پاس اس کمرے کی چابی نہیں ہے۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی اس کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی بنوالی تھی۔“ اس نے مٹھی کھول کر چابی لہرائی۔

میں بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے اسٹائل سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف آئی۔ ”وکٹر، تم آفس میں کام نہیں کرتے ہو کیا جو رات کو لیپ ٹاپ کھولے بیٹھے ہو۔ بند کرو اسے۔ رات دوسرے قسم کے کام کرنے کے لیے ہوتی ہے۔“

اس نے خود ہی میرا لیپ ٹاپ بند کر دیا اور بیڈ پر مجھے لیتے ہوئے لیٹ گئی۔ میری مزاحمت زیرو تھی۔ میں ٹرانس میں آئے ہوئے آدمی کی طرح ہر وہ کام کرتا رہا جو وہ کہتی رہی۔

صبح ہونے سے ذرا پہلے اس نے اپنے کپڑے کرسی سے اٹھائے اور دروازے کی طرف بڑھی۔ ”آج میں نے بے وقوف شیرن کو ایک اور شکست دے دی اور شاندار فتح حاصل کی۔“

وہ ہنسی اور تا تا کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں صبح دس بجے تک گہری نیند سوتا رہا، جاگنے کے بعد شاور لیتے ہوئے مجھے بار بار اسکیمو وومین مینا کی بتائی ہوئی تشبیہ یاد آرہی تھی۔

کمرے سے نکل کر میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں تو گوا کا سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ یہاں آکر کیا بن گیا ہوں۔

شیرن ڈیوٹی سے آکر اپنے بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ جینی نے میرے لیے ناشتا بنایا اور خود کافی کا مگ لے کر میرے سامنے بیٹھ گئی، اس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ فتح مندی کا غرور تھا۔ میں شرمندہ شرمندہ سا خاموشی سے ناشتا کرتا رہا۔

شام کو جینی، جینز کی اسکرٹ اور بلاؤز پہن کر باہر گھومنے چلی گئی۔ جب شیرن اور میں اکیلے ہوئے تو میں نے رات کا واقعہ پوری تفصیل سے اسے بتا کر کہا۔ ”شیرن اس کمرے کا تالا چینج کروا دو۔“

”کوئی فائدہ نہیں وکٹر۔ وہ اور چڑ جائے گی اور اس کی بھی ڈپلی کیٹ چابی بنوالے گی۔ میرا خیال ہے کہ اب دوبارہ تمہارے پاس نہیں آئے گی، اس نے بے وقوف شیرن کو شکست دے دی، اس کا مقصد پورا ہو گیا۔“

بعد میں آنے والی اکیلی راتوں نے ثابت کیا کہ شیرن غلطی پر تھی۔ جینی ہر اکیلی رات پر مجھ پر حملہ آور ہوتی رہی۔ میں شیرن سے شرمندہ و شرمندہ سار ہنے لگا۔

☆☆☆

اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ بینک کی طرف سے مجھے مڈل ایسٹ کی کئی برانچز میں سوفٹ ویئر پروگرامز کو اپ ڈیٹ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ وہاں میں نے دو ہفتے لگائے اور تمام برانچوں کا وزٹ کیا۔

ایک سال مکمل ہونے والا تھا، بینک کی پُرزور سفارش اور پیہم کوشش سے مجھے نیشنلٹی وقت سے پہلے مل گئی۔ دو ماہ کے بعد سالانہ چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں۔ میں علیحدہ اپارٹمنٹ لینا چاہتا تھا۔ یہاں بھی شیرن نے میری بہت مدد کی۔ اس نے مجھے ایک پوش علاقے میں فلی فرنشڈ تین بیڈ روم والا اپارٹمنٹ ہائر پرچیز کی بنیاد پر دلوا دیا۔

ہم یہ بات پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ میری شادی کے بعد ہم دوست ضرور رہیں گے مگر ہماری خاص قسم کی دوستی بالکل ختم ہو جائے گی۔ اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ بہت معقول لڑکی تھی۔

میری منگیتر آسیہ نے انگلش لٹریچر میں ماسٹر کیا تھا۔ ہم ساتھ پڑھتے کھیلتے جوان ہوئے تھے۔ ہمیں شروع سے یہ معلوم تھا کہ مستقبل میں ہمیں جیون ساتھی بننا ہے۔ ہم دونوں میں بہت بے تکلفی تھی۔

جب چھٹیاں شروع ہونے میں ایک ہفتہ رہ گیا تو میں نے آسیہ کے باپ، خالو یعقوب مسیح سے فون پر تفصیلی بات کی اور ان سے گزارش کی کہ میں صرف تین ہفتوں کی چھٹیوں پر گوا آرہا ہوں اس لیے آپ ایسا انتظام کریں کہ میرے گوا پہنچنے کے دوسرے دن ہی چرچ میں شادی کی رسومات ادا کر دی جائیں اور اسی دن شادی کا سرٹیفکیٹ رجسٹرڈ کرا دیا جائے تاکہ آسیہ کا پاسپورٹ بنوانے اور ویزا حاصل کرنے کے لیے مجھے کافی ٹائم مل جائے۔ دوسری طرف میں نے اپنے چچا کو فون کیا کہ آپ پوری فیملی کے پاسپورٹ بنوا لیں۔ میں سیٹ ہوتے ہی پوری فیملی کو وزٹ ویزے پر یو سٹن بلواؤں گا۔

چھٹیاں شروع ہوتے ہی میں گوا کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں تمام انتظامات مکمل تھے۔ دوسرے دن چرچ میں شادی کی رسم ادا کر دی گئی اور آسیہ دلہن بن کر میرے گھر آگئی۔ پہلی رات، جب میں کمرے میں داخل ہوا تو بیڈ پر آسیہ دلہن کے روایتی لباس میں گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ ”آسیہ میری چھوٹی سی پورمیبل دلہن، یہ شرمانے کی ایکٹنگ بند کرو ہم کوئی اجنبی ہیں۔“ اس نے فوراً سر سے گوٹا کناری والا دوپٹا اتار کر حسب سابق مجھے کلوا انگریز کہہ کر میرا منہ چڑایا اور ہنس دی۔

میں نے کہا۔ ”آسیہ فوراً دوپٹا سر پر ڈالو تمہیں منہ دکھائی نہیں لینی ہے کیا؟“ اس نے سر پر دوپٹا ڈال کر کہا۔

”لاؤ دو منہ دکھائی۔“ میں نے دس گرام والی سونے کی گنی اس کی مہندی لگی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس نے گنی اپنے پرس میں رکھ کر بڑی سادگی اور معصومیت سے کہا۔ ”کلو، اب دوپٹا اُتار دوں۔“ ہم دونوں ہنس پڑے اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔

تین ہفتے کی چھٹیاں ایسی گزریں کہ پتا ہی نہ چلا۔ اچھا کام یہ ہوا کہ اس دوران میں نے آسیہ کا ارجنٹ پاسپورٹ بنوا کر ویزا حاصل کر لیا تھا اور ہم دونوں ہیوسٹن کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

آسیہ بہت ذہین لڑکی ثابت ہوئی۔ اس نے ہیوسٹن پہنچ کر ایک ہفتے کے بعد انگلش بول چال سکھانے والے ادارے میں داخلہ لے لیا۔ دو ماہ کا کورس تھا۔ آسیہ امریکن لہجے میں انگلش بولنے لگی۔ اس نے میری اجازت سے ایک معیاری اسکول میں انگلش ٹیچر کی حیثیت سے جاب بھی شروع کر دی۔

میرے پاس سیونگ اکاؤنٹ میں بہت بڑی رقم تھی۔ میں نے اپارٹمنٹ کی تین سال کی قسطیں یکمشت ادا کر دیں اس طرح مجھے ساڑھے سات پرسنٹ ڈسکاؤنٹ مل گیا۔

ہم دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔ ہر ویک اینڈ پر میں آسیہ کو گھمانے پھرانے لے جاتا۔ ہم اچھے ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے۔ رات گئے گھر آ کر ایک دوسرے میں مشغول ہو جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ میں ایک گول مٹول صحت مند بچے کا باپ بن گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جس اسپتال میں آسیہ ڈلیوری کے لیے داخل ہوئی اسی اسپتال میں شیرن سینئر نرس کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ میں نے شیرن کا تعارف اپنی بیوی سے کرایا۔ شیرن، آسیہ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ دو تین دن میں ہی دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔

اسپتال سے فارغ ہو کر آسیہ گھر آ گئی۔ لوکل قانون کے تحت دو ماہ کی چھٹیاں تنخواہ کے ساتھ آسیہ کو دی گئیں۔ کبھی کبھی وہ شیرن کو انوائٹ کرتی تھی۔ اسے ہندوستان کے چٹ پٹے کھانے کھلاتی تھی۔ وہ شیرن کو ہندوستان اور دوسرے مشرقی ملکوں کے معاشرے کے متعلق بتاتی تھی کہ وہاں فیملی سسٹم کتنا مضبوط ہے۔ بوڑھے ماں باپ کا کتنا احترام اور خیال کیا جاتا ہے۔ شیرن کہتی تھی کہ کاش ہمارے یہاں بھی ایسا معاشرہ ہوتا۔ ہمارے یہاں تو فیملی سسٹم بالکل تباہ ہو چکا ہے۔

☆☆☆

میں اب اس کوشش میں تھا کہ میں وزٹ ویزے پر اپنے ماتا پتا کو یہاں بلوالوں تاکہ وہ اپنے پوتے کو دیکھ سکیں۔ میرا ارادہ تھا کہ جب ہم اپنے بیٹے کی پہلی سالگرہ منائیں تو میرے ماتا پتا بھی یہاں موجود ہوں۔

ہمارے دن بہت ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ ایک رات میرے سر پر ہمالیہ پہاڑ گر پڑا۔ رات کے گیارہ بجے ایف بی آئی نے میرے گھر پر چھاپا مارا۔ انہوں نے گھر کے کونے کونے کی تلاشی لی۔ میرا لیپ ٹاپ بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ میں حیران اور پریشان تھا۔ انہوں نے مجھے گرفتار کیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ آسیہ روتی رہ گئی۔

دوسرے دن ایف بی آئی انٹرویو میں مجھے بتایا گیا کہ میرے بینک کے تمام ٹاپ لیول مینجمنٹ کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ بینک کو مکمل طور پر شٹ ڈاؤن کر دیا گیا ہے۔ امریکا اور بیرونِ امریکا تمام برانچز بند کر دی گئی ہیں۔ میرا ذاتی بینک اکاؤنٹ بھی سیز کر دیا گیا ہے۔ خوش قسمتی میرے ساتھ یہ ہوئی کہ میں نے شادی کے بعد اپنی سیونگ سیکیورٹی بانڈز میں انویسٹ کر دی تھی۔ ورنہ میری فیملی کو بڑی پریشانی ہوتی۔

ایف بی آئی کے اس ایکشن سے میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے تو سرے سے کوئی بھی جرم نہیں کیا تھا۔ آسیہ نے ایک مشہور وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ رفتہ رفتہ بات کھلنے لگی۔ ایف بی آئی نے بینک پر بڑے سیریس چارج لگائے تھے۔ نمبر ایک، بڑے پیمانے پر منی لانڈرنگ، نمبر دو مافیاز سے اونچے لیول پر مسلسل ڈیلنگ، نمبر تین بڑی بڑی رقموں کی اِن کمنگ اینڈ آؤٹ گوئنگ ریمیٹ ٹینسز جنہیں قانون کے مطابق ڈکلیئر نہیں کیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

میں تو کمپیوٹر ڈویژن میں ایک سیکشن کا انچارج تھا۔ ذاتی طور پر تو میرا ان چارجز سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ سب لوگوں کے ساتھ مجھ پر بھی مقدمہ چلا۔ جج کے سامنے میں نے اپنی پوزیشن واضح کی، میرے وکیل نے بھی پورا زور لگایا۔ جج نے تسلیم کیا میرا ان الزامات سے براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ اس نے مجھ پر لگائے ہوئے چارجز کو ہلکا تصور کیا اور مجھے تین سال قید کی سزا دے دی جبکہ دوسرے لوگوں کو دس سے پندرہ سال کی سزا سنائی گئی۔ آسیہ نے وکیل کے توسط سے اپیل دائر کر دی جس کی سماعت دو ماہ بعد شروع ہونا تھی۔

آسیہ بڑی ہمت والی لڑکی ثابت ہوئی۔ وہ صبح بیٹے کو بے بی کیئر سینٹر چھوڑ کر اسکول میں جاب پر جاتی تھی۔ شام کو وکیل کے ساتھ میٹنگ کرتی تھی۔ ہر دوسرے دن سینٹرل جیل میں آ کر مجھ سے ملاقات کرتی تھی اور میرا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ شیرن بھی

قدم قدم پر اس کے ساتھ تھی۔

جیل میں مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی۔ تکلیف تھی تو یہ کہ میں اپنی فیملی سے بچھڑ گیا تھا۔ بلاشبہ یہ بہت بڑی تکلیف تھی۔

جیل میں کمپیوٹر سینٹر بھی تھا۔ میں وہاں قیدیوں کو کمپیوٹر سکھاتا تھا۔ جیلر کی درخواست پر جیل کی ریکوائرمنٹ کے مطابق، سوفٹ ویئر پروگرام بھی بناتا تھا۔ جیلر مجھ سے بہت خوش تھا۔

ایک دوپہر دو بجے کے قریب میں نے ایک قیدی کو دیکھا جو ایک درخت کے نیچے کپڑا بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔ چہرے مہرے سے انڈین لگتا تھا۔ تقریباً میرا ہم عمر تھا۔ گورا رنگ، چہرے پر ہلکی سی کالی داڑھی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے کپڑا جھاڑا اور درخت کی ایک شاخ پر ٹانگ دیا۔

میں نے اس کے پاس جا کر اسے سلام کیا اور ہندی زبان میں اپنا تعارف کرایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا اور ہندی زبان میں ہی اپنا تعارف کرایا۔ اس نے اپنا نام خادم حسین بتایا۔ آبائی تعلق اتر پردیش کے مشہور شہر لکھنو سے تھا۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے تین سال کی سزا ہوئی ہے۔ میرا تعلق میم یونائٹڈ بینک سے ہے جسے اتھارٹیز نے مکمل طور پر شٹ ڈاؤن کر دیا ہے۔ یہ سن کر اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”ارے مسٹر شرما آپ تو میرے پیٹی بند بھائی ہیں۔ میرا تعلق بھی میم یونائٹڈ بینک سے ہے۔ میں لاس میں بینک برانچ کا منیجر تھا۔ مجھے دس سال کی سزا ہوئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”حکومت نے بینک پر بڑے سیریس چارجز لگائے ہیں۔ ان الزامات کا مجھ سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے پھر بھی مجھے تین سال کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔“

”شرما بھائی ان الزامات میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ یہ چارجز فریم کیے گئے ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو اس بینک کے اصل مالکان تین دوست ہیں۔ مڈل ایسٹ کے ایک نہایت دولت مند ملک کے شیخ ہیں۔ تعلق شاہی فیملی سے ہے۔ تینوں دوست بہت دولت مند ہیں۔ ان کی لاتعداد پروپرٹیز یورپ اور امریکا میں ہیں۔ ان کا کاروبار پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ان دوستوں نے ایک غلطی کی۔ ان کے 100 ارب ڈالرز کے ڈپازٹس ایک بڑے امریکی بینک میں تھے۔ انہوں نے ایک سال پہلے یہ ڈپازٹس امریکی بینک سے نکال کر میم یونائٹڈ بینک میں ٹرانسفر کر دیے۔ ہمارا بینک امریکا کا سب سے بڑا ڈپازٹ ہولڈر بینک بن گیا بس یہاں سے دشمنی کی ابتدا ہوئی۔ وہ امریکی بینک اور حکومت دشمنی پر تل گئے۔ یہ چارجز وغیرہ سب بکواس ہیں۔“

میں بڑی حیرت سے اس کی باتیں سُن رہا تھا۔ ”مسٹر خادم حسین یہ سب باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں، یہ تو بہت اندرونی سیکرٹ ہیں۔“

”مسٹر شرما میرے والد بیس سال سے ان تینوں شیخوں کے مشترکہ سیکریٹری ہیں۔ ان کی تمام دولت اور کاروبار کی دیکھ بھال وہی کرتے ہیں۔ میرے والد کا سیکریٹریٹ دبئی میں ہے اور بیس افراد پر مشتمل ہے۔ وہ دبئی سے یہاں جیل میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ جاتے وقت مجھے نصیحت کر گئے ہیں کہ بیٹا مقدر میں لکھی یہ مصیبت صبر سے جھیل لو بس نماز کے بعد دعا مانگتے رہو کہ خدا جلد از جلد اس مصیبت سے نجات دلائے۔“

میں گم صم بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد خادم حسین نے کہا۔ ”شرما بھائی......“ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”مسٹر حسین بے فکر ہو کر بات کریں۔ یہاں کوئی ہندی سمجھنے والا نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے مسٹر شرما، میں کہہ رہا تھا کہ یہ امریکی بڑے ظالم اور متعصب ہیں۔ کسی دوسرے ملک کو ترقی کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ کہیں وائرس پھیلا کر کسی ملک کی اقتصادی ترقی کو جام کر دیتے ہیں، کہیں فساد برپا کر کے اپنا اسلحہ فروخت کرتے ہیں۔ مسلمان ان کے مین ٹارگٹ ہیں۔ 1990ء میں انہوں نے بالکل اسی طرح ایک بڑا مسلم بینک تباہ کیا تھا۔ وہ بینک ایک پاکستانی بینکنگ جینئس نے دبئی کے ایک شیخ سے مل کر دبئی میں رجسٹرڈ کرا دیا تھا۔ اس بینک نے اتنی تیز رفتار ترقی کی کہ پوری دنیا حیران رہ گئی۔ اس کی امریکا سے لے کر جاپان تک سیکڑوں برانچز تھیں۔ اس نے امریکا کے درجنوں کمزور بینک خرید کر اپنے میں ضم کر لیے۔ امریکی اس سے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ اس بینک پر ایسے ہی فریم کردہ چارجز لگائے گئے۔ بینک کو پوری دنیا میں شٹ ڈاؤن کر دیا گیا۔ بینک افسران کو لمبی لمبی سزائیں ہوئیں۔ اس بینک جینئس کا تعلق بھی لکھنؤ سے تھا۔ یہ سب مسلم دشمنی اور تعصب کا نتیجہ تھا۔ مسٹر شرما کبھی آپ نے معلوم کیا میم یو بینک کا پورا نام کیا ہے۔ اس کا نام ہے مڈل ایسٹ مسلم یونائٹڈ بینک۔ کیا سمجھے۔“

جب خادم حسین خاموش ہوا تو میں سوچنے لگا کہ یہ شخص مسلمان ہونے کی بنا پر یہ باتیں کر رہا ہے یا ان میں کوئی واقعی حقیقت ہے۔

کی صورت شروع ہوا۔ پاپولر ادب کی دنیا میں ایک قندیل روشن ہوئی جو دست بدست چلتی نکھرے اور معطر اجالوں کی پیامبر بنی...... بقول حبیب جالب

اسے بجھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چلے ہیں لہو سے جو ہم چراغِ سحر

الحمدللہ اَب ہم گولڈن جوبلی کے دور سے گزر رہے ہیں

انہی سنہری یادوں میں آپ کا بھی روپہلا اور سنہرا خوب صورت ساتھ لگتا ہے؟ ہمیں بھی بتائیں...... یہ سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین ہی کے لیے تو ہے۔

1...... ماہنامہ پاکیزہ سے پہلا تعارف......؟

2...... پاکیزہ تحریروں سے کوئی تین ایسی باتیں کیا سیکھیں جو آج بھی زندگی کا حصہ ہیں......؟

3...... سینئر یا دورِ حاضر کے پسندیدہ قلم کار کہ جن کی تحریریں پڑھنے کو آج بھی بے چین رہتی ہیں......؟

4...... کوئی فرمائشی سلسلہ ہے تو ضرور بتائیں۔

خادم حسین کے جانے کے بعد میں اٹھا اور جیل کے کمپیوٹر سینٹر میں گھس گیا۔ میں کمپیوٹر کی دنیا میں داخل ہو کر حقائق کھوجنے لگا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ خادم حسین کی تمام باتیں بالکل درست ہیں۔ 1990ء میں واقعی ایک بڑے مسلم بینک پر بھی چارجز لگائے گئے تھے اور اسے پوری دنیا میں شٹ ڈاؤن کر دیا گیا تھا۔ مجھے اس بینکنگ چینلس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ اس کا تعلق بھی لکھنؤ سے تھا۔

جیل میں دن گزرنے کی رفتار بہت سست محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ جانے کب یہ تین سال کی مدت ختم ہوگی اور کب میں اپنی بیوی اور بیٹے سے مل سکوں گا۔

خادم حسین سے میری کیمسٹری مل گئی تھی۔ ہم بینچ پر بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے۔ میں اسے گوا کے متعلق بتاتا۔ وہ بھی کبھی موڈ میں ہوتا تو بڑے اچھے ترنم سے گالب (غالب) کی غزلیں سناتا تھا۔ ایک تو اس کا ترنم اور اس کی سریلی آواز پھر گالب (غالب) کی آسان غزلیں۔ ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ بعض قیدی اس کی گائیکی سن کر قریب آ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور کہتے تھے ویری سوئٹ لینگویج۔ ویری سوئٹ۔

خادم حسین کہتا تھا کہ بٹوارے سے سب سے زیادہ نقصان اردو زبان کو ہوا۔ آج بھی اردو ہندی سے مکس ہو کر نیپال کی سرحد سے امرتسر تک بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن اب اس کو لکھنے اور پڑھنے والے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے بچے بھی اردو نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ خادم حسین کی بات درست تھی مگر میں اس فیلڈ کا آدمی نہیں تھا، کوئی کمنٹس نہیں کرتا تھا۔

میری بیوی آسیہ، شیرن کو ساتھ لے کر وکیل کے آفس جاتی اور اس پر زور دیتی کہ میری اپیل کی سماعت جلد شروع کی جائے۔

تین مہینے سست رفتاری سے گزر گئے۔ اتوار کا دن تھا۔ جیلر نے مجھے اپنے آفس میں طلب کیا، میرے لیے کافی منگوائی۔ کہنے لگا۔ ”مسٹر وکٹر شرما آپ کو مبارک ہو۔ آپ کی رہائی کے احکامات آ گئے ہیں۔ جج نے آپ کی وائف کی اپیل پر آپ کے خلاف تمام چارجز ڈراپ کر دیے ہیں اور فوری رہائی کا حکم دے دیا ہے۔ کل صبح آپ کو رہا کر دیا جائے گا۔ آپ نے جیل کے لیے جو سوفٹ ویئر پروگرام بنائے تھے، ان کی قیمت مارکیٹ کے لحاظ سے کم از کم پانچ ہزار ڈالرز فی پروگرام ہے لیکن جیل کا بجٹ بہت لمیٹڈ ہے۔ میں بہت شکر گزار ہوں۔ آپ جیل کی طرف سے یہ سات ہزار ڈالرز کا چیک قبول کریں۔“

میں اپنی رہائی کی خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑا۔ میں نے چیک اپنی جیب میں رکھا اور آگے بڑھ کر جیلر سے مصافحہ کیا۔

سب سے پہلے یہ خوش خبری میں نے اپنے پنجی بند بھائی اور دوست خادم حسین کو سنائی۔ وہ گرم جوشی سے گلے ملا اور مبارک باد دی۔

☆☆☆

دوسرے دن جیل کے باہر میری بیوی آسیہ میرے سوا سال کے بیٹے کے ساتھ موجود تھی۔ آسیہ کے ساتھ شیرن بھی تھی۔ شیرن نے کہا۔ ”وکٹر آپ بہت لکی ہیں، آپ کی وائف بہت ہمت والی ہے اسی کی کوشش سے آپ جلد رہا ہوئے ہیں۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم سب گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ شیرن اسپتال جانا چاہتی تھی مگر آسیہ کی ضد کی وجہ سے وہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ آسیہ نے کہا۔ ”شیرن آؤ چلو، گھر پر تھوڑا سا گیٹ ٹو گیدر کریں گے۔ بعد میں اسپتال چلی جانا۔“

میں حیران تھا کہ آسیہ نے خوب شیرن سے اپنی کیمسٹری ملائی ہے۔

شیرن کے رخصت ہونے کے بعد میں نے جیب سے سات ہزار ڈالرز کا چیک نکال کر آسیہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ آسیہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”آسیہ یہ جیل کی کمائی ہے۔ تمہارا یہ کلو شوہر سوفٹ ویئر کا چیتا ہے، تم دیکھنا کہ اگلے ہفتے ہی مجھے کہیں نہ کہیں جاب مل جائے گی۔“

”وکٹر اب یہ نوکری وغیرہ پر لعنت بھیجو، تم سوفٹ ویئر کے ماہر ہو۔ تم اپنی چھوٹی سی سوفٹ ویئر کمپنی بنا لو۔ دو تین ماہ میں ہی چل پڑے گی۔“

”واہ آسیہ کیا شاندار مشورہ دیا ہے۔ میں کل سے ہی اس پروجیکٹ پر کام شروع کرتا ہوں۔ یہ شاندار مشورہ ہے اس لیے کمپنی کا نام بھی شان سوفٹ ویئر کمپنی ہوگا۔ کیسا نام ہے آسیہ؟“

آسیہ کا مشورہ میرے دل کو بھا گیا، میں نے دوسرے دن سے ہی اس پروجیکٹ پر غور کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے میں نے کمپنی کو انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ میں رجسٹرڈ کرایا اور کمپنی کا مکمل تعارف انٹرنیٹ پر ڈال دیا۔ نتیجہ اچھا نکلا۔ ایک مہینے میں میرے پاس کام آنے لگا۔ گو شروع میں میری انکم زیادہ نہیں تھی لیکن مجھے پکا یقین تھا کہ جلد ہی میں اس فیلڈ میں

قدم جمالوں گا۔

دوسری طرف میں نے بینک کسٹوڈین سے وکیل کے ذریعے رجوع کیا۔ میری خاصی بڑی رقم میم یو بینک میں پھنسی ہوئی تھی۔ میرے سیز کیے گئے اکاؤنٹ میں میری ایک ماہ کی تنخواہ اور اچھی خاصی سیونگ تھی۔ وکیل نے مجھے یقین دلایا کہ عدالت کی طرف کلیئرنس ملتے ہی یہ رقم میرے نئے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردی جائے گی۔

ادھر سے اطمینان ہونے کے بعد مجھے اپنے پنچی بند بھائی اور جیل کے ساتھی خادم حسین کا خیال آیا۔ ایک دن میں نے اپنی کار نکالی اور سینٹرل جیل کی طرف روانہ ہوگیا۔ سب سے پہلے میں جیلر سے ملا، اس نے کہا۔ ''مسٹر ڈاکٹر جیل میں ملاقات کے لیے چند منٹ دیے جاتے ہیں مگر تمہارے لیے ٹائم ہی ٹائم ہے۔ جتنی دیر چاہو مسٹر حسین سے باتیں کر سکتے ہو۔''

خادم حسین مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ''شرما بھائی تمہارا بہت بہت شکریہ تم مجھ سے ملنے آئے۔ آؤ پرانی محفل جماتے ہیں۔ میرے والد نے بھی میری رہائی کی اپیل دائر کر دی ہے، دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ہر نماز کے بعد خدا سے دعا مانگتا ہوں۔ دل کو بڑا اطمینان ملتا ہے۔'' پھر ہماری باتیں شروع ہوئیں تو ایک گھنٹے تک جاری رہیں۔

واپسی میں نے جیلر کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ڈرائیونگ کرتے وقت میں خادم حسین کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ میں ایک غیر جانبدار کرسچن کے دماغ سے سوچنا چاہتا تھا۔

راستے میں، میں نے ایک بار دیکھا اور ایک جام پینے کے لیے کار سے اتر کر بار میں داخل ہوگیا۔ مجھے اس وقت شراب کی ضرورت تھی۔ خادم حسین کی باتوں نے میرے دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ ویسے سوفٹ ویئر کے پروگرامر بنانے والے بہت سوچ بچار کے عادی ہوتے ہیں۔ میں نے وہسکی کا جام لیا اور ڈرائی فروٹ کی پلیٹ اٹھا کر ایک میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت بار میں بہت کم لوگ تھے۔

خادم حسین نے کہا تھا۔ ''دیکھو ڈاکٹر شرما، دنیا میں ترکی سے لے کر انڈونیشیا تک تقریباً 60 اسلامی ملک ہیں ان میں امیر کبیر ملک بھی ہیں اور غریب ترین بھی ہیں جیسے خلیج عدن کے کنارے ملک یمن ہے۔ امیر ملکوں کی ایک خاص نیچر ہے۔ وہ مصیبت کے وقت خدا کو نہیں پکارتے بلکہ امریکا کو آواز دیتے ہیں کہ آؤ ہماری مدد کرو۔ امریکا اس خدمت کے لیے اربوں ڈالرز ڈیمانڈ کرتا ہے اور وہ بخوشی ادا کرتے ہیں۔

اسلامی ملکوں میں ایک اور بیماری ہے۔ یہ خود یا کسی کے کہنے پر آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور کمزور ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر شرما اصل کمزوری اور خرابی اسلامی ملکوں میں ہی ہے۔''

میں خادم حسین کی باتوں پر غور کررہا تھا کہ میری سوچ کا دھارا ٹوٹ گیا۔ ایک نوجوان لڑکی جام ہاتھ میں لیے میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے غور سے لڑکی کو دیکھا وہ جینی تھی، شیرن کی چھوٹی بہن۔ پہلے سے زیادہ صحت مند اور خوب صورت ہوگئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''جینی، بارٹینڈر نے تمہیں شراب کیسے دے دی؟''

جینی ہنسی۔ ''ڈاکٹر تم کہاں ہو، میں اٹھارہ سال کی ہو چکی ہوں۔ کیا تمہیں اپنا برتھ سرٹیفکیٹ دکھاؤں؟''

میں خاموشی سے جینی کو دیکھتا رہا۔ اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر، بے وقوف شیرن نے تم سے میری برائیاں کی ہوں گی۔ میں واقعی بہت بُری ہوں۔ بڑی بہن کی حیثیت سے شیرن کو میرا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ماما تو بزنس میں بزی رہتی تھیں۔ بس میرا وقت اِدھر اُدھر گزرنے لگا۔ یوں غلط صحبت کا شکار ہوتی چلی گئی۔''

جینی نے اپنا جام ختم کیا۔ میرے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا۔ اسے جلایا اور کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ ''ڈاکٹر مجھے معلوم ہے تم نے شادی کرلی ہے۔ میں نے تمہیں اپنے دائرہ شکار سے نکال دیا ہے۔ بے فکر رہو، میرے بھی کچھ اصول ہیں۔''

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور مجھے ٹاٹا کہتی ہوئی بار سے نکل گئی۔ میں سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔

میرا آدھا جام ابھی باقی تھا۔ میں گھڑی سامنے رکھ کر شراب پیتا ہوں آہستہ آہستہ۔ دن میں صرف ایک بار۔ میری بیوی میری اس عادت سے واقف ہے۔ گھر میں، میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ میں نے اپنا جام ختم کیا اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

جب میں نے اپنی بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ میں کار روکی تب میں خادم حسین کی باتوں کا ایک غیر جانب دار، روشن خیال دماغ سے پورا پورا تجزیہ کر چکا تھا۔ کمزوری واقعی مسلمانوں میں ہی ہے۔ امریکا نے تو ایک بینک کو ہی شٹ ڈاؤن کیا ہے، اگر تمام مسلم ممالک متحد ہو جائیں تو امریکا کے لیے آدھی دنیا شٹ ڈاؤن ہو جائے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

❖❖❖

قسط نمبر 8

دہر

حسام بٹ

کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانۂ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے اَن مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحرِ بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصدِ حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزارِ فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیقِ سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش ربا حیلہ سازیاں

گزشتہ اقساط کا خلاصہ
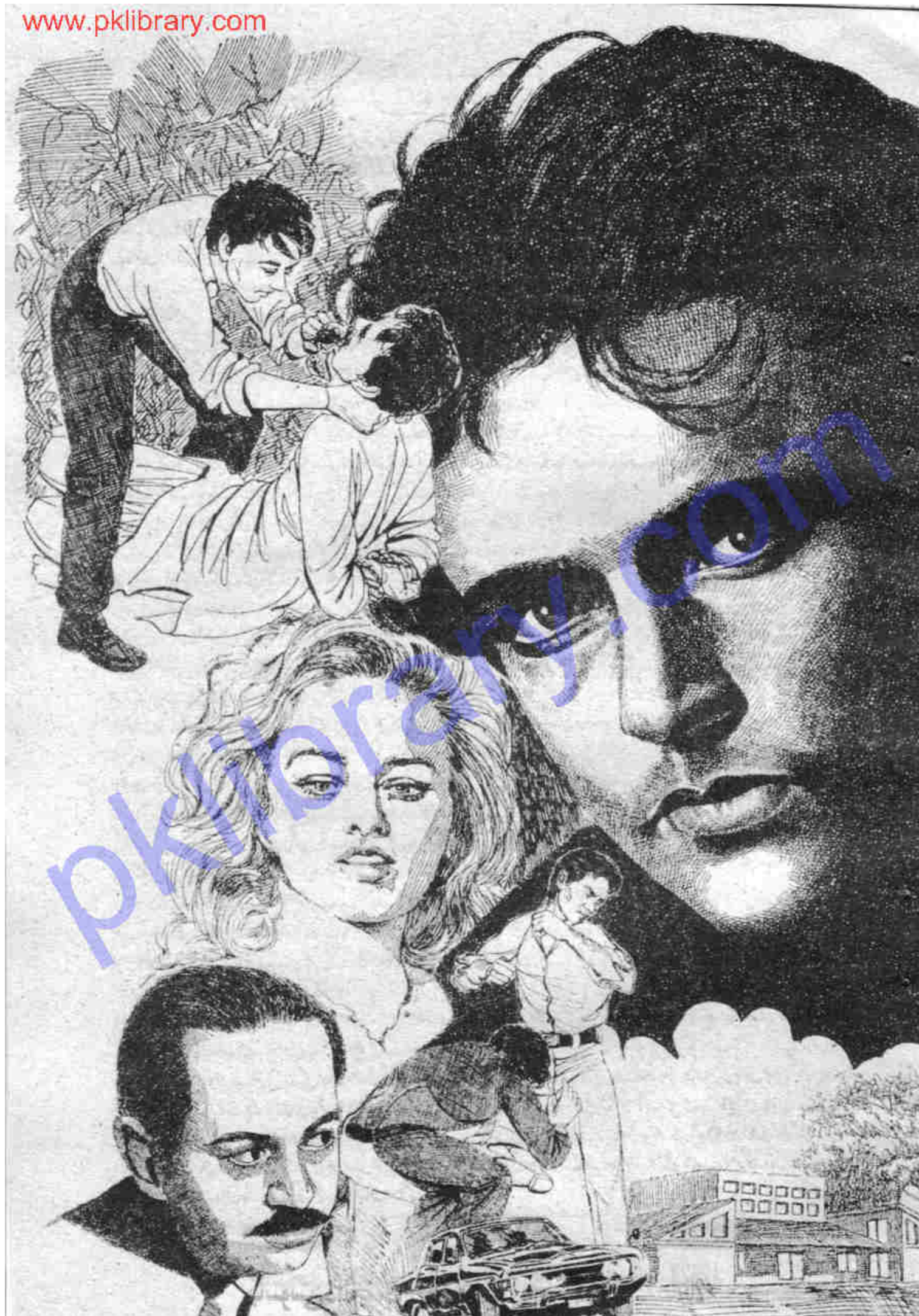
جاسم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ لڑکپن میں قدم رکھنا قیامت صغریٰ کا پیغام برثابت ہوا۔ اس کے والد قاسم باری نے مقامی غنڈوں کے خلاف پولیس کی مدد کی تو یہ چھوٹی سی فیملی طوفان کی زد میں آگئی۔ ایک رات اسی گینگ کے چند لوگوں نے گھر میں گھس کر جاسم کی والدہ اور والد پر قاتلانہ حملہ کردیا جس میں ماں ہلاک ہوگئی اور شدید زخمی باپ کو پرائیویٹ اسپتال پہنچادیا گیا۔ قاسم کا علاج شروع کرنے کے لیے پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ جاسم نے مدد کے لیے اپنے اکلوتے ماموں جلیل کی طرف دیکھا۔ جلیل نے اس شرط پر رقم کا انتظام کردیا کہ جاسم کو ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کچھ عرصے کے لیے جیل جانا پڑے گا۔ جاسم کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ماموں کی بات مان لی۔ اپنے باپ کی زندگی بچانے کے لیے وہ تیرہ سال کی عمر میں آٹھ سال کے لیے جیل چلا گیا۔ قید و بند کی اس زندگی میں دو افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش مراد علی تھا جسے سب دادا کہتے تھے۔ دوسرا کارل مارکس کا پیروکار ایک صحافی انور بیگ تھا جو کامریڈ کہلاتا تھا۔ دادا اور کامریڈ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی کی جاسم پر گہری نگاہ تھی۔ وہ جاسم کی بپتا سے واقف تھے اس لیے وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں لگ گئے۔ کامریڈ نے جاسم کی زبان کو تلوار اور دادا نے اس کے ہاتھ پاؤں کو موت کی للکار بنادیا۔ دادا نے اپنے بندوں کے ذریعے پتا لگالیا تھا کہ جاسم کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے پیچھے راجو نامی ایک گینگسٹر کا ہاتھ ہے اور یہ بھی کہ جلیل ماموں نے جاسم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ اپنی جیب میں ڈالے اور قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ دادا اتنا طاقتور بدمعاش تھا کہ وہ جیل میں بیٹھ کر بھی باہر کے معاملات کو چلاتا رہتا تھا۔ جلیل تو منظر سے ہٹ چکا تھا لیکن راجو تک پہنچنے کے لیے دادا نے جاسم کی مدد کی۔ اسے اپنے معتمدِ خاص کالی کے ساتھ چند گھنٹے کے لیے جیل سے باہر بھیجا۔ جاسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجو کو زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنادیا۔ دادا کا جیل سے باہر جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گیا تو اس کے ایک دیرینہ دشمن شعیب چاچا نے اسے اور اس کی بیٹی و بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دادا کی موت نے جاسم کو حد درجہ افسردہ کردیا۔ بہرحال وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جیل سے باہر آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک تربیت یافتہ کڑیل جوان تھا اور اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا اور اسی آغاز پر ایک مہ جبیں سے اس کا تعارف ہوگیا۔ ناجیہ ایک پروڈکشن ہاؤس میں ایسوسی ایٹ پروڈیوسر تھی۔ وہ جاسم کی فائٹنگ اسکلز سے حد درجہ متاثر ہوئی اور اس نے جاسم کو رنگ و نور کی دنیا سے روشناس کرادیا۔ جاسم کو پتا چلا کہ شعیب چاچا معاشرے میں ایک کامیاب ایکسپورٹر کی حیثیت سے عزت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن درپردہ وہ ڈرگز، ناجائز اسلحہ، انسانی اعضا کی فروخت اور نوعمر لڑکیوں کے اغوا جیسے مذموم کاموں میں ملوث ہے۔ اس مکروہ کاروبار میں بعض بااثر افراد اس کے ساتھ ہیں اور اسے بین الاقوامی کارٹلز کا تعاون بھی حاصل ہے۔ دونوں دوستوں نے مضبوط منصوبہ بندی سے شعیب چاچا کو نقصان پہنچانا شروع کردیا۔ دوسری سمت جاسم کا شوبز کا کام بھی جاری تھا اور اسے چند روز کے بعد ایک سیریل کی شوٹ کے لیے استنبول جانا تھا اس سے پہلے اس نے راجو کو بھی حسرت ناک موت سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ سنسنی خیز ہنگامے چل رہے تھے کہ کسی ڈیوڈ نامی شخص نے بڑے پُراسرار انداز میں جاسم سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کسی ری ایلیٹی ٹی وی میں، بھاری معاوضے پر شرکت کی دعوت دی۔ یہ وہی وقت تھا جب جاسم اپنے یونٹ کے ساتھ استنبول جانے والا تھا۔ ڈیوڈ کا رویہ اتنا پُراسرار اور خطرناک تھا کہ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ کوئی مخالف پروڈیوسر ڈیوڈ بن کر جاسم کو اپنے ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کررہا ہے لیکن جلد ہی جاسم کو اندازہ ہوگیا کہ ڈیوڈ ایک انتہائی طاقتور اور بااختیار شخص ہے۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کو اغوا کرکے جاسم کو اپنے ری ایلیٹی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے مجبور کردیا۔ دونوں کی ملاقات استنبول میں طے ہوگئی۔ جاسم کا پروڈیوسر تمام حالات سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے سیریل میں جاسم کا رول ایک دوسرے کردار میں ضم کردیا اور جاسم کو یونٹ کے ساتھ استنبول روانہ کردیا۔ پروڈیوسر سرمد صدیقی ناجیہ کے باپ غفار داؤد کا دوست تھا اس لیے صدیقی کی نظر میں اپنے سیریل سے زیادہ ناجیہ کی زندگی اور اس کی محفوظ واپسی کی اہمیت تھی۔ ڈیوڈ نے جاسم کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ استنبول میں ری ایلیٹی ٹی وی کے کنٹریکٹ پر دستخط کردے گا تو اس کی دوست ناجیہ کو رہا کردیا جائے گا۔ ڈیوڈ کا وہ ری ایلیٹی ٹی وی ایک میگا پروجیکٹ تھا جس کی تمام تر شوٹنگ پُراسرار سرزمین مصر میں ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، جاسم کو استنبول پہنچ کر اس کے خاص آدمی بن عرفات سے ملاقات کرنا تھی۔ جاسم استنبول کے ایک معروف مقام گلاٹا برج کے نیچے بنے ہوئے زیتان نامی ایک یونانی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں بن عرفات ماسٹر شیف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بن عرفات نے جاسم کے خون سے مذکورہ کنٹریکٹ پر دستخط کرالیے اور وعدے کے مطابق، اسے ناجیہ کی رہائی کی خوش خبری سنادی۔ جاسم نے فون پر ناجیہ سے بات کرکے اس امر کی تسلی کرلی کہ وہ بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ محفوظ سائڈ پر تھا لہٰذا اس نے ڈیوڈ کے پروجیکٹ میں کام کرنے سے صاف انکار کردیا۔ ڈیوڈ نے بن عرفات کے توسط سے جاسم کو نشا تفنیل کرکے ایک کروز شپ پر پہنچادیا۔ جب جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بڑے بحری جہاز پر پایا۔ بعدازاں ڈیوڈ نے ایک مرتبہ پھر جاسم سے پُراسرار انداز میں سیلولر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ کروز شپ استنبول سے مصر کی بندرگاہ، پورٹ سعید تک جائے گا۔ پھر اس کے آدمی جاسم کو پورٹ سعید سے بذریعہ جیپ قاہرہ پہنچادیں گے جہاں پر اس ری ایلیٹی ٹی وی کی افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔ جب جاسم نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا شکوہ کیا تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا کہ بدعہدی کی شروعات جاسم نے کی ہے۔ کنٹریکٹ پر دستخط کرنے کے بعد بغاوت اور سرکشی کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا تھا لیکن جاسم نے بن عرفات کے سامنے جن باغیانہ خیالات کا اظہار کیا، اس کی روشنی میں انہیں اس کے ساتھ غیرشائستہ سلوک کرنا پڑا۔ جاسم ڈیوڈ کی مکاری اور اپنی بے بسی پر جھنجلا کر رہ گیا مگر وہ مایوس اور پریشان ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ ڈیوڈ نے ری ایلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ سے پہلے ہی جاسم کے ساتھ شکار اور شکاری کا جو کھیل شروع کر دیا تھا، جاسم اسے انجوائے کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ڈیوڈ کی ہوشیاری کے سبب جاسم اس کا کھیل سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ اسے بذریعہ بحری جہاز مصر لے جارہا تھا۔ وہیں جاکے اس کے منصوبے کا انکشاف ہوتا کہ وہ چاہتا کیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جاسم کی رائے جیکب اور جوزف کو پسند نہیں آئی۔ وہ متذبذب انداز میں ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ اس لحاتی آئی کانٹیکٹ کے بعد جوزف نے کہا۔

''ہمیں مشورے کے لیے پانچ منٹ چاہئیں۔''

''پانچ منٹ نہیں، تم پانچ صدیاں لے لو۔'' جیون نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''لیکن میرا فیصلہ نہیں بدلے گا اور ہاں...... یہ اپنی باقی ماندہ رقم اور ٹکٹ بھی لے لو۔ ٹکٹ کی کینسلیشن میں جو پیسے کٹیں گے، وہ تم اس مہم کے اختتام پر مجھ سے لے لینا۔''

اس کے بعد جیون نے خفگی بھرے انداز میں جیکب اور جوزف کے ٹکٹ اور پانچ ہزار مصری پاؤنڈز میں سے بچ رہنے والی رقم ان کے حوالے کر دی۔ یعنی دونوں کو فرداً فرداً تین ہزار، چھ سو ساٹھ مصری پاؤنڈز دے دیے۔ یہ ڈراما رچانے کے بارے میں اس نے چونکہ پہلے سے سوچ رکھا تھا اس لیے وہ بڑی کرنسی نوٹوں کو بھنا کر مختلف مالیت کے چھوٹے نوٹ بھی لے آیا تھا تاکہ رقم کی واپسی میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

''جب تم نے اپنا فیصلہ سنا ہی دیا ہے تو ہماری بھی سن لو......'' جیکب نے کہا۔ ''اسی لمحے سے ہم دونوں، تم دونوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ ایشیا اور یورپ کا ملاپ یہیں تک تھا۔ ہمارے بیچ اب کوئی تعلق، کوئی حساب کتاب باقی نہیں ہے۔''

جوزف نے جیکب کی بات پر سیمنٹ کا لیپ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو چکے ہیں۔''

''ایشیا اور یورپ کبھی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔'' جاسم نے کہا۔ ''اور یہ حقیقت ہماری گھٹی میں شامل ہے اور اچھا ہوا کہ ہمارا بریک اَپ افریقا میں ہو رہا ہے ورنہ ہم ایک دوسرے کی سرزمین کو خواہ مخواہ موردِ الزام ٹھہراتے رہ جاتے۔''

جاسم کی اس گہری چوٹ کے جواب میں جیکب یا جوزف نے کچھ نہ کہا۔ بس، وہ انہیں گھورتے ہوئے ریسٹورنٹ سے اٹھ گئے۔ جیون نے جاسم سے پوچھا۔

''پارٹنر! کیسا تیج کیا ہے؟''

''زبردست!'' جاسم نے توصیفی نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہاری ذہانت اور معاملہ فہمی سے متاثر ہوا ہوں۔ کیا تمہارے آباؤاجداد میں قصاب بھی ہوا کرتے تھے؟''

جاسم کی بات کے آخری حصے نے جیون کو اُلجھن میں مبتلا کر دیا۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''یو مین بچر......؟''

''یس، آئی مین اِٹ!'' جاسم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو ہلکا سا اشارہ دیا تھا کہ جیکب اور جوزف کو کاٹنا ہے اور تم نے اتنی صفائی سے انہیں کاٹ ڈالا کہ مجھے شک ہوا کہ کہیں تمہارے پُرکھوں میں کوئی......!''

''ارے نہیں یار...... میں تو وِیگن ہوں۔'' جیون نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ماس، مچھی، انڈا اور تمام ڈیری پروڈکٹ سے دور ہی رہتا ہوں۔ بچر، وچر ہونا تو بہت آگے کی بات ہے۔''

''میں مذاق کر رہا تھا۔'' جاسم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مائنڈ نہیں کرنا۔''

''نیور مائنڈ۔'' جیون نے کشادہ دلی سے کہا۔ ''ویسے تمہارا مذاق مجھے اچھا لگا۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ جوزف اور جیکب بائی ائر سفر کریں گے یا ٹکٹ کینسل کروا دیں گے؟''

''میری طرف سے وہ دونوں گئے بھاڑ میں۔'' جاسم نے کہا۔ ''اور ہمیں ائرپورٹ کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔''

''ہماری فلائٹ میں تو ابھی اچھا خاصا وقت پڑا ہے۔'' جیون نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے ائرپورٹ بمشکل دو منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔''

''پہلی بات یہ کہ ہم ٹہلتے ہوئے دھیرے دھیرے ائرپورٹ کی جانب بڑھیں گے۔'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور دوسری بات یہ کہ مجھے ائرپورٹ کے کیفے ٹیریا میں تھوڑا کام ہے جس کے لیے میرا سات بجے وہاں پہنچنا ضروری ہے۔''

''تب تو ٹھیک ہے۔'' جیون نے رضامندی ظاہر کرنے والے انداز میں کندھے اُچکا دیے۔ ''لیٹس گو......''

انہوں نے ریسٹورنٹ کا بل ادا کیا اور باہر نکل کر ائرپورٹ روڈ پکڑ لی۔ اس ٹہل قدمی نے تیرہ منٹ کے بعد انہیں کائرو انٹرنیشنل ائرپورٹ پہنچا دیا۔

☆☆☆

کائرو (قاہرہ) کے قلب میں واقع مصری ریلوے کا ایک عظیم الشان جنکشن ''رعمسیس ٹرین اسٹیشن'' اس وقت مچھلی بازار کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ رش کا وہ عالم تھا جیسا کہ کراچی کینٹ اسٹیشن یا لاہور سٹی اسٹیشن پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

شام کے سات بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ یونٹ بی پلیٹ فارم پر پہنچ چکا تھا۔ انہیں ڈیلکس او ورنائٹ سلیپر ٹرین کے ذریعے کائرو سے لکسر تک سفر کرنا تھا۔

سلیپر ٹرین کا شمار لگژری ٹرینز میں ہوتا ہے۔ نیلی چھت والی اس لائٹ براؤن کلر ٹرین پر، اوپر اور نیچے گرین اسٹرپس (سبز پٹیاں) بنی ہوئی ہیں جو ٹرین کی خوب صورتی کو دوبالا کرتی ہیں۔ اس سلیپر ٹرین کا روٹ کائرو سے اسوان ہے۔ کائرو سے یہ ٹرین شام کے ٹھیک سات بج کر پینتالیس منٹ پر روانہ ہوتی ہے اور اگلے روز صبح سات بج کر پینتالیس منٹ پر یہ اسوان پہنچ جاتی ہے۔ لکسر، اسوان سے ایک اسٹیشن پہلے پڑتا ہے۔ سلیپر ٹرین صبح ٹھیک چھ بج کر پندرہ منٹ پر لکسر اسٹیشن میں داخل ہوجاتی ہے یعنی یونٹ بی کو ساڑھے دس گھنٹے اس ٹرین میں سفر کرنا تھا۔

رمسیس ٹرین اسٹیشن پر بہت زیادہ رش ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس جنکشن پر بیک وقت کئی ایک ٹرینز آتی اور جاتی رہتی ہیں جن میں بعض کی حالت اور حالات اپنے دیس کی ٹرینوں سے میل کھاتے ہیں لیکن اوور نائٹ سلیپر ٹرین کی بات ہی الگ تھلگ اور نرالی ہے۔

یونٹ بی نے کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے اپنے ممبرز کے لیے سنگل سیٹ بک کرائی تھیں۔ لفظ "بک" سے دنوں، ہفتوں یا مہینوں مراد نہ لی جائے۔ انہیں اس ٹرین کے ٹکٹ خریدے ابھی لگ بھگ ایک گھنٹا ہوا تھا ورنہ سلیپر ٹرین کے کیبن میں سفر کرنے کے لیے واقعتاً کئی روز پہلے بکنگ کرانا پڑتی ہے اور وہ بھی لگ بھگ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے برابر رقم ادا کر کے۔ ایک کیبن کے اندر زیادہ سے زیادہ دو مسافر سفر کر سکتے ہیں۔

فرسٹ کلاس اے سی سلیپر ٹرین سے سفر کرنے والے مسافروں کے لیے ویٹنگ روم الگ سے بنایا گیا تھا جہاں پر سیکنڈ اور تھرڈ کلاس ٹرین کے ویٹنگ روم سے کہیں زیادہ سہولیات مہیا کی گئی تھیں۔ سارا کھیل پیسے کا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ملک ہو، اگر آپ کی جیب میں نوٹ ہیں تو آپ کو ہر قسم کی آسانی حاصل ہوجاتی ہے۔ اگر غیر جانب دارانہ انداز میں سوچا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونا چاہیے۔ پیسا سب کچھ نہیں ہے مگر بہت کچھ ہے۔

یونٹ بی کے گروپ لیڈر جیرڈ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "میرا تعلق براعظم افریقا سے ہے لیکن میں اس سے پہلے کبھی مصر نہیں آیا البتہ میں نے اس سلیپر ٹرین کے بارے میں بہت کچھ پڑھ اور سن رکھا ہے۔ آج کی رات ہم ایک انوکھے تجربے سے گزرنے والے ہیں۔ سو، انجوائے کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوجاؤ۔"

"میں تو ہر نئے تجربے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہوں۔" موراکو کے باسی جرمیاح نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم سنگل سیٹ کے بجائے برتھ والے کیبن میں سفر کر رہے ہوتے۔ پوری رات سکون سے سو کر گزارتے اور نیند پوری کرنے کے بعد اگلی صبح ایک دم فریش بیدار ہوتے۔ اس طرح کل کا دن ہم اپنے مشن کو کافی حد تک نمٹا سکتے تھے۔"

"جرمیاح! میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔" جیسن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن ہمیں اپنے بجٹ کے اندر رہتے ہوئے ہی موو کرنا ہے۔ کیبن والی برتھ کا کرایہ ہوائی جہاز کے کرائے کے برابر ہی ہے۔ اگر ہم اس فضول خرچی کے متحمل ہوتے تو پھر اس ٹرین کے ذریعے ساڑھے دس گھنٹے کے سفر کی کیا ضرورت تھی۔ ہم بائی ائر لکسر پہنچ کر کم از کم اپنے نو گھنٹے بچا سکتے تھے۔"

جیسن کا تعلق شکیرا کی جنم بھومی بارنکیلا (کولمبیا) سے تھا۔ اس نے سچویشن کے مطابق انتہائی معقول بات کی تھی۔ اس کی حمایت میں ریوڈی جنیرو (برازل) سے تعلق رکھنے والے جنتیو نے کہا۔

"جیسن نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ ہمیں اس پوائنٹ کو ہر لحہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ہم کسی پارٹی کے انوائٹی نہیں ہیں کہ اپنے آرام اور عیش کے بارے میں سوچیں۔ ہم اس وقت ایک خطرناک مشن کے بیچوں بیچ ہیں لہٰذا اپنے کمفرٹ سے زیادہ ہمیں اپنے ٹارگٹ پر فوکس کرنا چاہیے۔"

گروپ لیڈر جیرڈ نے تحمل سے اپنے یونٹ کے ممبرز کی آرا کو سنا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اگر تم میں سے کوئی سنگل سیٹ کو بے آرام سمجھ رہا ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔ ہم لوگ بہ آسانی اس سیٹ پر اپنی نیند پوری کر سکتے ہیں اور ایک بات ذہن نشین کر لیں کہ......" لمحہ بھر رک کے جیرڈ نے باری باری اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"ہم لکسر میں ایک منٹ کا بھی اسٹے نہیں کریں گے۔ وہاں پہنچتے ہی ہمیں کوئی بھی سواری پکڑ کر فی الفور "ویلی آف دی کنگز" تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ اس تاریخی وادی کو "ویلی آف دی کوئینز" بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہاں پر قدیم مصری بادشاہوں کے ساتھ ہی ان کی ملکاؤں کے مقبرے بھی موجود ہیں یعنی...... "کنگز اینڈ کوئینز" کا وسیع و عریض

قبرستان......" وہ ایک بار پھر بات ادھوری چھوڑ کر خیالوں میں کھو گیا۔ کچھ پل بعد دوبارہ گویا ہوا۔
"ناشتا ہم لوگ "ویلی آف دی کنگز" کے کسی ہوٹل میں کریں گے اور وہی ہوٹل ہمارا بیس کیمپ بھی ہوگا۔ ناشتے کے بعد ہم ہلکی پھلکی میٹنگ کریں گے اور اپنی اپنی منزل کی سمت گو، وینٹ، گون...... کیا تم لوگ میری اس پلاننگ سے اتفاق کرتے ہو؟"

جیسن، جرمیاہ اور جسٹینو نے جیرڈ کو یقین دلایا کہ وہ ہر حال میں اپنے گروپ لیڈر کو فالو کریں گے۔

☆☆☆

شام کے سات بجنے ہی والے تھے۔ جاسم اور جیون اس وقت کائرو ائرپورٹ کی عمارت کے اندر موجود تھے۔ اس پُراسرار شخصیت نے جاسم کو ٹھیک سات بجے ائرپورٹ کے کیفے ٹیریا میں آنے کے لیے کہا تھا لیکن کائرو ائرپورٹ کے اندر تو کیفے ٹیریاز کا ایک جمعہ بازار لگا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال نے جاسم کو تھوڑا نروس کر دیا۔ اس نے اپنے اجنبی ملاقاتی کے لیے ایک میسج ٹائپ کیا۔

"میں اس وقت ائرپورٹ کے اندر ہوں مگر یہاں پر کئی ایک کیفے ٹیریاز ہیں۔ بتاؤ، مجھے کس کیفے ٹیریا میں آنا ہے؟"

اِدھر جاسم نے میسج سینڈ کیا، اُدھر اس کا ریپلائی بھی آ گیا۔ "ارائیول ہال نمبر دو کے نزدیک کیفے ریتازا میں آجاؤ۔"

جاسم نے جیون سے کہا۔ "مجھے چند منٹ کے لیے ارائیول ہال نمبر دو کی طرف جانا ہے۔ کیا تم مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ سکتے ہو؟"

وہائے ناٹ!" جیون نے سوالیہ نظر سے اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا تمہارے کسی اپنے کی آمد متوقع ہے؟"

"ابھی میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" جاسم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "البتہ، ایسا ہو بھی سکتا ہے۔"

جیون نے کچھ اس انداز سے جاسم کی طرف دیکھا جیسے وہ بہ زبانِ خاموشی کہہ رہا ہو...... پارٹنر! تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو...... "ٹھیک ہے!" جیون نے سرسری لہجے میں کہا۔ "تم اپنا کام نمٹا کر آجاؤ، تب تک میں وہ سامنے والے بک اسٹال میں کچھ کتابیں دیکھ لیتا ہوں۔ اگر کوئی کتاب پسند آ گئی تو خرید بھی لوں گا۔

جاسم نے دوستانہ انداز میں جیون کا کندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔ ٹھیک دو منٹ بعد وہ کیفے ریتازا کے اندر تھا۔ اس کیفے میں کافی، چائے، جوس، برگر، سینڈوچ، آئسکریم......وغیرہ سب ملتا تھا۔

جاسم نے ایک الگ تھلگ کونے کا انتخاب کیا اور اپنے اجنبی میزبان کی راہ دیکھنے لگا۔ کیفے کے اندر اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ وہ وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے ٹھیک شام سات بجے ائرپورٹ کے کیفے میں ملاقات کے لیے بلایا گیا تھا اور وہ دس سیکنڈ پہلے ہی ایک سیٹ سنبھال چکا تھا۔ بہت ضروری بات کرنے والے اس نامعلوم شخص نے تاکید کی تھی کہ اکیلے آنا ہے۔ جاسم نے اس کی یہ شرط بھی پوری کر دی تھی۔

قبل اس کے کہ کوئی ویٹر جاسم والی ٹیبل کا رخ کرتا، ایک پستہ قامت شخص اس کے سامنے ٹیبل کی دوسری جانب بچھی کرسی پر براجمان ہو گیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔

"شام بخیر مسٹر جبران!"

اس کے ساتھ ہی اس شخص نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ جاسم نے اخلاقیات کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس پستہ قامت اجنبی سے ہینڈ شیک کیا اور سوالیہ نظر سے اُسے تکنے لگا۔

"میرا نام آرتھر ہے......!" جاسم کے سامنے بیٹھے ہوئے گٹھیلے بدن کے مالک شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کے لہجے اور انداز سے بے پناہ اعتماد جھلکتا تھا۔ جاسم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

"مسٹر آرتھر! میں آپ کو نہیں جانتا۔ آج ہم پہلی بار ملے ہیں......"

جاسم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

"پہلی اور آخری بار مسٹر جبران......!"

"مسٹر آرتھر! جب ہم ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہیں تو تم نے اتنے پُراسرار طریقے سے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟" جاسم نے اُلجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔ "آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

آرتھر نے جاسم کے سوال کا جواب دینے کے بجائے استفسار کیا۔ "مسٹر جبران! تم کچھ لینا پسند کرو گے۔ چائے، کافی......؟"

’’تھینکس ......‘‘ جاسم نے کہا۔

جاسم کے واضح طور پر منع کرنے کے باوجود بھی آرتھر نے ایک ویٹر کو اشارہ کر کے دو فریش اورنج جوس کا آرڈر دے دیا۔ جاسم نے اپنے سوال کو دہرا دیا۔

آرتھر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی جاسم کے سیل فون پر ایک میسج ریسیو ہوا۔ یہ وہی سیل فون تھا جو ڈیوڈ کے بنگلے پر کسی خدمت گار نے چپکے سے اس کی جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ جاسم کا ملاقاتی اس وقت اس کے سامنے بیٹھا تھا اور آرتھر نے اپنے سیل فون کو آپریٹ نہیں کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ سات پردوں کے پیچھے چھپا ہوا وہ شخص آرتھر تو ہرگز نہیں تھا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں جاسم کے ذہن سے گزرے۔ اگلے ہی لمحے اس نے موصول ہونے والے میسج کو اوپن کر لیا۔ وہاں لکھا تھا۔

’’بروقت کیفے ٹیریا میں پہنچنے کا شکریہ۔ اس سیل فون کی اب ضرورت نہیں رہی۔ تم یہ سیل فون آرتھر کو دے دو۔ میں تم سے بات کرتی ہوں۔‘‘

’اوہ...... تو وہ کوئی خاتون ہے۔‘ جاسم نے حیرت بھرے انداز میں سوچا اور چپ چاپ وہ سیل فون آرتھر کی جانب بڑھا دیا۔

آرتھر نے مذکورہ سیل فون اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اگلے ہی لمحے آرتھر کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ آرتھر کا وہ اسمارٹ فون ٹیبل کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ آرتھر نے اپنے فون کے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی اور فون جاسم کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ’’مسٹر جبران! یہ کال تمہارے لیے ہے۔‘‘

جاسم نے ٹیبل سے وہ اسمارٹ فون اٹھا لیا۔ فون کے ڈسپلے پر ’’میڈم‘‘ کا لفظ فلیش ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جاسم نے وہ کال ریسیو کر لی۔

’’ہیلو......!‘‘ جاسم نے سیل فون کان سے لگا کر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

’’جے بی! میں جانتی ہوں، تم مجھ پر بہت غصہ ہو۔ مجھ سے ناراض ہونے کا تمہیں پورا حق ہے۔‘‘

دوسری جانب بولنے والی کو جاسم نے پلک جھپکتے میں پہچان لیا۔ وہ حسن و جمال کا پیکر، کافر اداؤں کی مالک جیکلین تھی۔ جاسم نے خفگی آمیز انداز میں بے ساختہ کہا۔

’’جیکی تم......؟‘‘

’’مجھے یقین تھا کہ میری آواز سنتے ہی تم مجھے پہچان لو گے۔‘‘ جیکلین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’تم یہی سمجھ رہے ہو نا کہ میں نے تمہیں دھوکا دیا مگر وہ میری مجبوری تھی، میری جاب تھی۔ مجھے ایسا ہی کرنا تھا۔‘‘

’’تو اب کیا......؟‘‘ جاسم نے کڑوے لہجے میں استفسار کیا۔

’’میں نے تمہارے ساتھ جو بھی غلط کیا، اب اُس کا کفارہ ادا کرنے کا وقت ہے۔‘‘ جیکی نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ’’کیا تم مجھے اپنی غلطی کی تلافی کا موقع نہیں دو گے؟‘‘

جاسم نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ’’کیا یہ تمہاری کوئی نئی چال ہے؟‘‘

’’نہیں جے بی!‘‘ وہ اٹل انداز میں بولی۔ ’’میں اپنے کیے پر واقعی بہت شرمندہ ہوں اسی لیے تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’کیسی مدد؟‘‘ جاسم نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

’’جے بی! جلوت میں تمہاری بہادری اور دریا دلی اور...... خلوت میں تمہاری وارفتگی اور جوش و جنون نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔‘‘ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔ ’’میں تمہارے ساتھ گزارے ہوئے ایک ایک لمحے کو زندگی بھر یاد رکھوں گی۔‘‘

جاسم نے قطع کلامی کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ’’کیا یہ کوئی ’’میلوڈراما‘‘ چل رہا ہے؟‘‘

’’نہیں!‘‘ وہ پوری قطعیت سے بولی۔ ’’یہ کوئی ڈراما نہیں بلکہ ایک سفاک سچائی ہے۔ میں ڈیوڈ کے سیٹ اَپ کو چھوڑ نہیں سکتی اور تمہیں اس کے شیطانی چنگل میں پھنستے ہوئے دیکھ نہیں سکتی۔‘‘

’’میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......‘‘ جاسم نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ’’صاف الفاظ میں بات کرو۔‘‘

’’میں فون پر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔‘‘ وہ معتدل انداز میں بولی۔ ’’میری بات مکمل ہونے پر تم فون آرتھر کو دے دینا۔ آرتھر میرا بھروسے کا آدمی ہے۔ یہ تمہیں دو لفافے دے گا۔ ایک لفافے میں ڈیوڈ اور اس کے نیٹ ورک کے بارے میں سنسنی خیز معلومات ہیں جنہیں پڑھ کر تمہارا دماغ گھوم جائے گا۔ دوسرے لفافے میں دو ہزار امریکی ڈالرز ہیں۔ اس رقم کی مدد سے تم دنیا کے کسی بھی حصے میں بہ آسانی پہنچ جاؤ گے۔ جتنی جلدی ممکن ہو، اس شیطانی ری ایلیٹی ٹی وی سے دور چلے جاؤ۔ میں تمہیں بے موت مرتے نہیں دیکھ سکتی۔ میرا جتنا اختیار تھا، وہ میں نے

تمہاری مدد کر دی۔ اس سے آگے تمہاری ذہانت، بہادری اور حکمتِ عملی کا امتحان ہے۔ مجھے یقین ہے، تم خود کو اس شیطانی کھیل کا حصہ بننے سے بچالو گے۔ میں دھوکے باز اور بے وفا نہیں، مجبور ہوں جے بی...... آل دی بیسٹ!''

جاسم کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل فون آل دی بیسٹ کے الفاظ کے ساتھ ہی خاموش ہو گیا تھا۔ یقیناً دوسری جانب اپنی بات مکمل کرنے کے بعد جیکلین نے سیلولر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ جاسم نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سیل فون آرتھر کی جانب بڑھا دیا۔

جواباً آرتھر نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے دو لفافے برآمد کیے جن میں سے ایک پھولا ہوا تھا اور اپنے حجم سے ظاہر کرتا تھا کہ اس کے اندر کرنسی نوٹ بھرے ہوئے ہیں۔ آرتھر نے وہ دونوں لفافے جاسم کو تھما دیے اور کھڑا ہو گیا۔

جاسم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا کام ہو گیا۔'' آرتھر نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب میں چلوں گا۔ انجوائے یور اورنج جوس!''

جس دوران میں جاسم، جیکلین سے سیلولر ٹاک کر رہا تھا، ویٹر نے جوس والا آرڈر پلیس کر دیا تھا۔ جاسم نے آرتھر کو روکنے یا اس سے کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ آرتھر کی بات کے جواب میں وہ محض کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

آرتھر کے جانے کے بعد جاسم نے پھولے ہوئے لفافے کے اندر جھانک کر جیکلین کے بیان کی تصدیق کی۔ لفافے میں سو ڈالر مالیت کے بیس نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ جیکلین نے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ وہ پورے دو ہزار ڈالرز تھے۔

جاسم نے کرنسی نوٹوں والا لفافہ فی الفور اپنی جیب میں رکھا اور دوسرا لفافہ کھول لیا۔ اس لفافے میں سے دو صفحات پر مشتمل ایک تحریر برآمد ہوئی۔ جاسم اورنج جوس کی چسکیاں لیتے ہوئے اس تحریر کو پڑھنے لگا۔

جیکلین نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس تحریر کا ایک ایک جملہ اپنے اندر تابکاری مواد رکھتا تھا اور ڈیوڈ کے مکروہ ابلیسی مشن پر روشنی ڈالتا تھا۔ اس دو صفحی تحریر نے جاسم کے سامنے ڈیوڈ اور اس کی تنظیم کے مذموم عزائم کو آشکار کر دیا تھا۔ جاسم کا دماغ سنگین حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا اور وہ ڈوبتے ابھرتے ہوئے اس تحریر کو پڑھتا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ یونٹ سی کا سفر جاری تھا۔ جیری، جیک، جوناتھن اور جیمس کی خوش گپیاں جاری تھیں۔ اس تفریحی پروگرام میں جیپ کا ڈرائیور باصر بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ سفاری جیپ اسّی کلومیٹرز فی گھنٹا کی رفتار سے روٹ ''سیون فائیو ایم'' پر رواں دواں تھی۔ روٹ ''پچھتر۔ ایم'' کائرو سے لکسر تک جانے والی مین روڈ تھی جسے ''طریق القاہرہ اسیوط الصحراوی'' بھی کہا جاتا تھا یعنی ''اسیوط ڈیزرٹ کائرو روڈ'' پچھلے چار گھنٹوں میں سفاری جیپ نے لگ بھگ تین سو کلومیٹرز کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔

یونٹ سی کا گروپ لیڈر ایک بھکّڑ انسان تھا۔ وہ ایک ایسا بسیار خور تھا کہ اسے ہر دو تین گھنٹے کے بعد بھوک کا دورہ پڑتا تھا اور وہ بھی ایسا کہ برداشت سے باہر۔ گیزا کے مقام پر جیری نے خوب ڈٹ کر پیٹ پوجا کی تھی اور کچھ سامان خورونوش ساتھ بھی رکھ لیا تھا جو کہ اب تک ختم ہو چکا تھا۔

''باصر......!'' جیری نے سفاری جیپ کے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اگلا پڑاؤ کتنی دیر میں آئے گا؟''

''کیا پھر سے تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟'' مصری ڈرائیور نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے سوال کیا۔

پچھلے چار گھنٹے میں باصر ان لوگوں کے ساتھ خاصا گھل مل گیا تھا اور ان کے بیچ گاہے بگاہے لطیفہ گوئی کا عمل بھی جاری تھا۔ جیری نے باصر کے استفسار کے جواب میں ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور کہا۔

''یار...... ''پھر سے'' ...... کا کیا مطلب ہوا؟ مجھے تو ہر وقت بھوک لگی رہتی ہے...... کھانے سے پہلے بھی اور...... کھانے کے بعد بھی!''

''ہم اسیوط سے کم و بیش اٹھاسی کلومیٹرز دور ہیں۔'' باصر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہیں کم از کم ایک گھنٹا اپنی بھوک کو برداشت کرنا ہوگا۔ اسیوط شہر تک پہنچے سے پہلے تو کچھ نہیں ہو سکتا...... اس وقت ہم اسیوط ڈیزرٹ سے گزر رہے ہیں۔''

''برداشت کرنا ہی تو سب سے مشکل کام ہے۔'' جیری نے کہا۔ ''جب مجھے بھوک لگتی ہے تو پھر صبر نہیں ہوتا مجھ سے۔''

''تو پھر بتاؤ باس......'' باصر نے پوچھا۔ ''میں اِس بیچ صحرا میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

"اسپیڈ......" جیری نے ہیجانی انداز میں کہا۔ "اپنی جیپ کو تم آندھی اور طوفان کی رفتار سے اُڑاؤ اور جلد از جلد اسیوط پہنچنے کی کوشش کرو۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا......؟"

اس سے پہلے کہ باصر، جیری کے سوال کا جواب دیتا، اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ باصر نے سفاری جیپ کو سڑک کے کنارے روکنے کے بعد کال ریسیو کی۔

"باصر! تم اس وقت کہاں ہو؟" دوسری طرف بولنے والے اس کے دوست جمال نے پوچھا۔

"روٹ سیونٹی فائیو۔ ایم پر ہوں۔" باصر نے بتایا۔ "اسیوط پہنچنے میں ایک سے ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا۔ خیریت تو ہے نا......؟"

"ابھی تک تو خیریت ہے لیکن آگے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" جمال نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

جمال سے باصر کی دوستی بہت پرانی تھی۔ جمال ایک ٹیکسی چلاتا تھا۔ باصر نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

"صاف صاف بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟"

"اسیوط شہر سے ستر کلومیٹرز کے فاصلے پر، ایک خطرناک صحرائی طوفان آنے والا ہے۔" جمال نے گمبھیر لہجے میں بتایا۔ "تمہارے پاس صرف تیس منٹ ہیں۔ اگر تم نے اتنے وقت میں وہ مقام عبور کر لیا جہاں پر میں نے صحرائی طوفان کی نشاندہی کی ہے تو پھر تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں اور اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ فاصلہ آسانی سے طے نہیں کر پاؤ گے تو پھر اس وقت جہاں ہو، وہیں رک جاؤ۔ باقی کا سفر طوفان کے گزر جانے کے بعد کر لینا۔"

"میرے لیے تیس منٹ بہت ہیں جمال!" باصر نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "میں پندرہ سولہ کلومیٹرز کا یہ فاصلہ بمشکل دس منٹ میں طے کر لوں گا۔ باقی میں اپنے پسنجرز سے بھی مشورہ کر لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" جمال نے کہا۔ "اللہ تمہارا حامی و ناصر......"

باصر نے سیلولر رابطہ موقوف کیا تو جیری کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "کس کا فون تھا...... وہ کیا کہہ رہا تھا...... کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے نا......؟"

جیری نے باصر پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی لیکن باصر نے تحمل سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر جیپ کی اندرونی لائٹس آن کرنے کے بعد سپاٹ آواز میں کہا۔

"باس! مجھے اپنی زبان دکھاؤ۔"

اس عجیب وغریب فرمائش پر جیری سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ کیسا بے ہودہ مذاق ہے؟"

"میں سیریس ہوں باس......" باصر اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ "میں تمہاری زبان چیک کرنا چاہتا ہوں کہ کہیں وہ کالی تو نہیں ہے کیونکہ......"

باصر نے ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑی تو جیری نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "کیوں کہ کیا......؟"

"کیونکہ...... ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا کہ میں اپنی جیپ کو آندھی اور طوفان کی رفتار سے اُڑاؤں......" باصر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اور ایسا ہی ہونے والا ہے۔"

"کک...... کیا مطلب ہے تمہارا......؟" جیک کے منہ سے نکلا۔

جوناتھن نے سراسیمہ آواز میں پوچھا۔ "کیا ہم کسی صحرائی طوفان کی لپیٹ میں آنے والے ہیں؟"

"جو بھی حقیقت ہے، ہمیں صاف صاف بتاؤ۔" جیسی نے فکرمندی سے کہا۔

باصر نے ان چاروں کے سوالیہ چہروں کے جواب میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔

"ہمارے پاس دو آپشنز ہیں۔ نمبر ایک، ہم یہیں پر رک کر طوفان کے گزر جانے کا انتظار کریں۔ نمبر دو، طوفان کے سیونٹی فائیو۔ ایم تک پہنچنے سے پہلے ہی اس علاقے سے گزر جائیں۔ میں دونوں طرح تیار ہوں۔ باقی جو آپ لوگوں کا مشورہ......؟"

بات مکمل کر کے باصر نے باری باری ان چاروں کی طرف دیکھا۔ جیری نے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس طوفان کا دورانیہ کتنا ہوگا؟"

"نہیں باس......" باصر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "صحرائی طوفانوں کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر یہ معمولی نوعیت کا کوئی جھکڑ ہوتا تو جمال مجھے اس کی اطلاع نہ دیتا۔ میں سمجھتا ہوں، کوئی بڑی مصیبت ہماری راہ دیکھ رہی ہے۔"

"لیکن ہم اس مصیبت کو اپنی راہ کے آس پاس بھی پھٹکنے نہیں دیں گے۔" جیری نے مضبوط لہجے میں کہا پھر باصر سے پوچھا۔ "تم نے یہی بتایا ہے نا کہ لگ بھگ پندرہ کلو

میٹرز آگے کے علاقے میں، تیس منٹ کے بعد کوئی صحرائی طوفان گزرنے والا ہے؟''

''بالکل! مجھے یہی اطلاع دی گئی ہے کہ اسیوط سے ستر کلومیٹرز پہلے روٹ سیونٹی فائیو۔ایم اس صحرائی طوفان کی زد میں آئے گا۔'' باصر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''اور اس وقت ہم مذکورہ مقام سے محض پندرہ سے سترہ کلو میٹرز کے فاصلے پر ہیں۔''

''اگر تم اپنی سفاری کو ہوا سے ہم کلام ہونے کا موقع دو تو میں سمجھتا ہوں تم دس سے بارہ منٹ میں اس مقام سے گزر جاؤ گے جہاں صحرائی طوفان کی آمد بتائی جا رہی ہے۔'' جیری نے کسی تجزیہ نگار کے انداز میں کہا۔ ''کیا تم یہ کر لو گے؟''

''یس باس!'' باصر نے چٹانی لہجے میں کہا۔

جیری نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''بس، تو پھر کام سے لگ جاؤ۔''

باصر نے سفاری کو دوبارہ ''طریق القاہرہ اسیوط الصحراوی'' پر چڑھا دیا۔ حالات کے پیش نظر اس نے ہائی وے کی اسپیڈ لیمٹ کو بالائے طاق رکھ کر جیپ کو واقعتاً ہوا کا گھوڑا بنا دیا تھا۔

تقدیر اور تدبیر میں ازلی ابدی کشاکش پائی جاتی ہے۔ انسان اپنے اختیار کے اندر رہتے ہوئے تدبیر کرتا ہے لیکن تقدیر کا مالک کوئی اور ہی پاک ذات ہے اسی لیے بگڑے ہوئے حالات اور اُلجھے ہوئے معاملات میں کہا جاتا ہے..... تدبیر کنند بندہ، تقدیر کنند خندہ!

ہوا سے باتیں کرتے ہوئے جب سفاری جیپ عین اس مقام پر پہنچی جہاں صحرائی طوفان کی آمد متوقع تھی تو اس کے انجن میں اچانک کوئی خرابی پیدا ہو گئی۔ جیپ کے بونٹ میں سے ایک ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور کئی ایک خوف ناک جھٹکے لینے کے بعد جیپ بند ہو گئی۔ حد سے زیادہ رفتار ہونے کے باعث باصر نے بمشکل اپنی جیپ کو سنبھالا اور روٹ سیونٹی فائیو۔ایم کے کنارے روک دیا۔

جیپ کے اندر موجود یونٹ سی کے چاروں ارکان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ باصر تو اسی صحرائی سرزمین کا پروردہ تھا لہٰذا وہ ایسے طوفانوں سے بالکل نہیں گھبراتا تھا بلکہ ایسے واقعات تو باصر کے لیے معمولاتِ زندگی کی حیثیت کے حامل تھے مگر وہ چاروں ایسی سچویشنز کے عادی نہیں تھے۔ یہ اُن کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور وہ بھی پردیس میں۔

''تمہاری جیپ کو کیا ہوگیا؟'' جیری نے باصر سے پوچھا۔

''انجن میں کوئی گڑبڑ لگتی ہے باس۔'' باصر نے جواب دیا۔ ''چیک کرنے کے بعد بتاتا ہوں، کیا صورتِ حال ہے۔''

''تمہارے اندازے کے مطابق، ہم اس وقت کہاں پر ہیں؟'' جوناتھن نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''عین اسی مقام پر جہاں سے وہ صحرائی طوفان گزرنے والا ہے۔'' باصر نے بتایا۔ ''اور طوفان کی آمد میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اگر جیپ خراب نہ ہوئی ہوتی تو ہم بہ حفاظت آگے بڑھ چکے ہوتے۔ صحرائے اسیوط میں اس نوعیت کے طوفانی معاملات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں!''

جیمس نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ ''تم نے تو ہماری جان ہی نکال لی ہے...... ہم پریشان نہ ہوں تو اور کیا کریں......؟''

''باصر! پلیز کچھ کرو۔'' جیک نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ''ہم اس لق و دق صحرا میں اذیت ناک موت مرنا نہیں چاہتے۔''

''باصر! جلدی سے تم جیپ کے انجن کو چیک کرو۔'' جیری نے تحکمانہ انداز میں ہا۔ ''ہوسکتا ہے، گاڑی میں کوئی معمولی نوعیت کی خرابی ہو جسے ٹھیک کرنے کے بعد ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔''

باصر نے جیپ کے عقبی حصے میں رکھی ہوئی ٹول کٹ اور ایمرجنسی لائٹ اٹھالی اور بونٹ اٹھا کر انجن کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ چاروں بھی سفاری جیپ سے باہر نکل آئے تھے اور جیک نے ایمرجنسی لائٹ پکڑ کر باقاعدہ باصر کی مدد کرنا شروع کردی تھی۔

باصر لگ بھگ پانچ منٹ تک انجن کی خرابی ڈھونڈنے میں مصروف رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں یہ مایوس کن اعلان کردیا۔

''آگے بڑھنے کے لیے جیپ کا انجن ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ اس کی خرابی دور کرنے کے لیے ہمیں باقاعدہ کسی آٹو مکینک کو یہاں بلانا پڑے گا اور مجھے نہیں لگتا کہ طوفان کی خبر عام ہونے کے بعد کوئی مکینک اِدھر کا رخ کرنے کی ہمت کرے گا لہٰذا رات کا باقی حصہ ہمیں اسی جیپ کے اندر دبک کر گزارنا ہوگا۔''

''تمہاری جیپ ایکا یک خراب کیسے ہوگئی؟'' جیری نے تڑخ کر کہا۔ ''کیا تم اس کی مینٹیننس پر توجہ نہیں دیتے ہو؟''

''میں اپنی سفاری کی باقاعدہ مینٹیننس کراتا ہوں باس۔'' باصر نے تحمل انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن......''

باصر نے جملہ نامکمل چھوڑا تو جیری نے پوچھا۔ ''لیکن کیا......؟''

''اس جیپ کو انسان نے بنایا ہے باس......'' باصر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اور اس کی مینٹیننس کا کام بھی انسان ہی کرتے ہیں۔''

''تو......!'' جیری نے سوالیہ نظر سے باصر کو گھورا۔ ''آخر تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کررہے ہو؟''

''باس! انسان کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے جو کہ قادرِ مطلق ہے۔'' باصر نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ انسان کب بیمار ہوگا اور کب اس کی موت واقع ہوجائے گی، اس بارے میں دعوے کے ساتھ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب خالق کائنات کے بنائے ہوئے انسان کی صحت اور زندگی کی کوئی گارنٹی نہیں تو سفاری جیپ کیا بیچتی ہے۔''

باصر کی ٹھوس دلیل نے جیری کی بولتی بند کردی تھی۔ جیک نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... یہ جیپ ایک مشین ہے اور مشین میں کسی وقت کوئی بھی خرابی پیدا ہوسکتی ہے۔ بتاؤ، اب کرنا کیا ہے۔ طوفان کی آمد میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہمیں کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہیے۔''

''صحرائے اسیوط کے اس بے رحم حصے میں ہمارے لیے سب سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ یہ سفاری جیپ ہی ہے۔'' باصر نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''جب تک یہ صحرائی طوفان آکر گزر نہیں جاتا، ہمیں دروازے، شیشے بند کرکے جیپ کے اندر ہی بیٹھے رہنا ہوگا۔ آگے جو اللہ کو منظور۔''

اِدھر باصر کی بات مکمل ہوئی، اُدھر فضا میں ایک پُراسراری عجیب وغریب آواز ابھری۔ اس آواز میں ایک رعب، دبدبہ اور ہیبت پائی جاتی ہے۔ یونٹ سی کے ارکان کے چہروں پر خوف رقص کرنے لگا۔

''یہ...... کیسی...... آواز ہے؟'' جیری نے باصر سے پوچھا۔

''اوہ...... یہ تو وہی ہے۔'' باصر نے تشویش بھرے انداز میں جواب دیا۔ ''ہمیں فوراً جیپ کے اندر پناہ گزین ہوجانا چاہیے۔''

بات کے اختتام پر باصر نے سفاری کے بونٹ کو

ایک جھٹکے سے گرایا اور آناً فاناً ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچ کر دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا۔

صحرائی طوفان کی آمد نے یونٹ سی کی گویا سٹی گم کر دی تھی۔ وہ بوکھلاہٹ بھرے انداز میں پلٹے اور بدحواسی کے عالم میں جیپ کے اندر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ اُن کی دھڑکنیں سینوں کے باہر سنائی دے رہی تھیں......!

☆☆☆

ایجپٹ ائر کی فلائٹ ''ایم ایس سکسٹی'' نے ٹھیک رات دس بج کر پینتالیس منٹ پر کائرو انٹرنیشنل ائرپورٹ سے اُڑان بھری اور ایک گھنٹا، پانچ منٹ کی پرواز کے بعد رات گیارہ بج کر پچاس منٹ پر لکسر انٹرنیشنل ائرپورٹ کے رن وے کو چھولیا۔ جاسم اور جیون ائرپورٹ کی فارمیلیٹیز پوری کرنے کے بعد باہر نکلے، زیادہ بھاڑے پر ایک پرائیویٹ کار پکڑی اور لگ بھگ ایک بجے رات وہ ''ویلی آف دی کنگز'' کے اندر واقع ایک ہوٹل ''فیسروز'' میں چیک اِن ہو گئے۔

ہوٹل فے روز دریائے نیل کے مغربی کنارے پر ''ہابوسٹی'' میں تھا اور ''ہابو ٹیمپل'' کے انتہائی نزدیک۔ ہابو ٹیمپل کو ''ٹیمپل آف رعمسیس تھرڈ'' بھی کہا جاتا ہے۔ ہابو ٹیمپل کا اندرونی نظارہ عقل کو دنگ اور سوچ کو مبہوت کر دیتا ہے۔

جاسم اور جیون نے رقم بچانے کے لیے ہوٹل فیروز ... میں ایک ڈبل بیڈ سنگل روم لیا تھا۔ اگرچہ جیکلین کی عنایت سے جاسم کے پاس ایک ہینڈسم اماؤنٹ آچکا تھا لیکن ظاہر ہے، وہ جیون کو اس راز میں شریک نہیں کر سکتا تھا اسی لیے وہ کفایت شعاری کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اپنے مشن کی تکمیل تک انہیں اسی ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ ہوٹل فیسروز کا وہ روم انہیں محض تین سو ساٹھ ای جی پی (ساڑھے بائیس ڈالرز) فی یوم میں مل گیا تھا۔

ڈبل بیڈ سنگل روم میں سیٹل ہونے کے بعد جاسم اور جیون اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ رات کا کھانا انہوں نے ائرپورٹ پر کھا لیا تھا لہٰذا اب آرام کرنے کا وقت تھا تاکہ ایک بھرپور نیند لینے کے بعد وہ اگلی صبح ایک دم فریش بیدار ہوں۔ بیس تاریخ کا آغاز ہو چکا تھا۔ آنے والا دن بہت زیادہ مصروفیت میں گزرنے والا تھا۔

جاسم نے آنکھیں بند کیں تو جیکلین کے دو صفحی خط کی تحریر اس کے دماغ کی اسکرین پر روشن ہو گئی۔ جیکلین نے اس تحریر کے ذریعے جاسم کو بتایا تھا کہ مصر میں شروع ہونے والے اس ری ایلیٹی ٹی وی کے علاوہ ڈیوڈ نے دنیا کے دس ممالک میں اسی نوعیت کے مہماتی شوز کا آغاز کر رکھا تھا جہاں دنیا کے جسمانی اور ذہنی طور پر قابل انسانوں کو مشکلات میں ڈال کر ان کی ہمت اور برداشت کا امتحان لینا مقصود تھا۔ اس ''ٹیلنٹ ہنٹ'' خطرناک مہماتی اسکیم کے ذریعے وہ ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تسخیر نوجوانوں کی ایک فوج تیار کرنا چاہتا تھا جن سے ڈیوڈ مستقبل قریب میں، دنیا کے سب سے بڑے شہر ''نی یوم'' کے حفاظتی انتظام و انصرام کا کام لینا چاہتا تھا۔ ہزاروں افراد پر مشتمل یہ آرمی ''نی یوم'' کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر کڑی نگاہ رکھتی اور اس آرمی کے اندر دنیا کے ہر خطے، ہر رنگ، ہر مذہب اور ہر نسل کے نوجوان شامل ہوں گے۔ سولہ ہزار مربع کلومیٹرز کے رقبے پر بسایا جانے والا یہ میگا سٹی ''نی یوم'' اتنا بڑا ہوگا کہ اس کے اندر اگر تینتیس نیویارک سٹی سائز کے شہروں کو ڈال دیا جائے تو یہ بھر نہیں سکے گا۔ ''نی یوم'' رقبے کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اور اپنی تعمیرات کی بنا پر کرۂ ارض کا سب سے بلند شہر ہوگا۔ سعودی عرب کے شمال مغرب میں، بحیرۂ احمر کے کنارے پر واقع ''تبوک'' نامی علاقے میں آباد کیے جانے والے ''نی یوم'' کو جیکلین نے ''دجالی شہر'' کا نام دیا تھا اور جاسم کو تاکید کی تھی کہ وہ جلد از جلد ڈیوڈ کے طوق سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس ابلیسی تنظیم کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے کہیں دور چلا جائے ...... کسی ایسی جگہ جہاں ڈیوڈ کی رسائی ممکن نہ ہو اور یہ اسی وقت ہو پائے گا جب جاسم، ڈیوڈ کے طوق کو اپنے گلے سے اتار پھینکے گا۔ اس طوق کی تفصیل بھی بڑی سنسنی خیز تھی۔

جیکلین کے مطابق، گلاٹا برج والے ''زینان'' ریسٹورنٹ میں ڈیوڈ کے آدمی بن عرفات نے جاسم کا خون نکالنے کے لیے جو سرنج استعمال کی تھی، اس کی نیڈل پر ایک خاص قسم کا کیمیکل لگا ہوا تھا جس کے اثر سے جاسم ریسٹورنٹ کے سامنے والی راہ گزر پر چکرا کر گر گیا تھا۔ بعد ازاں کروز شپ پر ڈیوڈ نے جاسم کی گردن والے زخم کے حوالے سے اسے یہی بتایا تھا کہ گرتے وقت کانچ کا کوئی ٹکڑا اس کی گردن میں چبھ گیا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جاسم کی بے ہوشی کے دوران میں اس کی گردن کا ایک مائنر آپریشن کر کے وہاں ایک مینوٹرینگ ڈیوائس کو چھپا دیا گیا تھا تاکہ اگر کبھی جاسم کے دماغ میں بغاوت کا کیڑا کلبلائے اور وہ ڈیوڈ کے سیٹ اَپ سے فرار ہونے کی کوشش کرے تو ان لوگوں کو اس کی لوکیشن کا پتا چلتا رہے۔ جیکلین نے اس نیو

ٹریکنگ ڈیوائس کے لیے ''غلامی کا طوق'' جیسے الفاظ استعمال کیے تھے اور جاسم کو بتایا تھا کہ اس مہم میں بھاگ لینے والے ہر نوجوان کو کھونٹے سے باندھ کر رکھنے کے لیے یہی طریقہ اپنایا گیا تھا۔ یہ لوگ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں، ان کی لوکیشن ڈیوڈ کے ٹریکنگ سسٹم کی پکڑ میں آجائے گی۔

جیکلین کی بتائی ہوئی باتوں کے بارے میں سوچ کر جاسم کا دماغ سنسنا اٹھا۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنی گردن کی بائیں جانب موجود زخم پر چلا گیا۔ کروز شپ پر جاسم نے آئینے میں اس زخم کا معائنہ کیا تھا۔ وہ ایک سے سوا انچ کا کٹ تھا جس پر ایک ٹانکا لگا کر اسے بند کر دیا گیا تھا اور اس زخم کے اوپر ہلکی پھلکی بینڈیج لگا دی گئی تھی۔ جاسم اس کٹ کو ایک معمولی سا زخم ہی سمجھ رہا تھا مگر جیکلین کی فراہم کردہ معلومات نے جاسم کو حد درجہ بے چین کر دیا تھا۔ پچھلے تین چار دن میں جاسم کی گردن کا یہ زخم بھر چکا تھا۔ اب اس میں کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن جیکلین کے سنسنی خیز انکشاف نے جاسم کی سوچ کو یکا یک سپردِ عذاب کر دیا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے گردن والے زخم کو سہلاتے ہوئے جیون سے مخاطب ہوا۔ ''پارٹنر...... کیا تم سو گئے؟''

''سونے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' جیون نے جواب دیا۔ ''مگر مجھے نیند نہیں آرہی۔''

بستر پر پہنچنے کے بعد انہوں نے کمرے کی لائٹ آف کر دی تھی البتہ، دروازہ آدھا بھیڑ کر واش روم کی لائٹ کو آن رہنے دیا تھا تاکہ وہاں سے آنے والی روشنی کمرے کے اندر تاریکی کو ڈیرا نہ ڈالنے دے۔

''تم کب سے ڈیوڈ کے رابطے میں ہو؟'' جاسم نے پوچھا۔

''اس ماہ کی ابتدا سے۔'' جیون نے بتایا۔ ''سمجھ لو، انیس بیس دن ہو گئے ہیں۔''

''کیا تمہیں چنائے سے ڈائریکٹ کائرو لایا گیا تھا؟''

''نہیں...... پہلے مجھے چنائے سے پونڈی چیری جانے کو کہا گیا۔'' جیون نے کہا۔ ''دو روز بعد مجھے ممبئی بلا لیا گیا۔ میں نے دو دن ممبئی میں قیام کیا اور پھر ڈیوڈ کے آدمیوں نے مجھے پورٹ آف ممبئی سے ایک کارگو شپ پر سوار کرا دیا۔ یہ ایک طویل سمندری سفر تھا۔ لگ بھگ بارہ دن کے بعد وہ کارگو شپ مصر کی بندرگاہ الگزینڈریا (اسکندریہ) پر لنگر انداز ہوا۔ اس کے بعد مجھے بائی ائر الگزینڈریا سے کائرو لایا گیا۔ اس تمام تر سفر میں، میں اپنی زندگی کے ایک انوکھے اور تکلیف دہ تجربے سے بھی گزرا ہوں......''

جیون نے بات مکمل کی تو جاسم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کون سا تجربہ؟''

''ممبئی سے الگزینڈریا آنے والے کارگو شپ پر میرے علاوہ عملے کے کئی افراد بھی سوار تھے۔ ہمارا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا ایک ساتھ ہی ہوتا تھا۔'' جیون نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس سمندری سفر کے پہلے ہی دن میرے پیٹ میں شدید قسم کا درد اٹھا۔ شپ کے اسٹاف میں ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اس ڈاکٹر نے میرا چیک اپ کرنے کے بعد بتایا کہ میرے پیٹ کے اندر اپنڈکس پھول گیا ہے۔ اگر فوری طور پر میرا آپریشن نہ کیا گیا تو اپنڈکس پھٹ جانے سے میری موت واقع ہو سکتی ہے۔ میں تکلیف کی شدت سے چلا رہا تھا لہٰذا اس ڈاکٹر نے میرا آپریشن کر ڈالا۔ سرجری کی دنیا میں اپنڈکس ریموول کو انتہائی مائنر آپریشن سمجھا جاتا ہے۔ اس ڈاکٹر نے مجھے گہری نیند کا انجکشن دیا اور میری بے ہوشی کے دوران میں مجھے اپنڈکس سے نجات دلا دی۔ بعد ازاں میری صبح شام ڈریسنگ کی گئی اور جب تک وہ کارگو شپ الگزینڈریا پہنچا، میرا زخم تقریباً بھر چکا تھا۔ ڈریسنگ کے علاوہ مجھے اینٹی بائیوٹک انجکشن اور پین کلر میڈیسن بھی باقاعدگی سے کھلائی گئی تھیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس پیٹ کے متاثرہ حصے پر ہلکی سی دکھن محسوس ہوتی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔''

جیون نے اپنی بات مکمل کر دی۔ اس کی آپ بیتی سن کر جاسم کا دماغ جھنجنا اٹھا۔ اگر جیکلین نے اسے ٹریکنگ ڈیوائس والی نینو ٹیکنالوجی کے بارے میں نہ بتایا ہوتا تو وہ جیون کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو معمولات میں شمار کرتا۔ ہر انسان کے پیٹ میں معدے سے تھوڑا نیچے دائیں جانب اپنڈکس موجود ہوتا ہے اور اگر اس کے اندر خوراک پھنس جائے تو اس کا پھولنا لازم ہے جس کے بعد آپریشن ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن یہاں پر معاملات سیدھے نہیں تھے۔ جاسم کو اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ اپنڈکس کے آپریشن کے بہانے جیون کے پیٹ کے اندر ٹریکنگ ڈیوائس کو نصب کر دیا گیا تھا۔

جیون اپنے بیڈ پر چت لیٹا ہوا تھا جبکہ جاسم نے کروٹ لے رکھی تھی۔ جیون کی جانب اس کی پیٹھ تھی۔

کمرے کے اندر ملگجا اُجالا پھیلا ہوا تھا جو نیند کی راہ میں حارج نہیں تھا تاہم ان کے لیے ایک بھرپور نیند لینا بھی ضروری تھا۔ جاسم نے ایک طویل جماہی لینے کے بعد جیون سے پوچھا۔

’’تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں کسی کروز شپ پر بورڈ آن کر کے استنبول سے پورٹ آف سعید تک نہیں لایا گیا تھا؟‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘ جیون نے پوری قطعیت سے کہا۔ ’’میں تمہیں اپنے چنائے سے کائرو تک پہنچنے کی داستان سنا چکا ہوں۔ تم بھی اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔‘‘

’’میری بپتا تمہاری طرح سیدھی سادی نہیں ہے پارٹنر......‘‘ جاسم نے ایک اور جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ’’میں اپنی کہانی تمہیں کل رات میں سناؤں گا۔ ابھی تو مجھے بڑی زور کی نیند آرہی ہے۔‘‘

’’اوکے...... تم سو جاؤ۔‘‘ جیون نے سرسری انداز میں کہا۔ ’’گڈ نائٹ!‘‘

’’گڈ نائٹ پارٹنر......‘‘ جاسم نے جواباً مخمور لہجے میں کہا اور ڈیوڈ کی شاطر دماغی کے بارے میں سوچنے لگا۔

ڈیوڈ نے جاسم کو بتایا تھا کہ اس ری ایلیٹی ٹی وی میں حصہ لینے والے بارہ کے بارہ نوجوان کروز شپ پر سوار ہیں مگر جاسم کو ان میں سے کوئی ایک بھی اس شپ پر نظر نہیں آیا تھا۔ جیون کا بیان بھی ڈیوڈ کی دروغ گوئی کی تصدیق کررہا تھا۔

وہ ڈیوڈ کی حرام زدگیوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اسے محسوس ہوا کہ بستر پر اس کے علاوہ کوئی اور انسان بھی موجود ہے۔ یہ خیال سنسنی خیز ہونے کے ساتھ ہی خاصا واہیات بھی تھا۔

جاسم نے اسے اپنا وہم جان کر ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش کافور ہوگئی۔ وہ سینے میں سانس روکے اس عجیب وغریب بستری صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے اپنا دماغ لڑا ہی رہا تھا کہ اس کے عقب میں جسمانی حرکت ہوئی۔ اس پُراسرار حرکت کے ساتھ ہی چوڑیاں کھنکیں اور ایک نسوانی ہاتھ اس کے شانے پر آٹکا۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنی گردن پر سانسوں کی تپش محسوس ہوئی۔

جاسم کے رگ وپے میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

ایسی پُراسرار، سنسنی خیز اور تحیر آمیز صورتِ حال سے زندگی میں پہلی بار جاسم کا واسطہ پڑا تھا۔ جب اس نے اپنے پیچھے، بستر پر کسی کی موجودگی کو محسوس کیا تو وہ یہی سمجھا تھا کہ یہ اس کا وہم ہے لیکن بعد میں جو کچھ ہوا، اس نے وہم کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا۔ چوڑیوں کی مخصوص کھنک، گردن پر محسوس ہونے والی سانسوں کی تپش اور کسی نسوانی ہاتھ کا اس کے شانے پر آٹکنا...... یہ سب بڑا ہی تعجب خیز اور مبنی برحقائق تھا جسے جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اُس کے دماغ نے یہ طے کرلیا کہ وہ کسی ماورائی جھمیلے میں پھنسنے جارہا ہے۔ وہ اس وقت سرزمینِ اسرار ورموز مصر میں، دریائے نیل کے مغربی کنارے پر واقع ’’ہابوٹی‘‘ کے ایک ہوٹل میں تھا۔ اس نے مصر سے متعلق بڑی عجیب وغریب اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں سن اور پڑھ رکھی تھیں لہٰذا اس ملک میں کچھ بھی حیرت ناک بلکہ خوفناک ہوسکتا تھا۔

ان سمجھ سے بالاتر لمحات میں، جاسم کا ذہن سوچ کے میدان میں روشنی کی رفتار کو مات دے رہا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں ایک اٹل فیصلہ کرلیا اور پلٹ کر عقبی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بجائے، اپنی ہی سمت میں ایک فوری اور طویل جست بھر کر وہ کمرے کے عین وسط میں فرش پر جاگرا۔ اگلے ہی لمحے اس نے گردن گھما کر اپنے عقب میں دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بیڈ کے اوپر ایسے کوئی آثار نہیں تھے جیسا تھوڑی دیر پہلے اس نے محسوس کیا تھا۔ یہ ایک ناقابلِ یقین اور چکرا دینے والا معاملہ تھا۔

جاسم کا بیڈ کسی مفلس کی جیب کے مانند ’’خالی‘‘ تھا اور دوسرے بیڈ پر جیون کروٹ لیے مزے کی نیند سو رہا تھا۔ چند منٹ پہلے جیون نے جاسم کو بتایا تھا کہ باوجود کوشش کے اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اسے تو اس وقت اپنی نیند کو منانے کی تگ ودو میں، اپنے بستر پر بے کیف کروٹیں بدلتے نظر آنا چاہیے تھا مگر وہ تو خراٹے دار گہری نیند لے رہا تھا حتیٰ کہ جیون کی اس پُراسرار نیند پر اس دھماکے کی بھاری بھرکم آواز کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا جو لانگ ڈائیو کے نتیجے میں جاسم کے بدن اور کمرے کے فرش کے تصادم سے پیدا ہوئی تھی۔ جیون کی یہ اچانک اور بے خبری کی نیند بھی جاسم کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجارہی تھی۔

سب کچھ گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ جاسم نے ابھی جس سنسنی خیز اور ناقابلِ یقین سچویشن کا تجربہ کیا تھا، اس کے مابعد اثرات نے اس کی سوچ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ یہ سب اس کا وہم تھا اور نہ ہی اس نے کھلی آنکھوں سے کوئی سپنا دیکھا تھا۔ وہ اپنی ان سنسناہٹ بھری کیفیات کو کسی سمی

یا بصری دھوکے سے تعبیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی پشت پر کوئی عورت اپنے مادّی وجود کے ساتھ موجود تھی۔ جاسم اس کے لمس اور تنفس سے کماحقہ آشنا ہوا تھا۔ آخر وہ تھی کون؟

اس سنسنی خیز سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ بند اور مقفل تھا۔ واش روم کے نیم وا دروازے سے راہ فرار اختیار کرنے والی روشنی ہوٹل کے اس کمرے کی تاریکی میں سیندھ لگا رہی تھی۔ وہاں پر اتنا اُجالا تھا کہ کمرے میں پائی جانے والی ہر شے کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ جاسم کو ''جس'' کی ڈھونڈ تھی، وہ کمرے میں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ عقل کو دنگ اور سوچ کو منتشر کر دینے والی سچویشن تھی۔ اس نے اپنے اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس پُراسرار نادیدہ و نامعلوم عورت کو کھوجنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔

کمرے کے ایک کونے میں سٹنگ ارینجمنٹ تھی۔ ایک ٹو سیٹر صوفے اور دو کرسیوں کے بیچ چھوٹی سی ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ جاسم نے کمرے کے اس حصے کا بہ غور جائزہ لیا پھر اپنے اور جیون والے بیڈ کے نیچے جھانک کر تسلی کر لی۔ اس کے بعد وہ واش روم میں گھس گیا۔ ال غرض، اس کی متلاشی نگاہ جہاں بھی گئی، وہاں مایوسی اور ناکامی نے اس کا استقبال کیا۔ ہوٹل نفے روز کے اس ڈبل بیڈ یعنی ٹو بیڈ سنگل روم میں جاسم اور جیون کے سوا اور کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔

جاسم کے دماغ میں عجیب سی بے چینی اور اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر یہ تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ چند منٹ پہلے وہ جس تشویش ناک تجربے سے گزرا تھا، وہ محض اس کا وہم یا اس کے احساس کا فریب تھا۔ اس نے بستر پر اپنے عقب میں جس عورت کو محسوس کیا تھا، اس کی سانسوں کی حدت اور ہاتھ کے آتشی لمس نے جاسم کو کسی تپتے ہوئے صحرا کی یاد دلا دی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے یکایک کسی نے اس کی پشت پر جہنم کی کھڑکی کھول دی ہو۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ہر سُو خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ انہیں اس ہوٹل میں چیک اِن ہوئے لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹا ہوا تھا۔ وہ جیون داس، چند لمحے پہلے جسے نیند نہیں آ رہی تھی، وہ اب بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ وہ جتنا سوچتا، اس کا دماغ اتنا ہی زیادہ اُلجھتا چلا جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر چیخ اٹھتا کہ کمرے کے داخلی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

جاسم نے چونک کر بند دروازے کی طرف دیکھا اور اس کے دماغ میں ایک سوال نے سر اٹھایا...... یہ کون آ گیا؟

دستک دینے والے نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ اس کے ہاتھ اور کمرے کے دروازے کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی مخصوص آواز سے گرد و پیش میں محوِ آرام کوئی شخص ڈسٹرب نہ ہو۔ جاسم کے قدم بے ساختہ بند دروازے کی سمت اٹھ گئے۔

''یہ ہوٹل کے اسٹاف میں سے تو کوئی ہو نہیں سکتا۔'' اس نے دروازے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے بڑبڑاہٹ آمیز انداز میں خودکلامی کی۔ ''اگر انہیں ہم سے کچھ کہنا ہوتا تو وہ روم سروس والے فون پر رابطہ کرتے۔''

جاسم دروازے سے چند فٹ کی مسافت پر تھا کہ عقل و دانش کے چودہ طبق گل کر دینے والا ایک واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ اس نے بہ قائمی ہوش و حواس جاگتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، بند دروازے کے چوبی وجود میں سے ایک لڑکی نکل کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس دروازے نے چشم زدن میں اسے جنم دیا ہو۔

جاسم یک ٹک بے یقینی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس اجنبی حسینہ کو تکے جا رہا تھا۔ وہ مہ جبیں قد بت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے آٹھ دس سال کی ایک اسکول گرل دکھائی دیتی تھی تاہم چہرے کے خال و خط اور آنکھوں کی گہرائی و گیرائی اسے ایک پختہ عمر اور تجربہ کار عورت بتاتے تھے۔ یوں لگتا تھا، کسی نوعمر لڑکی کے دھڑ پر ایک میچور عورت کا سر فٹ کر دیا گیا ہو۔

اس نووارد بلکہ عجب وارد لڑکی کا حسن بے مثال اور جوبن لاجواب تھا۔ جاسم نے اس نوعیت کی منفرد و خوب صورتی اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس پری وش کا سراپا اگرچہ انسانوں ایسا ہی تھا مگر اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر سوچ کو انوکھی بھول بھلیوں میں ڈالنے والا تھا۔ وہ اپنے پُرکشش اور جاذبِ نظر وجود کے ساتھ جاسم کے مقابل کھڑی، گہری سنجیدگی سے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی پھر کمرے کے کونے کی جانب بڑھتے ہوئے بڑے کروفر سے بولی۔

''آجاؤ......!''

اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا رعب اور تحکم پایا جاتا تھا۔ جاسم نے اس کے سمجھ میں نہ آنے والے رویّے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قدرے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''کیا در و دیوار تمہارے لیے کوئی حیثیت نہیں

رکھتے۔ تم بند دروازے کے اندر سے کیسے نمودار ہوئی ہو؟''

''میرے سامنے بیٹھو، پھر سب پتا چل جائے گا۔'' وہ جاسم کی طرف دیکھے بغیر سپاٹ آواز میں بولی۔ ''میں تم سے بہت ہی اہم باتیں کرنے آئی ہوں۔ ہم کم و بیش ایک گھنٹا ایک ساتھ گزارنے والے ہیں۔ اس نشست گاہ کی طرف آجاؤ۔''

جاسم کسی سحرزدہ انسان کے مانند اُس کے پیچھے چل دیا۔

وہ سیدھی ایک کرسی کے نزدیک پہنچی پھر کرسی سنبھالنے سے پہلے اس نے دیوار گیر کھڑکی کو کھول دیا اور سامنے والے صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''بیٹھ جاؤ......!''

جاسم نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کردی پھر کن انکھیوں سے سوئے ہوئے جیون کی طرف دیکھنے لگا۔

''اس کی فکر نہ کرو۔'' اس نے جیسے جاسم کی سوچ پڑھ لی ہو۔ ''میں نے تمہارے ساتھی کو گہری نیند سلا دیا ہے۔ اب وہ طلوعِ آفتاب سے پہلے بیدار نہیں ہوگا۔ اس دوران میں چاہے طوفان آئے یا زلزلہ، اس کی آنکھ نہیں کھلے گی۔''

''اوہ......!'' جاسم نے اطمینان بھری گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ''کیا تھوڑی دیر پہلے بستر پر تم ہی میرے عقب میں اپنی بلوریں چوڑیاں کھنکا رہی تھیں؟''

جاسم اس پُراسرار حسینہ کی محیرالعقول انٹری کو ابھی تک ہضم نہیں کر پایا تھا تاہم وہ اس کی موجودگی سے خوف زدہ ہرگز نہیں تھا۔ اس امر کا وہ بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھی، اسے نقصان پہنچانے وہاں نہیں آئی تھی۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ اس کے خلاف کوئی مخاصمانہ کارروائی کرنے کے بجائے یوں ''میٹنگ'' کی دعوت نہ دیتی۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں جاسم کے ذہن سے گزرے۔ اگلے ہی لمحے اس کی جواب بردار آواز جاسم کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ہاں، وہ میں ہی تھی۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''پہلے میں نے تمہارے ساتھی کو گہری نیند میں پہنچایا۔ اس کے بعد اپنی موجودگی کے ہوش رُبا احساس کے ساتھ تمہیں اَپ سیٹ کردیا۔''

''کیوں......؟'' جاسم نے اُلجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ ''تم نے مجھے اَپ سیٹ کیوں کیا۔ اس میں تمہارا کیا فائدہ ہے؟''

''میں اپنے فائدے کے لیے یہاں نہیں آئی بلکہ میرے آقا نے مجھے تمہارے فائدے اور مدد کے لیے بھیجا ہے۔'' وہ جاسم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جس طرح ہر تخریب کے اندر تعمیر کا پہلو چھپا ہوتا ہے، بالکل ویسے ہی میں نے تمہیں ''سیٹ اَپ'' کرنے کے لیے ''اَپ سیٹ'' کیا ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ہوٹل سے باہر جانا ہوگا۔''

''وہ کیوں؟'' بے ساختہ جاسم کے منہ سے نکلا۔ ''اور ابھی تک تم نے میرے پہلے سوال کا جواب بھی نہیں دیا۔''

لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بار پھر جیون داس کے بیڈ کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تم دروازہ کھولے بغیر کمرے کے اندر کیسے آگئیں اور یہ بھی بتاؤ، تم ہو کون اور تمہارا نام کیا ہے اور...... اور تمہارا وہ آقا کون ہے...... اُسے میری بھلائی کی اتنی فکر کیوں ہے......؟''

''اتنے سارے سوالات ایک ساتھ...... خیر!'' وہ پلکیں جھپکائے بغیر بڑے رسان سے بولی۔ ''میرے آقا کا نام ہے ''اخناتن''۔ وہ ایک قدیم مصری شہنشاہ ہوا کرتا تھا۔ میں اخناتن کی بیوی ''نفرتیتی'' کی کنیز ہوں اور یہاں ویلی آف دی کنگز (ویلی آف دی کوئینز) میں نفرتیتی کے مقبرے میں رہتی ہوں۔ میرا آقا تمہاری مدد کیوں کرنا چاہتا ہے، یہ میں نہیں جانتی اور آقا سے سوال کرنے کا مجھے حق حاصل نہیں ہے۔ میں صرف حکم کی تعمیل کرتی ہوں۔ میرا نام ایشتار ہے اور میں ایک جن زادی ہوں۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے کھوج بھری نظر سے جاسم کو دیکھا اور ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''میرا خیال ہے، اب تو تمہاری یہ اُلجھن دور ہوگئی ہوگی کہ میں در و دیوار کے اندر سے کیسے گزر جاتی ہوں۔''

''اچھا مذاق ہے۔'' جاسم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''کیا تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتی ہو۔ تھوڑی بہت ہسٹری تو میں نے بھی پڑھ رکھی ہے۔ نفرتیتی تو اس مصری بادشاہ کی ملکہ تھی جس نے ایک عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ کے دور میں، ایک طاقتور فرعون کی حیثیت سے ظلم و زیادتی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ بالآخر وہ اپنی پوری سپاہ کے ساتھ اسی دریائے نیل میں غرق ہوا تھا۔''

''تمہاری تاریخی معلومات میں کئی ایک کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔'' ایشتار ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اعتماد سے بولی۔ ''موسیٰ یعنی موزز کے مدِمقابل جو فرد مصر کا حکمراں تھا، اس کا نام رعمسیس دوم تھا جسے ''رعمسیس دی

گریٹ'' بھی کہا جاتا ہے۔ موزز (حضرت موسیٰ) نے اسی فیرو (فرعون) کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا تھا۔ اس فیرو کی بیوی کا نام نفرتاری تھا۔ شاید تم ملتے جلتے ناموں کی وجہ سے کنفیوژ ہو رہے ہو۔''

''نفرتاری ہو یا نفرتیتی، مجھے قبل مسیح کے ان کرداروں سے کچھ لینا دینا نہیں۔'' جاسم نے بیزاری سے کہا۔'' مجھے بتاؤ، تم ایک گھنٹے کے لیے مجھے ہوٹل سے باہر کہاں لے جانا چاہتی ہو؟''

''دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر لکسر کا جدید شہر آباد ہے جبکہ دریا کے مغربی کنارے پر، ''تھیبین ہلز'' کے قدموں میں ''ہابو ٹیمپل'' ہے جو کہ ''ٹیمپل آف رعمسیس سوم'' بھی کہلاتا ہے۔ ہمیں اسی ٹیمپل کے اندر جانا ہے۔''

اِشتار کے منہ سے یہ سن کر کہ وہ ایک جن زادی ہے، جاسم کی ریڑھ کی ہڈی میں، ایک لمحے کے لیے سرد لہر سی دوڑ گئی تھی۔ تاہم اِشتار کے دوستانہ رویے کے باعث اس کے ذہن اور دل میں کسی قسم کا کوئی ڈر یا خوف نہیں جاگا تھا۔ وہ ایک دم ریلیکس ماحول میں اس سے بات چیت کر رہا تھا۔ اِشتار کا جواب مکمل ہوا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''اِشتار! تم ہابو ٹیمپل کے اندر میرے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟''

''میں تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانا چاہتی ہوں جس کی وجہ سے تم بہت زیادہ پریشان ہو رہے ہو۔'' اِشتار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' اس کے علاوہ کچھ اور ضروری باتیں بھی کرنا ہیں۔''

ان لمحات میں جاسم کا ذہن پوری ہشاشی بشاشی کے ساتھ ڈیوڈ کی اسپیچ کے اس حصے کو ری کال کر رہا تھا جب اس نے مشن کے دوران میں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ہدایات دی تھیں۔ ڈیوڈ کے الفاظ کچھ اس طرح تھے...... ''تم لوگوں کو ٹریک سے ہٹانے، گمراہ کرنے اور نت نئی مشکلات میں مبتلا کرنے کے لیے میں اپنے شاطر ایجنٹس کا استعمال بھی کروں گا۔ میرے ان ایجنٹس میں خوب صورت عورتیں اور ہرفن مولا تیز و طرار مرد شامل ہیں جو قاہرہ سے ویلی آف دی کنگز (وادی سلاطین) تک سائے کی طرح آپ لوگوں کے ساتھ چلیں گے اور تمہاری منزل کو کھوٹا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور یہی تم لوگوں کی سب سے بڑی آزمائش ہوگی۔ تمہیں منزل تک پہنچنے سے پہلے بھٹکنے سے بھی بچنا ہے کیونکہ مصر کے صحرا میں جو بھٹک جاتا ہے پھر اس کا نام و نشان نہیں ملتا...... بلاہ، بلاہ، بلاہ......''

''کہیں خود کو جن زادی کہنے والی یہ اِشتار بھی ڈیوڈ کی کوئی خوب رُو ایجنٹ تو نہیں جو مجھے مس گائیڈ کرنے کے لیے قدیم پُراسرار مصری ماحول کی کہانیوں کے ساتھ یہاں پہنچی ہے اور مجھے اُلّو بنانے کی فل ٹائم کوشش کر رہی ہے؟'' یہ سوال بجلی کے کوندے کے مانند جاسم کے ذہن میں لپکا۔ ایسا ہونا عین ممکن تھا۔ اس نے مبینہ جن زادی کی بات کی صداقت کو چیک کرنے کے لیے ایک اہم سوال کیا۔

''اِشتار! کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم مجھے، میری کون سی مصیبت سے نجات دلانے کی بات کر رہی ہو؟''

''وہی مصیبت جو تم اپنی گردن کے بائیں جانب چھپائے پھر رہے ہو۔'' وہ جاسم کی گردن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔'' اور تمہارا ایک بااختیار دشمن تمہاری پل پل کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔''

''اوہ......!'' جاسم ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

یہ بات تو ثابت ہو گئی تھی کہ اِشتار، ڈیوڈ کی ایجنٹ نہیں تھی۔ وہ تو ڈیوڈ کے ایک بدمعاشانہ راز کا پردہ فاش کر رہی تھی۔ اس دوران میں اِشتار یک ٹک، پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ جاسم کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کے جواب میں وہ نرمی سے بولی۔

''مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ لو کہ میں تمہاری دوست ہوں۔''

''تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں کسی قسم کے خوف میں مبتلا ہوں؟'' جاسم نے اپنی اندرونی بے چینی کو چہرے تک پہنچنے سے روکتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور...... تم میری دوست کیسے ہو سکتی ہو؟ تمہارا آقا تو اخناتن ہے اور تم اس کی بیوی نفرتیتی کی ادنیٰ سی خدمت گار ہو...... تم نے مجھے یہی بتایا ہے نا؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے منہ سے جن زادی کا ذکر سن کر تو تمہارے ہوش اُڑ جانا چاہیے تھے۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔'' لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مجھے تمہارے اندر وہ سراسیمگی نظر نہیں آئی جو ایسے موقع پر عود کر آنا چاہیے تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم مضبوط اعصاب کے مالک ایک بہادر انسان ہو۔ باقی جہاں تک تمہاری دوسری بات کا معاملہ ہے تو...... اسے تم ایک اسٹوری سمجھ لو۔''

''میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جن، انسان سے زیادہ طاقتور اور باتدبیر ہو ہی نہیں سکتا۔'' جاسم نے دوٹوک انداز

میں کہا۔ ''پھر اس سے کیوں ڈرا جائے؟''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتی ہوں۔'' وہ گہری نظر سے جاسم کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''بہ شرط یہ کہ...... وہ محض صورت شکل کا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں انسان ہو۔''

ایشتار نے بڑی گہری بات کردی تھی۔ جاسم نے اس پر تبصرہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور کُریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔

''اور...... وہ اسٹوری کا کیا قصہ ہے؟''

''میں نے تمہیں نفرتیتی، اخناتن، نفرتاری اور رعمسیس دوم کے حوالے سے جتنی بھی باتیں بتائی ہیں، ان کا موجودہ چویشن کی حقیقت سے اور مجھ سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

''تو پھر اس دروغ گوئی کا مقصد......؟''

''صرف تمہارا ذہن بنانا......'' وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولی۔ ''تاکہ تم مجھ جن زادی کے خوف سے تھرتھر کانپنے نہ لگ جاؤ، تمہاری روح فنا نہ ہو جائے اور...... میرا کام ادھورا نہ رہ جائے۔''

''کون سا کام؟'' جاسم نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانا۔'' اس نے ایک بار پھر جاسم کی گردن کی جانب اشارہ کیا۔ ''تاکہ تم اپنے دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے مشن کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ سکو۔''

''اس کا مطلب ہے، تم میرے مشن کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہو؟'' جاسم نے سوالیہ نظر سے ایشتار کی طرف دیکھا۔

''بہت کچھ تو نہیں، بس اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے راستے چاہے جدا ہوں لیکن ہمارا مقصد اور منزل ایک ہی ہے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ''تم مجھے اپنا ساتھی سمجھ سکتے ہو۔''

''مگر میری ساتھی تو ناجیہ ہے۔'' جاسم نے جلدی سے کہا۔

''ناجیہ تمہاری مستقبل کی شریکِ حیات ہے۔'' ایشتار نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''میں ایک جن زادی ہوں اور تم ایک انسان ہو۔ ناری اور خاکی مخلوق کے مابین ازدواجی تعلقات ممکن نہیں ہیں لہٰذا میں تمہاری شریکِ حیات نہیں، محض شریکِ سفر ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہاری روکھی سوکھی دوستی سے بھی

گزارہ کرلوں گا۔'' جاسم ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے چھیڑنے والے انداز میں بولا۔''اب جلدی سے یہ بھی بتادو کہ ہم دونوں جس راہ کے مسافر ہیں، اس کی منزل کیا ہے؟''

ایشتار نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔''نی یوم۔''

جاسم گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جیکلین نے اپنے دو صفحی خط میں جس دجالی شہر کا خصوصی ذکر کیا تھا، ایشتار بھی اسی کا نام لے رہی تھی۔ ڈیوڈ اسی میگا سٹی کی سیکیورٹی اینڈ سیفٹی کے لیے دنیا بھر میں ری ایلیٹی ٹی وی کرارہا تھا تا کہ ایک ناقابلِ تسخیر آرمی تیار کی جاسکے جو مستقبل قریب میں سعودی عرب کے شمال مغرب میں، تبوک نامی علاقے میں آباد و تعمیر ہونے والے نی یوم نامی اس شہر کے حفاظتی انتظامات کو سنبھال سکے۔

''تمہارا نی یوم سے کیا تعلق؟'' جاسم نے دلچسپی بھرے انداز میں استفسار کیا۔''اس شہر کو دنیا کے نقشے پر نمودار ہونے میں ابھی کئی سال لگیں گے۔''

''میں اس ابلیسی شہر کے خلاف ہوں اور اسی سلسلے میں ایک خاص الخاص مشن پر ہوں۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولی۔''اور یقیناً تم بھی......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ٹٹولنے والی نظر سے جاسم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر عجیب سے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہم جن و انس مل کر شیطان کے خلاف کام کریں گے تو بڑا مزہ آئے گا...... ہیں نا؟''

جاسم کو یہ ساری باتیں خواب و خیال جیسی محسوس ہورہی تھیں۔ اس نے ایشتار کے عزائم پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''تو شروع کرتے ہیں۔'' ایشتار نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''سب سے پہلے میں تمہاری آنکھوں میں ڈراپس ڈالوں گی۔ اس کے بعد ہم ہابوتیمپل چلیں گے۔''

''میری آنکھیں تو بالکل ٹھیک ہیں پھر ڈراپس کس لیے......؟'' جاسم نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔''اور تم نے تو کہا تھا کہ قبل مسیح کے فیروز کی کہانیوں کا موجودہ حالات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے، پھر ہابوتیمپل میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ہابوتیمپل کی مسٹری میں تمہیں وہاں پہنچ کر ہی بتاؤں گی۔'' وہ رسان بھرے لہجے میں بولی۔''باقی جہاں تک تمہاری آنکھوں اور میرے آئی ڈراپس کا معاملہ ہے تو وہ صرف تمہاری آنکھوں کی طاقت کو بڑھانے کے لیے ہے۔''

وہ اٹھ کر دیوار گیر کھڑکی کے نزدیک گئی اور جاسم سے کہا۔''ذرا اِدھر آؤ اور مجھے بتاؤ کہ تھیبن ہلز پر تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟''

جاسم صوفے سے اٹھا اور ایشتار کے کہنے کے مطابق اس نے کھلی کھڑکی کے باہر تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا پھر روئے سخن ایشتار کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔

''چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ میں تھیبن ہلز کے اوپر دیکھنے کے قابل نہیں ہوں۔''

''میں تمہاری اسی قابلیت کو بڑھانے کی بات تو کررہی ہوں۔'' ایشتار نے معنی خیز انداز میں کہا۔''میرے آئی ڈراپس کی بدولت تم اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو جاؤ گے۔''

''ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے۔'' وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''یہ آئی ڈراپس ہیں یا اینٹی ڈارک آئی لینس......؟''

''یہ تو آزمائش کے بعد ہی پتا چلے گا۔'' ایشتار نے سپاٹ آواز میں کہا۔''کیا تم اس سنسنی خیز تجربے سے گزرنے کے لیے تیار ہو؟''

ایک لمحہ سوچے بغیر جاسم نے ہامی بھرلی۔

☆☆☆

رات کا ایک بجا تھا۔ بیس تاریخ، بروز بدھ کا آغاز ہو چکا تھا۔''رمسیس ٹرین اسٹیشن'' کائرو سے اپنے سفر کا آغاز کرنے والی ڈیلکس اوورنائٹ سلیپر ٹرین اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ وہ کائرو اسٹیشن سے ٹھیک سات بج کر پینتالیس منٹ پر روانہ ہوئی تھی۔ اس ٹرین کی منزل مصر کا ایک جنوبی شہر''اسوان'' تھی جہاں صبح ٹھیک سات بج کر پینتالیس منٹ پر اس نے اپنے سفر کا اختتام کرنا تھا۔ کائرو سے اسوان تک اس ٹرین کا پورے بارہ گھنٹے کا سفر تھا۔

''یونٹ بی'' اسی اوورنائٹ سلیپر ٹرین پر سوار تھا۔ تاہم انہیں اسوان سے پہلے لکسر کے اسٹیشن پر اترنا تھا۔ ان کا سفر ساڑھے دس گھنٹے کا تھا جس میں سے وہ لوگ لگ بھگ آدھا سفر طے کر چکے تھے۔ کل صبح چھ بج کر پندرہ منٹ پر اس سلیپر ٹرین نے لکسر کے اسٹیشن میں داخل ہوجانا تھا۔

اس خطرناک مہم پر روانہ کرنے سے پہلے شاطر دماغ ڈیوڈ نے چھ براعظموں کے بارہ جوانوں کو تین یونٹس''اے، بی، سی'' میں بانٹ دیا تھا۔ ہر یونٹ میں دو براعظموں کے چار جوان شامل تھے۔ یونٹ بی دراصل براعظم افریقا اور براعظم جنوبی امریکا کا ملاپ تھا جس کے چار ارکان کا تعلق

علی الترتیب جیرڈ فرام ڈربن یعنی ساؤتھ افریقا اور جرمیاح فرام مورا گو سے تھا۔ اسی طرح جیسن فرام بارنکیلا یعنی کولمبیا اور جسٹیو برازیل سے تعلق رکھتے تھے۔ یونٹ بی کا گروپ لیڈر جیرڈ تھا۔

یونٹ بی نے کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے اس سلیپر ٹرین میں کیبن والی برتھ سیٹ کے بجائے اپنے لیے سنگل سیٹس والا کمپارٹمنٹ لیا تھا۔ اس کمپارٹمنٹ (بوگی) میں سنگل سیٹس بالکل ہوائی جہاز کے مانند فٹ کی گئی تھیں لیکن تعداد قدرے مختلف تھی۔ لمبائی کے رخ ان سنگل سیٹس کی تین قطاریں تھیں۔ دو قطاریں ایک طرف اور ایک قطار دوسری جانب۔ بیچ میں گزرگاہ تھی۔ ان لوگوں کا کم و بیش سوا پانچ گھنٹے کا سفر باقی تھا لہٰذا سب نے ایک مناسب سی نیند لینے کا فیصلہ کیا تھا اور آنکھیں بند کر کے اپنی سیٹس پر ایزی ہو گئے تھے۔

جیرڈ ابھی سونے اور جاگنے کی درمیانی حالت میں تھا کہ اسے اپنے کندھے پر نسوانی ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ بے ساختہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے اسے ایک ادھیڑ عمر مگر دلکش و دل پذیر عورت کھڑی نظر آئی۔ وہ یکایک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''آئی ایم ویری سوری......!'' اس عورت نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میں نے خواہ مخواہ آپ کو ڈسٹرب کر دیا مگر مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

اس کمپارٹمنٹ میں محوِ سفر تمام مسافر بہ شمول جیرڈ کے ساتھیوں کے، اپنی نیند پوری کرنے میں مصروف تھے۔ جیرڈ نے نارمل انداز میں کہا۔

''اِٹس اوکے...... بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''میرا نام سلمٰی ہے۔'' اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے دھیمی آواز میں بتایا۔ ''میں اپنے شوہر رجب کے ساتھ دوسرے کمپارٹمنٹ کے ایک کیبن میں سفر کر رہی ہوں۔ رجب مجھ سے پینٹری (ڈائننگ کار) میں جانے کا کہہ کر کیبن سے نکلے تھے۔ جب وہ آدھے گھنٹے تک واپس نہیں آئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں انہیں دیکھنے پینٹری میں گئی تو میں نے دیکھا، وہ وہاں ایک کرسی پر بیٹھے، ٹیبل پر سر لگائے سو رہے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ رجب کو ہمارے کیبن تک پہنچانے میں میری مدد کریں...... پلیز!''

سلمٰی نے اپنے بیان کا آخری لفظ ایسی لجاجت سے ادا کیا تھا کہ جیرڈ اس کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔ سلمٰی کے مطابق، مذکورہ پینٹری دو کمپارٹمنٹ آگے تھی۔ وہ جہاں جہاں سے بھی گزرے، جیرڈ نے سلیپر ٹرین کے زیادہ تر مسافروں کو سوتے ہوئے پایا۔ جلد ہی وہ پینٹری کے اندر داخل ہو گئے۔

یہ دیکھ کر جیرڈ کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پینٹری میں کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا۔ اس نے اُلجھن زدہ لہجے میں سلمٰی سے استفسار کیا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے...... نہ ڈائننگ کار کا اسٹاف اور نہ ہی کوئی مسافر۔ آپ کا شوہر رجب کہاں ہے؟''

وہ دونوں پینٹری میں آگے پیچھے کھڑے تھے یعنی سلمٰی، جیرڈ کے عقب میں تھی۔ چنانچہ اسے اپنے کام میں دقت نہیں ہوئی۔ جیسے ہی جیرڈ کا سوال مکمل ہوا، اسے اپنی گردن کے عقبی حصے میں کسی سوئی کے چبھنے کا احساس ہوا۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ متاثر مقام پر جا پہنچا لیکن قبل اس کے کہ وہ سمجھ پاتا، اس کے ساتھ ہوا کیا ہے...... اسے بہت زور کا چکر آیا اور اگلے ہی لمحے وہ کٹے ہوئے شہتیر کے مانند پینٹری کے فرش پر دھڑام سے گرا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

سلمٰی نے جیرڈ کو بے ہوشی کی حالت میں کھینچ کر پینٹری کی لمبی ٹیبل کے نیچے پہنچا دیا اور اپنے دوسرے شکار سے ''درخواست'' کرنے واپس اسی کمپارٹمنٹ میں آ گئی جہاں سے اس نے جیرڈ کو ٹریپ کیا تھا۔ اب کی بار اس نے جرمیاح کا انتخاب کیا۔

جرمیاح نے اپنے شانے پر ''تھپتھپاہٹ'' محسوس کی تو کچی نیند کو توڑ کر سرخ آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑی ایک پختہ عمر پُرکشش عورت کو دیکھا۔ قبل اس کے کہ وہ اس عورت سے کوئی سوال کرتا، وہ دھیمی آواز میں بول اٹھی۔

''میرا نام سلمٰی ہے۔ میں ابھی پینٹری کی طرف سے آ رہی ہوں۔ وہاں میں نے ایک آدمی کو بے ہوش پڑے دیکھا ہے۔'' پھر اس نے جیرڈ والی خالی سیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''میں نے دو گھنٹے پہلے اسی بندے کو اس سیٹ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ کہیں وہ آپ کا ساتھی تو نہیں؟''

سلمٰی کی فراہم کردہ معلومات میں حد درجہ سنگینی پائی جاتی تھی۔ جرمیاح نے جیسن اور جسٹیو کو جھنجوڑ کر جگایا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ دونوں بھی اپنے گروپ

لیڈر کے غیاب اور پُراسرار بے ہوشی کے بارے میں سن کر سخت پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد وہ تینوں آناً فاناً، دو کمپارٹمنٹ آگے پینٹری کی جانب بڑھ گئے۔

سلمٰی پینٹری کے دروازے تک اُن کے ساتھ آئی تھی۔ پھر انگلی کے اشارے سے جیرڈ کی نشاندہی کرنے کے بعد اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم لوگ اپنے ساتھی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ میں اس ٹرین کے اسٹاف میں سے کسی کو یہاں بلا کر لاتی ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ پینٹری سے اس طرح غائب ہو گئی جیسے بقول شخصے... گدھے کے سر سے سینگ!

جرمیاح، جیسن اور جسٹیو، سلمٰی کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بے ہوش جیرڈ کی جانب لپک گئے تھے۔ انہوں نے نہایت مہارت کے ساتھ اپنے گروپ لیڈر کو پینٹری کی تنگ اور لمبی چوبی میز کے نیچے سے نکال کر میز کے اوپر لٹایا پھر اسے ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگے۔

سلمٰی واپس اسی کمپارٹمنٹ میں پہنچی جس میں یونٹ بی سفر کر رہا تھا تو وہاں کے مسافروں میں سے اِکا دُکا جاگ چکے تھے اور اس ایمرجنسی کے حوالے سے خاصے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے ایک نے سلمٰی کے ساتھ جرمیاح، جیسن اور جسٹیو کو جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے سلمٰی سے پوچھا۔

''ان لوگوں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تم انہیں کہاں لے گئی ہو؟''

''ان کے ایک ساتھی کو ہارٹ اٹیک آیا ہے۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''باقی تینوں اسے دیکھنے پینٹری کی طرف گئے ہیں۔ وہاں پر ایک ڈاکٹر بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر نے ان چاروں کے بیگ منگوائے ہیں۔ تم لوگ ریلیکس ہو جاؤ۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' پھر اس نے جیرڈ، جرمیاح، جیسن اور جسٹیو کے سفری بیگز کو اپنے قبضے میں کیا اور یہ کہتے ہوئے کمپارٹمنٹ سے نکل گئی۔ ''ان میں سے کسی کے بیگ میں ہنگامی صورتِ حال میں استعمال کی جانے والی ادویات ہیں مگر یہ معلوم نہیں کس بیگ میں، لہٰذا میں چاروں بیگ پینٹری میں پہنچا رہی ہوں۔''

سلمٰی نے اب کی بار پینٹری کا رخ نہیں کیا بلکہ ایک کمپارٹمنٹ پہلے ہی اس نے ان چاروں کے ٹریولنگ بیگز کو، تمام تر ساز و سامان کے ساتھ ٹرین سے باہر کے ماحول پر چھائی ہوئی پُرسکون اور گہری تاریکی کی گود میں اچھال دیا اور اطمینان سے چلتے ہوئے اپنے کیبن میں آ گئی... وہ کیبن جو ''جائے وقوعہ'' سے چار کمپارٹمنٹس کی مسافت پر تھا۔

کمپارٹمنٹ کے اندر پہنچنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنے گیٹ اَپ کو تبدیل کیا، بہ الفاظ دیگر وہ تبدیل شدہ گیٹ اَپ سے واپس اپنے اصلی حلیے میں آ گئی۔ اب وہ چالیس سالہ کوئی ادھیڑ عمر گڈ لکنگ آنٹی نہیں بلکہ ایک پچیس سالہ عام سی شکل وصورت کی مالک نوبیاہتا نادیہ نامی عورت تھی جو اپنے شوہر شمس کے ہمراہ اس اوورنائٹ سلیپر ٹرین میں کائرو سے اسوان جا رہی تھی۔

نادیہ اور شمس ان دونوں کے اصلی نام تھے اور واقعتاً وہ ایک نوبیاہتا جوڑا نہیں تھے۔ وہ ڈیوڈ کے سیٹ اَپ کے لوگ تھے اور انہوں نے ہدایات کے عین مطابق اپنے حصے کا کام کر دیا تھا۔

جیرڈ کو ہوش میں لانے کے لیے چند منٹ لگے۔ جب وہ بولنے کے قابل ہوا تو اس کی کہانی سن کر باقی تینوں کے ہوش اُڑ گئے۔ پھر جب انہیں پتا چلا کہ کمپارٹمنٹ میں سے ان چاروں کے سفری بیگز کوئی عورت یہ کہہ کر لے گئی ہے کہ ٹرین کی پینٹری میں ان کے ایک ساتھی کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے تو... حقیقت ان چاروں کی سمجھ میں ٹھیک ٹھیک بیٹھ گئی۔ ڈیوڈ کی عیار ایجنٹ سلمٰی نے سر ٹرین انہیں چونا اور کتھا ایک ساتھ لگا دیا تھا۔

اس کے بعد سلمٰی کی تلاش شروع ہوئی۔ ڈیوڈ کا ذکر کیے بغیر سب سے پہلے جیرڈ نے سلیپر ٹرین کے عملے کے چیف آفیسر مسٹر صادق العمر سے مل کر انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس آفیسر نے پوری توجہ سے جیرڈ کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ جو کچھ بتا رہے ہیں وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ بہرحال، آپ اطمینان رکھیں۔ میں تفتیش کرتا ہوں۔''

''اس میں سمجھ میں نہ آنے والا کیا ہے؟'' جیرڈ نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم چاروں کے سفری بیگز چرانے کی غرض سے اس سلمٰی نامی عورت نے یہ سارا ڈراما رچایا ہے۔ ہمارے علاوہ کمپارٹمنٹ کے چند ایک دیگر مسافروں نے بھی اس فراڈن سلمٰی کو دیکھا ہے۔ وہ ہمارے بیگز کے ساتھ اس تیز رفتار ٹرین سے چھلانگ نہیں لگا سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سلمٰی ٹرین میں موجود ہے۔ آپ اس مکار عورت کو جلدی سے تلاش کر کے ہمارے بیگز ہمیں واپس

دلائیں۔ اس سلیپر ٹرین میں سفر کرنے والے تمام پسنجرز اور ان کے سامان کی حفاظت کرنا آپ کی ذمّے داری ہے آنیسر......!''

صادق العمر نے بڑے تحمل سے جیرڈ کی بات سنی اور مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا نا، میں تفتیش کرنے جا رہا ہوں۔''

''وہ کیسی تفتیش......؟'' جیسن نے سوال کیا۔

''میں سب سے پہلے ٹرین پر سفر کرنے والے تمام مسافروں کا چارٹ چیک کروں گا جس سے یہ پتا چل جائے گا کہ سلمیٰ اور اس کا شوہر رجب اس وقت ٹرین کے کس کمپارٹمنٹ میں مل سکتے ہیں۔'' صادق العمر نے انہیں اپنے تفتیشی طریقہ کار سے آگاہ کرتے ہوئے رسان بھرے انداز میں کہا۔ ''اس کے بعد میں پینٹری کے سپروائزر حبیب علی اور اس کے دو معاونین عارف و احسان سے پوچھ تاچھ کروں گا کہ رات کے ایک بجے پینٹری کس خوشی میں کھلی ہوئی تھی اور اگر کسی وجہ سے کھلی بھی تھی تو وہ تینوں کہاں تھے؟ ان کی عدم موجودگی میں اتنا بڑا واقعہ کیسے رونما ہو گیا...... آپ کی اطلاع کے لیے بتادوں کہ رات گیارہ بجے کے بعد پینٹری کی سروس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اس ٹرین کا رول ہے۔ گیارہ بجے پینٹری کو لاک کر دیا جاتا ہے اور اس کا تین رکنی اسٹاف ریسٹ پر چلا جاتا ہے۔ اگلی صبح یہ لوگ چھ بجے دوبارہ اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ باقی جہاں تک اس عورت سلمیٰ کے ٹرین سے اتر جانے کا معاملہ ہے تو یہ ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ٹرین اس وقت ستّر کلو میٹرز فی گھنٹا سے اوپر کی رفتار سے رواں دواں ہے۔ تیس منٹ کے بعد اس کا اگلا اسٹیشن آئے گا جس کا نام ''اسیوط'' ہے۔ میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسیوط پہنچنے سے پہلے میں اس کیس کو حل کر لوں گا۔''

صادق العمر کی بات سے سنجیدگی اور معقولیت جھلکتی تھی لہٰذا یونٹ بی کے چاروں ارکان اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس ریلوے آفیسر کی تفتیش کے نتائج کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے۔

جیرڈ کی گردن کے عقبی حصے میں، اس مقام پر ابھی تک سوئی کی چبھن کا احساس ہو رہا تھا جہاں پر سلمیٰ نامی اس شاطر عورت نے جیرڈ کو ناک آؤٹ کرنے کے لیے کوئی زود اثر نشلی دوا انجیکٹ کی تھی۔ سلمیٰ نے جیرڈ کی بے خبری اور اپنی پھرتی کے طفیل جیرڈ کو پلک جھپکتے میں دنیا و مافیہا سے لاتعلق کر دیا تھا۔ اگرچہ ریلوے آفیسر صادق العمر نے انہیں تسلی دی تھی کہ وہ ٹرین کے اسیوط پہنچنے سے پہلے فراڈن سلمیٰ کو ڈھونڈ کر ان کے سامنے لا کھڑا کرے گا مگر جیرڈ کا ذہن کسی اور ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ اسے شک نہیں بلکہ یقین سا ہو چلا تھا کہ سلمیٰ والی اس ''واردات'' کے پیچھے ڈیوڈ چھپا ہوا ہے۔ ڈیوڈ نے اپنے خطاب میں بڑے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ اس مشن میں حصہ لینے والے بارہ جوانوں کو بھٹکانے اور ان کی منزل کھوٹی کرنے کی غرض سے وہ اپنے ہوشیار ایجنٹس کا استعمال کرے گا اور جیرڈ کی سوچ کے مطابق، یہ سلمیٰ، ڈیوڈ ہی کی بھیجی ہوئی ایک شاطر ایجنٹ تھی جس نے انہیں ان کے سفری بیگز سے یکسر محروم کر دیا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت اس نے اپنے یونٹ کے لوگوں سے پوچھا۔

''تمہارے سیل فونز کہاں ہیں؟''

سب نے بہ یک زبان جواب دیا۔ ''جیب میں......!''

''اوکے!'' جیرڈ نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''اور رقم؟''

جیسن، جسٹیو اور جرمیاح نے باری باری جو جواب دیا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ڈیوڈ کی دی ہوئی رقم پانچ ہزار مصری پاؤنڈز کا بیشتر حصہ بیگز کے اندر رکھا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے پاکٹ منی کے طور پر تھوڑے تھوڑے پیسے اپنی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔ اس صورتِ حال نے جیرڈ کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھتے ہوئے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے ضروری ڈاکومنٹس کے ساتھ ہی زادِ راہ بھی گیا۔ یہ خاصی پریشان کن صورتِ حال ہے۔''

ان لوگوں کو ڈیوڈ کی جانب سے جو سفری بیگ دیے گئے تھے، ان کے اندر پانچ ہزار مصری پاؤنڈز کے چھوٹے بڑے نوٹوں کے علاوہ ان کے فرضی ناموں سے بنے ہوئے پاسپورٹ، آئی ڈی کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس، مصر کا روڈ میپ، ویلی آف دی کنگز کا اسٹریٹ میپ، نارتھ کمپاس (قطب نما)، ڈیجیٹل رسٹ واچ اور پہننے کے کپڑے وغیرہ تھے۔ جیرڈ کا سیل فون بھی اس کی جیب میں تھا اور ایک معقول رقم بھی اس نے بیگ سے نکال کر اپنے لباس کی مختلف جیبوں میں رکھ لی تھی۔

''زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں باس۔'' جیسن نے جیرڈ کی تشویش کے جواب میں کہا۔ ''مجھے امید ہے، اسیوط پہنچنے سے پہلے یہ ریلوے آفیسر اپنا وعدہ پورا کر کے دکھا دے گا۔ وہ کمینی سلمٰی جہاں بھی چھپی بیٹھی ہے، اسے ڈھونڈ لیا جائے گا۔ پھر اس کی کسٹڈی سے ہمارا سامان بازیاب کرانا مشکل نہیں ہوگا۔''

وہ لوگ بڑے دھیمے انداز میں گفتگو کر رہے تھے تاکہ اس کمپارٹمنٹ میں موجود دیگر مسافر ڈسٹرب نہ ہوں۔ ویسے اس عجیب و غریب اور غیر متوقع واقعے نے مذکورہ کمپارٹمنٹ میں ان مسافروں میں بے چینی پھیلا دی تھی جو دوسروں کی طرح گہری نیند میں تھے۔ تاہم ان میں سے کسی نے یونٹ بی والوں سے کوئی سوال نہیں کیا تھا جبکہ یہ چاروں ''سر جوڑے'' بیٹھے تھے۔ اس ہنگامی صورتِ حال میں سب نے اپنی رائے دی۔ آخر میں جیرڈ نے کہا۔

''تم لوگ ایک اہم نکتے کو بھولے بیٹھے ہو۔''

جسٹیو نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''کون سا نکتہ باس؟''

جیرڈ کو اپنا گروپ لیڈر چننے کے بعد وہ اسے ''باس'' کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ قبل اس کے کہ جیرڈ، جسٹیو کے سوال کا جواب دیتا، جرمیاح بول اٹھا۔

''باس! کہیں تم ڈیوڈ کی تقریر کی بات تو نہیں کر رہے؟''

''ایگزیکٹلی......!'' جیرڈ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''ڈیوڈ نے تو ہمیں واضح الفاظ میں خبردار کر دیا تھا کہ ہمیں چوبیس گھنٹے اپنی آنکھوں اور کانوں کو کھلا رکھنا ہے۔ وہ ہمیں گمراہ کرنے اور منزل سے دور کرنے کے لیے مختلف حربے آزمائے گا۔ اس کے احکامات کی تعمیل کرنے والے افراد میں خوب صورت عورتیں بھی شامل ہیں۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے سلمٰی پر بھروسا کر کے ٹرین کی پینٹری کی طرف نہیں جانا چاہیے تھا۔ وہ مکار عورت یقیناً ڈیوڈ ہی کی بھیجی ہوئی تھی۔ میری غفلت کے باعث ہم سب اپنے قیمتی سامان سے محروم ہو گئے ہیں۔''

''ایسا تو ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا بلکہ ہو بھی چکا ہے۔'' جیسن نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''سلمٰی نے پہلے مرحلے پر تمہیں اپنے شوہر رجب کی فرضی کہانی سنا کر پینٹری میں جانے کے لیے مجبور کر دیا تھا اور دوسرے مرحلے میں ہم تینوں کو تمہاری حقیقی کہانی سنا کر اپنے ساتھ پینٹری میں لے گئی تھی اور جب ہم چاروں پینٹری میں موجود تھے تو تیسرے مرحلے پر اس بدبخت نے دیگر مسافروں کو تمہارے ہارٹ اٹیک کی کہانی سنا کر ہمارے بیگز پر ہاتھ صاف کر لیا۔ گویا، ہم چاروں نے غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔ لہٰذا ہم سب ایک جیسے قصوروار ہیں باس...... تم صرف خود ہی کو الزام نہ دو۔''

''بہرحال......'' جیرڈ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جو بھی ہے، میری طرف سے تم لوگوں کے لیے اوپن آفر ہے۔ تم چاہو تو کسی اور کو اپنا گروپ لیڈر چن سکتے ہو۔''

''یہ نہیں ہو سکتا باس۔'' جرمیاح نے حتمی انداز میں کہا۔ ''اس ری ایلیٹی ٹی وی کی پہلی تین روزہ مہم میں چاہے کچھ بھی ہو جائے، ہر حال میں تم ہی ہمارے گروپ لیڈر رہو گے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

جسٹیو اور جیسن نے جرمیاح کے فیصلے پر صاد کیا۔

ان کے درمیان یہ گمبھیر بات چیت جاری ہی تھی کہ ریلوے آفیسر صادق العمر اپنی تفتیش مکمل کر کے واپس لوٹ آیا۔ مذکورہ آفیسر کے چہرے پر حوصلہ افزا تاثرات کا فقدان تھا۔ وہ جیرڈ کو اپنے ساتھ اس کمپارٹمنٹ سے باہر ایک محفوظ مقام پر لے گیا اور جب اس نے زبان کھولی تو جیرڈ کے تمام تر خدشات کی تصدیق ہوگئی۔

''اس ٹرین میں سلمٰی نام کی کوئی عورت اور رجب نام کا کوئی مرد سفر نہیں کر رہا۔'' صادق العمر نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''پینٹری کے سپروائزر حسیب علی نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے ٹرین کے قانون کے مطابق ٹھیک گیارہ بجے رات پینٹری کو لاک کر دیا تھا اور اپنے ہیلپرز احسان و عارف کے ہمراہ وہ گارڈز روم میں چلا گیا تھا تاکہ وہ تینوں ہلکی پھلکی نیند لے لیں کیونکہ صبح چھ بجے انہیں پینٹری کی سروس آن کرنا تھی جس کے لیے ان کا پانچ بجے تک بیدار ہو جانا لازمی تھا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ان حالات میں آپ لوگوں کے ساتھ جو حیرت انگیز واقعہ پیش آیا ہے، وہ سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''مسٹر صادق!'' جیرڈ نے ریلوے آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ''تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہم غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ اس چور اور چکر باز عورت سلمٰی کو ہمارے علاوہ اس کمپارٹمنٹ کے کئی ایک دوسرے مسافروں نے بھی دیکھا ہے جب وہ میرے ہارٹ اٹیک کا

بہانہ بنا کر میڈیسنز کی آڑ میں ہم چاروں کے سفری بیگز اٹھا لے گئی تھی۔"

"میں آپ کی نیت پر شک کر رہا ہوں اور نہ ہی آپ کی بات کو جھٹلا رہا ہوں مسٹر جیرڈ۔" ریلوے آفیسر صادق العمر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں تو آپ کے سامنے ایک ٹھوس حقیقت رکھ رہا ہوں۔ بہرحال، آپ لوگوں کی مدد کرنے کا میرے پاس اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔"

"ہمیں صبر کی تلقین کرنا۔" جیرڈ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"ایسی بات نہیں ہے مسٹر جیرڈ۔" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "ہم اس وقت اسیوط کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، پندرہ سولہ منٹ میں ٹرین اسیوط کے اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو کر پلیٹ فارم پر لگ جائے گی۔ یہ پندرہ سے سولہ منٹ بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس دوران میں آپ لوگوں کے اطمینان اور تسلی کے لیے میں ایک کام کر سکتا ہوں۔"

"کون سا کام؟" جیرڈ نے اُلجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"شناخت پریڈ......" صادق العمر نے جواب دیا۔

"شناخت پریڈ......" جیرڈ نے بے ساختہ ریلوے آفیسر کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھا نہیں......؟"

"آپ نے اپنا نام سلمٰی بتانے والی اس عورت کو بہت قریب سے دیکھا ہے مسٹر جیرڈ لہٰذا اسے دوبارہ دیکھنے پر فوراً پہچان سکتے ہیں۔" صادق العمر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں سب سے پہلے آپ کو اس ٹرین میں سفر کرنے والے مسافروں کا چارٹ اپنے سسٹم کے اسکرین پر دکھاتا ہوں۔ اس کے بعد......"

"اس چارٹ کو دیکھنے میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہوگا۔" جیرڈ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "آپ نے وہ چارٹ دیکھ لیا۔ مجھے آپ کی بات پر بھروسا ہے۔ عین ممکن ہے، اس چال باز عورت نے مجھے اپنا اور اپنے شوہر کا نام غلط بتایا ہو۔ آپ شناخت پریڈ کی کیا بات کر رہے تھے؟"

"میں اسی طرف آرہا تھا مگر آپ نے مجھے ٹوک دیا۔" ریلوے آفیسر بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

"آئی ایم ویری سوری آفیسر۔" جیرڈ نے جلدی سے کہا۔

"اِٹس او کے۔" صادق العمر نے کہا۔ "آپ آئیں میرے ساتھ۔"

جیرڈ اس کے ساتھ ہولیا۔

آئندہ بارہ، تیرہ منٹ میں، ایک کمپارٹمنٹ سے دوسرے کمپارٹمنٹ کے بیچوں بیچ پیدل مارچ کرتے ہوئے صادق العمر نے جیرڈ کو ایک ایک مسافر کا چہرہ دکھایا، خصوصاً کیبنز میں سفر کرنے والے مسافروں کو رات کے اس پہر بے آرام کرتے ہوئے خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تاہم صادق العمر نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اس ناخوشگوار کام کو نمٹا ڈالا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ نادیہ اور شمس بھی اس شناخت پریڈ سے گزرے مگر حیرت انگیز طور پر جیرڈ نادیہ کو سلمٰی کی حیثیت سے پہچان نہیں پایا تھا...... باقی لیڈیز پسنجرز کی شناخت کا کیا ذکر کرنا۔

صادق العمر کی اس مخلصانہ کوشش کا نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا تو اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"آئی ایم سوری مسٹر جیرڈ...... میرے اختیار میں جو تھا، وہ میں نے کر دیا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں آپ لوگوں کے بیگز کو برآمد کر سکا اور نہ ہی انہیں چُرانے والی سلمٰی کو پکڑ سکا۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سلمٰی نامی جو عورت، اپنے شوہر رجب کی نیند کا بہانہ کر کے آپ کو پینٹری میں لے گئی تھی، وہ اس ٹرین میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو کسی بھی فورم پر میرے خلاف شکایت درج کرا سکتے ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر صادق!" جیرڈ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جو ہوا، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں، پھر آپ کے خلاف کمپلین کیسی...... آپ بالکل ٹینشن نہ لیں۔"

"تھینک یو مسٹر جیرڈ!" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ "آپ نے میرے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے منزل تک پہنچنے سے پہلے جتنا بھی وقت ہے، میں اس چیٹر سلمٰی کی تلاش جاری رکھوں گا۔ ابھی ہم نے مل کر شناخت پریڈ جیسا جو فوری آپریشن کیا ہے اس کا ایک خاص سبب تھا۔"

صادق العمر یہاں تک پہنچ کر رکا تو جیرڈ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "کون سا سبب آفیسر؟"

"ٹرین اسیوط پہنچنے ہی والی ہے۔" ریلوے آفیسر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے خدشہ تھا کہ سلمٰی

چپ چاپ اسیوط کے ریلوے اسٹیشن پر اتر کر ہماری دسترس سے باہر نہ چلی جائے لیکن افسوس کہ جو عورت آپ کی مجرم ہے وہ تو اس ٹرین کے کسی بھی حصے میں موجود نہیں۔ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے ٹرین کا ایک ایک کیبن اور سارے کمپارٹمنٹس چیک کرلیے ہیں...... ہیں نا؟''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' جیرڈ اس کے چہرے پر نگاہ جما کر بولا۔ ''لیکن آپ کی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کون سی بات؟'' صادق العمر نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''ہم دونوں نے مل کر ابھی جو سرچ آپریشن کیا ہے وہ سراسر ناکام رہا ہے۔'' جیرڈ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں سلمٰی کہیں نظر آئی اور نہ ہی ہمارے سفری بیگز ملے۔ تو پھر آپ......'' اس نے معنی خیز انداز میں توقف کیا پھر ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔

''تو پھر آپ اس ٹرین میں اسیوط سے قنا اور قنا سے لکسر تک کون سی چیز سلمٰی اور کون سے ہمارے بیگز کی تلاش جاری رکھنے کا وعدہ کررہے ہیں؟''

''آپ کی بات منطقی اعتبار سے تو درست ہے مسٹر جیرڈ۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن گراؤنڈری ایلیمنٹ بھی کوئی چیز ہے جسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' جیرڈ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''گراؤنڈ، گراؤنڈ کی بات ہوتی ہے مسٹر جیرڈ۔'' وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''مصر کی سرزمین (گراؤنڈ) بہت ہی پُراسرار اور محیّر العقول ہے اور یہ کوئی آج کی بات نہیں، میں آپ کو اپنی بات سمجھا بھی پا رہا ہوں یا نہیں۔''

''میں سمجھ گیا آفیسر......'' جیرڈ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ یقیناً یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اس اسرار و رموز کی دھرتی مصر پر کسی وقت کچھ بھی عجیب ہوسکتا ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں مسٹر جیرڈ۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ کے ساتھ پینٹری والا جو واقعہ پیش آیا ہے، وہ بالکل ماورائی لگتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کسی غیر مرئی مخلوق نے یا کسی نادیدہ طاقت نے سلمٰی نامی ایک عورت کے ذریعے آپ لوگوں کے سفری بیگز غائب کروائے ہیں اور پھر اس سلمٰی کو بھی انسانی آنکھ سے اوجھل کر دیا ہے اسی لیے وہ آپ کو پوری ٹرین میں کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں سمجھتا ہوں، اگر وہ غیبی قوت آپ کی دشمن نہیں اور اس نے کسی خاص مقصد سے آپ کے بیگز چوری نہیں کروائے تو سلمٰی ملے یا نہ ملے لیکن لکسر پہنچنے سے پہلے آپ چاروں کے بیگز ضرور مل جائیں گے۔ میں نے اسی وجہ سے اپنی کوشش جاری رکھنے کی بات کی تھی۔''

''آپ کے فلسفے میں ایک طرف امید کی کرن ہے تو دوسری جانب مایوسی کی تاریکی......'' جیرڈ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ اگر وہ نادیدہ طاقت ہماری دشمن ہے تو ہمارے بیگز ملنا تو در کنار، لکسر پہنچنے کے بعد ہمارے لیے اور بھی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔''

''انسان کو مثبت انداز میں سوچنا چاہیے۔'' صادق العمر نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''لکسر جانے کا آپ لوگوں کا کوئی خاص مقصد ہے؟''

''ہم چاروں دوست ٹورسٹ ہیں۔'' جیرڈ نے نیم سچا/نیم جھوٹا جواب دیا۔ ''ہمارا تعلق ساؤتھ افریقا کے شہر ڈربن سے ہے۔ ہم لکسر سے ویلی آف دی کنگز جائیں گے اور اس کے بعد واپس اپنے گھر......''

''ویری گڈ۔'' صادق العمر نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''میں آپ کے لیے دعا کروں گا...... ہیپی جرنی!''

''تھینک یو فار یور نائس کارپوریشن آفیسر۔'' جیرڈ نے کہا۔

''اگر لکسر پہنچنے تک کوئی بھی پریشانی ہو تو آپ مجھ سے کانٹیکٹ کرسکتے ہیں۔''

''شیور مسٹر صادق!''

یہ تمام تر گفتگو انہوں نے یونٹ بی والے کمپارٹمنٹ کے اندر نہیں کی تھی بلکہ صادق العمر، جیرڈ کو کمپارٹمنٹ سے باہر ایک الگ تھلگ جگہ پر لے گیا تھا۔ خیر، جیرڈ جب واپس آیا تو جسٹیو، جیسن اور جرمیاح کی سوالیہ نظریں حقیقتِ حال جاننے کے لیے بے چین تھیں۔

جیرڈ نے انہیں صادق العمر سے ہونے والی اپنی بات چیت کا خلاصہ سنایا اور آخر میں کسی لیڈر کے انداز میں کہا۔

''یہ سب... تسلی کی باتیں ہیں کہ ایسا ہوجائے گا اور ویسا ہوجائے گا۔ جو ہونا تھا، وہ ہوچکا۔ اپنے بیگز اور ان کے اندر رکھے ہوئے سامان کو بھول جاؤ۔ ہمیں آگے کی طرف دیکھنا ہے کہ لکسر پہنچنے کے بعد ویلی آف دی کنگز تک کس طرح رسائی حاصل کرنا ہے اور کیسے اپنی منزل اس ہرم کا سراغ لگانا ہے جس کے تہ خانے میں صندل ووڈ کا بنا ہوا منقش

باکس رکھا ہوا ہے۔ اس پُراسرار باکس کو ہرم کے تہ خانے سے نکال کر ڈیوڈ تک پہنچانا ہی ہمارا مشن ہے اور...... ہم اس مشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔''

''لیکن کیسے؟'' جشیبو نے اُلجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔

جیسن بولا۔ ''اس پُراسرار ہرم تک پہنچانے والے مخصوص نقشہ جات اور دیگر چیزیں تو بیگز کے ساتھ ہی ہماری پہنچ سے دور چلی گئی ہیں۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم ویلی آف دی کنگز میں جا کر ایک ایک بندے سے یہ پوچھتے پھریں کہ وہ کون سا ہرم ہے جس کے تہ خانے میں ہمارا وہ باکس چھپا کر رکھا گیا ہے۔''

''اور ہمارے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔'' جرمیاح نے کہا۔

''ان تمام مسائل کا حل ہے میرے پاس۔'' جیرڈ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اس جادوئی صندل ووڈ باکس کو حاصل کرنے کے لیے کسی نقشے کی ضرورت ہے اور نہ ہی پیسوں کی۔''

''تو پھر......'' جیسن نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہم یہ ناممکن کام کیسے کریں گے؟''

''اپنی عقل کے استعمال سے......'' جیرڈ نے اپنی انگلی سے کھوپڑی پر دستک دیتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''لکسر پہنچتے ہی ہمیں پہلی فرصت میں کسی دوسرے یونٹ کو جوائن کر لینا چاہیے۔ ان لوگوں کے پاس رقم بھی ہے اور تمام تر نقشہ جات بھی۔''

جرمیاح نے ایک اہم سوال کیا۔ ''لیکن وہ لوگ اپنی چیزیں ہمارے ساتھ کیوں شیئر کریں گے؟ یہ تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی بات ہوگی۔ جبکہ یہ مہم ''ڈو آر ڈائی'' کی بنیاد پر سر کی جانے والی ہے حتیٰ کہ ڈیوڈ نے آگے بڑھنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھی یا ساتھیوں کی جان تک لینے کی اجازت دے رکھی ہے۔''

''جرمیاح! شاید تم نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔'' جیرڈ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے عقل کا استعمال کرنے کا ذکر کیا ہے۔''

''مگر کیسے؟'' جشیبو نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''ہمیں ان میں سے کسی ایک یونٹ کو مختصری مدت کے لیے جوائن کرنا ہے۔ مطلب، ایک چھوٹی سی ملاقات......'' جیرڈ اپنی جیب سے سیل فون برآمد کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اس کے بعد اپنی عقل، پھرتی اور حکمتِ عملی سے ہم اُن چاروں کی ہر شے کو اپنے قبضے میں لے لیں گے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں ڈیوڈ کی دی ہوئی اس خاص الخاص ''اجازت'' والا آپشن یوز کیوں نہ کرنا پڑے۔ جب یہ موت اور زندگی کی جنگ ہے اور...... جیت اور شکست کی مہم ہے تو پھر ہمارے حصے میں موت اور شکست کیوں آئے۔ ہمیں ہر حال میں جینا اور جیتنا ہے...... ایٹ اینی کاسٹ!''

بات کے اختتام پر جیرڈ کے لہجے میں کسی وحشی درندے جیسی سفاکی جھلکنے لگی تھی۔ جیسن، جرمیاح اور جشیبو نے اسے یقین دلایا کہ وہ لوگ ہر قسم کے حالات میں اس کے ساتھ ہیں۔ اپنے ساتھیوں کی جانب سے ''گو اہیڈ'' ملتے

ہی وہ اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

ڈیوڈ نے اس ری ایلیٹی ٹی وی کی اوپننگ سیرمنی میں تقریر کرتے ہوئے ان سب کو بتا دیا تھا کہ تم میں سے ہر ایک کے سیل فون کی "فون بک" میں دیگر گیارہ کھلاڑیوں کے نمبرز ان کے نام کے ساتھ فیڈ کر دیے گئے ہیں۔ یہ تم لوگوں کے آپسی رابطے کے لیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ نے سختی سے یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ وہ لوگ اپنے ان سیل فونز سے کوئی بھی ایسا نمبر ڈائل نہیں کریں گے جو اُن کے سیل فون کی "فون بک" میں فیڈ نہ ہو ورنہ...... بلاہ، بلاہ، بلاہ!

جیرڈ نے ڈیوڈ کی دھمکی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی فون بک میں سے ایک نمبر کا انتخاب کیا اور سیل فون کان سے لگا کر کال کے اٹینڈ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

رات کے دو بجنے والے تھے۔ یونٹ سی کے چاروں ارکان پچھلے ساڑھے تین گھنٹے سے سفاری جیپ کے اندر دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ خطرناک صحرائی طوفان کی ہولناکی سے بچنے کے لیے انہیں اس جیپ میں مقید ہونا پڑا تھا۔

صحرائی طوفان کی آمد نے گویا یونٹ سی کی جان ہی نکال دی تھی۔ باصر تو اسی ماحول کا پروردہ تھا اور اکثر و بیشتر ایسے صحرائی طوفانوں کا سامنا کرتا رہتا تھا۔ ایسے واقعات اس کے لیے معمولاتِ زندگی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اس قسم کی سچویشن میں قطعاً گھبراتا نہیں تھا لیکن جیری، جیک، جوناتھن اور جیمس کی حالت بقول کسے، خاصی پتلی ہو رہی تھی۔ اس نوعیت کی صورتِ حال سے ان کا زندگی میں پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ انہوں نے پہلے کبھی سرزمینِ مصر پر قدم رکھا تھا اور نہ ہی کسی صحرائی طوفان کا نظارہ کیا تھا اسی لیے ان کی سٹی گم تھی۔ وہ بوکھلاہٹ اور بدحواسی کے نرغے میں تھے۔ یہ ساڑھے تین گھنٹے انہوں نے جس ذہنی اذیت میں، موت کی آغوش میں سانس لیتے ہوئے گزارے تھے، یہ وہی جانتے تھے یا پھر ان کا خدا......

اب صحرائی طوفان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ہلکی پھلکی ریت اُڑ رہی تھی جو خطرناک نہیں تھی۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ جیپ سے باہر نکلنے کا رسک لے سکتے تھے۔ گروپ لیڈر جیری نے جیپ کے ڈرائیور سے کہا۔

"باصر! تم جیپ کے انجن کو ٹھیک کرنے کی دوبارہ کوشش کرو۔ صحرائی طوفان سے تو ہم بچ نکلے ہیں لیکن اگر رات کا باقی حصہ اِدھر بیٹھ کر ہم کسی مکینک کا انتظار کرتے رہے تو میں بھوک کی شدت سے ضرور مر جاؤں گا۔ تم میری کمزوری سے تو اچھی طرح واقف ہو ہی چکے ہو۔"

"یس باس۔" باصر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اور میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ موت کو سامنے دیکھ کر تمہاری بھوک دم دبا کر بھاگ جاتی ہے۔"

"تم تو یہ بات اتنے اطمینان سے اس طرح کر رہے ہو کہ جیسے تمہیں موت سے ذرا سا بھی خوف نہ آتا ہو؟" جیک نے کہا۔

جوناتھن بولا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے، تم ہماری بے بسی کا مذاق اُڑا رہے ہو۔"

"جو بھی ہے۔" جیمس نے اضطراری انداز میں کہا۔ "ہمیں جلد از جلد اس منحوس صحرائے اسیوط سے نکل جانا چاہیے۔"

"تم لوگ میری نیت پر شک نہ کرو۔" باصر نے ٹول کٹ اور ایمرجنسی لائٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ لوگوں کا بہ خدا مذاق نہیں اڑا رہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں ان طوفانوں کا عادی ہوں اور آپ کا شاید یہ پہلا تجربہ ہے اسی لیے میں مطمئن اور آپ ڈرے سہمے نظر آرہے ہیں۔ خیر......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر جیپ سے باہر نکلتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ موت کا ایک دن اور وقت مقرر ہے۔ جو رات قبر میں ہے، وہ باہر نہیں اور جو رات باہر ہے، وہ زیرِ زمین نہیں۔ پھر موت سے کیا ڈرنا؟"

وہ چاروں بھی کوئی بزدل اور نکمے نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ڈیوڈ اس خطرناک مہم کے لیے کبھی ان کا انتخاب نہ کرتا۔ وہ بارہ کے بارہ جوان خطروں کے کھلاڑی تھے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پیش قدمی کیا کرتے تھے لیکن صحرائے اسیوط کے اس بے رحم حصے میں وہ یکایک جس نوعیت کی غیر متوقع صورتِ حال میں گھر گئے تھے وہاں ان کے لیے بچاؤ کا کوئی راستہ کھلا نہیں رہا تھا لہٰذا وہ سفاری جیپ کے اندر ہی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے اور یہی مجبوری انہیں بے بسی کا احساس دلا رہی تھی۔ ایسا مایوس کن احساس انسان کو اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ان کی سوچیں اسی ہنگامی شکست و ریخت کا شکار تھیں کہ فضا میں اُبھرنے والی صحرائی طوفان کی آمد سے پہلے کی عجیب و غریب اور ہیبت ناک آوازوں نے انہیں شعوری اور لاشعوری طور پر حد درجہ خوف زدہ کر دیا تھا۔ میدانِ جنگ میں ہر پل متحرک رہنے

والا کوئی شخص اگر اس بے چارگی کے ساتھ کسی ایک جگہ مقید ہو کر بیٹھ جائے تو اس کے ذہن کی وہی حالت ہوتی ہے جو اس وقت اِن چاروں کی تھی۔

بہرحال اب وہ صحرائی طوفان آکر گزر چکا تھا۔ اسیوط کے اس لق و دق صحرا میں ریتیلے تھپیڑے بھی تھم گئے تھے اسی لیے جیپ کا ڈرائیور باصر ٹول کٹ اور ایمرجنسی لائٹ اٹھا کر دوبارہ انجن کی ''مزاج پرسی'' میں لگ گیا تھا۔

یونٹ سی کا گروپ لیڈر جیری اپنے ساتھی جیک پر سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا۔ جیک کا تعلق آسٹریلیا کے شہر پرتھ سے تھا جبکہ جیری فلوریڈا کے شہر میامی کا رہنے والا تھا۔ یونٹ سی دراصل براعظم آسٹریلیا اور براعظم نارتھ امریکا کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ اس یونٹ کے باقی دو ارکان میں سے جوناتھن نیوزی لینڈ کے شہر آک لینڈ کا باسی تھا جبکہ جیمس کا تعلق کینیڈا کے شہر وینکوور سے تھا۔

''جیمس...... جوناتھن......!'' جیری نے اپنے یونٹ کے دونوں ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ باہر جا کر باصر کی مدد کرو۔ ہم چاروں بہت اچھے ڈرائیور ہیں اور ظاہر ہے، چھوٹے موٹے مکینک بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے، جیپ کے انجن کا جو فالٹ باصر کی سمجھ میں نہ آرہا ہو، اسے تم میں سے کوئی ٹھیک کردے۔ ہمیں فوراً آگے بڑھ جانا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہوسکے گا جب یہ جیپ چلنے کے قابل ہوجائے گی۔''

''اوکے باس......'' جیمس اور جوناتھن نے بہ یک زبان ہوکر کہا۔

''جیک......!'' ان کے جانے کے بعد جیری نے اپنے معتمدِ خاص کو مخاطب کیا اور انتہائی رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے یہ بندہ باصر ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

جیک نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے باس۔ اس کا رویّہ بہت عجیب سا ہے۔ ہم صحرائی طوفان کے دوران میں، جیپ کے اندر پل پل جی رہے تھے، پل پل مر رہے تھے اور یہ بندہ بڑے اطمینان سے بیٹھا کوئی ضخیم عربی ناول پڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز کو دیکھ کر میرے ذہن میں ڈیوڈ کے کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے تھے ''میرے خاص ایجنٹس تم لوگوں کو تمہاری راہ سے بھٹکانے کی کوشش کریں گے لہٰذا ان سے محتاط رہنے کی کوشش کرنا۔ اگر تم نے غفلت اور بے احتیاطی سے کام لیا تو پھر اپنی منزل تک رسائی حاصل نہیں کرسکو گے۔''

''جیک! تم بالکل میرے ہی انداز میں سوچ رہے ہو۔'' اگرچہ اس وقت جیپ کے اندر ان کی باتیں سننے والا کوئی موجود نہیں تھا پھر بھی جیری دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں کہ باصر، ڈیوڈ ہی کا کوئی ایجنٹ ہے۔ جس جمال نامی ٹیکسی ڈرائیور نے فون کرکے باصر کو طوفان کی آمد کی اطلاع دی وہ بھی ڈیوڈ ہی کا نمک خوار ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، ذرا اس پر غور کرو......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر باصر چاہتا تو ہم لوگ اس صحرائی طوفانی ایریا سے بہ آسانی گزر سکتے تھے مگر جیپ میں کوئی بھیانک نقص پیدا ہوگیا اور وہ رکی بھی تو ایسی جگہ جہاں سے طوفان کو گزرنا تھا۔ پھر باصر کی تمام تر کوشش کے باوجود بھی جیپ کے انجن کی خرابی دور نہیں کی جاسکی اور ہم اس خوفناک صحرائی طوفان کے رحم و کرم پر، جیپ کے اندر قید ہوکر رہ گئے جس سے ہمارے چار گھنٹے ضائع ہوچکے ہیں۔ آگے کیا ہوگا، اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ عین ممکن ہے، کسی مکینک کے انتظار میں ہمیں رات کا باقی حصہ صحرائے اسیوط ہی میں گزارنا پڑے۔''

''لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا باس!'' جیک نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' جیری نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے جیک......؟''

''آپ کی طرح میں بھی اِن واقعات کو انسیڈینس نہیں سمجھتا۔'' جیک ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''باصر کی حرکات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ڈیوڈ کے سیٹ اَپ سے تعلق رکھتا ہے اور اگر میں غلط نہیں...... یقیناً میں غلط نہیں ہوں لہٰذا آپ دیکھ لینا، انجن کے ساتھ تھوڑی چھیڑ چھاڑ کے بعد باصر جیپ کو اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔''

''اگر ایسا ہوا تو ہمیں باصر کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟'' جیری نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ہمیں ڈیوڈ کی ہدایات کو فالو کرنا چاہیے۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' جیری اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''اگر ہمیں اپنی منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اپنے یونٹ کے کسی ممبر کی جان لینے کی اجازت ہے تو پھر اس ''لائسنس ٹو کِل'' کا فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔'' جیک نے بے حد سفاکی سے کہا۔ ''جب ہم چاروں کو ڈرائیونگ آتی ہے تو پھر لکسر تک بلکہ ویلی آف دی کنگز تک

پہنچنے کے لیے باصر کی محتاجی کس لیے باس......؟‘‘

’’گڈ شاٹ جیک!‘‘ جیری نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ’’تمہارا آئیڈیا مجھے پسند آیا لیکن باصر چونکہ ڈیوڈ کا ایجنٹ ہوسکتا اس خدشے کے پیشِ نظر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا اور جب تک ہم باصر کو صحرائے اسیوط میں دفن کر کے آگے نہیں بڑھ جاتے، اپنے ساتھیوں کو اس ’’حرکت‘‘ کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہو گیا۔‘‘ جیک تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

پھر وہ ہنگامی نوعیت کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گئے۔

دس منٹ کے بعد جیپ اسٹارٹ ہوگئی اس دل خوش کن اطلاع نے تصدیق کردی کہ باصر ڈیوڈ ہی کا ایجنٹ تھا۔ اس نے یونٹ سی کا وقت برباد کرنے کے لیے انہیں عین صحرائی طوفان کی گزرگاہ پر پھنسا کر چار گھنٹے ضائع کردیے تھے۔ خیر، جب وہ آگے بڑھنے لگے تو جیری پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیک اور جیمس و جوناتھن نے عقبی نشستوں پر ڈیرا جمالیا۔ جیک، باصر کے عین پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور یہ اس منصوبے کے مطابق تھا جو تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنے گروپ لیڈر کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ اسی مقصد کی خاطر اس نے ٹول کٹ کو اپنے قدموں کے انتہائی نزدیک رکھ لیا تھا۔

جب باصر کی سفاری جیپ ’’طریق القاہرہ اسیوط الصحراوی‘‘ پر دس کلومیٹرز آگے بڑھ گئی تو جیری نے اضطراری لہجے میں ڈرائیور سے کہا۔

’’باصر! چند منٹ کے لیے جیپ کو سائڈ پر لگاؤ۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ باصر نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

’’میں تھوڑا ہلکا ہونا چاہتا ہوں۔‘‘ جیری نے پیٹ کے زیریں حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ’’میرے مثانے پر دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے...... میں برداشت نہیں کر پا رہا ہوں۔‘‘

’’تمہارے ساتھ اتنے زیادہ مسائل کیوں ہیں؟‘‘ باصر نے بیزاری سے کہا۔ ’’تم سے بھوک و پیاس برداشت ہوتی ہے اور نہ ہی......‘‘

باصر کے ادھورے جملے کو کماحقہٗ سمجھنے کے بعد جیری نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ’’میں اللہ کا بنایا ہوا ایک انسان ہوں اور میرے ساتھ جتنے بھی مسائل ہیں وہ بہرحال، تمہاری جیپ سے تو کم ہی ہیں۔‘‘

’’ہم چالیس سے پچاس منٹ میں اسیوط شہر میں داخل ہو جائیں گے۔‘‘ باصر نے اس کی طرف دیکھے بغیر ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔ ’’کیا تم اتنی دیر تک صبر نہیں کر سکتے؟‘‘

’’میں تو صبر کرلوں گا لیکن اگر ’’اس‘‘ نے میری نہ سنی اور ’’بغاوت‘‘ پر اتر آیا تو میرے لباس کے ساتھ ہی تمہاری جیپ کی پسنجر سیٹ کا بھی سوا ستیاناس ہو جائے گا۔‘‘ جیری نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’رات کے اس پہر کوئی موثر مکینک تو دستیاب ہو نہیں سکا، ہم واشنگ ایریا کہاں تلاش کرتے پھریں گے؟‘‘

جیری کی بات کے اندر مبنی برحقیقت دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ باصر نے بادلِ ناخواستہ سفاری کو روٹ ’’سیونٹی فائیو۔ایم‘‘ کے کنارے لگا دیا۔

روٹ ’’سیونٹی فائیو۔ایم‘‘ اور ’’طریق القاہرہ اسیوط الصحراوی‘‘ یعنی اسیوط ڈیزرٹ کاریڈور روڈ دراصل ایک ہی ہائی وے کے نام ہیں جو مصر کے دو شہروں قاہرہ اور اسیوط کو آپس میں ملاتا ہے لہٰذا ہائی وے کے ان مختلف ناموں سے ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں۔

جیری، جیپ کے رکتے ہی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اضطراری قدموں سے چلتے ہوئے وہ ہائی وے سے بارہ پندرہ گز دور چلا گیا۔ اس کی چال سے بے انتہا بے چینی جھلکتی تھی جو کہ ایسے ہر ضرورت مند کا خاصہ ہوتی ہے۔

’’تم میں سے کسی اور نے بھی ہلکا ہونا ہے تو یہ شوق پورا کر سکتا ہے۔‘‘ باصر نے سرسری انداز میں کہا۔ ’’میں اسیوط پہنچنے سے پہلے کہیں بھی سفاری کو روکوں گا نہیں۔‘‘

ادھر باصر کی بات مکمل ہوئی، اُدھر جیک کے ہاتھوں نے میکانکی انداز میں طوفانی حرکت کی...... اور یہ ’’حرکت‘‘ اپنے ’’بابرکت‘‘ ہونے کے باعث صحرائی طوفان کو شرمندہ کر دینے والی تھی۔

جس دوران میں جیری جیپ سے نکلا تھا، جیک نے باصر کی ٹول کٹ کے اندر سے، اسی کی کھوپڑی پر آزمانے کے لیے ایک ہیوی اسپینر نکال کر مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ پھر جیسے ہی باصر نے اپنی بات پوری کی، جیک نے وہ ہیوی اسپینر (رینچ) کھینچ کر اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر دے مارا......!

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے

اگرچہ یہ کوئی فارمولا نہیں ہے لیکن عام طور پر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ ذہین لوگ بڑے ٹھنڈے مزاج اور مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں۔ پروفیسر نظم الدین بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔ عمر پچپن سے متجاوز، مائل بہ فربہی بدن۔ خوش شکل مگر پستہ قامت، وہ مقامی کالج میں اکنامکس پڑھاتا تھا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے بالکل تنہا پایا۔ گھر میں بھی اور اپنی ذات میں بھی!

قانون اور مصنف سے دس قدم آگے چلنے والے منصوبہ ساز کی حکمت عملی

مصنف کہانی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے... چونکا دینے والا انجام ہی اس کی کہانی کو دلچسپ اور منفرد بناتا ہے... کہانی کی کھوج میں نکلے ایک ایسے ہی مصنف کی تگ و دو... جرم و سزا کی ایک سنسنی خیز کہانی اس کی منتظر تھی...

دس قدم

سید ریاض

یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب مجھے اپنے نئے ناول کو تحریر کرنے کے لیے کسی پُرسکون جگہ کی تلاش تھی۔ میں نے شہر سے لگ بھگ دس کلومیٹرز دور ایک سرسبز و شاداب قصبہ ڈھونڈ نکالا تھا جس میں بہ یک وقت شہر اور گاؤں کا فلیور موجود تھا۔ مجھے وہ قصبہ اپنے کام کے لیے پسند آگیا تھا۔ وہاں میری کسی سے جان پہچان نہیں تھی لہٰذا میں ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس جا پہنچا جو اس قصبے کا واحد پراپرٹی ڈیلر تھا۔

اس ایجنٹ نے میرا بڑا پُراخلاق استقبال کیا۔ میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ اس کے پاس خال خال ہی کوئی ضرورت مند آیا کرتا تھا۔

''تو آپ کو ایک پُرسکون رہائش گاہ چاہیے اور وہ بھی صرف چھ ماہ کے لیے۔'' رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''چھ ماہ تو میں نے احتیاطاً بتائے ہیں جناب۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا کام چار سے پانچ ماہ میں ختم ہوجائے گا۔''

''او اچھا......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''آپ کے کام کی نوعیت کیا ہے؟''

''میں ایک لکھاری ہوں۔ کہانیاں اور ناول وغیرہ لکھتا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اسی لیے شہر کے ہنگاموں سے دور کسی فطری ماحول کی حامل جگہ کی تلاش میں رہتا ہوں اور یہ قصبہ مجھے کچھ ایسا ہی لگا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس ایک گھر ہے، قصبے سے بالکل الگ تھلگ۔ آپ کو یقیناً پسند آئے گا اور مجھے بھی خوشی ہوگی کہ میں نے کسی پڑھے لکھے ادبی شخص کو وہ گھر کرائے پر دیا۔ اصل میں، اس گھر کا مالک بلکہ مالکن ملک سے باہر رہتی ہیں۔ انہوں نے گھر کے معاملات کو میرے سپرد کر رکھا ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک بھی مجھے اختیار دے رکھا ہے کہ اگر اس گھر کا کوئی مناسب گاہک لگے تو میں اسے فروخت کر دوں مگر پچھلے ایک سال سے وہ گھر بند ہی پڑا ہے۔ خوش قسمتی سے آپ آگئے ہیں۔ میں آپ کو گھر دکھا دیتا ہوں۔ پسند یا ناپسند کرنا آپ کی مرضی ہے۔''

''اگر وہ گھر ایک سال سے بند پڑا ہے تو یقیناً وہاں صفائی کی اشد ضرورت ہوگی۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی، بالکل۔ ایسا ہی ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ بس مجھے ایک دن کی مہلت دیں گے۔ میں اس گھر کو آئینے کے مانند صاف اور شفاف کروا کے آپ کے حوالے کروں گا اور آپ کو ایک ایسا ملازم بھی مہیا کر دوں گا جو آپ کی خدمت کے علاوہ گھر کو بھی صاف ستھرا رکھے گا۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''تو پھر گھر دیکھنے چلیں؟''

''جی ضرور...... کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

پراپرٹی ایجنٹ کا دکھایا ہوا گھر مجھے پسند آگیا تھا۔ وہ اگرچہ میری ضرورت سے بہت زیادہ تھا لیکن پرائم لوکیشن پر ہونے کی وجہ سے وہ میرے دل و دماغ میں گھر کر گیا تھا۔ اس کے قرب و جوار میں صرف ایک ہی مکان تھا جس میں پروفیسر نظم الدین اکیلا ہی رہتا تھا۔ پروفیسر کا گھر میرے گھر سے چند قدموں کی دوری پر تھا۔ میں نے ایجنٹ سے کرایہ وغیرہ طے کیا اور کہا۔

''میں پرسوں اپنا مختصر سا سامان لے کر یہاں آجاؤں گا۔ آپ آج اور کل کا دن لگا کر اسے رہنے کے قابل بنا دیں۔ باقی یہاں بیڈ اور دوسرا تمام ضروری فرنیچر تو موجود ہی ہے۔ مجھے صرف اپنے کپڑے اور لکھنے پڑھنے کا سامان ساتھ لانا ہوگا۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں جناب۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''پرسوں آپ جب تشریف لائیں گے تو آپ کو یہ گھر ریڈی ملے گا۔ آپ میری ایجنسی سے چابیاں اٹھائیں اور سیدھے یہاں آکر قیام پذیر ہوجائیں۔ آپ نے تین ماہ کا کرایہ مجھے ایڈوانس میں دے دیا ہے۔ باقی کا حساب تین ماہ کے بعد کریں گے اور ہاں......'' لمحاتی توقف کے بعد وہ بولا۔

''میں آپ کے لیے کسی ملازم کا بندوبست تو کر دوں نا جو صفائی ستھرائی، کھانا تیار کرنے اور پھول دار پودوں کی حفاظت کا کام کرنا جانتا ہو......؟''

''بالکل!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''مجھے ایک ایسے آدمی کی لازمی ضرورت ہوگی۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

''ایک معروف اور کامیاب لکھاری بننے کے لیے کسی کالج یا یونیورسٹی کا ڈگری یافتہ ہونا ضروری نہیں۔ بس، واجبی سی تعلیم سے کام چل جاتا ہے۔''

میرا یہ جواب کسی کو ہضم نہیں ہوتا اور اس کے بعد

طرح طرح کے سوالات اٹھنے لگتے ہیں۔ میں ان نوع بہ نوع سوالات کا گلا صرف ایک جواب سے گھونٹ ڈالتا ہوں۔

''ایک مشہور اور عظیم، ہردلعزیز مصنف کا مقام حاصل کرنے کے لیے آپ کی کھوپڑی کے اندر ایک دماغ کا ہونا ضروری ہے اور اس دماغ میں توانا سوچ کا ہونا بھی لازم ہے۔ سینے کے اندر ایک دھڑکتا ہوا دل ہونا چاہیے جو انسانی جذبات واحساسات کا ادراک رکھتا ہو۔ آنکھوں میں قوتِ مشاہدہ اور ماحول کو اپنے اندر جذب کرنے کی طاقت ہونا چاہیے اور آپ جس زبان میں لکھنا چاہتے ہیں اس سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ آپ کی تحریر کو پڑھنا ممکن اور سمجھنا آسان ہو۔ باقی کاغذ، قلم اور کلپ بورڈ تو آپ کو ہر اسٹیشنری کی دکان سے بہ آسانی دستیاب ہو جائیں گے۔''

میرا یہ جواب بھی اکثر لوگوں کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ میں اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتا کیونکہ اصلی کھری ہو یا سچی بات، اسے ہضم کرنا آسان نہیں ہوتا۔

پراپرٹی ایجنٹ کے مہیا کردہ ملازم کا نام غفور احمد تھا۔ غفور کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی لیکن وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور چاق چوبند شخص تھا اور اس کے ساتھ ہی خاصا باتونی بھی۔ میں نے اسے ''اوکے'' کرنے سے پہلے چند ضروری سوال کرنا مناسب سمجھا۔

''اس ایجنٹ نے مجھے بتایا تھا کہ تم کھانا بنانا جانتے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کیا کیا آسانی سے تیار کر لیتے ہو؟''

''سبزی، دال، گوشت...... سب کچھ صاحب جی۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ پلاؤ، بریانی، روٹی، پراٹھا، چائے وغیرہ......''

''باقی بچا ہی کیا ہے۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''غفور چاچا! تمہیں تو اس قصبے میں اپنا ایک ہوٹل کھول لینا چاہیے۔''

اس نے عجیب سا جواب دیا۔ ''بس جی، میں ایسے ہی خوش ہوں۔''

غریب آدمی کے پاس سب سے بڑی دولت اس کی قناعت پسندی ہوتی ہے۔ وہ اپنی خواہشات کو لگام ڈال کر رکھتا ہے اور ہر حال میں اپنے مالک کا شکر ادا کرتا رہتا ہے۔ ویسے اگر حقیقت پسندانہ انداز میں سوچا جائے تو ایک انسان کی بنیادی ضروریات میں تین وقت پیٹ بھر صحت بخش کھانا، جسم پر صاف ستھرا لباس اور سونے کے لیے ایک آرام دہ اور محفوظ جگہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں اور یہ سب حاصل کرنے کے لیے ماہانہ لاکھوں یا کروڑوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چند ہزار میں سب اچھے سے ہو جاتا ہے۔ باقی انسان کی حرص، ہوس اور خواہشات کی کوئی حد نہیں ہے۔ آپ انہیں جتنا بھی بڑھانا چاہیں، کوئی آپ کو روکنے والا نہیں۔

اس گھر کے عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا پائیں باغ بھی تھا جس میں گھاس اور پھول دار پودے لگے ہوئے تھے۔ غفور نے مجھ سے کہا۔

''میں گھر کی صفائی ستھرائی کے علاوہ پچھواڑے والے باغ کی دیکھ بھال بھی کر دیا کروں گا صاحب۔ آپ کو کسی بھی حوالے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''گھر کے کاموں کے علاوہ بازار سے سودا سلف لانا، دھوبی سے میرے کپڑے دھلوانا وغیرہ...... سب تمہاری ذمے داری ہوگی۔''

''سمجھ گیا صاحب جی۔ آپ بےفکر ہو جائیں۔''

''رات کو تم ادھر ہی رکو گے یا اپنے گھر چلے جایا کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی، سارے کام ختم کرنے کے بعد میں اپنے گھر ہی جانا چاہوں گا۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''اگر آپ کو کوئی دقت نہ ہو تو۔''

''مجھے کوئی دقت نہیں ہے غفور...... اپنی فیملی کو وقت دینا بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے شُستہ انداز میں کہا۔ ''ویسے بھی میں زیادہ تر رات ہی میں کام کرتا ہوں اور ان لمحات میں مجھے مکمل تنہائی چاہیے ہوتی ہے۔''

''میں گھر جانے سے پہلے آپ کے لیے چائے کا تھرماس بھر کر رکھ دیا کروں گا۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نے سنا ہے، لکھنے کا کام کرنے والے چائے اور سگریٹ بہت زیادہ پیتے ہیں۔''

''تم نے غلط نہیں سنا ہے غفور لیکن بعض لکھاری اس کے علاوہ بھی کچھ پینے کے عادی ہوتے ہیں۔ بہرکیف، میں صرف چائے ہی سے کام چلا لیتا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ''اس سے پہلے تم کہاں کام کرتے تھے؟''

''جی...... شیخ ادریس کے گھر میں۔'' اس نے بتایا۔ ''قصبے میں شیخ صاحب کی کپڑے کی بہت بڑی دکان ہے صاحب جی۔''

"وہاں سے چھوڑا کیوں؟"

"میں نے نہیں چھوڑا صاحب، انہوں نے مجھے نوکری سے نکال دیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کا کوئی خاص سبب؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

میرے اس سوال پر وہ تذبذب میں گھر گیا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں غفور۔ میں نے تو بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ اگر نہیں بتانا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔"

"ایسی بات نہیں ہے صاحب جی۔" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ "دراصل میں آپ سے غلط بیانی نہیں کرنا چاہتا۔"

"او اللہ کے بندے! میں نے کب کہا کہ تم مجھ سے جھوٹ بولو......" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ایک کہانی کار ہوں اور سچ بولنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ اگر تم مجھ سے بھی دروغ گوئی نہیں کرو گے تو میرا وعدہ ہے کہ میں تمہاری ہر چھوٹی بڑی غلطی کی پردہ پوشی کرتے ہوئے تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کی بھی کوشش کروں گا۔"

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے مجھے میرے سوال کا جامع جواب دے دیا۔

"شیخ صاحب کی ایک بیٹی ہے شکیلہ۔ وہ میٹرک میں پڑھتی ہے۔ عمر میں وہ میری بیٹی صغریٰ کے برابر ہی ہے۔ میں ہمیشہ اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا اور وہ بھی میرا نام لینے کے بجائے مجھے انکل کہہ کر پکارتی تھی۔ میری آنکھوں کی بدنصیبی کہ ایک روز میں نے شکیلہ کو پڑوس والے لڑکے سے کچھ معاملات کرتے دیکھ لیا۔ مجھے وہ منظر اچھا نہیں لگا اور میں وہاں سے ہٹ گیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ان دونوں کی مجھ پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔ اگلے روز میں نے تنہائی میں اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے گزشتہ روز والے واقعے کا تذکرہ بھی کر دیا۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھی اور بدتمیزی بھرے انداز میں مجھ سے کہا کہ مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں تو میرے لیے بہتر ہوگا۔ اسی وقت میں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر میں شیخ صاحب سے بات کروں گا مگر......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"مگر مجھے بہت دیر ہو گئی۔ مجھ سے پہلے ہی شکیلہ اپنے باپ کے کان بھر چکی تھی۔ میرے لیے سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس نے الٹا مجھ ہی پر الزام لگا دیا تھا کہ میں اسے میلی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور گندے اشارے بھی کرتا ہوں۔ شیخ صاحب نے اپنی بیٹی کی بات کو معتبر جانا اور مجھے بُری طرح ذلیل کرنے کے بعد نوکری سے نکال دیا۔"

"میں تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں غفور۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "جو بیت چکا اسے بھول جاؤ۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور آنکھوں میں اُتر آنے والے آنسوؤں کو اپنے ہاتھ کی پشت سے صاف کرنے لگا۔

☆☆☆

غفور کے پاس قصے کہانیوں کی جادوئی زنبیل تھی۔ اس پر مستزاد کہ وہ حد درجہ باتونی بھی تھا۔ صرف دو دن میں اس نے مجھے درجن بھر کہانیاں سنا ڈالیں اور میں بھی پوری توجہ سے محض اس لیے سنتا رہا کہ مجھے ایک سنسنی خیز پلاٹ کی ضرورت تھی۔ مجھے اپنا ناول جرم و سزا کی بنیاد پر لکھنا تھا جو قاری کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دے۔ لہٰذا سینٹرل آئیڈیا بہت ہی پھڑکتا ہوا ہونا چاہیے تھا۔

تیسرے روز گوہر مقصود ہاتھ لگ گیا اور وہ کہانی تھی پروفیسر نظم الدین کی۔ غفور نے دردمندانہ انداز میں کہا۔

"صاحب جی! پروفیسر صاحب کے ساتھ بہت ہی بُرا ہوا۔"

"مجھے تفصیل سے بتاؤ۔" میں ہمہ تن گوش ہو گیا اور کاغذ قلم سنبھال لیا تاکہ اہم پوائنٹ نوٹ کر سکوں۔

"یہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے جی......" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ان کی بیوی کو کسی سفاک شخص نے بیدردی سے قتل کر دیا اور گھر کے اندر جتنا بھی سونا اور نقد رقم موجود تھی، قاتل اپنے ساتھ لے گیا۔"

"اوہ...... یہ تو واقعی بہت افسوسناک واقعہ ہے۔" میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے تو یہ ڈکیتی کی واردات لگتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں صاحب جی۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ جو کوئی بھی تھا، بہت ہی پتھر دل اور شیطان کی اولاد تھا۔ سیدھی سی بات ہے جی...... جب اس نے طلائی زیورات اور روپیہ پیسا سب

سمیٹ لیا تو پھر پروفیسر کی بیوی کو گولی مارنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ نرگس ایک خوب صورت اور دراز قد عورت تھی۔ اس کی موت کے بعد پروفیسر صاحب ایک دم ٹوٹ کر رہ گئے ہیں۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر...... ان کی زندگی یہیں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ انہوں نے لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا ہے۔"

"میرے خیال میں......" غفور کے خاموش ہونے پر میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پروفیسر کی بیوی نے شاید ڈکیت کو پہچان لیا تھا اور عین ممکن ہے اس نے اپنے قاتل کو کوئی دھمکی وغیرہ بھی دی ہو۔ ایسے خطرناک موقع پر عورتیں خود کو بہادر ثابت کرنے کے چکر میں اس قسم کی غلطی کر جاتی ہیں۔"

"یہ خیال میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا۔" وہ سادگی سے بولا۔ "ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہوا ہو۔"

"جب یہ اندوہناک واقعہ پیش آیا، اس وقت پروفیسر کہاں تھا؟" میں نے استفسار کیا۔

"پروفیسر دو دن کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔" غفور نے بتایا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ اسلام آباد میں اس کی کوئی میٹنگ تھی۔"

"اوہ، اس کا مطلب ہے، اس قاتل ڈکیت کو پروفیسر کے اسلام آباد جانے کی خبر تھی۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اسی لیے اس نے پوری منصوبہ بندی سے وہ خونیں واردات کی تھی۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے صاحب جی......!" غفور میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔

"مجھے اپنے ناول کے لیے میری مرضی کا مواد مل رہا تھا لہٰذا میں غفور سے، سوال پر سوال کرتا جا رہا تھا اور وہ اللہ کا بندہ بھی میرے ہر سوال کا مفصل جواب دے رہا تھا۔

"مجھے بتاؤ، یہ واقعہ لگ بھگ کتنے بجے پیش آیا تھا؟"

"صحیح وقت کا پتا تو پولیس بھی نہیں لگا پائی، میں بھلا آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں۔" وہ معذرت بھرے لہجے میں بولا۔ "پروفیسر کو اس رات دس بجے والی فلائٹ سے اسلام آباد جانا تھا۔ نرگس کی لاش اگلی صبح گھریلو ملازمہ نے دریافت کی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔ "لیکن مجھے یہ جاننا ہے کہ پولیس نرگس کی موت کا تعین کیوں نہیں کر پائی تھی۔ کیا ان لوگوں نے نرگس کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا تھا؟"

"پولیس نے اپنی تمام کارروائیاں کی تھیں صاحب جی۔" اس نے بتایا۔ "لیکن سننے میں آیا تھا کہ پانی کی وجہ سے یہ پتا نہیں چل سکا کہ نرگس کی موت کتنے بجے واقع ہوئی تھی۔"

"پانی کی وجہ سے......!" میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں پوچھا۔ "اس کا کیا مطلب ہوا غفور چاچا......؟"

"نرگس کی لاش باتھ روم کے اندر نہانے والے ٹب میں پڑی ملی تھی۔" وہ انکشاف کرتے ہوئے بولا۔ "اور وہ ٹب پانی سے بھرا ہوا تھا جس میں نرگس کی پیشانی سے نکلنے والا خون بھی شامل تھا۔ اس منحوس شخص نے نرگس کی پیشانی پر گولی ماری تھی۔ بس جی، پانی والے معاملے کے بارے میں، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

"نہیں جانتے تو جان لو، میں بتا رہا ہوں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ "جب کسی انسان کی موت واقع ہونے کے فوراً بعد اسے کسی سردخانے میں رکھ دیا جائے یا پانی میں ڈبو دیا جائے تو پوسٹ مارٹم میں اس کی موت کا وقت معلوم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پروفیسر کی بیوی کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔"

"میں آپ کی ذہانت کو مان گیا صاحب جی۔" وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لکھاری لوگوں کو ہر قسم کی معلومات رکھنا پڑتی ہیں۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق، ہمیں تمام ضروری چیزوں کے بارے میں ریسرچ کرنا پڑتی ہے تاکہ ہماری تحریر کو پڑھنے والا شخص ہم پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ ہم اپنے اس کام کو "ہوم ورک" کا نام دیتے ہیں۔"

"صاحب جی! ایک سوال کروں، اگر آپ ناراض نہ ہوں تو؟" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ ضرور پوچھو۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "تمہیں مجھ سے سوال کرنے کا پورا حق ہے غفور۔"

"شکریہ صاحب!" وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اللہ کے فضل سے ہمارے اس قصبے میں ہر شے موجود ہے۔ بجلی، پانی، گیس، ٹیلی فون، اسپتال، اسکول، انٹرنیٹ، ٹی وی کیبل...... سب کچھ! اب تو وہ ہوٹل بھی کھل گئے ہیں جن میں باہر کے ملکوں والے کھانے بھی ملتے ہیں جیسا کہ پزا، برگر وغیرہ۔"

''ہاں، میں نے اس قصبے کو منتخب کرنے سے پہلے یہاں کے مین بازار کا ایک چکر لگایا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''تمہارا قصبہ کسی شہر سے کم نہیں ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ تم مجھ سے پوچھنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''وہ جی بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگوں کی سب سے بڑی تفریح ٹی وی ہے، خاص طور پر میری عمر کے لوگوں کی ورنہ نوجوان نسل تو اپنے موبائل فونز ہی میں غرق ہے۔'' وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں ٹی وی ڈرامے اور فلمیں بہت شوق سے دیکھتا ہوں جی اور واقعات کے اتار چڑھاؤ، پل پل رنگ بدلتی صورتِ حال اور ایک کے بعد ایک نئے موڑ کو دیکھ کر میں سوچتا ہوں کہ ان ڈراموں اور فلموں کی کہانی لکھنے والے لوگ بہت خاص قسم کے ہوتے ہوں گے۔ ان کی گردن پر ہم سے کہیں بڑا، سب سے بڑے تربوز کے جتنا سر ہوگا اور اس سر کے اندر بڑے خربوزے کے سائز کا مغز موجود ہوگا جس سے وہ ایسی حیرت انگیز اور پیچیدہ باتیں سوچ لیتے ہیں مگر آپ تو بالکل عام انسانوں کی طرح کے ہیں۔ میں زندگی میں پہلی بار کسی کہانی کار سے ملا ہوں اور آپ کو دیکھ کر مجھے بالکل یقین نہیں آرہا کہ لکھاری ایسے بھی ہوتے ہیں۔''

غفور احمد کی سادگی بھری بات سن کر میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کیا اور زیرِلب مسکراتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔ میرا انداز سمجھانے والا تھا۔

''دیکھو غفور چاچا! اس دنیا کے تمام لوگ اٹھارہ بیس کے فرق سے دیکھنے میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ انہیں ایک دوسرے سے الگ، مختلف اور منفرد بناتا ہے۔ ہم لکھنے والے لوگوں کا سارا کھیل سوچ بچار کا ہے۔ اپنے ماحول سے مختلف قسم کی کہانیوں اور ان کے کرداروں کو چن کر اپنے ذہن میں محفوظ کرنا۔ ان پر غور وفکر کر کے کوئی نئی چیز تخلیق کرنا اور پھر اسے اپنے الفاظ میں کاغذ پر تحریر کر ڈالنا۔ ایک بات نوٹ کرلو چاچا...... اس دنیا میں انسانوں پر لکھی جانے والی تمام کہانیوں کا پلاٹ ایک ہی ہے جس کے بنیادی کردار صرف تین ہیں۔ نمبر ایک...... حوا یعنی عورت یا ہیروئن۔ نمبر دو...... آدم یعنی مرد یا ہیرو۔ نمبر تین...... شیطان یعنی بُرا انسان یا ولین......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اب سارا کھیل ہے پیشکش کا۔ ہر لکھاری ان تین کرداروں کو اپنے ڈھنگ سے استعمال کرتا ہے جس کے نتیجے میں ہر ڈراما، ہر فلم، ہر کہانی اور ہر ناول دوسرے سے منفرد اور جداگانہ ہو جاتا ہے۔ اُمید ہے، میرے اس جواب سے تمہاری تسلی ہو گئی ہو؟''

''جی، جی۔ میں سب سمجھ گیا۔'' وہ تشکرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ صاحب جی!''

''سمجھ گئے ہو تو پروفیسر صاحب کی طرف چلیں......؟''

''اس وقت تو وہ اپنے کالج میں ہوں گے۔'' اس نے معصومیت بھرے لہجے میں بے ساختہ کہا۔

میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''میرا مطلب تھا، ان کی کہانی کی طرف!''

''لگتا ہے، آپ کو یہ کہانی پسند آگئی ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ قاتل نے پروفیسر کی بیوی کی پیشانی پر گولی ماری تھی۔ جو حالات تم نے بیان کیے ہیں ان کے مطابق، وقوعہ کا وقت رات دس بجے کے بعد کا ہونا چاہیے۔ تو کیا قصبے والوں میں سے کسی نے فائر کی آواز نہیں سنی تھی؟''

''نہیں صاحب!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''گولی چلنے کی آواز آس پاس میں کسی نہ کسی کو تو ضرور سنائی دینا چاہیے تھی۔''

''پولیس کا کہنا ہے کہ وہ ایک بے آواز فائر تھا۔'' غفور نے بتایا۔ ''اس نامراد ڈاکو نے اپنے پستول پر کوئی ایسی مشین فٹ کر رکھی تھی جو گولی کی آواز کا گلا گھونٹ ڈالتی ہے۔ میں نے فلموں اور ڈراموں میں نلکی جیسی وہ مشین دیکھی ہے مگر اس وقت اس کا نام یاد نہیں آرہا......''

''سائیلنسر!'' میں نے اس کی یادداشت پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی، بالکل یہی نام ہے۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''کیا پولیس کو پروفیسر کے گھر سے قاتل کے حوالے سے کوئی اشارہ، ثبوت یا سراغ ملا تھا جس کی مدد سے وہ نرگس کے قاتل تک پہنچ سکتے۔'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، قاتل کے فنگر پرنٹس وغیرہ؟''

اس نے نفی میں گردن ہلانے کے بعد بتایا۔ ''پولیس نے پورے گھر کا اچھی طرح معائنہ کیا تھا اور انہیں کہیں پر بھی پروفیسر صاحب، ان کی بیوی نرگس اور گھریلو ملازمہ رحیمہ کی

انگلیوں کے نشانات کے سوا کچھ بھی نہیں ملا تھا جس پر انہوں نے سوچ لیا کہ وہ قاتل ڈاکو اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن کر واردات کرنے آیا تھا۔"

"اوہ...... یہ تو بڑی حوصلہ شکن صورتِ حال ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ پولیس نرگس کے قاتل کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہو گی۔"

"جی...... آپ بالکل صحیح سمجھ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "حالانکہ انہوں نے نرگس کے موبائل فون سے بھی کوشش کی تھی۔"

"مقتول کے موبائل فون سے کیسے کوشش کی؟" میں نے پوچھا۔

"پولیس نے نرگس کے موبائل فون کو چیک کیا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہاں انہیں دو اہم میسجز اور ایک فون کال کا ریکارڈ ملا تھا۔ کال سب سے آخر میں لگ بھگ پونے بارہ بجے رات آئی تھی اور وہ کال پروفیسر صاحب نے اپنی بیوی کو کی تھی۔ جب اس کال کے بارے میں پولیس نے پروفیسر سے سوال کیا تو اس نے تصدیقی انداز میں بتایا کہ انہوں نے اسلام آباد پہنچنے کے بعد نرگس کو اپنی خیریت سے آگاہ کرنے کے لیے وہ کال کی تھی۔"

"اور وہ دو اہم میسجز؟" میں نے سوالیہ نظر سے غفور کی طرف دیکھا۔

"نرگس کے موبائل فون کے مطابق، وہ میسجز پندرہ اگست کی رات پونے دس بجے کیے گئے تھے۔ میرا مطلب ہے، جس رات پروفیسر اسلام آباد گیا تھا۔" غفور نے بتایا۔ "پہلا میسج نرگس نے کسی ضیغم نامی شخص کو کیا تھا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا...... "پروفیسر آج دس بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہا ہے۔ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ تم بے دھڑک آسکتے ہو۔" دوسرا میسج دراصل اس کا رپلائی تھا جو ضیغم کی طرف سے آیا تھا...... "اوکے! میں ٹھیک گیارہ بجے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ گھر کا داخلی دروازہ کھلا رکھنا۔"

"او خدایا...... یہاں تو کچھ اور ہی معاملہ چل رہا تھا۔" میں نے غفور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں یہ ساری تفصیلات کیسے معلوم ہوئیں؟"

"صاحب! یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔ "پولیس نے تفتیش کے دوران میں بہت سے لوگوں سے پوچھ تاچھ کی تھی۔ اتفاق سے میں بھی انہی میں شامل تھا۔ پھر پروفیسر صاحب کی گھریلو ملازمہ رحیمہ پیٹ کی بہت ہلکی ہے۔ بہت ساری باتیں تو اس کے منہ سے بھی نکلی ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ اس قصبے کا تقریباً ہر شخص جانتا ہے۔"

غفور کی وضاحت وزن سے خالی نہیں تھی۔ نسبتاً کم مصروف علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے پاس سب سے بڑی مصروفیت یہی ہوتی ہے کہ دوسروں کے معاملات کو جاننے کی کوشش کی جائے۔

"تو پولیس نے مقتول کے سیل فون سے ضیغم کا نمبر نکال کر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟" میں نے غفور سے پوچھا۔ "تاکہ یہ پتا لگایا جا سکتا کہ جب وہ وقوعہ کی رات گیارہ بجے پروفیسر نظم الدین کے گھر پہنچا تو اس وقت نرگس زندہ تھی یا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا؟"

"پولیس نے ضیغم کے نمبر پر کئی بار فون کیا تھا مگر ہر مرتبہ وہ نمبر بند ملا۔" غفور نے جواب دیا۔ "جب اس نمبر کی رجسٹریشن چیک کی گئی تو وہ کسی منصور کے نام رجسٹر ملا۔ پولیس نے جب منصور سے پوچھ گچھ کی تو وہ اسی سال کا ایک اپاہج شخص نکلا اور اس نے قسم کھا کر بتایا کہ وہ تو موبائل فون ہی استعمال نہیں کرتا اور یہ کہ اس نے کبھی کوئی سم نہیں نکلوائی۔"

"ضیغم کے حوالے سے پولیس نے پروفیسر سے بھی تو پوچھا ہو گا؟" میں نے کہا۔

"جی، بہت پوچھا۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "مگر انہوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ ضیغم نام کے کسی شخص کو نہیں جانتے۔"

"پروفیسر نظم الدین کو اسلام آباد جانے کے لیے رات دس بجے والی فلائٹ پکڑنا تھی۔" میں نے بہ آوازِ بلند خود کلامی کی۔ "اس مقصد کے لیے وہ اپنے گھر سے کم و بیش ساڑھے آٹھ بجے نکلا ہو گا۔ اس کی فلائٹ سے ٹھیک پندرہ منٹ پہلے یعنی پونے دس بجے مقتول نرگس کسی ضیغم کو میسج کرتی ہے اور اسے پروفیسر کی روانگی کا بتانے کے بعد اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہے۔ جب کوئی عورت اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کسی شخص کو اپنے پاس بلائے اور وہ بھی آدھی رات کو تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ وہ شخص اس عورت کا آشنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ضیغم مل جائے تو پھر نرگس کے قاتل تک پہنچنا ناممکن نہیں رہے گا۔"

"مگر وہ بندہ ملے کہاں سے......" غفور نے بے بسی سے کہا۔ "پروفیسر صاحب اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور پولیس اس کی تلاش میں ناکام ہو چکی ہے۔"

”ضیغم یا تو نرگس کا قاتل ہے اور یا پھر وہ نرگس کے قاتل تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں تک اسے ڈھونڈنے کا معاملہ ہے تو یہ کام ہم کریں گے یعنی میں اور تم چاچا غفور......!“

اس کی آنکھوں میں الجھن آمیز حیرت چمکی پھر اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”میں کیسے جی......؟“

”وہ سب میں تمہیں بتا دوں گا۔“ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”بس، تم یہ بتا دو کہ میرا ساتھ دو گے یا نہیں؟“

”میں ضرور ساتھ دوں گا جی۔“ وہ توانا لہجے میں بولا۔ ”میں تو خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ نرگس کا قاتل پکڑا جائے۔ چاہے وہ ضیغم ہو یا کوئی اور......“

”انشاء اللہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔“ میں نے پورے یقین سے کہا۔

غفور اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

پروفیسر نظم الدین کی کہانی میرے نئے ناول کے لیے نہایت ہی موزوں اور موثر ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے اندر وہ سارا مصالحہ موجود تھا جو کرائم اسٹوریز کا خاصہ ہوتا ہے لیکن میری نظر میں اس پلاٹ میں ایک بڑی خامی بھی تھی یعنی اس کا کوئی منطقی انجام نہیں تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کوئی مجرم کسی خوب صورت عورت کو بے دردی سے قتل کرے، گھر میں موجود نقدی اور طلائی زیورات کو سمیٹے اور چپ چاپ چلتا بنے اور...... اور پولیس مکھیاں مارتی رہ جائے۔

جرم و سزا کی کہانیوں میں قارئین مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور پروفیسر کی کہانی میں تو ابھی تک مجرم کا تعین ہی نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی گرفتاری اور سزا وغیرہ تو بعد کے معاملات تھے۔ خیر...... اب میں نے غفور کی مدد سے اس کام کا بیڑا اٹھا لیا تھا اور مجھے اُمید تھی کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔

غفور دن میں مجھے نرگس کے قتل کے حوالے سے جو باتیں بتاتا، میں رات میں ان کے نوٹس تیار کر لیا کرتا تھا۔ میرے پاس اتنا مواد جمع ہو گیا تھا کہ میں اس سنسنی خیز اور تحیر آمیز ناول کو لکھنا شروع کر سکتا تھا۔ باقی جہاں تک اس کے اینڈ کی بات تھی تو اس کا کھوج مجھے ”اپنی مدد آپ“ کے تحت خود ہی لگانا تھا۔

مقتول نرگس کے سیل فون سے ملنے والے دو میسجز اس امر کی تصدیق کرتے تھے کہ وہ ضیغم نامی یا اس شخص کا جو بھی نام تھا، اس کے ساتھ غیر اخلاقی تعلقات رکھتی تھی۔ ضیغم کے نمبر کی انویسٹی گیشن نے بھی یہی ثابت کیا تھا کہ وہ بندہ دھوکے باز اور جرائم پیشہ تھا۔ اس نے ایک ایسے شخص کی آئی ڈی پر سم کارڈ رجسٹر کرا رکھا تھا جو سرے سے سیل فون استعمال ہی نہیں کرتا تھا۔

مجھے یہ بات بھی آسانی سے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی کہ پروفیسر، ضیغم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی کی بے وفائی سے پوری طرح واقف ہو اور اس نے بدنامی کے خوف سے پولیس کے سامنے ضیغم کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہو۔ بہرحال اسی گتھی کو اب مجھے ہی سلجھانا تھا۔

آئندہ روز سے میں نے غفور کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ جو بھی ڈش بنائے، اس میں سے ایک پلیٹ وہ پروفیسر کو بھی دے کر آئے۔ ساتھ ہی میں نے اسے یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ پروفیسر کے استفسار پر اسے میرے بارے میں بتائے کہ میں ایک قلم کار ہوں۔ اپنے کسی ناول کی تکمیل کے لیے اس قصبے میں آ کر ٹھہرا ہوا ہوں۔ عام طور پر میں بہت مصروف رہتا ہوں لیکن کسی روز میں پروفیسر صاحب سے ملاقات کرنے ان کے گھر آؤں گا...... وغیرہ ہم!

میں اس اسکیم سے صرف یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ پروفیسر کس قسم کے موڈ اور مزاج کا مالک ہے۔ وہ اپنے گھر پر کسی کی آمد کو پسند کرتا بھی ہے یا نہیں۔ اس بات کا تو مجھے پکا یقین تھا کہ نرگس کے قتل کا سراغ تو اس گھر کے اندر ہی سے ملے گا۔ اگر پروفیسر مجھے اپنے گھر میں خوش آمدید کہنے کو تیار نہیں ہوا تو پھر مجھے مجبوراً اس کی غیر موجودگی میں زبردستی اس کے گھر میں گھسنا تھا اور اسی مقصد کے لیے میں نے غفور کو تیار رہنے کے لیے کہا تھا۔ پروفیسر روزانہ صبح اپنے کالج چلا جاتا تھا۔ پھر اس کی واپسی چار سے پانچ بجے تک ہوتی تھی۔ گھر آ جانے کے بعد وہ پھر باہر نہیں نکلتا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ گھریلو ملازمہ رحیمہ نرگس کی زندگی میں صبح نو بجے سے دوپہر بارہ بجے تک مختلف کام کرنے آیا کرتی تھی لیکن اب پروفیسر نے اسے شام میں پانچ سے چھ بجے تک کے لیے رکھا ہوا تھا۔ نرگس کے زمانے میں رحیمہ کھانا وغیرہ بھی بنا دیا کرتی تھی۔ پروفیسر اس سے ہفتے میں ایک ہی دن دو تین سالن بنوا لیا کرتا تھا جس سے اس کا کام چل جاتا تھا اور وہ دن عموماً ہفتہ وار چھٹی کا ہوا کرتا تھا۔

میری پروفیسر کے گھر کھانا بھجوانے کی ترکیب کام کر گئی۔ تیسرے روز اس نے غفور کے ذریعے میرے لیے پیغام بھجوایا کہ اپنے صاحب سے کہنا، کبھی شام کی چائے پر گپ شپ کرنے آجائیں......

مجھے اسی موقع کا انتظار تھا۔ اگلے روز میں پوری ذہنی اور جسمانی تیاری کے ساتھ پروفیسر سے ملاقات کرنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں غفور کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا تھا تاکہ مجھے گیٹ پر کھڑے ہو کر اپنا تعارف کرانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔

پروفیسر نے ہمارا پُرتپاک استقبال کیا۔ میں نے غفور کو واپس بھیج دیا اور خود پروفیسر کی معیت میں ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ وہ شام کا وقت تھا اور رحیمہ گھر میں موجود تھی۔ پروفیسر نے اسے چائے اور لوازمات وغیرہ کا کہا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے توانا لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ کا نام سن رکھا ہے لیکن اتفاق سے ابھی تک آپ کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ ہمارے کالج میں شعبۂ اردو کے ہیڈ تو آپ کے فین ہیں۔''

''سن کر اچھا لگا۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ جان کر مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اکنامکس جیسے خشک مضمون کا پروفیسر بھی اردو فکشن میں دلچسپی رکھتا ہے۔''

میرے ذہن میں پروفیسر نظم الدین کا جو تصور تھا وہ اس کے بالعکس ثابت ہو رہا تھا۔ وہ سرد مہر یا سنکی ہونے کے بجائے خوش مزاج اور ملنسار تھا اور ایک حد تک باتونی بھی۔

''میں نے تقریباً اردو کے تمام ادیبوں اور شاعروں کو پڑھ رکھا ہے۔'' وہ ایک دیوار گیر ریک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بعض کے ادبی اور شعری مجموعے وہاں رکھے ہیں۔''

پروفیسر نے اپنے ڈرائنگ روم کی ایک دیوار میں کنگ سائز کا بک شیلف بنوا رکھا تھا جس میں دو سو سے زیادہ کتابیں موجود تھیں جن میں زیادہ تر اکنامکس کے بارے میں تھیں۔

''بہت خوب۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ ادبی لوگ تو ہم کمرشل رائٹرز کو سرے سے قلم کار ہی نہیں مانتے۔''

''ان کی وہ جانیں جناب۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''پڑھنے والے فکشن رائٹرز کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میں نے اردو ڈپارٹمنٹ کے جن ہیڈ کا ذکر کیا ہے نا، وہ خود بھی افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ جب وہ آپ کے فین ہیں تو اسی سے آپ اپنی مقبولیت کا اندازہ لگا لیں۔''

اسی وقت رحیمہ چائے لے کر آگئی۔ چائے کے ساتھ ایک پلیٹ میں مکس بسکٹس اور دوسری پلیٹ میں نمکو وغیرہ تھا۔ جب وہ چائے سرو کر چکی تو پروفیسر نے اس سے کہا۔

''رحیمہ! اب تم چھٹی کر لو۔ کل صبح جلدی آجانا۔''

''جی، ٹھیک ہے۔'' وہ فرمانبرداری سے بولی اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

اگلے روز ہفتہ وار تعطیل تھی۔ غفور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق، چھٹی کے دن رحیمہ جلدی کام پر آجاتی تھی کیونکہ اسے صفائی ستھرائی کے علاوہ اس روز کھانا بھی تیار کرنا ہوتا تھا۔

''میرے ذہن میں ایک سوال ہے۔'' پروفیسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو پوچھتا ہوں کیونکہ...... وہ سوال خاصا ذاتی نوعیت کا ہے۔''

''آپ مجھ سے ہر قسم کا سوال پوچھ سکتے ہیں پروفیسر صاحب۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''ذاتی اور غیر ذاتی کی کوئی قید نہیں۔ ہم لکھاری لوگ اندر باہر سے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہم کسی سے کچھ نہیں چھپاتے۔ ہر طرح کے حالات کو جھیلنے کا ہمارے اندر حوصلہ ہوتا ہے۔''

''آپ نے تو میرا کام آسان کر دیا جناب۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں خواہ مخواہ تذبذب کا شکار تھا۔''

''سارے تکلفات کو ایک طرف رکھ کر آپ مجھ سے سوال پوچھیں پروفیسر صاحب!'' میں نے چائے کا گھونٹ لینے کے بعد کہا۔

''چھ شہرۂ آفاق ناول، پچاس سے زیادہ شارٹ، ایک لانگ کرائم اسٹوریز اور دو ٹی وی سیریلز......'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے توصیفی انداز میں بولا۔ ''اور وہ بھی صرف پانچ سال کے عرصے میں۔ میرا سوال آپ کی اسی کامیابی اور ناموری سے متعلق ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اتنے کم عرصے میں وہ مقام کیسے حاصل کر لیا جس کے حصول کی خاطر دوسروں کو دس پندرہ سال کڑی محنت اور صبر آزما انتظار کرنا پڑتا ہے؟''

میں نے بہ زبانِ خاموشی اس کے الفاظ دہرا دیے۔ ''آپ نے تو میرا کام آسان کر دیا پروفیسر صاحب۔'' پھر

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ ’’پروفیسر صاحب! یہ جملہ تو آپ نے بھی سنا ہوگا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔‘‘

’’جی بالکل سنا ہے۔‘‘ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’اس عظیم عورت کے بارے میں مجھے بتائیں جو آپ کی شہرت اور کامیابی کا سبب بنی ہے۔‘‘

’’وہ کوئی اور نہیں، میری بیوی تھی، انیلا۔‘‘ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق کہا۔ ’’میں تو ایک معمولی سا سیلزمین ہوا کرتا تھا۔ دن بھر اپنی پھٹیچر بائیک پر شہر کی سڑکیں ناپتا پھرتا تھا۔‘‘ میں نے اپنی مطلب برآری کے لیے مبنی بر دروغ اداکاری کے جوہر دکھانا شروع کر دیے۔ ’’انیلا نے ایک ہی جھٹکے میں مجھے زمین سے اٹھا کر شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا ہے پروفیسر صاحب۔‘‘

’’ایک جھٹکا...... صرف ایک جادوئی پش...... واہ، زبردست۔‘‘ وہ میری پرفارمنس کے سحر کا اسیر ہوتے ہوئے بولا۔ ’’ذرا آپ مجھے اس طلسماتی پش کے بارے میں بھی بتائیں نا......‘‘

’’ویری سمپل پروفیسر صاحب!‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’میں اپنے خون پسینے کی کمائی سے انیلا کو جس قدر خوشیاں دے سکتا تھا، اس میں میں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا مگر اسے بہت زیادہ کی طلب تھی۔ وہ میرے رزقِ حلال سے مطمئن نہیں تھی اور اٹھتے بیٹھتے مجھے دوسروں کی کامیابی کے قصے سناتی رہتی تھی جس سے میرا جگر چھلنی ہو جاتا تھا۔ چلیں، یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ میں اس کی زبان سے ملنے والے ہر زخم کی اذیت کو چپ چاپ سہہ رہا تھا۔ جب اس نے حد سے تجاوز کیا تو میں برداشت نہ کر سکا......‘‘ میں نے دانستہ لمحاتی توقف کر کے پروفیسر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ یک ٹک مجھے تکے جا رہا تھا۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کیا۔

’’سر! آپ جاننا نہیں چاہیں گے کہ انیلا نے کون سی حد کو پھلانگ ڈالا تھا؟‘‘

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ’’میں ہمہ تن گوش ہوں جناب...... آپ بولتے جائیں۔‘‘

’’انیلا نے مجھے تڑپانے، نیچا دکھانے اور اذیت پہنچانے کے لیے دولت مند افراد سے دوستیاں گانٹھ لی تھیں۔ وہ منکوحہ تو میری تھی مگر غیروں اور نامحرم مردوں کے تصرف میں تھی۔‘‘ میں نے اپنی اداکاری کو ماسٹر کلاس ٹچ لگاتے ہوئے، ہارے ہوئے جواری کے انداز میں اپنی بات مکمل کر دی۔ ’’انیلا کے اس رویے نے میرا دل خون کر دیا۔ میں نے اسے اپنی زندگی سے کسی فضول اور ناکارہ شے کے مانند نکال باہر کیا اور خود تخلیقی کام میں لگ گیا۔ میں نے سیلزمین کی جاب چھوڑ دی اور اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کی عکاسی کرنے لگا اور پچھلے پانچ سال سے میں اسی کام میں مصروف ہوں۔‘‘

’’آئی ایم ویری سوری۔‘‘ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ’’مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرا سوال آپ کے لیے اس قدر پرسنل ہو جائے گا۔‘‘

’’اٹس اوکے پروفیسر صاحب!‘‘ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ’’جب دوستی ہو گئی تو کیا پرسنل اور کیا پرائیویٹ۔ ہم رائٹر لوگ بہت ہی کھلے دل و دماغ کے ہوتے ہیں۔ میں تو انیلا کا شکرگزار ہوں کہ اس نے میرے دل پر چوٹ لگائی۔ یہ اسی چوٹ کا نتیجہ ہے کہ آج میں ملک کا ایک ’’بیسٹ سیلر‘‘ رائٹر ہوں۔ اس نے واقعتاً مجھے میری اوقات دکھا دی۔ اگر وہ مجھ سے بے وفائی نہ کرتی تو میں آج بھی اپنی پھٹیچر بائیک پر سیلزمینی ہی کر رہا ہوتا۔‘‘

’’آپ ایک شہرت یافتہ مصنف ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہیں۔‘‘ وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

’’ذرہ نوازی کا شکریہ پروفیسر صاحب!‘‘ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’میری اس کامیابی کے پیچھے بہرحال، ایک عورت ہی کا ہاتھ ہے۔‘‘

اس کے بعد ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرے اندر ایک اداکار بھی چھپا بیٹھا ہے۔ جب میں پروفیسر کے گھر سے رخصت ہونے لگا تو میں نے اس کے ڈرائنگ روم میں موجود بکس کلیکشن پر بھی ایک سرسری سی نگاہ ڈال۔

یہ سرسری نگاہ خاصی حیرت انگیز اور سودمند ثابت ہوئی۔ شیلف میں موجود ان درجنوں کتابوں کے اندر رکھی ایک غیر متعلق کتاب نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے مذکورہ کتاب کو شیلف سے باہر نکالا اور پروفیسر سے پوچھا۔

’’کیا آپ کو میڈیکل کے شعبے سے بھی دلچسپی ہے؟‘‘

کتاب پر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ متغیر ہو گیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔

’’ارے نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا ایک

ڈاکٹر دوست اس کتاب کو یہاں بھول گیا تھا اور میں نے اسے اٹھا کر شیلف میں رکھ دیا۔ اب تو وہ میرا ڈاکٹر دوست اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو چکا ہے اور یہ کتاب اس کی نشانی کے طور پر میرے شیلف میں رکھی ہے۔''

وہ صد فیصد غلط بیانی سے کام لے رہا تھا کیونکہ مذکورہ کتاب کا تعلق میڈیکل سے زیادہ انویسٹی گیٹنگ کرمنالوجی سے تھا۔

''یہ کتاب میرے بہت کام کی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اسے پڑھنے کے لیے لے جاؤں؟''

''کیوں نہیں، ضرور جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''یہ ویسے بھی میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ آپ اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لیں۔''

''یہ مت بھولیں پروفیسر صاحب کہ یہ کتاب آپ کے ایک ڈاکٹر دوست کی نشانی ہے اور نشانیوں کو سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں اسے پڑھنے کے بعد آپ کو لوٹا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔

''انشاء اللہ جلد ہی ملاقات ہوگی۔'' میں نے کہا۔

اس نے نارمل انداز میں کہا۔ ''انشاء اللہ۔''

میں اس کتاب کے ساتھ پروفیسر نظم الدین کے گھر سے نکل آیا جس کا ٹائٹل تھا۔ ''پیتھالوجی اینڈ میتھوڈولوجی آف فرانزک اینڈ پیرامیڈیکلز۔''

☆☆☆

دو روز کے بعد میں پھر پروفیسر نظم الدین کے روبرو، اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ شام کا وقت تھا۔ رحیمہ اپنا کام ختم کر کے جا چکی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے وہ کتاب پروفیسر کو دکھاتے ہوئے کہا۔

''یہ بہت ہی دلچسپ کتاب ہے۔ خاص طور پر اس کے صفحہ نمبر سیونٹی نائن نے مجھے حد درجہ متاثر کیا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں پڑھ کر سناتا ہوں۔ زیادہ نہیں بس، چند سطور......''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، ہاں......ضرور۔''

''آپ کے ڈاکٹر دوست نے ہائی لائٹر کی مدد سے ان سطور کو نمایاں کر رکھا ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا اور پڑھنا شروع کیا۔ ''اگر کسی شخص کی موت واقع ہوتے ہی اسے کولڈ اسٹوریج میں رکھ دیا جائے یا اسے پانی میں ڈبو دیا جائے تو پھر اس انسان کی موت کے درست وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا......'' میں نے کتاب سے نگاہ اٹھا کر پروفیسر کی آنکھوں میں جھانکا اور سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کر دیا۔

''آپ کی وائف نرگس کی لاش بھی تو باتھ ٹب کے اندر، پانی میں ڈوبی ہوئی ملی تھی اسی لیے پوسٹ مارٹم کے باوجود بھی اس حقیقت کا پتا نہیں چلایا جا سکا کہ قاتل نے کتنے بجے اس کی پیشانی پر گولی ماری تھی۔''

''آپ کو......یہ سب......کیسے......پتا چلا......؟'' وہ حیرت اور الجھن کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ مستفسر ہوا۔

''پروفیسر صاحب! یہ بہت چھوٹا سا قصبہ ہے اور میں لگ بھگ ایک ماہ سے یہاں رہ رہا ہوں۔'' میں نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی یہ کہانی تو اس قصبے کے ہر دوسرے بندے کے علم میں ہے۔ بس، مجھے بھی کہیں سے پتا چل گئی۔''

''وہ میری زندگی کا بدترین اور بھیانک واقعہ تھا۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''باوجود کوشش کے بھی میں اسے بھلا نہیں پا رہا ہوں۔''

لوہا گرم ہو چکا تھا۔ ایک کاری ضرب لگانے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے پروفیسر کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ ''آپ ضیغم کو جانتے تھے نا......؟''

میرے الفاظ نے گویا پروفیسر پر لیکوئیڈ امونیا کا اسپرے کر دیا تھا۔ وہ فریزر میں رکھے ہوئے آئس کیوبز کے مانند ساکت و جامد سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ بولے گا تو الفاظ برف کی ٹکڑیوں کی طرح اس کے لبوں سے خارج ہوں گے اور وہ کچھ کہہ نہیں پائے گا۔

''دوستی کے درمیان اگر پردے حائل ہو جائیں تو پھر اسے قائم نہیں رکھا جا سکتا۔'' میں نے اس کی کیفیت سے کھیلتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا اور صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''ہماری دوستی بس یہیں تک تھی۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''میں چلتا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے ''خدا حافظ'' پروفیسر صاحب۔''

میری یہ جذباتی چال کامیاب رہی۔ قبل اس کے کہ میں جانے کے لیے قدم اٹھاتا، ایک فیصلہ کن آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''بیٹھ جائیں......اس طرح دوستی توڑ کر چلے جانا اچھی بات نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ میری کہانی آپ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ بلکہ میں تو آپ

سے بھی زیادہ جذباتی نکلا تھا۔"

میں چپ چاپ واپس صوفے پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے کندھے ڈھلک چکے تھے اور وہ یکایک اپنی عمر سے دس سال زیادہ کا نظر آنے لگا تھا۔ اس نے بولنے سے پہلے آنکھیں بند کرلیں، پھر بند آنکھوں کے پیچھے سے اس کی شکست خوردہ آواز آنے لگی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ کسی عمیق اور تاریک کنوئیں میں جا گرا ہو...... کسی قعرِ مذلت میں!

"ضیغم ایک کروڑپتی بزنس مین تھا۔ میں نے دو، تین مرتبہ نرگس کو اس کے ساتھ دیکھا تو اس حوالے سے نرگس سے بات کی۔ وہ الٹا مجھی پر چڑھ دوڑی۔ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے جو مجھ پر شک کررہے ہو۔ تمہاری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہوگا۔ تمہیں اپنے چشمے کا نمبر چیک کرانا چاہیے۔"

"مجھے دھوکا نہیں ہوا تھا لیکن ٹھوس ثبوت کے بغیر نرگس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سو، میں نے اسے ضیغم کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑنے کا منصوبہ بنالیا۔ وہ میرے اسلام آباد جانے والی کہانی اس منصوبے کا حصہ تھی......"

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ضیغم کو گھر پر بلائے گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میں نے کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ایک سائیلنسر لگی گن کا بندوبست کرلیا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کو سروس کے لیے پیٹرول پمپ پر چھوڑ دیا تھا اور اپنے گھر سے تھوڑے فاصلے پر موجود تھا۔ میرا خیال تھا، ضیغم اپنی کسی قیمتی گاڑی میں یہاں آئے گا لیکن جب وہ ایک آٹو رکشا سے اترا تو مجھے حیرت ہوئی۔ خیر، ہوسکتا ہے، اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر یہ راستہ اپنایا ہو۔" وہ ایک مرتبہ پھر تھما۔ اس دوران میں، میں مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تو بند تھیں تاہم چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آرہے تھے۔ وہ اس وقت حد درجہ اذیت سے گزر رہا تھا۔

"میں نے رات پونے بارہ بجے نرگس کے نمبر پر فون کیا تاکہ اسے اپنے اسلام آباد پہنچنے کی اطلاع دے سکوں۔" وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "نرگس نے یہ کہتے ہوئے میری کال کاٹ دی...... 'اچھا، ٹھیک ہے۔ میں واش روم جارہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں تم سے بات کرتی ہوں'...... نرگس نے میری کال تو کاٹ دی تھی لیکن اس چند سیکنڈ کی گفتگو نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس کی آواز کے زیروبم اور دھونکنی کے مانند چلتی ہوئی سانس نے مجھے یقین دلا دیا کہ ان لمحات میں وہ جسمانی تسکین کے کسی عمل سے گزر رہی تھی۔"

اب کی بار پروفیسر نے لگ بھگ ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی۔ میں اس کے چہرے پر ابھرنے اور ڈوبنے والے کرب کو دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے آنکھیں کھول دیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں اپنے گھر سے محض پندرہ منٹ کے پیدل فاصلے پر موجود تھا۔ میں نے سائیلنسر لگی گن کو اپنے لباس میں چھپایا اور گھر کی سمت چل پڑا۔ گھر کی چابیوں کا ایک سیٹ میرے پاس موجود رہتا تھا لہٰذا گھر کے اندر داخل ہونے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپ اس وقت کی میری ذہنی کیفیت کو تو سمجھ رہے ہیں نا......؟"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"میں بلی کے مانند دبے پاؤں آگے بڑھتا چلا گیا۔" وہ معتدل انداز میں بولنے کی کوشش کرنے لگا۔ "وہ دونوں ڈرائنگ روم میں نہیں تھے۔ میں نے بیڈ روم میں جھانکا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھے۔ پھر وہ مجھے دکھائی دے گئے۔ وہ واش روم کے اندر باتھ ٹب میں ایک ساتھ بیٹھ کر نہا رہے تھے اور بے شرمی کی انتہا دیکھیں کہ انہوں نے واش روم کا دروازہ بند کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ نرگس کا رخ میری جانب تھا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے میرے ہاتھ میں گن دیکھ لی تھی لیکن میں نے اسے چیخنے چلانے یا ذرا سی بھی آواز نکالنے کا موقع نہیں دیا۔" اچانک اس کی آواز میں سفاکی اور درندگی در آئی۔ "کالج کے زمانے میں، میں نے "این سی سی" کی جو ٹریننگ لی تھی، وہ میرے بہت کام آئی۔ میں نے پہلی بے آواز گولی نرگس کی پیشانی کے عین وسط میں ماری اور دوسری بے آواز گولی ضیغم کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں اتار دی۔ میرا نشانہ سچا تھا۔ وہ دونوں اپنی زندگی کے آخری گناہ کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتر گئے...... کھیل ختم، دکان بند۔"

"کھیل یہاں پر ختم نہیں ہوتا پروفیسر صاحب......" میں نے اس کے خاموش ہونے پر قدرے بلند آواز میں کہا۔ "میں ایک رائٹر ہوں۔ آپ کی کہانی کا یہ اینڈ مجھے بالکل ہضم نہیں ہوسکتا کیونکہ اگلی صبح جب گھریلو ملازمہ یہاں آتی ہے تو اسے باتھ ٹب میں صرف ایک نرگس کی لاش ملتی ہے۔ ضیغم کی لاش کے ساتھ آپ نے کیا کیا؟"

''اس گھر کے پچھواڑے، بائیں باغ کے کونے میں ایک متروک کنواں ہے۔'' وہ ایک گہری اور آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میری سائیلنسر لگی گن، ضیغم کا سوئچڈ آف سیل فون اور خود ضیغم کو اس متروک کنوئیں کی تہ تک پہنچانے میں اگرچہ مجھے کافی مشقت کرنا پڑی لیکن میں نے جیسے تیسے یہ مشکل کام بھی کر ڈالا۔ اس کے بعد گھر کو نارمل حالت میں لانے میں مجھے صبح ہوگئی۔ میں نے گھر کے اندر رکھی ہوئی نقدی، جیولری اور دیگر قیمتی چیزوں کو سمیٹا اور سورج طلوع ہونے سے پہلے گھر سے نکل گیا۔ میں نے گھر کے اندر کچھ ایسا ماحول بنا دیا تھا کہ وہ ڈکیتی اور قتل کی واردات لگے اور سب کچھ میری توقعات کے عین مطابق ہوا۔ اگر میں ان دونوں بدکاروں کو کہیں اور بھی شوٹ کرتا تو میرا، نرگس کو ٹب کے اندر ہی ڈبونے کا ارادہ تھا تاکہ اس کی موت کے وقت کا درست تعین نہ ہو سکے۔''

''اس کتاب سے حاصل ہونے والی معلومات......'' میں نے ''پیتھالوجی اینڈ میتھوڈولوجی آف فرانزک اینڈ پیرا میڈیکلز'' کو اس کی آنکھوں کے سامنے لاتے ہوئے کہا۔ ''سے صحیح معنوں میں آپ اسی وقت استفادہ کر سکتے تھے جب آپ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے اپنی وائف کی زندگی کا چراغ گل کر کے اسے باتھ ٹب میں ڈبو جاتے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا......؟''

''آپ ایک ذہین مصنف ہیں۔'' وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک رائٹر سوچ کے اعتبار سے اپنے قارئین سے ہمیشہ دس قدم آگے ہوتا ہے اسی لیے وہ دلچسپی سے اسے پڑھتے چلے جاتے ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''پہلے میرا بھی یہی ارادہ تھا جیسا آپ نے ابھی فرمایا لیکن پھر میں نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کر لی۔ جس شیطان صفت انسان کی وجہ سے نرگس بے راہ روی کا شکار ہوئی، میں بھلا اسے کیسے چھوڑ دیتا۔ اگر ضیغم زندہ رہتا تو پتا نہیں، کتنے شوہروں کے گھر اجاڑنے کا سبب بنتا...... اور آپ تو خود ایسے حالات سے گزر چکے ہیں۔ اس معاملے کی نزاکت اور ہلاکت خیزی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔''

میں نے پروفیسر نظم الدین کے آخری الفاظ پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہ جانا کیونکہ میں اس حوالے سے کوئی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میری زندگی میں ایسا کوئی واقعہ گزرا ہی نہیں تھا جس کا پروفیسر ذکر کر رہا تھا۔

''نرگس کے سیل فون سے حاصل ہونے والی ٹیکسٹ چیٹ نے پولیس کے کان کھڑے کر دیے تھے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انہیں ضیغم نامی کسی شخص کی تلاش تھی۔ انہوں نے اس سلسلے میں آپ سے بھی کڑی پوچھ تاچھ کی تھی۔ اگر انہیں بائیں باغ والے متروک کنوئیں پر شک ہو جاتا اور وہ اس کے اندر اپنے آدمیوں کو اتار دیتے تو آپ کے لیے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا۔''

''میری جان پھنسی ہی کب تھی جو میں اسے چھڑانے کی فکر کرتا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''وقوعہ کے روز میں اسلام آباد جانے کے لیے ساڑھے آٹھ بجے رات اپنے گھر سے نکلا تھا اور اس وقت بہ خدا، نرگس زندہ تھی۔ میں نے اسلام آباد پہنچنے کے بعد رات پونے بارہ بجے نرگس کو فون کیا تو وہ اس وقت بھی بہ قید حیات تھی۔ اس کے بعد میرے گھر میں کیا واقعہ پیش آیا اس میں مجھے نہیں گھسیٹا جا سکتا کیونکہ میں اس وقت یہاں نہیں بلکہ اسلام آباد میں تھا۔ آئندہ روز جب مجھے اس اندوہناک واقعے کی اطلاع ملی تو میں پہلی ممکنہ فلائٹ پکڑ کر یہاں آ گیا تھا۔''

''ایک رائٹر اپنے قاری کی سوچ سے دس قدم آگے ہوتا ہے یا نہیں لیکن آپ نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ آپ ضرور پولیس کی سوچ سے دس قدم آگے تھے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر اٹھ کر اس کتاب کو واپس دیوار گیر شیلف میں رکھنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''اس کتاب کو آپ ہی کے گھر میں ہونا چاہیے۔ یہ مجھ سے زیادہ آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔''

''جب پولیس کی آمد و رفت کا سلسلہ رکا تو میں نے اس متروک کنوئیں میں ملبا ڈلوا کر اس جگہ پر جامن کا ایک پیڑ لگا دیا تھا۔'' وہ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ پودا چل پڑا ہے۔ دو، تین سال میں پھل بھی دینے لگے گا...... ٹھنڈے ٹھار جامن، دل بہار جامن......!''

پروفیسر نظم الدین اس کے بعد بھی بہت کچھ کہتا رہا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی سنائی ہوئی کہانی میں کس حد تک سچائی تھی۔ جب میں نے اسے انیلا، اپنی فرضی بیوی کی بے وفائی کی جھوٹی کہانی سنائی تھی تو وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتا تھا؟

سچ اور جھوٹ کی بحث میں پڑے بغیر میں پوری طرح مطمئن تھا کہ مجھے اپنے نئے ناول ''دس قدم'' کا ایک سنسنی خیز اینڈ مل گیا تھا۔

❖❖❖

وحشت اور محبت

محمد فاروق انجم

خوش قسمت لوگوں کو مواقع ملتے ہیں... سفر کرنے کے... محبت کرنے کے... اور لوگوں کو قریب سے دیکھنے کے... مگر اصل خوش قسمتی یہ ہے محبت کے جواب میں محبت ملے... دل کی دنیا کا باغ ہر ایک کے لیے خوشنما پھولوں سے لدا نہیں ہوتا... کسی کسی کے حصے میں یہ بہار آتی ہے... ایسے ہی کرداروں سے سجا سرورق... جہاں ہر کوئی اپنے دل میں بسی خواہش و تمنا کا اسیر تھا... کوئی بھی اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا... سمجھوتے مصلحت اور دوراندیشی کو تھام کر چلنے میں ہی عافیت چھپی ہوتی ہے... مگر اُن وحشت اور محبت گزیدوں نے زندگی کو خارزار بنادینے کی ٹھان رکھی تھی...

جرم کی انگلی پکڑ کے مجرم تک پہنچنے کی سنسنی خیز داستان......

میٹنگ ختم ہوتے ہی زبیر حسن نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا تو دن کے چار بج رہے تھے۔ اُس نے ضروری فائل اپنے بیگ میں رکھی اور وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور زبیر کا ملازم نصیر نمودار ہوتے ہی بولا۔ ”سر کوئی نادر صاحب آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“

نصیر کی بات سن کر زبیر چونکا، اس نے پہلی بار نادر کا نام سنا تھا۔ اسے جانے کی جلدی تھی اور اس میں کسی نادر نام کے شخص کا آنا زبیر کے لیے ناگواری کا باعث تھا۔ ”یہ کون صاحب ہیں؟“

”سر وہ کہہ رہے ہیں کہ ضروری بات کرنی ہے۔“ نادر کے بارے میں نصیر کے پاس بھی کوئی خاص معلومات نہیں تھی اس لیے اس نے کندھے اچکاتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہا۔

زبیر نے ایک بار پھر وقت دیکھا اور پھر بادلِ ناخواستہ کہا۔ ”بھیج دو......“

”اوکے سر۔“ نصیر کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ زبیر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی ایک شخص دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی، چہرے پر بڑی مونچھیں اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ شکل سے ہی کوئی شریف آدمی نہیں لگتا تھا۔ زبیر نے اس سے قبل اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس شخص نے زبیر کو سلام کیا اور بولا۔ ”میرا نام نادر ہے۔“

”آپ کا نام مجھے بتایا جا چکا ہے۔“ زبیر اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ذرا جلدی ہے اس لیے میں چاہوں گا ہم مقصد کی بات پر آ جائیں۔“

”وقت میرے پاس بھی کم ہے۔ ویسے بھی میں سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”آپ نے گودام میں چوری کے الزام میں دلاور کے خلاف رپورٹ لکھوا کر اُسے گرفتار کرا دیا ہے...... دلاور میرا قریبی دوست ہے۔“

زبیر نے میز پر سے اپنا قیمتی موبائل فون اُٹھایا اور اسے

کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنی ہے۔ وہ آدمی میرا ملازم ہو کر میرے گودام سے چوری کرتا رہا اور مجھے لاکھوں کا نقصان پہنچاتا رہا...... وہ جیل میں ہے اور مجھے اپنی ریکوری چاہیے...... آپ براہ مہربانی تشریف لے جائیں۔“

زبیر کی بات سن کر نادر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں جیسے ان میں خون اتر آیا ہو۔ ”آج تک میری بات کاٹنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔“

”میری جرأت کو سلام کیجیے اور یہاں سے تشریف لے جائیں، مجھے بھی جانا ہے۔“

”اگر آپ مجھے جانتے ہوتے تو آپ کی مجھ سے ایسی بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ میں کون ہوں اور کیا کر سکتا ہوں، کسی سے میرے بارے میں پوچھ لیں تو یہ بہتر ہوگا۔“ نادر اسے گھورتا ہوا بولا۔

”مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاتے ہو یا میں سیکیورٹی کو اندر بلاؤں۔“ اس بار زبیر کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

”اپنا وہ کیس واپس لو اور میرا آدمی حوالات سے باہر نکلواؤ۔“ نادر بھی سیخ پا ہو گیا۔

زبیر نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور متانت سے بولا۔ ”ایسا نہیں ہوگا، مجھے اس نے لاکھوں کا نقصان پہنچایا ہے؛ تم جیسے شخص کا اُس کے پیچھے آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عادی مجرم ہے اور اس کی پشت پناہی میں تم جیسا شخص ہے۔“

”انجام اچھا نہیں ہوگا۔“ اس نے تحمل سے زبیر کی بات سننے کے بعد اپنے دھیمے لہجے میں خطرناک دھمکی دی۔

”کیا کر لو گے؟“ زبیر نے بلا تامل پوچھا۔

”وہ کر دوں گا جس کے بارے میں تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔“ نادر کا غصہ دوچند ہو گیا۔

”تمہیں جو کرنا ہے کر لو، مجھے پروا نہیں ہے۔“ زبیر چیخا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

نادر اس کو زہر آلود نگاہوں سے گھورتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنی شہادت کی انگلی اُٹھا کے کہا۔ ”تیار رہنا، تم کو ایسا سرپرائز دوں گا کہ تمہارے پیروں کے نیچے سے زمین سرک جائے گی۔“ وہ ایک دم گھوم کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد زبیر نے پانی کا ایک گلاس پیا اور لمبے سانس لینے کے بعد اس نے اپنی ٹائی کی ناٹ غیر ارادی طور پر ٹھیک کی اور اپنے آپ کو نارمل کرنے کے بعد نصیر کو اندر بلا کر کہا۔ ”تم نے اس شخص کی شکل اچھی طرح سے دیکھی تھی؟“

”جی سر میں نے دیکھی تھی۔“ نصیر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

”اس کی شکل کو یاد رکھنا اور اگر یہ کبھی دوبارہ یہاں آئے تو مجھے بتانے کے بجائے اسے اُٹھا کر باہر پھینک دینا۔“

”یہ کون تھا...... سر؟“ نصیر حیرت سے زبیر کو دیکھنے لگا۔

”کوئی بات کی تھی اس نے؟“

”وہ جو کوئی بھی تھا، اس بات کو چھوڑو۔ جو میں نے کہا ہے بس اس پر عمل کرنا۔“ زبیر نے کہا۔

نصیر کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اس کے اندر کچھ سوال اُٹھ رہے تھے لیکن وہ ان سوالوں کو اپنی زبان پر نہ لاتے ہوئے بس اتنا بولا۔ ''جی بہتر سر...... جو آپ کا حکم۔''

''میں جا رہا ہوں۔ خیال رکھنا۔'' زبیر کہہ کر دفتر سے باہر چلا گیا جبکہ نصیر کے چہرے پر تشویش بدستور قائم تھی۔ اس کا دماغ جیسے اُلجھا ہوا تھا۔

جونہی زبیر لفٹ سے باہر نکلا اپنے خیالوں میں مخمور وہ ایک خوش پوش آدمی سے ٹکرا گیا۔

ٹکرانے والے شخص نے فوری کہا۔ ''سوری......''

''کوئی بات نہیں۔'' زبیر نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''ایک بار پھر سوری۔''

زبیر نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے مصافحہ کیا اور عجلت میں اپنے ہاتھ پر نظر ڈال کر بولا۔ ''اوکے...... نو پرابلم......'' زبیر کہہ کر باہر جانے کے لیے چل پڑا۔

اپنی گاڑی تک جاتے ہوئے زبیر نے نادر اور اس کی باتوں کو اپنے دماغ سے محو کر دیا تھا۔ زبیر ڈرپوک انسان نہیں تھا۔ وہ ایک باہمت اور ذہین انسان تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اُس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جس مقصد کے لیے دفتر سے جلدی گھر جا رہا تھا، اس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ اندر سے سرشار ہو رہا تھا۔

اُس نے گاڑی ایک بڑے مال کے سامنے روکی اور باہر نکل کر دائیں بائیں دیکھا اور مال کے اندر چلا گیا۔

وہ تین منزلہ مال تھا اور اس جگہ صارف کو اپنی پسند کی ہر چیز آسانی سے مل جاتی تھی، بس صارف کی جیب میں پیسہ ہونا شرط تھی۔ زبیر جیسا کاروباری شخص کچھ بھی خریدنے کی طاقت رکھتا تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی، وہ مضبوط جسم اور وجیہہ شکل وصورت کا مالک تھا۔ اس کا پھیلا ہوا کامیاب کاروبار اپنے باپ سے منتقل ہوا تھا اور اس کاروبار کو زبیر نے اپنی عقل اور سوچ سے مزید کامیابی کے زینے پر گامزن کر دیا تھا۔

زبیر نے ایک خوب صورت رِنگ خریدی اور ڈبیا کو اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر زیرِلب مسکراتا ہوا مال سے باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

زبیر کی شادی کو ایک سال ہوا تھا اور آج اُن کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ اپنی شادی کی پہلی سالگرہ منانے کا زبیر نے اپنی بیوی نتاشا کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اس نے شادی کی پہلی سالگرہ منانے کی پوری منصوبہ بندی کی تھی۔

زبیر نے راستے سے ایک خوب صورت اور تازہ گلدستہ خریدا اور پہلے سے آرڈر کیا ہوا مشہور بیکری سے کیک لیا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

زبیر کا گھر پوش علاقے میں تھا۔ اُس نے اپنی گاڑی گھر کے باہر کھڑی کی۔ گلدستہ اور وہ شاپر جس میں کیک کا ڈبا تھا، پکڑے باہر نکلا اور گیٹ کی طرف چلا گیا...... جیب سے گیٹ کی چابی نکال کر اس نے قفل میں لگانے کے لیے آگے بڑھائی ہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ چھوٹا گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ زبیر کے چہرے پر یہ سوچ کر مسکراہٹ آ گئی کہ یقیناً نتاشا نے آفس میں فون کر کے اس کے بارے میں دریافت کیا ہوگا اور پھر جب اسے پتا چلا ہوگا کہ وہ آفس سے نکل گیا ہے تو نتاشا نے اس کے آنے سے قبل ہی تھوڑا سا گیٹ کھول دیا ہوگا۔

زبیر نے نتاشا کو سالگرہ کے بارے میں نہ ہی یاد دلایا تھا اور نہ اس نے اس بارے میں کوئی تذکرہ کیا تھا...... لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ نتاشا کو اپنی شادی کی سالگرہ یاد نہ ہو...... یقیناً وہ خود اسے سرپرائز دینے کے لیے تیار ہوگی۔

گیٹ کھول کر زبیر اندر گیا اور گیٹ بند کرنے کے بعد وہ مین دروازے کی طرف بڑھا۔ مین دروازہ کھولتے ہی ایک مختصر سی راہداری آتی تھی اور اسے عبور کرنے کے بعد سامنے کشادہ ٹی وی لاؤنج تھا۔ اس وقت ٹی وی لاؤنج میں اندھیرا تھا۔ کھڑکیوں کے آگے گہرے رنگ کے پردے گرے ہوئے تھے۔ زبیر ایک جگہ رک گیا اور اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ نتاشا کی طرف سے ملنے والا سرپرائز ذہنی طور پر قبول کرنے کو تیار تھا۔ اس کی دانست میں تھا کہ نتاشا شاید ایک طرف سے یکدم باہر نکلے اور ایسا بھی ممکن تھا کہ اس نے کچھ مہمان بلائے ہوں اور وہ بھی ایک ساتھ شور مچاتے اس کے سامنے آ جائیں۔

زبیر اسی جگہ کھڑا دائیں بائیں دیکھ رہا تھا لیکن کسی طرف سے کوئی بھی باہر نہیں نکلا تھا۔

زبیر نے اپنی گاڑی کی چابی ایک طرف رکھی اور کچن کے بند دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا تو کچن میں کوئی نہیں تھا۔ کچن کی شیلف صاف اور دھلے ہوئے برتن قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔

وہ کچن سے باہر نکلا اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے وہ اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا۔

دروازے کے پاس جا کر اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلدستہ ایک بار سونگھا اور پھولوں کی مسحور کن خوشبو کو اس نے محسوس کرتے ہوئے دروازے کا ہینڈل گھما کر ایک دم دروازہ

کھول دیا، اندر اندھیرا تھا اور اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔

اس بار زبیر کے چہرے پر عیاں مسکراہٹ معدوم ہو گئی تھی۔ اس کی دانست میں نتاشا اور مہمانوں کو اسی کمرے میں ہونا چاہیے تھا لیکن کمرا خالی تھا۔

زبیر نے گھوم کر سوئچ بورڈ کی طرف دیکھا اور ایک ساتھ دو بٹن دبا کر کمرے کو پوری طرح سے روشن کر دیا اور اس کے بعد جونہی وہ گھوما اور اس کی نگاہ بیڈ کے ساتھ فرش پر پڑی تو اس کی متوحش خیرہ نگاہیں اسی جگہ منجمد ہو گئی تھیں۔ اس کی سانس جیسے رک گئی تھی اور دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو کر منہ زور گھوڑے کے مانند دوڑنے لگی تھی۔

فرش پر نتاشا کی لاش پڑی تھی، اس کے جسم سے خون نکل کر اردگرد پھیل چکا تھا۔ نتاشا کا گلا تیز دھار چیز سے کٹا ہوا تھا۔

زبیر نے جو کچھ پکڑا تھا وہ نیچے گر گیا۔ وہ اپنے لائے ہوئے تازہ پھولوں پر پیر رکھ کر آگے بڑھا اور نتاشا کا بازو پکڑ کر پہلے اس کی نبض دیکھی جو ساکت تھی اور اس کے بعد وہ چلایا۔

”نتاشا۔۔۔۔۔۔نتاشا۔۔۔۔۔۔“

نتاشا کے بے جان خون آلود جسم سے کوئی آواز نہیں آئی۔

زبیر نے ناچاری سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اس نے جلدی سے اپنے کوٹ کی جیب سے۔۔۔ موبائل فون نکالا اور اس پریشانی اور ہیجانی کیفیت میں سوچنے لگا کہ وہ کس کو کال کرے۔۔۔۔۔۔ پھر جیسے اُسے خیال آیا اور اس نے ایمرجنسی پولیس کو کال کر دی۔

☆☆☆

قتل کی اس واردات سے تقریباً سات گھنٹے قبل اسی گھر کے کچن میں نتاشا کھڑی ناشتا تیار کر رہی تھی۔ اپنے بیڈ روم میں قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا زبیر اپنی ٹائی باندھ رہا تھا۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔

ان کا بیڈ روم کشادہ تھا۔ ڈبل بیڈ کے ساتھ ہی ایک کونے میں لکھنے کی میز اور کرسی رکھی تھی جس پر ایک پیڈ اور خوب صورت بکس میں لکھنے کے لیے پنسلیں نظر آ رہی تھیں۔ اسی ٹیبل کے ساتھ دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی لیکن بہت خوب صورت ڈیزائن کی شیلف تھی جس میں کتابیں زیادہ نہیں تھیں لیکن جتنی بھی تھیں، وہ قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سب کتابیں نتاشا کی تھیں۔ چند دن قبل زبیر نے ایسے ہی ایک ناول اُٹھا لیا تھا اور جیسے جیسے وہ پڑھتا رہا، وہ اس ناول کی کہانی میں گم ہوتا گیا اور اب وہ کئی دنوں سے اس ضخیم ناول کے چند صفحے رات کو پڑھ کر ہی سوتا تھا۔ وہ ناول ہر وقت اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر موجود رہتا تھا۔

”آپ کی تیاری ختم ہو گئی ہے تو آ جائیں اور ناشتا کر لیں۔ دُلہنوں کی طرح تیار ہوتے ہیں آپ۔ ورنہ مرد تو چٹکی بجاتے تیار ہو جاتے ہیں۔“ نتاشا نے کمرے کا دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے کہا۔

زبیر آئینے میں اپنا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ”ایک ٹائی ہی باندھ رہا تھا میں کونسا سولہ سنگار کر رہا تھا۔“

”آپ کا ٹائی باندھنا بھی کسی سولہ سنگار سے کم نہیں ہوتا ہے۔ آ جائیے آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ آئینے کے سامنے سے ہٹیں گے تو اس بے چارے کو بھی سانس آئے گا۔“ نتاشا کے لہجے میں شرارت تھی۔

”تمہارا مطلب ہے میں آئینے کا گلا دبا کر کھڑا ہوں؟“ زبیر نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”جب کوئی مسلسل کسی کے سامنے کھڑا رہے تو وہ بھی دل ہی دل میں کہنا شروع کر دیتا ہے کہ اب ہٹ بھی جاؤ۔“

”تم آئینے کی سائڈ لے رہی ہو جبکہ تمہارا شوہر میں ہوں۔“ زبیر اس کے قریب جا کر پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ میرے شوہر ہی نہیں میرے بادشاہ ہو۔۔۔۔۔۔ اور میں آپ کی کنیز ہوں۔“ اس نے اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے زبیر کی ٹائی کو پکڑ کر ذرا سا ہلایا۔

”بادشاہ ہوں تو تم میری ملکہ ہو، میری کنیز نہیں۔۔۔۔۔۔“ زبیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”مجھے کنیز ہی رہنے دیں۔ ملکہ بے چاریاں تو مظلوم ہوتی ہیں۔ چھ چھ ملکائیں جو بادشاہ نے اس کے سر پر بٹھائی ہوتی ہیں۔“ نتاشا کہہ کر کھلکھلائی۔ ”میں اتنی مظلوم نہیں بننا چاہتی۔“

”کنیز مظلوم نہیں ہوتی؟“

”کنیز تو نظروں پر نچاتی ہے۔“ معنی خیز انداز میں کہہ کر نتاشا ہنسی اور زبیر کا ہاتھ پکڑ کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف لے گئی۔

”صحیح کہہ رہی ہو ہم آپ کی نظروں پر کیا، اشاروں پر ناچتے ہیں اور میں اسی طرح ناچتا رہنا چاہتا ہوں۔“ زبیر نے اپنی کرسی سنبھال لی۔

”آج تاریخ کیا ہے؟“ بیٹھتے بیٹھتے اچانک نتاشا نے پوچھا۔

”آج شاید دس تاریخ ہے۔“ زبیر نے آملیٹ کی پلیٹ اُٹھاتے ہوئے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

"واقعی آج دس تاریخ ہے؟" نتاشا کپ میں چائے ڈالنے لگی۔
"جو بھی تاریخ ہے۔ چھوڑو اس بات کو یہ بتاؤ آج تم سارا دن کیا کررہی ہو؟" زبیر نے نتاشا کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑا۔
"اس بے چاری بلبل نے کیا کرنا ہے۔ اِس ڈال سے اُس ڈال پر اور اُس ڈال سے اِس ڈال پر......" نتاشا نے اپنے چہرے پر مصنوعی معصومیت سجاتے ہوئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور پھر سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی اس بات اور ادا پر زبیر ہنسا تو نتاشا بھی ہنسنے لگی۔
ناشتا کرنے کے بعد زبیر اپنا دفتری بیگ لے کر چلا گیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے زبیر مسکرایا۔ اس نے جان بوجھ کر صحیح تاریخ نہیں بتائی تھی۔ اسے یاد تھا کہ آج ان کی شادی کی پہلی سالگرہ ہے اور وہ شام کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ نتاشا برتن سمیٹنے لگی۔ اس کی کام والی تین دن سے چھٹی پر تھی اور ابھی اس کے کام پر واپس آنے میں مزید دو دن باقی تھے۔
نتاشا ابھی کچن میں ہی تھی کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ گھر کی خاموشی میں وہ بیل کسی گھڑیال سے کم نہیں تھی۔ نتاشا نے موبائل فون اُٹھایا تو اس کی دوست سنبل کی کال تھی۔
"کیسی ہو سنبل؟" فون کان سے لگاتے ہی نتاشا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
سنبل نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے عجلت میں پوچھا۔ "تم گھر پر ہو اور زبیر بھائی تو پاس نہیں ہیں؟"
"کیا بات ہے سنبل؟ خیریت تو ہے۔ تم کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو؟" اس کی بات سن کر نتاشا نے جلدی سے پوچھا۔
"پہلے مجھے میری بات کا جواب دو۔ تم اکیلی ہو؟" اس نے اپنے سوال پر اصرار کیا۔
"ہاں میں اس وقت اکیلی ہوں۔" نتاشا نے جواب دیا۔
"اب میری بات دھیان سے سنو۔ میں صبح سے گھر سے نکلی ہوئی ہوں اور اس وقت سرمد کے ساتھ ہوں۔"
"تم سرمد کے ساتھ ہو؟" نتاشا نے سنتے ہی حیرت کا اظہار کیا۔
"تم جانتی ہو کہ میں سرمد سے محبت کرتی ہوں۔ امی سے بھی سرمد کے بارے میں بات کی تھی لیکن انہوں نے میری بات سنتے ہی مجھے ڈانٹ دیا اور آئندہ ایسی بات کرنے سے بھی منع کر دیا۔ لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں تو رات سے بھاگ جانے کے لیے تیار تھی لیکن مجھے موقع منہ اندھیرے ملا۔ میں اس وقت سرمد کے ساتھ ہوں لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ میرے گھر والوں کو میرے نکلنے کے کچھ دیر بعد ہی پتا چل گیا اور وہ اب میرے پیچھے ہیں۔ سرمد کا دوست میرے گھر کے باہر نگرانی پر موجود تھا اور اسی نے بتایا ہے۔" سنبل نے تفصیل بتائی۔
"یہ تم نے کیا کر دیا ہے سنبل؟ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ سرمد تمہارے قابل نہیں ہے تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔" نتاشا جلدی سے بولی۔
"ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ بات میں تم کو کئی بار بتا چکی ہوں۔ اور اب ہم نکاح کرنا چاہتے ہیں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" سنبل بولی۔
"میری بات مانو اور فوراً واپس اپنے گھر چلی جاؤ۔ تم بہت غلط کررہی ہو۔" نتاشا نے اسے سمجھانا چاہا۔
"میں نے تم سے کوئی مشورہ نہیں مانگا ہے۔ تم میری پرانی اور ہم راز دوست ہو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم میرے گھر جاؤ اور انہیں سمجھاؤ کہ وہ مجھے تلاش کرنے کے بجائے اطمینان سے گھر بیٹھ جائیں۔ سرمد میری پسند ہے اور ہم نکاح کر رہے ہیں، ان کو بالکل کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" سنبل نے تیز لہجے میں بات کی۔
"سنبل......تم جذباتی ہو کر مت سوچو۔ سرمد تم سے محبت نہیں کرتا ہے وہ تم سے پیسوں کے لیے شادی کر رہا ہے۔ اُس کی نظر تمہارے ابو اور بھائیوں کے پیسے پر ہے۔" نتاشا نے ایک بار پھر سمجھایا۔
"تم میری مدد کرو گی یا نہیں؟" سنبل پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں تھا، اس نے دوٹوک پوچھا۔
"میں پھر کہتی ہوں......" نتاشا نے کہنا چاہا۔
"تم میری مدد کرنا چاہتی ہو، یا نہیں...... اگر ہمارا آج نکاح نہ ہوا تو ہم دونوں جان دے دیں گے اور ہماری لاشیں بند کمرے میں پڑی ملیں گی۔" سنبل غصے سے بولی۔
نتاشا ایک لمحے کے لیے چپ ہو گئی "تم اس وقت کہاں ہو؟"
"تم میری مدد کرو گی یا مجھے دھوکا دینے کے لیے پوچھ رہی ہو؟" سنبل نے تصدیق چاہی۔
"میں تمہاری مدد کے لیے پوچھ رہی ہوں۔ میں سنبل کو کھونا نہیں چاہتی۔" نتاشا نے کہا۔
"مجھے معلوم تھا تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ تم میری بہت اچھی دوست ہو۔ سرمد بہت اچھا ہے، نکاح کے بعد میں

تمہارے ہر ابہام کو دور کردوں گی۔ تم میرے گھر جاؤ گی؟‘‘ سنبل خوش ہوگئی۔

’’میں تمہارے گھر جاتی ہوں اور انہیں سمجھاتی ہوں۔‘‘ نتاشا ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

’’تم میرے گھر جاکر اُن سے بات کرو۔ میرے بھائی جو مجھے جگہ جگہ تلاش کررہے ہیں، وہ واپس گھر چلے جائیں تاکہ ہم آسانی سے نکاح کرسکیں۔ اس کے بعد تم میرے پاس آجانا مجھے تمہاری گواہی کی ضرورت ہے۔‘‘ سنبل نے کہہ کر اس جگہ کا پتا بتا دیا جہاں وہ سرمد کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ ’’میرے گھر والوں کو صاف کہہ دینا کہ اگر مجھے نکاح کرنے نہ دیا گیا تو ہم دونوں اپنی جان لے لیں گے۔ یہ بات تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ مجھے تم پر اپنے آپ سے بھی زیادہ اعتماد ہے۔‘‘

’’میں ابھی تمہارے گھر جارہی ہوں۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اپنی جان کو نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔‘‘ نتاشا بولی۔

’’تم میرا ساتھ دے رہی ہو تو میں اپنی جان کو کیوں نقصان پہنچاؤں گی۔‘‘ دوسری طرف سے سنبل کی آواز آئی۔

نتاشا نے فون بند کیا اور جلدی سے تیار ہونے کے بعد اس نے پہلے سنبل کے باپ کو کال کی اور رابطہ ہونے کے بعد سنبل کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ’’مجھے ابھی سنبل کی کال آئی تھی۔ آپ ایسا کریں گرین چوک کے پاس بھائیوں کو بھیج دیں اور میں بھی وہاں پہنچ رہی ہوں، وہ میرا انتظار کریں۔‘‘

وہ گھر سے باہر نکلی اور تیز تیز چلتی چوک تک پہنچی اور وہاں سے ایک ٹیکسی لے کر وہ سنبل کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

آگے چوراہا آیا تو ریڈ لائٹ پر ٹیکسی رک گئی۔ اسی وقت ایک اور کار اس کے برابر میں آرکی۔ اس کار کے کالے شیشے تھے۔ اندر کون بیٹھا ہے نظر نہیں آرہا تھا۔ نتاشا سامنے دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس کی غیر ارادی طور پر اپنے دائیں طرف نظر پڑی تو وہ چونک گئی۔

اس کار کی پچھلی سیٹ کا شیشہ اتنا نیچے تھا کہ اندر براجمان شخص کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں اور وہ دو نگاہیں مسلسل نتاشا کو دیکھ رہی تھیں۔ نتاشا کی نظر بھی ان نگاہوں پر ٹھہر گئی اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ نتاشا ان آنکھوں کو پہچانتی تھی۔ وہ وہی آنکھیں تھیں، نتاشا کے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف عیاں ہوگیا۔ اُس کے دل کی دھڑکن اور سانس تیز ہوگئی۔ اس نے ایک دم نظریں ہٹا دیں اور مضطرب اشارہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ اسی اثنا میں گرین لائٹ جلی تو اس کی ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

نتاشا کے اندر بے چینی دوڑ رہی تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملنے لگی تھی۔ اس نے گردن گھما کر متوحش نظروں سے اپنے عقب میں دیکھا، اسے وہ کار دکھائی نہیں دی۔ اس کے بعد اس نے اپنے دائیں بائیں اور پھر متلاشی نظروں سے سامنے دیکھا تو وہ کار غائب تھی۔

جب تک ٹیکسی اپنی منزل پر نہیں پہنچی، نتاشا گھبرائی نظروں سے اس کار کو ہی تلاش کرتی رہی تھی۔ کار اس جگہ رکی تو نتاشا نے اپنے پرس سے پیسے نکال کر کرایہ دیا اور دروازہ کھولتے ہی اس نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھا اور باہر نکل گئی۔

ابھی وہ کچھ ہی آگے گئی تھی کہ سنبل کا بھائی اُس کے پاس آگیا۔ ’’کہاں ہے سنبل؟‘‘

’’پہلے مجھ سے وعدہ کرو کہ تم لوگ کچھ نہیں کرو گے۔ سنبل کو لوگے اور گھر چلے جاؤ گے۔‘‘ نتاشا ایک طرف چل رہی تھی۔

’’ہم وعدہ کرتے ہیں کہ کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جس سے کوئی ہنگامہ ہو۔‘‘ اس نے جلدی سے کہا۔

’’تم لوگ گھر جاکر بھی سنبل کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے؟‘‘ نتاشا نے ایک اور وعدہ لیا۔

’’ہم وعدہ کرتے ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’تم میرے پیچھے چلو اور ذرا فاصلہ رکھنا۔‘‘ نتاشا کہہ کر آگے چلنے لگی۔ سنبل کے ساتھ اس کی پرانی دوستی تھی اس لیے اس کے گھر والے بھی نتاشا کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔

سنبل کا بھائی آہستہ چل رہا تھا۔ نتاشا چلتے ہوئے ایک گلی میں چلی گئی۔ وہ گلی کشادہ نہیں تھی۔ ایک مکان کے سامنے رک کر نتاشا نے دستک دی تو تھوڑی دیر کے بعد اندر سے کسی نے دروازے کی درز سے باہر دیکھا اور دروازہ کھولا تو سامنے سرمد کھڑا تھا جو اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک کمرے سے سنبل باہر نکلی اور آتے ہی پوچھا۔ ’’تم نے میرے گھر والوں سے بات کی ہے؟‘‘

نتاشا نے ایک نظر سرمد کی طرف دیکھ کر سنبل سے کہا۔ ’’یہ مجھے دیکھ کیسے رہا ہے؟‘‘

’’جب تم اس سے یہ کہہ رہی تھیں کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں تو وہ باتیں میں سن رہا تھا۔ اگر تم سنبل کی دوست نہ ہوتیں تو میں تمہیں بتاتا کہ تمہیں میرے بارے میں ایسا کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔‘‘ سرمد کو اس کی بات پر غصہ تھا۔

’’سرمد...... تم اندر چلو۔ یہ میری دوست ہے اور ہماری مدد کررہی ہے۔‘‘ سنبل نے فوراً کہا۔

سرمد اسی جگہ کھڑا پیچ و تاب کھانے لگا۔ نتاشا اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ”میں اب بھی یہ کہتی ہوں کہ تم اس کے قابل نہیں ہو۔ یہ معصوم ہے اور تم ایک شاطر شخص ہو۔“

”میں شاطر ہوں؟“ وہ غصے سے نتاشا کو گھورنے لگا۔ ”ایسی کیا بات تم نے دیکھ لی ہے کہ تم میرے سامنے مجھے شاطر کہہ رہی ہو؟“

سنبل نے پھر مداخلت کی۔ ”سرمد تم چپ رہو۔“

”یہ میری بےعزتی کرے اور میں چپ رہوں؟“ سرمد بولا۔ ”میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں اور شاید یہ بات اس عورت سے برداشت نہیں ہو رہی۔“

”تمیز سے بات کرو۔“ نتاشا غصے سے بولی۔

”یہ جو میں تم سے اس طرح سے بات کر رہا ہوں، یہ تمیز ہی ہے۔ سنبل کو میرے خلاف ورغلانے کی سزا میں تمہیں تمہاری شہ رگ کاٹ دیتا۔“ سرمد کی سرخ آنکھیں نتاشا کے چہرے پر منجمد تھیں۔ اس کے سفاک لہجے نے نتاشا کو خوفزدہ کر دیا تھا۔

نتاشا اسی وقت سنبل کی طرف گھومی۔ ”دیکھا تم نے...... یہ ایک سفاک انسان ہے، جو مجھے قتل کر دینے کی بات تمہارے سامنے کر رہا ہے۔ یہ ہے اس کا اصل چہرہ۔ اسی لیے میں تم سے کہتی ہوں اس سے شادی مت کرو۔“

”تم اپنی بکواس بند کرتی ہو یا میں کچھ ایسا کروں کہ تمہاری زبان بند ہو جائے۔“ سرمد نے نتاشا کا بازو پکڑ کر نچوڑا۔ ”تم نکلو یہاں سے۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سنبل، تم سے کہا تھا اسے مت بلاؤ۔ کورٹ تک میں تمہیں لے جاؤں گا۔“ نتاشا نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس سے چھڑایا۔

سنبل نے نتاشا کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف لے گئی۔ سرمد اسی جگہ کھڑا غصے سے تلملاتا رہا۔ سنبل بولی۔ ”میں نے تم سے فون پر بھی کہا تھا کہ مجھے تمہاری کسی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہماری مدد کرنا چاہتی ہو تو ہمارے پاس آجاؤ اور تم نے یہاں آکر بھی وہی باتیں شروع کر دی ہیں۔“

”سنبل تم سمجھنے کی کوشش کرو، یہ وہ نہیں ہے جو تم کو دکھائی دے رہا ہے۔ یہ ایک خطرناک انسان ہے۔“ نتاشا اسے کچھ اور آگے لے گئی اور اس نے یہ بات کہتے ہوئے اپنا لہجہ دھیما رکھا۔ کچھ فاصلے پر کھڑا سرمد اس کی بات کو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ نتاشا کا اس طرح دھیمے انداز میں بولنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اُس کا چہرہ غصے سے مزید سرخ ہو گیا۔

”بہت ہو گیا نتاشا...... اب تم یہاں سے چلی ہی جاؤ تو بہتر ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ اچھا ہوتا اگر میں سرمد کی بات مان کر تم کو یہاں مدد کے لیے نہ بلاتی۔“

”پاگل مت بنو۔“ نتاشا نے کہنا چاہا۔ اسی اثنا میں سرمد سرعت سے ان کی طرف بڑھا اور اس نے نتاشا کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا دروازے تک لے گیا۔

”تم یہاں سے نکلو......“ سرمد نے کہتے ہوئے دروازہ کھولا اور نتاشا کو باہر دھکا دینا ہی چاہتا تھا کہ رک گیا اور اس کی خیرہ نگاہیں باہر جم گئیں۔ سنبل کے بھائی باہر کھڑے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گئے اور ایک نے سرمد سے نتاشا کا بازو چھڑایا اور اسے ایک طرف دھکا دے دیا۔

سرمد دیوار سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ سنبل تیزی سے سرمد کی طرف بڑھی اور اس کے قدم اسی جگہ رک گئے۔ اس کے دونوں بھائی اپنی بہن کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”آپ چپ چاپ سنبل کو لے جائیں اور گھر جا کر بھی اسے کچھ نہیں کہیں گے...... آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔“ نتاشا نے کہا۔ ”مجھے اس بات کا یقین ہے کہ سنبل اب دوبارہ نادانی نہیں کرے گی۔“

”تم انہیں اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں؟“ سنبل نے نتاشا کی طرف دیکھا۔ سرمد اسی جگہ گرا پڑا تھا اور اس کی نظریں نتاشا پر مرکوز تھیں جن میں خون اترا ہوا تھا۔

”میں نے جو کچھ بھی کیا، تمہاری بھلائی کے لیے ہی کیا تھا۔ میں تم کو اس حیوان سے بچانا چاہتی تھی۔“ نتاشا نے کہا۔

سنبل کا ایک بھائی آگے بڑھا اور اس نے سنبل کا بازو پکڑتے ہوئے اسے خبردار کیا۔ ”چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو...... ہم اپنے وعدے کی پاسداری اس وقت تک کریں گے جب تک تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گی جو ہمیں اپنا وعدہ توڑنے پر مجبور کر دے۔“

سنبل کے بھائی کے لہجے میں ایسی ہی بات تھی کہ سنبل نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے بھائیوں کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے پیچھے ہی نتاشا بھی چلی تو سرمد نے غصے سے کہا۔ ”اپنی سانسیں گن لو......“

”میری سانسیں تمہارے اختیار میں نہیں ہیں۔“ نتاشا بلاتامل بولی۔

”تم نے میرا کھیل بگاڑا ہے۔ میں تم کو معاف نہیں کروں گا، ایسی سزا دوں گا کہ تم یہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہو گی کہ سزا ملی کیا ہے۔“ سرمد غصے سے ہانپ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر نتاشا نے بے پروائی سے سر کو جھٹک دیا۔

سنبل کو اس کے بھائی لے گئے اور نتاشا چوک کی طرف چلی گئی۔ اسے ٹیکسی اسی جگہ سے ملتی تھی۔ اسی وقت وہی کار سرعت سے آئی اور نتاشا کے آگے کھڑی ہوگئی۔ نتاشا کے چلتے قدم اسی وقت تھم گئے۔ اس نے متوحش نظروں سے دیکھا کہ کار کا سیاہ شیشہ اتنا ہی نیچے ہوا کہ اندر براجمان شخص کی محض آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں، جو اس پر منجمد تھیں۔

نتاشا نے اسی وقت اپنا راستہ بدلا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی دوسری طرف چلنے لگی۔ نتاشا کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ آگے جاتے ہی اسے ایک خالی رکشا مل گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی اپنی کالونی کا نام بتایا اور جلدی چلنے کو کہا۔ رکشا ڈرائیور نے رکشا اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

نتاشا سارے راستے بار بار دائیں بائیں اور کبھی گردن گھما کر عقب میں دیکھتی رہی۔ اس دوران میں اس کا گھر آ گیا اور وہ رکشا کا کرایہ ادا کرنے کے بعد تیز قدم اُٹھاتی اپنے گھر کے دروازے تک پہنچی اور اس وقت بھی وہ دائیں بائیں دیکھتی ہوئی قفل میں چابی ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دھیان دوسری طرف ہونے کی وجہ سے وہ قفل میں چابی نہیں ڈال سکی اور پھر اس نے دھیان سے چابی لگائی اور گیٹ کھول کر اندر گئی اور فوری گیٹ بند کر دیا۔

گھر کے اندر جاتے ہی جیسے نتاشا کو سکون سا آ گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر اسی جگہ رک کر اپنی سانس اور دل کی منتشر دھڑکن کو ٹھیک کیا اور اس کے بعد وہ مین دروازے کی طرف بڑھی۔

جس وقت نتاشا ٹی وی لاؤنج میں گئی تھی اسی وقت کسی نے گیٹ کے قفل میں چابی ڈالی اور اسے گھما کر گیٹ کا قفل کھولا تھا۔

☆☆☆

نتاشا کی لاش فرش پر پڑی تھی اور زبیر اس سے کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ وہ غم سے نڈھال تھا اور پولیس آ کر اپنی تفتیش میں مصروف تھی۔ گھر کے اندر سے ثبوت تلاش کیا جا رہا تھا۔ مختلف زاویوں سے قتل کا معاملہ دیکھا جا رہا تھا۔ نتاشا کا موبائل فون تلاش کرنے پر بھی کہیں سے نہیں ملا تھا۔

زبیر نے پولیس کے سوالوں کے جواب دے دیے تھے اور بتا دیا تھا کہ جب وہ گھر آیا تو اسے نتاشا کی لاش یہاں پڑی ملی تھی۔

انسپکٹر جلال ایک طرف کھڑا نتاشا کے بے جان جسم اور غم سے نڈھال زبیر کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر جلال کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ اس کی توند نکلی ہوئی تھی اور چہرے پر مونچھیں ایسی تھیں کہ لگتا تھا جیسے وہ کوئی پولیس والا نہیں بلکہ جرائم پیشہ ہو۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت اور چہرے پر کرختگی عیاں تھی۔

اچانک وہ اپنے اہلکار کی طرف گھوما۔ ”کوئی چیز ملی......؟“

”کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے ہمیں کوئی مدد مل سکے۔“ اہلکار نے جواب دیا۔

انسپکٹر جلال نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور زبیر کی طرف بڑھا۔ ”ہم لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جا رہے ہیں۔“ انسپکٹر جلال کی بات سن کر زبیر نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تو انسپکٹر جلال مزید بولا۔ ”قاتل نے بڑی صفائی اور ہوشیاری سے قتل کیا ہے۔ کوئی ثبوت نہیں چھوڑا۔ انگلیوں کے نشان تک نہیں ہیں۔ آپ کو کسی پر شک ہو تو مجھے ضرور مطلع کریں۔“ انسپکٹر جلال کہتا ہوا بک شیلف کی طرف متوجہ ہو گیا اور ایک ایک قرینے سے رکھی کتاب کے نام دل ہی دل میں پڑھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے زبیر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یہ کتابیں، ناول آپ پڑھتے ہیں؟“

زبیر اپنے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے انسپکٹر جلال کا سوال بھی پوری طرح سے نہیں سنا تھا اور غیر ارادی طور پر اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔ زبیر کی ہلتی گردن کو دیکھ کر انسپکٹر جلال کی آنکھوں کی چمک جیسے دو چند ہوگئی۔ اس نے ایک بار پھر کتابوں کی طرف دیکھا اور ایک ہی قطار میں لگی جرم و سزا کی کتابوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ اپنے اہلکار کی طرف بڑھا اور اسے اشارہ کیا اور نتاشا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے۔ زبیر گم صم سا اسی جگہ کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

تین دن کے بعد اچانک زبیر کو نادر کا خیال آیا۔ جس دن نتاشا کا قتل ہوا تھا، وہ اسی دن اس کے آفس آیا تھا۔ جب زبیر نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا تو اس نے بُرے انجام کی دھمکی دی تھی۔

زبیر نے اسی وقت نصیر کو کال کی اور اُسے اپنے آفس میں لگے کیمرے سے نادر کی تصویر بھیجنے کو کہا۔ نصیر نے جلدی ہی اس کی چند تصویریں لے کر زبیر کو بھیج دیں۔ زبیر نے ان تصویروں کو غور سے دیکھا اور پولیس اسٹیشن انسپکٹر جلال کے پاس جا پہنچا۔

زبیر کے موبائل میں موجود نادر کی تصویروں کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نے موبائل فون زبیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اس شخص پر شک ہے۔ اس نے سنگین

دھمکی دی تھی؟"

"جی بالکل۔" زبیر بولا۔

"یہ آپ کے پاس اسی دن آیا تھا جس دن آپ کی بیوی کا قتل ہوا تھا۔" انسپکٹر جلال نے اگلا سوال کیا۔

"یہ اسی دن آیا تھا اس میں کوئی شک نہیں ہے۔" زبیر نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

انسپکٹر جلال نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ "اس دن گیارہ تاریخ تھی۔ اب آپ میرے ساتھ آیئے۔" انسپکٹر اپنی کرسی سے اُٹھا تو زبیر کچھ نا سمجھتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور اس کے پیچھے حوالات کے سامنے جا پہنچا۔

حوالات میں اس وقت پانچ آدمی تھے۔ ان میں ایک دوسری طرف منہ کیے لیٹا تھا۔ انسپکٹر نے بارعب آواز میں اس شخص کو مخاطب کیا۔ "اُٹھ کے ادھر آ او ئے۔"

انسپکٹر کی آواز سن کر وہ شخص اُٹھا اور جونہی ان کے سامنے آیا، زبیر چونک گیا۔ وہ نادر تھا۔

"یہی ہے وہ؟" انسپکٹر جلال نے زبیر سے تصدیق چاہی۔

"ہاں بالکل یہی ہے۔" زبیر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"دس تاریخ کو اسے کار چوری کے الزام میں، میں نے گرفتار کیا تھا۔ یہ پولیس ریمانڈ میں ہے۔ چاہیں تو آپ رجسٹر دیکھ سکتے ہیں۔"

زبیر کے لیے انسپکٹر کی بات کا یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا...... یہ شخص گیارہ تاریخ کو میرے آفس آیا تھا اور اس نے مجھے سنگین دھمکی دی تھی۔"

"صاحب...... یہ کون ہے؟" نادر کے سوال نے زبیر کو چونکا دیا۔

"میرا ایک ملازم جو میرے گودام سے چوری کرتا رہا تھا تم اُس کے لیے میرے پاس آئے تھے۔ تم نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں اپنا کیس ختم کر کے اسے اس الزام سے بری کرواؤں......"

"میں نے یہ بات کی تھی؟ وہ بھی گیارہ تاریخ کو جبکہ میں دس تاریخ کو یہاں تھا۔" نادر مسکرایا۔

"میرے پاس اس کی ویڈیو موجود ہے۔ جب یہ میرے آفس میں آیا تھا۔" زبیر جلدی سے بولا۔

"آپ میرے ساتھ آ جائیں۔" انسپکٹر کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو زبیر بھی اس کے پیچھے آ گیا...... وہ اُلجھا ہوا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے، گیارہ تاریخ کو اس کے آفس میں آ کر اسے دھمکی دینے والا شخص دس تاریخ کو حوالات میں بند تھا؟

"آپ کی تسلی ہو گئی ہے، یا میں کچھ اور بھی دکھاؤں؟" انسپکٹر نے اپنی نشست پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

زبیر تذبذب کا شکار تھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے......"

"میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کوئی اور ہو گا اور اس کی شکل اس آدمی سے بہت ملتی جلتی ہو گی۔"

انسپکٹر جلال کی بات سن کر تھوڑی دیر تک زبیر اُسے دیکھتا رہا۔ اس کی یادداشت ایسی بھی کمزور نہیں تھی کہ وہ نادر کو پہچان نہ سکے۔ صاف ظاہر تھا کہ انسپکٹر اور نادر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ زبیر کو یقین سا ہو گیا تھا کہ نتاشا کو اسی نے مارا تھا...... اگر ایسا نہ ہوتا تو دونوں مل کر اتنا بڑا کھیل نہ کھیلتے......

زبیر بغیر کچھ کہے وہاں سے اٹھ گیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ سوچنے لگا کہ اب اسے یہ کیسے ثابت کرنا ہو گا کہ نادر ہی نتاشا کا قاتل ہے۔ جو کھیل دونوں مل کر کھیل رہے تھے، زبیر کو ان سے بھی بڑی بساط بچھانی پڑے گی۔ زبیر سوچتا ہوا گاڑی اس جگہ سے لے گیا۔

☆☆☆

زبیر جب گھر پہنچا تو شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ گھر میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور خاموشی ایسی تھی جیسے پھن پھیلائے سانپ ہو کہ ابھی ڈس لے گا۔ اس نے گیراج کا بلب جلایا اور اندر چلا گیا۔ ٹی وی لاؤنج کو روشن کرنے کے بعد وہ اسی جگہ کھڑا رہا اور ایک ایک چیز کو دیکھتا رہا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ابھی نتاشا کچن سے مسکراتی ہوئی نکل کر اس کے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔

وہ بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں گیا اور اندھیرے میں ڈوبے کمرے کے سوئچ بورڈ کو تلاش کیا اور ایک ساتھ کئی بٹن دبا دیے۔ کمرا یکدم روشن ہو گیا۔ اس نے اسی جگہ رک کر دائیں سے بائیں دیکھا۔ ہر چیز اُسی طرح اپنی جگہ موجود تھی۔ اسی کمرے میں نتاشا کو قتل کیا گیا تھا اور اس کے پھیلے ہوئے خون کو ایسے صاف کر دیا تھا کہ دیکھ کر لگتا نہیں تھا، اس فرش پر نتاشا کا خون گرا تھا۔

ایک عجیب سی وحشت ہوئی اور بمشکل روکے ہوئے آنسو چھلک پڑے۔ وہ روتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور دوسرے کمرے میں جاتے ہی اس نے ایک دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔ اس کمرے میں مکمل اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں زبیر کی سسکیوں کی آواز بہت دیر تک آتی رہی تھی۔

صبح کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ دھوپ رفتہ رفتہ پھیل رہی

تھی۔ رات جانے کب کرسی پر روتے ہوئے زبیر سو گیا تھا۔ وہ کرسی پر گٹھڑی کی صورت پڑا تھا۔ اس نے ایک دم جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں اور خالی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

زبیر نے غیر ارادی طور پر کچن کی طرف دیکھا اور باتھ روم چلا گیا۔

پانی کھول کر اس نے اپنے چہرے پر اپنے ہاتھوں کے پیالے سے پانی ڈالا اور سر اوپر کر کے جونہی اس کی نظر شیشے پر پڑی، وہ خود کو دیکھتا رہا۔ چند دنوں میں اس کا چہرہ ویرانی کی تصویر بن گیا تھا۔

''ایسے کام نہیں چلے گا۔''

زبیر نے خود کو مخاطب کیا۔ اس نے اسی وقت شیو کی، نہایا اور باہر نکل کر پہلے اپنے لیے چائے تیار کی، کیبن سے ایک بکس نکال کر اس کے اندر سے بسکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور ڈائننگ ٹیبل پر چلا گیا۔

وہ ناشتا کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ''ایسے کام نہیں چلے گا۔ انسپکٹر جلال بدنیت انسان ہے۔ نادر سے ملا ہوا ہے۔ اس وقت انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ انسپکٹر جلال ہے...... وہ قاتل تک پہنچنے نہیں دے گا اور ثنا شا کے قتل کی فائل گرد کے حوالے کر کے اس کیس کو ماضی کی تیخ یاد بنا دے گا۔ اُسے خود کھوج لگانا پڑے گا...... خود قاتل تک پہنچنا پڑے گا...... اب وہ روئے گا نہیں بلکہ قاتل کے گریبان تک اپنا ہاتھ لے جا کر اسے سب کے سامنے لے کے آئے گا......''

زبیر نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کے بعد اس کے چہرے پر وہ ویرانی معدوم ہو گئی تھی جو اس سے قبل عیاں تھی۔

وہ پوری توانائی سے تیار ہوا اور آفس چلا گیا۔ اس نے ایک میٹنگ بلائی اور چند دن کے لیے اپنی مصروفیت کا بتا کر تمام ذمے داری اپنے قابلِ اعتماد جنرل منیجر شکیل احمد کے کندھوں پر رکھ کر آفس سے چلا گیا۔ اس سے قبل جب... زبیر اور ثنا شا چھٹیاں منانے بیرونِ ملک گئے تھے تو ساری ذمے داری ساٹھ سالہ ایماندار شخص شکیل احمد ہی پوری کرتا تھا۔

کار میں بیٹھتے ہی زبیر نے ٹائی اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ کوٹ اتار کر پچھلی سیٹ پر اچھال دیا اور گاڑی نکال کر اس جگہ سے لے گیا۔

☆☆☆

سب سے پہلے زبیر نے اپنے ایک دوست کی توسط سے جیل تک رسائی حاصل کی۔ وہاں اس کا وہ ملازم قید تھا جس نے اس کے گودام سے چوری کی تھی اور جس کی خاطر نادر نے آ کر اسے دھمکی دی تھی۔

ملاقات کے لیے جب ملازم آیا تو وہ زبیر کو دیکھ کر چونک گیا۔ زبیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیسے گزر رہے ہیں دن اور رات......؟''

''قید میں کیا دن اور کیا رات......'' اس نے پھیکے سے انداز میں جواب دیا۔

''میں اپنا الزام واپس لینے کے لیے تیار ہوں۔ تمہاری رہائی کا انتظام بھی کر دیتا ہوں۔ جو تم نے کیا وہ بھی معاف کر دیتا ہوں۔ تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا۔'' زبیر متانت سے بولا۔

اس نے زبیر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''مجھے آپ کا کیا کام کرنا ہو گا؟''

''مجھے یہ بتانا پڑے گا کہ نادر کہاں رہتا ہے؟ مجھے اُس کا پتا چاہیے، وہ کرتا کیا ہے؟'' زبیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

زبیر کی بات سن کر اس کا ملازم متحیر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا اور اس نے پوچھا۔ ''آپ کس نادر کی بات کر رہے ہیں؟''

''میں اس نادر کی بات کر رہا ہوں جو تمہاری رہائی کے لیے میرے پاس آیا تھا۔ تمہارے خلاف کارروائی واپس نہ لینے پر اس نے مجھے دھمکی دی تھی۔'' زبیر بولا۔

''سر...... میں کسی نادر کو نہیں جانتا...... میرا کسی نادر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ملازم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکشاف کیا۔

اس کی بات سن کر زبیر کو حیرت نہیں ہوئی۔ ''اس کا مطلب ہے تم یہاں سے باہر نہیں نکلنا چاہتے ہو۔''

''آپ میری بات کا یقین کریں میں کسی نادر کو نہیں جانتا۔ ہمارے خاندان میں بھی نادر نام کا کوئی شخص نہیں ہے۔ میرے والدین اس شہر میں نہیں رہتے۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہیں ہے کہ میں یہاں قید ہوں۔'' اس بار زبیر چونکا۔

''ایسی بات ہے تو پھر نادر تمہارے لیے کیوں آیا؟ تم نے کسی کو تو بتایا ہو گا کہ تم یہاں ہو...... تمہارا کوئی دوست......؟''

''میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا سر...... میں نے جو کیا اس پر شرمندہ ہوں۔'' زبیر کے اس ملازم کی آنکھوں میں ندامت اور زبان پر سچائی عیاں تھی۔

زبیر حیران تھا۔ اس کے لیے یہ نیا انکشاف تھا۔ وہ خاموش ہو کر سوچنے لگا اور پھر اس نے کہا۔ ''تم واقعی سچ کہہ رہے ہو؟''

"میری بات کا یقین کریں، میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ مجھے یہاں سے رہا کرا دیں۔ میں جوئے کی وجہ سے چوری کرتا رہا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور میں یہاں قید ہوں۔ میرے والدین میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

زبیر تذبذب میں اُٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔ باہر نکل کر اس نے اپنے وکیل کو کال کی کہ وہ اس کے ملازم کی رہائی کا انتظام کردے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پھر نادر کو کس نے بھیجا......؟ اس کا مقصد کیا تھا؟

زبیر سوچوں میں گم رہا اور کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ شام کے وقت وہ ٹیرس پر بیٹھا تھا۔ جب سے وہ گھر آیا تھا، ایک بار بھی بیڈروم میں نہیں گیا تھا۔ اچانک اسے نصیر کی کال آگئی۔ وہ دھیمے لہجے میں بات کررہا تھا۔

"سر...... وہ آدمی جو آفس میں آیا تھا، وہ اس وقت میرے سامنے ہوٹل میں بیٹھا ہے۔"

نصیر کی بات سن کر زبیر چونکا۔ "تم نادر کی بات کررہے ہو......؟ کس ہوٹل میں ہے؟"

زبیر کے پوچھنے پر نصیر نے بتایا تو زبیر نے ہدایت کی۔ "جب تک میں آنہ جاؤں تمہیں اسی جگہ رہنا ہے۔ اور اگر وہ میرے آنے سے پہلے اُٹھ کر جائے تو تمہیں اس کا پیچھا کرنا ہے۔"

"جی بہتر سر۔" نصیر کی آواز آئی۔

زبیر اسی وقت اُٹھا اور کار نکال کر اس ہوٹل کی طرف چلا گیا جو کچھ فاصلے پر ایک ایسے علاقے میں تھا جہاں سڑک کنارے ایسے ہوٹل عام دکھائی دیتے تھے جہاں مزدور طبقہ زیادہ کھانا کھانے جاتا تھا۔

زبیر برق رفتاری سے وہاں پہنچا اور کار ایک طرف کھڑی کرکے اس ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ نصیر ہوٹل کے باہر ہی کھڑا تھا۔ اندر کھانا کھانے والوں کا رش تھا۔

"وہ بیٹھا ہے۔" نصیر نے ایک طرف اشارہ کیا تو وہ نادر ہی تھا جو کھانا کھانے میں مشغول تھا۔

"تم جاؤ۔" زبیر نے کہا اور نصیر اس جگہ سے چلا گیا۔ زبیر چلتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ نادر کے سامنے دال کی پلیٹ، روٹیاں اور سلاد رکھا تھا۔ وہ کھانا کھانے میں اتنا مشغول تھا کہ اس نے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے۔

زبیر نے کچھ توقف کے بعد سامنے والی کرسی کھینچی اور اس پر براجمان ہوگیا۔ زبیر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ اچانک کھاتے ہوئے نادر کی نظر اپنے سامنے براجمان زبیر پر پڑی تو وہ ایک دم چونکا اور اس کا چلتا ہوا منہ ساکت ہوگیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ میں حرکت ہونے لگی اور وہ اسی طرح کھانے میں مشغول ہوگیا جیسے وہ پہلے تھا۔

"انسپکٹر جلال نے تمہیں چھوڑ دیا......؟" زبیر نے پوچھا۔

"ضمانت کا قانون موجود ہے۔ میں کوئی حوالات توڑ کر باہر نہیں آیا ہوں۔" نادر اپنا کھانا ختم کرچکا تھا اور اس نے کہتے ہوئے اپنے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ عیاں کی اور پانی کا گلاس غٹا غٹ پینے کے بعد خالی گلاس میز پر رکھا اور زبیر سے پوچھا۔ "آپ اِدھر کہاں......؟ یہ تو ہم جیسے غریب لوگوں کا ہوٹل ہے۔ یہاں دال روٹی ملتی ہے۔"

"تم نے مجھے سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی۔ اسی دن میری بیوی کا قتل ہوگیا تھا۔" زبیر اس کی بات کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

زبیر کی بات سن کر وہ بولا۔ "میں کھانے کا بل دے دوں......" اس نے اُٹھنا چاہا۔

"بیٹھ جاؤ۔" زبیر نے دانت پیسے۔

اس نے زبیر کی آنکھوں میں جھانکا۔ "مجھے انسپکٹر جلال نے سب کچھ بتادیا تھا۔ میرا اس معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔"

"تم ایک دن پہلے کیسے گرفتار ہوگئے تھے؟ انسپکٹر کے ساتھ مل کر کیا کھیل کھیلا جارہا ہے؟"

"ہم کہیں اور جاکر بات کریں تو بہتر ہوگا۔ اس وقت یہاں رش ہوتا ہے اور کھانا کھانے کے بعد فضول بیٹھنا اور باتیں کرنا منع ہے۔" وہ کھڑا ہوگیا۔

اس کے ساتھ ہی زبیر بھی اُٹھا۔ "میری باتوں کو فضول مت کہو......"

"میں نے آپ کی باتوں کو فضول نہیں کہا ہے۔ ہوٹل والوں کی بات کی ہے۔ وہ کاؤنٹر پر بیٹھا آدمی باتیں کرتے ہوئے لوگوں کو گھورنے لگتا ہے...... میرے ساتھ چلو باہر نکل کر بات کرتے ہیں۔"

نادر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا اور اس کے پیچھے ہی زبیر بھی تھا۔ نادر نے بل ادا کیا اور باہر نکل کر ہوٹل سے ملحق ایک کھوکھے سے پان لے کر منہ میں رکھا اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر ایک طرف کھڑے زبیر کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور ایک دم اس نے سامنے کی طرف دوڑ لگادی۔

زبیر کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے

بھاگ کھڑا ہوا۔ نادر تیز بھاگ رہا تھا۔ زبیر کو باقاعدہ ورزش اور دوڑنے کی عادت تھی اس لیے اس کے لیے نادر کے تعاقب میں بھاگنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

نادر بھاگتا ہوا بازار سے نکل کر گلیوں میں گھس گیا۔ ایک گلی سے دوسری اور پھر تیسری میں داخل ہوتے ہی اس نے بھاگتے ہوئے جست لگائی اور ایک دیوار سے نکلے ہوئے جستی پائپ پر ہاتھ جمادیے۔ اس سے قبل کہ وہ اوپر کی طرف اپنا جسم کھینچ لیتا اور وہاں سے ایک کھڑکی سے اندر چلا جاتا، عین اسی وقت زبیر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے جست لگا کر اس کے پیروں کو پکڑا اور اسے نیچے لیتا ہوا آ گیا۔ دونوں نیچے گر گئے تھے۔ نادر کیونکہ اس کے نیچے تھا اس لیے اسے ہی چوٹ اور خراش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

آواز سن کر اوپر کی ایک کھڑکی کھلی اور اندر سے ایک آدمی کا چہرہ نمودار ہوا اور اس نے بارعب آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے...... کیا ہو رہا ہے؟''

زبیر نے اس کی طرف گھور کے ایسے دیکھا کہ وہ تاب نہ لا سکا اور اپنا منہ اندر کرتے ہوئے کھڑکی ایسے بند کر دی جیسے اندیشہ ہو کہ اس کا سر پھوڑ دیا جائے گا۔

زبیر نے اُٹھتے ہوئے اس کو گریبان سے پکڑ کر سیدھا کیا اور کھینچتا ہوا گلی سے باہر لے گیا۔ وہ سڑک تھی اور ایک طرف کھمبا تھا۔ زبیر نے اسے ایک جھٹکے سے کھمبے میں دے مارا۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو بچایا اور سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کچھ مت کہنا...... میں بھاگوں گا نہیں......''

''تم نے مجھے دھمکی دی تھی اور حوالات میں انسپکٹر جلال کے سامنے انکار کر دیا تھا کہ تم مجھے جانتے ہی نہیں ہو...... مجھے بتاؤ حقیقت کیا ہے ورنہ مجھ سے کسی نرمی کی توقع مت کرنا......'' زبیر کا لہجہ زہر آلود اور آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔

نادر ڈر گیا۔ ''دیکھو بھائی میں چھوٹا موٹا چور ہوں...... حوالات میں میرا آنا جانا لگا رہتا ہے...... جابر کے ساتھ میرا دوستانہ ہے...... میں نے ایک بڑے آدمی کی جیب صاف کی تھی تو اس کے آدمی میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ میں بھاگ کر جلال کے پاس پہنچ گیا۔ وہ راشی آدمی ہے۔ اسے کچھ پیسے دیے اور حوالات میں بیٹھ گیا......''

''تم نے مجھے جو دھمکی دی تھی...... وہ کیا تھی؟؟'' زبیر بولا۔

نادر نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں رات کے دو بجے گھر جا رہا تھا۔ میرے پاس ایک گاڑی رکی اور اندر بیٹھے ایک آدمی نے مجھ سے کہا میں گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔ مجھے کس چیز کا ڈر تھا، میں بیٹھ گیا۔ اس آدمی نے منہ پر ماسک چڑھایا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ گاڑی چلانے لگا۔ اور پہلے مجھے بتایا کہ وہ مجھے جانتا ہے، اس کے بعد اس نے آپ کے بارے میں بتایا اور پھر مجھے ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکال کر دیے اور کہا کہ میں آپ کے آفس جا کر وہ کہوں جو میں نے آپ کے آفس میں جا کر کہا تھا۔ دوسرے دن میں نے ویسا ہی کہا اور باہر نکل کر اس آدمی سے اور بھی پیسے لیے اور اپنی راہ لی۔''

زبیر نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ''تم بہت بڑے کہانی باز ہو، میرے ساتھ جھوٹ بول رہے ہو۔''

''میں نے سچ کہا ہے۔ مجھے کہانیاں سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بھی مجھے پیسہ دو اور جو کام کرانا ہے، وہ کرا لو سوائے کسی کو جان سے مار دینے کے......'' نادر نے بے پروائی سے کہا اور فٹ پر بیٹھ گیا۔

''تم عادی جھوٹے ہو، اعتماد سے جھوٹ بولتے ہو۔'' زبیر کو اس کی بات پر یقین نہیں تھا۔

''میں نے جو کہا ہے وہ بالکل سچ ہے، آپ یقین کرنا چاہیں تو کر لیں ورنہ میں سامنے بیٹھا ہوں مجھے سزا دے دیں۔''

زبیر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اسے لگا کہ نادر سچ کہہ رہا ہے۔

''جب وہ دوبارہ ملا تھا تو تم نے اُس کا چہرہ دیکھا؟''

''تب بھی اس نے ماسک چڑھایا ہوا تھا۔ کوئی امیر آدمی لگتا تھا۔ برانڈڈ کپڑے پہنے ہوئے تھے اور گاڑی بھی ایسی تھی کہ اس کے اندر بیٹھ کے مزہ آ گیا......'' نادر یاد کرتے ہوئے خوش ہو گیا۔

زبیر کے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ وہ آدمی کون تھا اور اس نے ایسا کہنے کو کیوں کہا تھا......؟ اس کے علاوہ وہ کتنا باخبر تھا کہ اسے معلوم تھا میرا ایک ملازم حوالات میں ہے۔ زبیر نے سوچتے ہوئے نادر کی طرف دیکھا جو پُرسکون اور بے فکری سے بیٹھا پان کی جگالی کر رہا تھا۔

''پتا نہیں کیوں مجھے تمہاری بات پر یقین آ رہا ہے۔'' زبیر بولا۔

وہ مسکرایا۔ ''نادر دو نمبری میں بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ صاحب چاہو تو میرا نمبر لکھ لو کام پڑے تو یاد کر لینا......''

''نمبر بولو......'' زبیر نے اپنا موبائل نکالا اور اس کا نمبر محفوظ کر لیا۔ پھر پوچھا۔ ''مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ جو تم نے اُس آدمی میں دیکھی ہو؟''

نادر سوچ میں پڑ گیا۔ ''ابھی تو کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔

میرے نمبر پر بیل دے دو، یاد آ گیا تو بتا دوں گا۔"
زبیر نے اس کے نمبر پر بیل دی تو اس نے نمبر دیکھا اور بولا۔ "ٹھیک ہے صاحب...... یاد رہے گا...... اب مجھے اجازت ہے۔"
"تم رہتے کہاں ہو؟"
وہ ہنسا۔ "جس بندے نے کھڑکی کھول کے رعب سے پوچھا تھا، وہ میرا ابا ہے، اپنی دوسری بیوی کے ساتھ اس کمرے میں رہتا ہے...... گلی کا تھانیدار ہے ہر اونچ نیچ میں بولے گا ضرور...... ایک بار پائپ پر چڑھ جاتا تو سیدھا اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کے اندر جا پڑتا...... ابا کے ساتھ والا کمرا میرا ہے...... آپ ڈھونڈ نہ پاتے۔" اس نے مسکرا کر زبیر کی طرف دیکھا۔
"میرا کام یاد رکھنا۔ اس آدمی کی کوئی چیز تم کو یاد آئے تو مجھے بتانا...... اگر مجھے تمہاری ضرورت پڑی تو تم میرے پاس پہنچ جانا۔" زبیر نے کہا۔
"صاحب چاند پر بھی بلاؤ گے تو آ جاؤں گا مگر مفت نہیں آؤں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔ زبیر نے اپنے پرس سے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔
"یہ رکھ لو...... مجھے کال کرنے کے لیے بیلنس ڈلوا لینا۔"
ابھی زبیر چند قدم ہی چلا تھا کہ عقب سے نادر کی آواز آئی "صاحب...... ایک بات کہوں...... انسپکٹر جلال بہت کمینہ انسان ہے، اس پر بھروسا مت کرنا۔"
زبیر کے رکے قدم پھر اٹھنے لگے اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب وہ ایک نئی اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ نادر کو ایسا کرنے کے لیے کس آدمی نے کہا تھا اور وہ باخبر آدمی کون تھا؟

☆☆☆

زبیر باہر سے کھانا لے آیا تھا اور سیدھا کچن میں چلا گیا تھا۔ وہ سالن ڈالنے کے لیے برتن ڈھونڈ رہا تھا۔ سب کچھ سامنے تھا لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا جس کی وجہ سے وہ اِدھر اُدھر دراز کھول کر جھانکتا اور بند کر دیتا تھا۔ ایسے ہی اس نے نیچے والے کیبن کا پٹ کھولا اور وہاں موجود برتنوں کو دیکھنے کے بعد وہ پٹ بند ہی کرنے والا تھا کہ اس کی نظر ثناشا کے پرس پر پڑی جو برتنوں کے پیچھے پڑا تھا اور اس کا ایک کونا دکھائی دے رہا تھا۔
زبیر نے متحیر نظروں سے دیکھا اور برتن ایک طرف ہٹا کر پرس نکال لیا۔ وہ ثناشا کا نیا پرس تھا جو اس نے زبیر کے ساتھ جا کر خریدا تھا۔ وہ پرس اٹھا کر ٹی وی لاؤنج میں آ گیا۔
اس نے زپ کھولی تو اندر اس کا موبائل فون بھی موجود تھا۔ موبائل فون بند تھا۔ اس نے آن کرنے کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ زبیر نے اس کا چارجر تلاش کیا اور اسے چارجنگ پر لگانے کے بعد اس کا پرس دیکھنے لگا۔
پرس کے اندر کچھ پیسے اور کئی دن قبل ہونے والی شاپنگ کی رسیدیں تھیں۔ اسے حیرت اس بات کی تھی کہ ثناشا نے اپنا پرس اس جگہ کیوں چھپایا تھا۔
زبیر کھانا کھانا بھول گیا تھا۔ اب اسے اس بات کی بے چینی تھی کہ موبائل فون چارج ہو اور وہ اسے دیکھے، شاید اسے کوئی مدد مل جائے۔
زبیر موبائل فون کے قریب ہی ٹہلتا رہا اور بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ جیسے ہی کچھ وقت گزرا وہ اسی جگہ بیٹھ گیا اور موبائل فون آن کیا۔ تھوڑی دیر بعد جب موبائل آن ہوا تو اس نے سب سے پہلے اس دن آنے اور جانے والی کالز دیکھیں۔
آنے والی کال میں سنبل کا نام تھا۔ زبیر جانتا تھا کہ سنبل اور ثناشا گہری دوست تھیں۔ ایک غیر محفوظ نمبر سے بھی مسلسل ثناشا کو تین کالز آئی تھیں۔ ثناشا نے وہ کالز سنی نہیں تھیں۔
زبیر سوچنے لگا کہ وہ نمبر کس کا ہے؟ وہ سوچتے ہوئے واٹس ایپ میں گیا تو اسی نمبر سے دو وائس میسج بھی آئے تھے جو کہ ثناشا نے سنے نہیں تھے۔ زبیر نے جلدی سے نیٹ آن کیا اور وہ میسج سننے لگا۔
پہلے میسج میں غصے بھری آواز سنائی دی۔ "تم نے اچھا نہیں کیا۔ میری اور سنبل کی شادی رکوا کر تم نے موت کو آواز دی ہے۔ تم جانتی نہیں ہو، میں کتنا خطرناک انسان ہوں۔ تم نے میرا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا......"
اس کے بعد دوسرا مختصر میسج تھا۔ "تم آج کی شام نہیں دیکھ سکو گی، یاد رکھنا۔"
اس کی آواز میں وحشت اور غصہ ایسا تھا کہ جیسے اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ فون کے اندر سے نکل کر ثناشا کا گلا دبا دیتا۔
دونوں میسج بار بار سننے کے بعد زبیر ششدر سا سوچ رہا تھا کہ یہ کون تھا......؟ ایک بات تو صاف تھی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، وہ سنبل سے شادی کرنا چاہتا تھا اور ثناشا ان کی شادی کی منصوبہ بندی میں مانع تھی اور اس وجہ سے وہ اس پر شدید ناراض تھا، اتنا ناراض کہ وہ اسے جان سے ہی مار دینا چاہتا تھا۔ اور شاید اس نے ثناشا کو مار ہی دیا تھا۔
سنبل اور اس کے گھر والوں سے زبیر متعدد بار ثناشا کے ساتھ مل چکا تھا۔ سنبل کے چھوٹے بھائی ضیا کا موبائل فون نمبر

بھی اس کے پاس تھا۔ زبیر جلدی سے اُٹھا اور اپنا موبائل فون اُٹھا کر ضیا کا نمبر تلاش کرنے لگا۔ وہ نمبر محفوظ تھا۔ جونہی اسے ملا اس نے کال ملائی اور مضطربانہ انداز میں ٹہلتے ہوئے کال اُٹھانے کا انتظار کرنے لگا۔ آخرکار ضیا کی آواز آئی۔

''ہیلو......''

''ضیا...... میں زبیر بول رہا ہوں۔'' زبیر اُس کی آواز سنتے ہی بولا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' دوسری طرف سے ضیا چہکا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ ایک ضروری کام ہے۔ ابھی ملنا چاہتا ہوں، ملاقات ہو سکتی ہے؟'' زبیر وقت ضائع کیے بغیر بولا۔

''ملاقات بالکل ہو سکتی ہے۔ سب ٹھیک ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''کہاں مل سکتے ہیں...... ابھی اسی وقت؟'' زبیر نے اس کا سوال نظرانداز کر دیا۔

''اس وقت آپ کہاں ہیں؟''

''میں اپنے گھر ہوں۔''

''میں گھر ہی جا رہا تھا پہلے آپ کے پاس آجاتا ہوں۔'' ضیا نے کہا۔

''کتنی دیر میں آجاؤ گے؟'' زبیر بے چین تھا۔

''بس دس سے پندرہ منٹ لگ جائیں گے۔''

''میں انتظار کر رہا ہوں۔'' زبیر نے کہہ کر فون بند کر دیا اور ایک بار پھر نتاشا کا فون لے کر بیٹھ گیا۔ وہ موبائل فون کو اچھی طرح سے چیک کرنے لگا کہ شاید اسے مزید کچھ مل جائے۔

زبیر اس وقت چونکا جب دروازے کی بیل ہوئی۔ اس نے فون ایک طرف رکھا اور جلدی سے جا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ضیا کھڑا تھا۔ وہ اس سے گرمجوشی سے ملا اور زبیر اسے اندر لے آیا۔

''آپ کچھ نروس لگ رہے ہیں، سب ٹھیک ہے نا؟'' اندر آتے ہوئے ضیا نے پوچھا۔

زبیر نے جوس کا ٹین پیک نکال کر اسے کھولا اور ضیا کی طرف بڑھا دیا۔ ضیا نے جوس پکڑ لیا۔

''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔'' زبیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کی بے چین کیفیت ایسی تھی کہ اس نے ضیا کو بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔ ضیا اس کے سامنے کھڑا تھا اور کچھ اندیشوں نے اسے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ اُس دن سنبل کی وجہ سے جو کچھ ہوا تھا اور سرمد نے کھلی دھمکیاں دی تھیں، وہ اسے سب یاد آنے لگی تھیں۔

''بات کیا ہے؟''

''سنبل کسی سے شادی کرنا چاہتی تھی اور نتاشا نے آپ کی یا سنبل کی کوئی مدد کی تھی؟'' زبیر نے پوچھا۔

ضیا نے دائیں بائیں نظر پھیر کر اس دن کا واقعہ اختصار سے بتا دیا اور پھر پوچھا۔ ''بھابی ٹھیک ہیں......؟''

زبیر نے کچھ توقف کے بعد بتایا۔ ''اسی دن نتاشا کا قتل ہو گیا تھا۔''

''کیا......؟'' ضیا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ اس نے جوس کا ٹن ایک طرف رکھا اور حیران نظریں زبیر پر جما دیں۔ ''اسی دن بھابی کا قتل ہو گیا؟ آپ نے بتایا ہی نہیں......''

''کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ کسے بتانا ہے اور کیا کرنا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔'' زبیر نے کہا۔

''یہ تو بہت دکھ بھری بات ہے، قاتل کا کوئی سراغ ملا......'' ضیا کے دماغ میں سرمد کی وہ دھمکیاں گردش کرنے لگی تھیں۔

''اب جو بھی کرنا ہے، مجھے ہی کرنا ہوگا۔ بہت دنوں کے بعد مجھے نتاشا کا فون اور اس کا پرس ملا......'' یہ کہتے ہوئے زبیر نے نتاشا کا موبائل فون اُٹھایا اور وہ میسج سنانے لگا۔ ضیا فوراً پہچان گیا تھا۔

''یہ سرمد کی آواز ہے۔''

''سرمد...... کہاں رہتا ہے وہ؟'' زبیر نے پوچھا۔

''جہاں سے ہم سنبل کو لے کر آئے تھے وہ جگہ بہت آسان ہے۔ میں سمجھا دیتا ہوں۔''

''تم اپنے گھر جا رہے ہو؟''

''ہاں میں گھر جا رہا ہوں۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ مجھے وہ جگہ دکھا دو۔'' زبیر نے نتاشا کے فون کا سوئچ آف کر کے اسے چارجر سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور ضیا کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

''سرمد کو شامل تفتیش کرنا ہے تو پولیس کو اطلاع کر دیتے ہیں۔ ان کو اس کے وائس میسج بھی سنا دیتے ہیں۔'' ضیا نے مشورہ دیا۔

''پولیس کچھ نہیں کرے گی۔ مجھے ہی سب کچھ کرنا ہے۔ مجھے وہ جگہ دکھا دو اور اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا کہ تم نے مجھے سرمد کا گھر دکھایا تھا۔'' زبیر نے چلتے ہوئے تاکید کی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے یہ خبر سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔ ابھی تک یقین نہیں

آرہا ہے۔ آپ فکر نہیں کریں، میں آپ کے ساتھ ہوں اور جیسی مجھ سے مدد چاہیے، میں حاضر ہوں۔'' ضیا نے کہا۔
''مجھے بس سرمد کا گھر دیکھنا ہے۔ سہیل سے اس بات کا بالکل بھی ذکر نہ کرنا کہ تم نے سرمد کا کوئی وائس میسج سنا ہے۔''
''میں سمجھتا ہوں۔'' ضیا نے اپنی بائیک سیدھی کی۔ زبیر اس کی بائیک پر بیٹھ گیا۔
جس محلے میں سرمد رہائش پذیر تھا، وہاں ایک گلی میں داخل ہونے سے قبل ضیا نے اپنی موٹر سائیکل روک لی اور زبیر سے کہا۔ ''میں یہاں سے سمجھا دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہم دونوں کو دیکھے اور کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔''
''یہ بہتر ہے۔'' زبیر کہتا ہوا بائیک سے اتر گیا۔ اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ ضیا نے ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ سرمد کا گھر ہے۔ اس گھر کے سامنے ایک درخت تھا جس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں، گلی چوڑی تھی اگر تنگ ہوتی تو وہ درخت آنے جانے والوں کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہوسکتا تھا۔
''ٹھیک ہے آپ جاؤ۔'' زبیر بولا۔
''میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔'' ضیا نے پیشکش کی۔
''بس آپ جاؤ اور اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرنا ہے۔'' زبیر نے کہا اور ضیا وہاں سے چلا گیا۔
زبیر خراماں خراماں چلتا اس مکان کے پاس پہنچا اور اس کا جائزہ لیتا ہوا آگے چلا گیا۔ اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور نادر کو کال کی۔ تھوڑی دیر بعد نادر کی آواز آئی۔ ''جی باس......''
''ایک کام ہے۔''
''میں حاضر ہوں۔''
''کام مفت نہیں کراؤں گا......'' زبیر نے یہ اس لیے کہا تھا تاکہ اسے تسلی رہے۔ اس کے بعد زبیر نے اسے محلے کا پتا سمجھایا اور وہاں جلدی پہنچنے کا کہہ کر گلی سے گھوم کر پھر بازار کی طرف چلا گیا۔ وہ محلے کا عام سا بازار تھا، جہاں خال خال دکانیں تھیں جبکہ اس محلے کا بڑا اور گنجان بازار اس سے کچھ آگے تھا جہاں تقریباً ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔
نادر جلد ہی پہنچ گیا تھا۔ نادر کو دیکھتے ہی زبیر اس کی طرف لپکا اور اسے ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں ایک مکان دکھاتا ہوں۔ تم کسی بھی طرح اس کے اندر جاؤ اور دیکھو کہ اندر کون کون ہے۔''
''کوئی فیملی ہے؟'' نادر نے پوچھا۔
''میری اطلاع کے مطابق وہ اس مکان میں اکیلا ہی رہتا ہے۔ اپنا موبائل فون سائلنٹ پر رکھنا اور مجھے اندر سے میسج کر دینا۔'' زبیر نے کہا۔
''میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' نادر نے کہہ کر سوالیہ نگاہوں سے زبیر کی طرف دیکھا۔ زبیر اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے اپنا پرس نکالا اور ہزار کے کچھ نوٹ نکال کر اس کی جیب میں ٹھونس دیے۔ نادر کی باچھیں کھل گئیں۔
''تم واپس آؤ گے تو میں تمہیں اسی جگہ ملوں گا۔'' زبیر نے کہا۔ نادر نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
دونوں ایک ساتھ اس گلی میں گئے۔ زبیر کچھ آگے چلنے لگا۔ جونہی وہ اس کے گھر کے سامنے پہنچا، زبیر نے ہوشیاری سے مکان کی طرف اشارہ کر دیا۔ نادر سمجھ گیا۔ زبیر چلتا ہوا آگے چلا گیا اور آگے جا کر وہ گلی سے دائیں ہو کر پھر اسی جگہ کی طرف چل پڑا، جہاں وہ نادر کو ملا تھا۔
نادر کچھ آگے گیا اور گلی کا جائزہ لیتا ہوا واپس آگیا۔ وہ چلتے ہوئے ایک درخت کے پاس رک گیا۔ جب اس نے تسلی کر لی کہ باہر کوئی نہیں ہے تو وہ جست لگا کر درخت کے اوپر چڑھ گیا اور وہاں سے بالکونی میں قدم جما دیے۔
بالکونی میں ایک بند دروازہ اور کھڑکی تھی۔ کھڑکی لکڑی کی تھی اور اوپر شیشے لگے تھے۔ نادر نے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر اندھیرا ہونے کی وجہ سے اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔
اس نے جیب سے ایک چاقو نکالا اور اسے کھول کر اس کی نوک شیشے پر مارنے لگا۔ ایک دم چھناکے کی آواز آئی اور شیشہ ٹوٹ گیا۔ نادر اسی جگہ ساکت ہوگیا۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد جب کسی طرح کا کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے ہاتھ اندر ڈال کر کھڑکی کی چٹخنی کھولی اور پٹ کھول کر اندر چلا گیا۔
کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ احتیاط سے چلتا ہوا دروازے تک گیا اور بغیر آہٹ پیدا کیے دروازہ کھول کر باہر جھانکا...... مکمل سکوت تھا، جیسے اس مکان میں کوئی رہائش پذیر نہ ہو۔
وہ سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ نیچے روشنی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ نیچے کوئی تھا۔
سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ پوری طرح سے ہوشیار تھا۔ کسی کی موجودگی کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ نیچے اتر گیا۔
وہ چھوٹا سا گھر تھا۔ آگے پیچھے دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں کے دروازے بند تھے اور کچن کا دروازہ کھلا تھا لیکن وہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔
دونوں کمروں کے دروازے کے نیچے سے بھی روشنی

دکھائی نہیں دے رہی تھی، اس کا مطلب تھا کہ کمروں میں کوئی نہیں تھا۔ نادر سوچنے لگا کہ اسے کس کمرے میں جانا چاہیے...... اچانک وہ چونکا اُس نے دیکھا کہ سامنے باتھ روم کے باہر لگے بیسن کے پاس لٹکے ہوئے سفید تولیے پر سرخ نشان تھے...... جیسے خون لگا ہو...... نادر کا دل دھڑکا۔

وہ تولیے کی طرف جھک گیا اور بغور اس نشان کو دیکھنے لگا۔ وہ خون کا ہی نشان تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف مترشح دکھائی دینے لگا اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے آنکھیں گھما کر اپنے چاروں طرف دیکھا اور اس کی نگاہیں کمرے کے دروازے پر منجمد ہوگئیں۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اپنا کان دروازے کے ساتھ لگا دیا۔ بالکل سکوت تھا۔ کسی آہٹ کی بھی آواز نہیں تھی۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اپنی بے ترتیب ہوتی سانس کو درست کرنے کے بعد ایک جھٹکے سے جونہی دروازہ کھولا اس کے منہ سے چیخ نکلتی رہ گئی۔

☆☆☆

زبیر اس جگہ کھڑا نادر کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بار بار اس طرف دیکھ رہا تھا جس طرف سے نادر کو آنا تھا۔ زبیر کا دھیان اس طرف تھا اور اسے معلوم بھی نہ ہوسکا کہ کس وقت اس کے عقب میں پولیس وین رکی اور اندر سے انسپکٹر جلال باہر نکل کر اس کے قریب کھڑا ہوکر بولا۔

”خیریت ہے، آپ یہاں کھڑے ہیں؟“

آواز سنتے ہی زبیر نے چونک کر اپنے عقب میں دیکھا اور اس کی نگاہیں انسپکٹر جلال کے مکروہ چہرے پر جم گئیں۔

”ایک دوست کا انتظار ہے۔“ زبیر نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

”کوئی خاص دوست ہے؟“ انسپکٹر جلال زیرِلب مسکرایا۔

زبیر کو اس کی بات ناگوار لگی۔ ”آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے جو کام آپ کے ذمے ہے وہ تو پورا ہوتا نہیں ہے۔“

زبیر کی بات سن کر انسپکٹر کی زیرِلب مسکراہٹ ایک دم معدوم ہوگئی۔ وہ فوراً سمجھ گیا تھا کہ زبیر کا اشارہ کس طرف ہے۔ ”آپ کی بیوی کے قتل کی تفتیش ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ہر زاویے پر کام ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے اب ہمیں آپ کو بھی شاملِ تفتیش کرنا پڑے......“ انسپکٹر جلال نے اس کی بات کا غصہ نکالا تھا۔

”مجھے کیوں شاملِ تفتیش کریں گے آپ؟“ زبیر نے کہا۔

”اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ مجھے آپ کی

بیوی کے قاتل تک پہنچنا ہے اور میرا ماضی اس بات کا گواہ ہے کہ میں نے کوئی کیس ہاتھ میں لیا ہو اور اسے حل کیے بغیر دفن کر دیا ہو۔" انسپکٹر نے اسے مشکوک نظروں سے ایسے دیکھا جیسے اس کا مجرم اس کے سامنے کھڑا ہو۔

"مجھ سے آپ کو جو مدد درکار ہوگی، میں ضرور تعاون کروں گا۔" زبیر نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرایا۔ "مدد تو جو مجھے چاہیے ہوگی وہ تو مل ہی جائے گی...... تفتیش کے لیے پورا بندہ بھی چاہیے ہوگا۔"

زبیر نے اُس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ "مجھے جانا ہے، پھر ملاقات ہوگی، میرا وکیل آپ سے رابطہ کرے گا۔"

انسپکٹر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آپ تو یہاں اپنے دوست کا انتظار کر رہے تھے...... اچانک کہاں چل دیے؟ دوست سے مل کر نہیں جائیں گے؟ یا اس سے ملنے کا ارادہ بدل دیا ہے؟"

"اب مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ میں نے دوست سے ملنے کا ارادہ بدل لیا ہے، یا نہیں......" زبیر کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

انسپکٹر جلال نے اپنی معنی خیز نظریں اُس کے چہرے پر پیوست کر دیں۔ "پولیس جو پوچھے، وہ بتانا پڑتا ہے ورنہ جاننے کے لیے پولیس کے پاس بہت طریقے ہیں۔"

"یہ بات آپ اُس سے کریں جو سن کر ڈر جائے، جسے قانون کا علم نہ ہو، مجھ سے یہ باتیں مت کریں......" زبیر تحمل مزاجی سے بولا۔

وہ ہنسا اور اپنی گاڑی کی طرف گھوم گیا۔ اسی اثنا میں نادر بھاگتا ہوا ایک طرف سے نمودار ہوا اور زبیر کے پاس انسپکٹر جلال کو دیکھ کر اس نے خود کو روکا اور جونہی اس نے واپس گھوم جانا چاہا عین اسی وقت کچھ کہنے کے لیے انسپکٹر.... نے زبیر کی طرف رخ کیا تو اس کی نگاہ نادر پر جا پڑی۔ وہ ایک دم بولا۔

"اِدھر آؤ...... میں تمہیں دو دن سے ڈھونڈ رہا ہوں۔"

نادر کے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ بادلِ ناخواستہ اس کی طرف چلنے لگا۔ زبیر کو پہلے ہی ڈر تھا کہ کہیں انسپکٹر جلال کی موجودگی میں نادر نہ آجائے...... اور ایسا ہو گیا تھا۔

جونہی نادر اُن کے قریب آیا، انسپکٹر نے ایک نظر زبیر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "جس دوست کے انتظار میں آپ یہاں کھڑے تھے، کہیں وہ دوست یہی تو نہیں ہے۔"

"یہاں اور بھی کچھ لوگ گزر کر گئے ہیں، ان کے بارے میں بھی آپ یہی سوچیں گے؟" زبیر نے بلا تامل جواب دیا۔

انسپکٹر نے زبیر کی بات کو نظر انداز کیا اور نادر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ نادر کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ وہ اس کے قریب چلا آیا۔

"کہاں سے آرہے ہو اور چہرے کا رنگ کیوں بدلا ہوا ہے؟ اس سے پہلے کئی بار ملے ہو کبھی تمہارے چہرے پر ایسی گھبراہٹ نہیں دیکھی ہے۔" انسپکٹر جلال نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کوئی گھبراہٹ نہیں ہے، ہم دونوں تو بلّی اور چوہے کی طرح ہیں پھر ڈر اور گھبرانا کیسا۔" نادر نے نادانستہ طور پر چوہا کہتے ہوئے انسپکٹر کی طرف اشارہ کر دیا۔ انسپکٹر کا چہرہ درشت ہو گیا تو نادر نے جلدی سے کہا۔ "چوہا میں نے اپنے آپ کو کہا ہے۔" نادر نے ساتھ ہی دانت نکال دیے۔

"اب اس کے ساتھ دوستی ہو گئی ہے؟" انسپکٹر نے کہتے ہی جونہی گھوم کر اپنے عقب میں دیکھا تو چونک گیا۔ زبیر اس جگہ سے جا چکا تھا۔ انسپکٹر نے متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا تو اس کے سپاہی نے بتایا۔

"وہ تو اسی وقت چلا گیا تھا۔"

انسپکٹر نے سپاہی کو ایسے دیکھا جیسے آنکھوں آنکھوں میں کہہ رہا ہو کہ تم نے اسے جانے کیوں دیا۔ وہ پھر نادر کی طرف گھوما۔

"تم دونوں مل کر کیا کھچڑی پکا رہے ہو؟"

"یہ اتفاق تھا کہ میں اِدھر آیا تو آپ دونوں کھڑے تھے۔ ورنہ میرا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔" نادر پُراعتماد لہجے میں بولا۔

"کوئی تو تعلق نظر رہا ہے۔" انسپکٹر جلال کی مشکوک نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"آپ ہمارے مائی باپ ہو جو چاہیں سمجھ لیں، یہ غلام آپ کی کسی بات کی نفی تھوڑی کرے گا۔" نادر چاپلوسی پر آگیا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اندر سے ایک سگریٹ نکال کر اس انداز میں انسپکٹر.... کو پیش کی جیسے وہ ادب کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتا ہو۔ انسپکٹر.... نے اس کو گھورتے ہوئے سگریٹ لیا اور اپنے دانتوں میں دبا لیا۔ نادر نے ماچس سے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ "اجازت ہو تو جاؤں۔"

"جاؤ......" انسپکٹر نے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا اور نادر ایک طرف چلا گیا۔ وہ تیزی سے ایک طرف چلنے لگا۔ جونہی وہ ایک گلی میں گیا، اس نے موبائل فون نکال کر زبیر کو کال کی اور مضطربانہ انداز میں دوسری طرف سے آواز آنے کا انتظار

کرنے لگا۔
تھوڑی دیر کے بعد دوسری طرف سے زبیر کی آواز آئی۔ "ہیلو......"
"باس...... بہت خطرناک صورتِ حال ہے۔" نادر ایک طرف چلتے ہوئے بولا۔
"کیا ہوا ہے؟"
"میں اندر گیا تھا۔ اندر میں نے وہ منظر دیکھا کہ دل کانپ گیا۔" نادر چلتے ہوئے اپنے پیچھے بھی دیکھ رہا تھا مبادا کہیں انسپکٹر جلال نمودار نہ ہو جائے۔
"کیا دیکھا تم نے......؟ بتاؤ گے یا اسی طرح باتیں کرتے رہو گے۔" زبیر کو اس کی باتوں سے اُلجھن ہونے لگی تھی۔
"اندر ایک لاش پڑی تھی۔" نادر نے انکشاف کیا تو زبیر چونکا۔ "کمرے میں ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی۔ شاید اس کے سر پر کوئی سخت چیز ماری تھی۔ خون بہہ رہا تھا، سامان بکھرا ہوا تھا۔"
"تم اس وقت کہاں ہو؟"
"میں آگے پیچھے گلیوں میں ہی گھوم رہا ہوں۔"
"تم اسی وقت رکشا لو اور اپنے گھر کے پاس پہنچو میں وہیں آرہا ہوں۔ وہاں بات کرتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔" نادر نے کہہ کر موبائل فون جیب میں رکھا اور ایک طرف تیزی سے چلنے لگا۔

☆☆☆

انسپکٹر جلال کو جرائم پر قابو پانے کی اتنی جستجو نہیں ہوتی تھی، جتنی اسے حرام پیسہ اپنی جیب میں ڈالنے کی فکر لاحق ہوتی تھی۔ زبیر اور نادر کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا تھا اور گاڑی میں بیٹھا وہ تانے بانے بن رہا تھا کہ دونوں کا ایک جگہ ہونا اتفاق تھا، یا اس کے پیچھے کوئی کہانی تھی۔
ابھی وہ اسی سوچ بچار میں تھا کہ اسے ایک قتل کی اطلاع ملی۔ قتل اسی جگہ ہوا تھا جہاں وہ موجود تھا اور اسی جگہ کچھ دیر قبل اس کی ملاقات زبیر اور نادر سے ہوئی تھی۔ اس کے اندر ایک ہلچل برپا ہو گئی تھی۔ اُس کی دانست میں جس تانے بانے کی بنت وہ اپنے دماغ میں کر رہا تھا، اس کا سرا اس قتل پر منتج ہوتا ہے۔
اس نے جائے وقوعہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچے تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مکان کے باہر کچھ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ انسپکٹر آگے بڑھا تو سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور اس نے جینز کے ساتھ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری تھی۔ وہ تیزی سے انسپکٹر کی طرف بڑھا اور بولا۔ "میرا نام شوکت ہے اور میں نے ہی پولیس کو اطلاع دی تھی۔"
"لاش کہاں ہے؟" انسپکٹر جلال کو شاید لاش دیکھنے کی جلدی تھی، اس نے فوری پوچھا۔
"اس کمرے میں ہے۔" شوکت نے سامنے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو انسپکٹر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھولا تو اندر کا منظر عجیب تھا۔
چارپائی پر ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی اور خون اُس کے جسم سے نکل کر چارپائی پر بچھے بستر پر پھیل چکا تھا۔ کمرے کا سامان بکھرا ہوا تھا اور سرہانوں کو کسی تیز دھار چاقو، یا چھری سے چاک کیا ہوا تھا جیسے کچھ تلاش کیا گیا ہو۔
انسپکٹر نے پہلے کمرے کا اچھی طرح سے جائزہ لیا اور اس کے بعد وہ شوکت کی طرف متوجہ ہوا۔ "تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"
"یہ میرا دوست ہے۔ ہم اسی مکان میں رہتے تھے۔ میں کھانا لینے گیا تھا اور واپس آیا تو اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ میں نے اسی وقت پولیس کو اطلاع کر دی۔" شوکت نے بتایا۔
"اس کا کیا نام تھا؟" انسپکٹر جلال نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔
"اس کا نام سرمد تھا۔" شوکت نے جلدی سے جواب دیا۔
انسپکٹر نے زیرِلب اس کا نام دہرایا اور ایک بار پھر لاش کے ساتھ ساتھ کمرے کا بھی جائزہ لینے لگا۔
"تم کھانا لینے گئے تھے اور واپس آئے تو اسے کسی نے قتل کر دیا تھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔
"جی بالکل......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
"جب تم واپس آئے تھے تو دروازہ کھلا ہوا تھا؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔
"دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ اپنی چابی سے کھولا تھا۔ آٹومیٹک لاک لگا ہے دروازے پر...... باہر سے دروازہ بند کرو تو لاک ہو جاتا ہے۔" شوکت نے مزید بتایا۔
"تم نے سامان دیکھا...... کوئی قیمتی چیز غائب ہوئی ہے؟" انسپکٹر نے پوچھتے ہوئے اس کا جائزہ ایسے لیا جیسے وہ اس کے چہرے سے ابھرنے والے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔
"میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ بس لاش دیکھی تو چیختا ہوا باہر بھاگ گیا۔ لوگ جمع ہو گئے اور میں نے سب کو بتایا کہ اندر سرمد کی لاش پڑی ہے۔" شوکت ابھی تک اس

خوف کے حصار میں تھا۔

"تم دونوں میں کب سے دوستی ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔ اس کی تیز نگاہیں مسلسل شوکت کے چہرے پر جمی تھیں۔

"اسکول کے زمانے سے دوستی ہے۔" شوکت نے بتایا۔

انسپکٹر نے دائیں بائیں دیکھا اور بولا۔ "اس کا موبائل فون کہاں ہے؟"

شوکت ایک دم ہچکچایا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکال کر انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ "سرمد کا موبائل فون میں آپ کو دینے ہی والا تھا۔"

"اسکول کے زمانے کے دوست ہو، رازدار بھی ہو گے، اس کا پاس ورڈ بھی جانتے ہو گے؟" انسپکٹر نے موبائل فون پکڑنے سے قبل کہا۔ شوکت نے جلدی سے پاس ورڈ کھول دیا اور بتا بھی دیا۔

انسپکٹر جلال موبائل فون چیک کرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ وہ اچھی طرح سے دیکھ رہا تھا۔ سرمد نے جو وائس میسج نتاشا کو کیے تھے، وہ موجود تھے۔ موبائل فون کان سے لگا کر اس نے وہ میسج سنے...... اور جس نمبر پر میسج کیے تھے، اس نمبر کو غور سے دیکھنے کے بعد اپنے اہلکار کو وہ نمبر لکھوا کر تاکید کی وہ فوری طور پر معلوم کرے کہ یہ نمبر کس کا ہے۔

ضروری کارروائی ہو چکی تھی۔ انسپکٹر جلال نے شوکت سے اور بھی سوال کیے تھے اور اس کا نام پتا بھی لکھ لیا تھا۔ اس کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے چلی گئی تھی۔

جب انسپکٹر اپنی گاڑی میں بیٹھا تو وہ سوچ رہا تھا کہ اسے سب سے پہلے نادر کو اپنی گرفت میں لینا پڑے گا۔ نادر گرفت میں آ گیا تو وہ اس سے سب کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ زبیر کی طرف ہاتھ بڑھائے گا۔ ضروری ہوا تو وہ دونوں کو قتل کے الزام میں جیل بھیج دے گا ورنہ دونوں سے بھاری رشوت لے کر انہیں چھوڑ دے گا۔

یہ سوچ کر انسپکٹر زیر لب مسکرایا اور جیب سے موبائل فون نکال کر نادر کا نمبر تلاش کیا اور اسے کال کر دی۔ بیل جانے لگی۔ رابطہ ہوا تو انسپکٹر نے بڑے پیار سے پوچھا۔ "کہاں ہو میری جان......"

"کوئی کام ہے جو اتنے پیار سے پیش آ رہے ہیں۔" نادر نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

"بہت ضروری کام ہے۔ چاہتا ہوں اس کام کو تم کرو...... مجھے تو جو ملے گا وہ ملے گا ہی...... تم بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لو گے۔" انسپکٹر ہنسا۔

"پیسے کے لیے تو آگ میں بھی کود جاؤں...... بتایئے کہاں آؤں؟" نادر نے کہا۔

انسپکٹر نے اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی اور کہا۔ "اسی چائے کے کھوکھے پر آ جاؤ...... جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔"

"میں آ رہا ہوں۔" نادر کی آواز آئی اور انسپکٹر نے اپنا موبائل فون بند کرنے کے بعد معنی خیز انداز میں اپنے برابر میں براجمان اہلکار کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جیسے ہی وہ میرے پاس آئے، اُسے دبوچ لینا......"

اہلکار نے بات سنی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

زبیر اور نادر ایک ساتھ کھڑے تھے۔ نادر سب کچھ بتا چکا تھا اور زبیر کو حیرت اس بات کی تھی کہ اچانک سرمد کو کس نے قتل کر دیا؟ ان کے پیچھے کوئی ایسا شخص ہے جو نتاشا کا اصل قاتل ہے اور اسے جونہی علم ہوا کہ وہ سرمد کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے اسے قتل کر کے کوئی ثبوت مٹا دینے کی کوشش کی ہے۔

حیران کن بات یہ بھی تھی کہ زبیر اپنی کسی بات کو نادر کے سوا کسی تیسرے شخص سے نہیں کرتا تھا...... ان دونوں کے بیچ میں کوئی تیسرا شخص نہیں تھا تو پھر اس کا ارادہ اس تک کیسے پہنچ گیا تھا؟

زبیر کے دماغ میں دو باتیں ایسی تھیں جو اسے مضطرب کر رہی تھیں۔ پہلی بات یہ کہ جسے نادر دیکھ کر آیا تھا، کیا وہ واقعی سرمد تھا؟ اور اگر سرمد ہی تھا تو نہیں نادر نے ہی تو اس کا خون نہیں کر دیا تھا؟ نادر نے بتایا تھا کہ اُسے زبیر کے پاس ایک ایسے شخص نے بھیجا تھا جس کا وہ چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا...... کیا معلوم نادر اس کے لیے ہی کام کر رہا ہو؟

یہ سوچتے ہوئے زبیر کو پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے نادر پر بھروسا کر کے اور اسے اپنے ساتھ ملا کر غلطی کر دی تھی۔

اس دوران نادر کو انسپکٹر جلال کی کال آ گئی تھی اور وہ اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا تھا۔ زبیر کا دھیان اس کی باتوں کی طرف مرکوز تھا۔ جونہی بات ختم ہوئی اس نے بتایا۔ "مجھے انسپکٹر جلال نے بلایا ہے...... کوئی کام ہے اس کے پاس اور میرے ذریعے سے وہ ڈیل کروانا چاہتا ہے۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے۔"

"تم انسپکٹر جلال کے پاس جا رہے ہو؟" زبیر نے اس کی طرف دیکھا۔

"انسپکٹر مجھے اچھے پیسے دیتا ہے اس لیے مجھے جانا تو

پڑے گا۔" وہ مسکرایا۔

زبیر نے اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔ جلال کے لیے کب سے کام کررہے ہو؟"

"حرام خور کو اپنے جیسا حرام خور چاہیے ہوتا ہے، جب وہ مجھے ملا تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی تلاش ہو، ہم کب ملے مجھے اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں مجھے اس نے پیسے اچھے خاصے دیے تھے، وہ مجھے یاد ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ شاید مجھے آئندہ تمہاری ضرورت نہ پڑے۔" زبیر نے کچھ توقف کے بعد جان بوجھ کر کہا۔

"باس کیا یہیں سے راستے الگ کررہے ہو؟ بس اتنی ہی ضرورت تھی؟" اس نے زبیر کی طرف دیکھا۔

زبیر نے اپنے پرس سے کچھ پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ "میری بیوی کا قاتل شاید مجھے کبھی نہ مل سکے اور یہاں جب تک انسپکٹر جلال جیسے رشوت خور افسران زندہ ہیں تب تک انصاف کڑکتی دھوپ میں موم کی طرف پگھل تو سکتا ہے لیکن وہ کسی کو مل نہیں سکتا اس لیے میں نے اب فیصلہ کرلیا ہے کہ یہ ملک چھوڑ کر یہاں سے چلا جاؤں۔"

"ٹھیک کہتے ہو باس...... مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے۔" نادر نے اس کی تائید کی۔

زبیر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور خدا حافظ کہہ کر ایک طرف چل دیا۔ نادر نے پیسے جیب میں ڈالے اور گنگناتے ہوئے متلاشی نظروں سے کسی رکشا والے کو دیکھنے لگا۔ زبیر نے محض تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ اب اپنی بیوی کے قاتل کو تلاش کرنے کے بجائے اس کام سے سبکدوش ہوکر ملک چھوڑ کر جارہا ہے۔ نادر اگر اس کے ساتھ ملا ہوگا تو وہ اسے بتادے گا اور اس طرح قاتل اس سے بے نیاز ہوجائے گا۔

نادر رکشے میں سوار ہوکر اس کھوکھے کے پاس پہنچ گیا جہاں وہ پہلی بار انسپکٹر جلال سے ملا تھا۔ رکشے والے کو کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ ابھی چائے کے کھوکھے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اس کے قدم رک گئے۔ اسے کھوکھے کے باہر انسپکٹر جلال کی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی البتہ اس کی تیز نظر نے اس کا ایک اہلکار دیکھ لیا تھا جو چوک میں ایک طرف ایسے کھڑا تھا جس کی نگاہ دونوں طرف سڑک پر بھی تھی اور چائے کا کھوکھا بھی اس کے سامنے تھا۔ نادر ٹھٹک گیا۔ اسے خطرے کی بُو محسوس ہوئی۔ وہ ایک طرف چلا گیا۔ وہاں ڈرائی فروٹ کا ٹھیلا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس طرح سے کھڑا ہوگیا کہ اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ البتہ اُس کی نظر اس اہلکار اور چائے کے کھوکھے پر تھی۔

وہ اچھی طرح سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس ایک اہلکار کے علاوہ اسے کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کی دانست میں اس کا واہمہ تھا کہ کوئی خطرے کی بات ہے۔ اس نے سوچا وہ انسپکٹر جلال سے مل لے۔

ابھی وہ پلٹا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا۔ اس کے پیچھے انسپکٹر جلال کھڑا تھا۔ جونہی ان کی آنکھیں چار ہوئیں انسپکٹر مسکرایا۔ "کیا دیکھ رہے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں...... بس ایسے ہی......" نادر سے کوئی معقول جواز نہ بن سکا۔

"میرے ساتھ آجاؤ۔" وہ دونوں چلنے لگے۔ چلتے ہوئے انسپکٹر کہہ رہا تھا۔ "تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں اپنے چاروں طرف ایسے ہی نظر رکھتا ہوں جیسے شکاری کی نظر اپنے شکار پر ہوتی ہے۔"

"آپ کی بات ہی الگ ہے، آپ جیسا پولیس افسر میں نے زندگی میں نہیں دیکھا ہے۔" نادر چاپلوسی پر اتر آیا۔

وہ اسے لے کر چائے کے کھوکھے پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک پولیس افسر کو دیکھ کر چائے والے نے بھی کسی اور کا آرڈر روک کر ان کی میز کی طرف دو کپ چائے بھیج دی۔ جونہی لڑکا چائے رکھ کر گیا، انسپکٹر نے نادر کی طرف رکھا ہوا چائے کا کپ اپنی طرف سرکا لیا۔ نادر متحیر سا دیکھ رہا تھا۔

"میرے پاس وقت کم ہے اور مجھے جاننا زیادہ ہے۔" انسپکٹر چائے پینے لگا۔ "جہاں میں نے زبیر اور تم کو ایک ساتھ دیکھا تھا اسی محلے میں سرمد نام کا ایک نوجوان رہتا تھا، تم دونوں کے جانے کے بعد مجھے اس کے قتل کی اطلاع ملی اور میں جائے وقوعہ پر چلا گیا۔ تم دونوں کا اس جگہ ایک ساتھ ہونا میرے لیے حیران کن تھا۔ اس قتل کے بعد مجھے جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ اس کا قتل زبیر کے کہنے پر تم نے کیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم دونوں نے مل کر اس کا قتل کیا ہو؟"

انسپکٹر کی بات سن کر نادر کا گلا خشک ہوگیا تھا۔ اس نے تھوک نگل کر اپنا گلا تر کیا اور بولا۔ "کون سرمد......؟ اور مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اس کا قتل کرتا اور وہ بھی زبیر کے کہنے پر......" نادر کے الفاظ بے ترتیب ہورہے تھے۔ "میں نے تو کبھی مکھی نہیں ماری......"

انسپکٹر اطمینان سے چائے پیتا رہا۔ اُس نے ایک کپ چائے کا ختم کرتے ہی دوسرا کپ بھی اُٹھا لیا۔ "تم جانتے ہو میرا نام انسپکٹر جلال ہے اور میں نام کا ہی جلال نہیں ہوں......

بڑے بڑے مجرم میرا نام سن کر کانپنے لگتے ہیں اور تم تو چیز ہی کچھ نہیں ہو۔''

''بخدا میں نے کسی کا قتل نہیں کیا ہے۔ وہاں ہم دونوں کا ملنا محض اتفاق تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس جگہ کیا کر رہا تھا؟''

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ زبیر نے اسے مارا ہو اور تم اچانک وہاں آگئے ہو؟'' انسپکٹر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہو سکتا ہے......''

''زبیر نے سرمد کا قتل کیا ہو اور اچانک تم سے اُس کی ملاقات ہو گئی ہو۔ اور اسی وقت میں وہاں پہنچ گیا۔''

''ہماری تو ملاقات ہوئی ہی نہیں تھی۔ آپ پہلے سے وہاں موجود تھے اور میں اس طرف آگیا تھا۔'' نادر نے کہا۔

''ایسا ہی ہوا تھا لیکن جونہی تمہاری نظر مجھ پر پڑی تم نے اسی وقت پلٹنے کی کوشش کی تھی۔''

''میں آپ کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔''

''مجھے دیکھ کر تم کیوں ڈر گئے تھے؟''

''بس ایسے ہی...... مجھے خود اُس وقت کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔'' نادر کے لیے کوئی جواز تلاش کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''ایک منٹ کے لیے مان لیتے ہیں کہ سب کچھ اتفاق سے ہوا تھا۔ مگر اب اس بات کا کیا کروں کہ تم دونوں وہاں سے الگ الگ گئے اور ایک جگہ پھر اکٹھے ہو کر باتیں کرنے لگے تھے؟'' انسپکٹر کی سوالیہ نگاہیں نادر کے چہرے پر منجمد تھیں۔ نادر کے چہرے پر تغیر کے رنگ بکھر رہے تھے۔

''اب وہ بھی اتفاق ہی تھا۔'' نادر نے کندھے اچکائے۔

''بار بار اتفاق نہیں ہوا کرتا...... مجھے سچ بتاؤ سرمد کا قتل کیوں کیا تھا؟ سچ بتا دو گے تو میں کہانی بدل دوں گا۔ سب کچھ زبیر کے سر پر رکھ دوں گا۔ اس سے لمبا مال کمائیں گے...... اور اس قتل کو فائلوں میں دبا دوں گا۔'' انسپکٹر کا لہجہ درشت ہو گیا تھا اور نادر سہم سا گیا تھا۔

''سچ یہ ہے کہ میں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے۔'' نادر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔

''تم دونوں وہاں کیا کر رہے تھے؟'' انسپکٹر کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

نادر سوچنے لگا، وہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اگر وہ سچ کہہ دیتا... اور یہ بتا دیتا... کہ زبیر نے اسے اس گھر میں بھیجا تھا اور وہ لاش دیکھ کر اس جگہ سے بھاگ کر اس طرف آیا تھا تو وہ خود بھی پھنس سکتا تھا کیونکہ انسپکٹر کی کسی بات کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔

''مجھے زبیر نے اس جگہ بلایا تھا۔'' آخر کار کچھ سوچنے کے بعد نادر نے کہہ ہی دیا۔

''زبیر نے تم کو کیوں بلایا تھا؟''

''مجھے اس نے کال کی تھی کہ ایک کام ہے اور وہ مجھے اس کام کے پیسے دے گا۔'' نادر نے جواب دیا۔

''وہ کام کیا تھا؟؟'' انسپکٹر اس کی جانب مزید متوجہ ہو گیا تھا۔

''میں ابھی اس جگہ پہنچا ہی تھا کہ اچانک آپ آگئے اور بات نہیں ہو سکی۔'' نادر کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس معاملے کو سنبھال کر اپنی جان چھڑا لے۔ ''مجھے زبیر اس جگہ ملا جہاں آپ نے ہم دونوں کو دیکھا تھا۔ ابھی آپ نے بتایا تھا۔''

''وہاں کیا بات ہوئی تھی؟''

''زبیر نے مجھ سے کہا کہ میں اُس کی بیوی کے قاتل کو تلاش کرنے میں اس کی مدد کروں۔ میرا کیونکہ ہر طرح کے لوگوں میں بیٹھنا اُٹھنا ہے اس لیے وہ مجھے مدد کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ آپ کی تفتیش سے بالکل بھی مطمئن نہیں ہے۔''

نادر کی بات سن کر انسپکٹر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ''تم زبیر سے ملو اور اس سے کہو......'' ابھی انسپکٹر نے اپنی بات مکمل نہیں کی تھی کہ اس کا موبائل فون بول پڑا۔ انسپکٹر نے موبائل فون اپنے کان سے لگایا اور دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ جیسے جیسے وہ بات سن رہا تھا، اس کے چہرے پر تغیر کے کئی رنگ اُبھر اور معدوم ہو رہے تھے۔

بات سننے کے بعد انسپکٹر نے موبائل میز پر رکھا اور متحیر انداز میں سوچنے لگا اور پھر ایک دم نادر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ابھی تم زبیر سے مت ملنا...... اس سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔ تم جاؤ اور جب میں تم کو بلاؤں تم میرے پاس آجانا۔''

''جی بہتر...... اب میں جاؤں؟'' نادر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں تم جاؤ۔'' انسپکٹر نے جانے کے لیے سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی کرسی پر بیٹھا رہا اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھا اور زیرِ لب بولا۔ ''نتاشا اور سرمد کا آپس میں کیا تعلق تھا۔''

انسپکٹر جلال سوچتا ہوا اپنی گاڑی تک پہنچا اور اپنی سیٹ پر براجمان ہوتے ہی ڈرائیور سے بولا۔ ''قتل ہونے والے کا نام سرمد تھا۔ اس کے موبائل فون میں میسج تھا اور وہ دھمکیاں دے رہا تھا ابھی مجھے فون پر بتایا گیا ہے کہ وہ نمبر نتاشا کے نام پر رجسٹر ہے...... نتاشا، زبیر کی بیوی تھی...... سرمد نے نتاشا کو قتل کیا اور زبیر نے سرمد کو مار دیا...... سرمد نے نتاشا کو اس لیے

قتل کیا کہ اس نے سنبل نام کی لڑکی سے اس کی شادی نہیں ہونے دی تھی۔ غصے اور جنون میں انسان بھیڑیا بن جاتا ہے...... اب سنبل کو بھی تلاش کرنا پڑے گا اور سنبل کے بارے میں ہمیں کون بتائے گا؟" انسپکٹر نے سوالیہ نگاہیں اپنے ڈرائیور کی طرف گھما دیں۔

"ایک بندہ ہی بتائے گا۔" ڈرائیور بولا۔

"بھلا کون ہے وہ بندہ؟"

"اس کا نام زبیر ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

انسپکٹر کے چہرے پر ایک دم سے مسکراہٹ آگئی۔

"میرے ساتھ رہتے ہوئے تم ذہین ہو گئے ہو...... بالکل، ہمیں زبیر بتائے گا کہ سنبل کون ہے اور آگے کی کہانی ہم زبیر سے سنیں گے۔"

"اب کس طرف جانا ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

انسپکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ "مجھے ابھی زبیر کو سرمد کے قتل کے الزام میں گرفتار نہیں کرنا چاہیے، اس سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ اس کے بعد اسے گرفتار کرنے کے بارے میں سوچوں گا...... تمہارا کیا خیال ہے؟"

"سر جی اس کو پکڑ کے بند کرتے ہیں اور الٹا لٹکا کر سب کچھ پوچھ لیتے ہیں، وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ ہے؟" ڈرائیور کو شاید جلدی تھی۔

"میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے اس لیے پہلے کوئی ٹھوس ثبوت تلاش کرلوں تو اچھا رہے گا۔"

"سر جی ہم پولیس والے ہیں، کسی عام بندے کو گرفتار کرنے کے لیے ہمیں ٹھوس ثبوت کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔" وہ کہہ کر ہلکے انداز میں ہنسا۔

"کبھی کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے کہ ٹھوس ثبوت ہاتھ میں ہو، اس لیے ابھی تفتیش ہوگی اور سنبل کو بھی تو دیکھیں، وہ کیا حسن پری ہے۔" انسپکٹر نے کمینے سے انداز میں کہا۔

☆☆☆

زبیر اپنے گھر میں داخل ہوا اور اس نے بتی جلانے کے بعد کرسی سنبھال لی۔ کچھ دیر وہ سوچ میں گم رہا اور پھر اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ چائے تیار کرنے کے بعد اس نے چائے مگ میں ڈالی اور جونہی کچن سے باہر نکلا، وہ اسی جگہ رک گیا۔ زبیر کئی دنوں سے اپنے بیڈ روم میں نہیں گیا تھا۔ وہ سوتا بھی ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر تھا۔

گھر کی کئی دن سے صفائی نہیں ہوئی تھی۔ فرش اور گھر میں موجود سامان پر گرد کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ فرش پر گرد کی چادر پر جہاں اس کے پیروں کے نشان تھے، وہاں اسے جوتوں کے وہ نشان بھی دکھائی دیے جو اس کے بیڈ روم تک جاتے تھے اور وہ جوتوں کے نشان اس کے نہیں تھے۔ زبیر ہاتھ میں چائے کا مگ پکڑے بیڈ روم کی طرف گیا اور اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرا روشن کیا اور چاروں طرف اچھی طرح سے دیکھنے کے بعد بیڈ کے نیچے بھی دیکھا...... وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ابھی زبیر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک دم تیز بیل نے زبیر کو چونکا دیا۔ اس نے تذبذب میں دائیں بائیں دیکھا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے، مگ پکڑے دروازے کی طرف گیا۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا، وہ چونک گیا۔ سامنے انسپکٹر جلال اکیلا ہی کھڑا تھا۔ اس نے پولیس کی وردی نہیں پہنی ہوئی تھی۔

"میرے آنے کی خبر مجھ سے پہلے ہی پہنچ گئی جو آپ چائے تیار کر کے دروازے تک لے آئے۔" انسپکٹر جلال مسکراتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی اس نے چائے کے مگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

زبیر نے مگ اس کی طرف بڑھا دیا اور راستہ چھوڑ دیا۔ انسپکٹر نے مگ پکڑا اور اندر آتے ہوئے بولا۔ "میں دو چیزیں کبھی نہیں چھوڑتا...... ایک مفت کا مال اور دوسری چیز وہ کیس جو میں ہاتھ میں لے لوں۔"

"پہلی چیز کے بارے میں تو مجھے اچھی طرح سے علم ہے۔" زبیر نے چوٹ کرتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ انسپکٹر جلال ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ دونوں ٹی وی لاؤنج میں پہنچ گئے تھے۔

"آپ تشریف رکھیں، میں اپنے لیے بھی چائے لے آؤں۔" زبیر کہہ کر کچن میں چلا گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں بھی ایک مگ تھا اور وہ انسپکٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ انسپکٹر مزے سے چائے پی رہا تھا۔

"آپ چائے بہت اچھی بناتے ہیں، اچھی چائے میری کمزوری ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"کوئی ایسی چیز بھی ہے جو آپ کی کمزوری نہ ہو؟" زبیر نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

"اس پر کبھی غور نہیں کیا۔ میری ریٹائرمنٹ میں کچھ ہی سال ہیں۔ فرصت میں اس بارے سوچوں گا، فی الحال تو آپ مجھے اس سوچ سے نکالیں کہ سنبل کا آپ کی بیوی نتاشا سے کیا تعلق تھا؟"

"سنبل میری بیوی کی دوست تھی۔" زبیر نے ایک نظر انسپکٹر کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"سنبل کا سرمد کے ساتھ کیا تعلق تھا؟" انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً سوال کر دیا۔

"یہ میں نہیں جانتا۔" زبیر نے بلا تامل جواب دیا۔

انسپکٹر نے اپنے خالی مگ کے اندر جھانکا اور اسے ایک طرف رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ "سنبل اور سرمد ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور شادی کرنا چاہتے تھے لیکن سنبل کے گھر والے رضا مند نہیں تھے اس لیے دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھاگ کر شادی کر لیں۔ سنبل آپ کی مرحومہ بیوی کی اچھی دوست تھی۔ اس نے مدد کے لیے آپ کی بیوی نتاشا کو فون کیا اور نتاشا نے ان کی مدد کرنے کے بجائے سنبل کے گھر والوں کو اپنے ساتھ لیا اور اس جگہ پہنچ گئی جہاں وہ دونوں موجود تھے۔ یوں آپ کی بیوی کی وجہ سے اُن کی شادی نہیں ہو سکی اور سرمد نے آپ کی بیوی کو سنگین دھمکی دی اور پھر اسے جان سے مار دیا۔" انسپکٹر چپ ہو گیا، کچھ توقف کے بعد

انسپکٹر چلتا ہوا زبیر کے پاس آیا اور جھک کر اپنا منہ اس کے کان کے قریب کر کے سرگوشی کی۔ "سرمد نے آپ کی بیوی کو قتل کیا اور آپ نے سرمد کو جان سے مار دیا...... اپنی بیوی کے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار کر اب آپ مزے سے چائے پی رہے ہیں۔"

"یہ غلط ہے۔"

"کیا غلط ہے؟"

"یہ غلط ہے کہ میں نے سرمد کو قتل کیا ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ سرمد نے میری بیوی کو جان سے مارا ہے۔" زبیر کی بات سن کر انسپکٹر ایک دم سے چونکا۔

"ایک بات کی تو سمجھ آتی ہے کہ تم قتل کر کے اس لیے انکار کر رہے ہو کہ ہر جرم کرنے والا اپنا جرم اتنی آسانی سے قبول نہیں کرتا ہے...... لیکن مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آپ نے اس بات کو ماننے سے انکار کیوں کر دیا ہے کہ سرمد آپ کی بیوی کا قاتل ہے؟"

"آپ اپنی جگہ جا کر بیٹھ سکتے ہیں؟" زبیر کو اس کا اتنا قریب ہونا ناگوار گزر رہا تھا۔

"ایک پولیس والے کا اتنا قریب ہونا اچھا نہیں لگ رہا ہے؟" انسپکٹر کے چہرے پر خفیف تبسم کی لکیر ابھری اور معدوم ہو گئی۔

"آپ سامنے تشریف رکھیں۔" زبیر نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے خشک لہجے میں کہا۔

انسپکٹر جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی سوالیہ نگاہیں زبیر کے چہرے پر جما دیں۔ زبیر چائے کے گھونٹ بھرتا رہا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ سرمد آپ کی بیوی کا قاتل کیوں نہیں ہے؟" جب زبیر نہ بولا تو انسپکٹر نے زبان کھولی۔

"آپ اپنی تفتیش سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کیسے بھی ہو معاملہ حل ہو جائے اور آپ کی جان چھوٹے۔" زبیر نے کہا۔

وہ بے پروائی سے مسکرایا۔ "زمانے کی گرد کے نیچے کسی بھی فائل کو دبا دینا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ آپ کے پاس آنے سے پہلے میں سنبل کے گھر گیا تھا اور ساری تفتیش کر کے آیا ہوں۔ اس بات میں اب کوئی ابہام نہیں ہے کہ سرمد کو قتل تم نے کیا ہے۔"

"آپ سے ایک دم تم پر آ گئے ہو؟" زبیر نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے سامنے ایک قاتل بیٹھا ہے۔ جب تک پوچھ گچھ ہوتی رہی آپ کہتا رہا اور اب تم ایک قاتل ہو...... سرمد کے قاتل...... جس نے تمہاری بیوی کو قتل کیا تھا۔ میں تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں۔" انسپکٹر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

زبیر اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ "انسپکٹر صاحب اپنی تفتیش مکمل کر لیں اور ثبوت لے کر میرے پاس آ جائیں تو گرفتاری دے دوں گا ورنہ قانون میں بھی جانتا ہوں...... کہیں آپ کو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مجھے...... لینے کے دینے پڑے ہوں۔ تم سرمد کے قاتل ہو اور ثبوت عدالت میں پیش کروں گا...... بھاگ نہیں سکو گے۔" انسپکٹر ایک بار پھر اس کے قریب آ گیا۔ "میں جب کسی کو گرفتار کرنے پر آ جاؤں تو پھر یہ بھی نہیں دیکھتا کہ وہ کون ہے...... میں پھر اپنا کام کرتا ہوں، باہر میرے آدمی کھڑے ہیں اس لیے عزت سے اٹھ کر میرے ساتھ چلو......"

زبیر نے اسے گھورتے ہوئے جونہی اپنے موبائل فون کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو انسپکٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اب کوئی کال نہیں ہو گی...... ہاں ایک رابطہ ہو سکتا ہے وہ اگر تم چاہو تو......"

زبیر کی سوالیہ نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ اسی اثنا میں اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر اپنے کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے اسے آواز آئی۔

"سر...... آپ کا شک صحیح نکلا...... سرمد کو قتل کرنے والا جوا خانے کا مالک تھا۔ دونوں میں لین دین پر جھگڑا ہوا اور اس

نے سرمد کو قتل کر دیا۔"
"آگے کی بات بتاؤ۔" انسپکٹر نے دھیمے سے پوچھا۔
"اسے گرفتار کر لیا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ ابھی فائل بند رکھنا اور میرے آنے کا انتظار کرنا۔ سمجھ گئے ہو میری بات؟"
"جی بالکل سمجھ گیا ہوں۔" دوسری طرف سے جواب آیا۔ وہ انسپکٹر جلال کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا.... فائل بند رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی سب کچھ مخفی رکھے گا اور کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دے گا۔
موبائل جیب میں ڈال کر انسپکٹر، زبیر کی طرف گھوما۔ "دیکھو...... یہاں بہت سے مسئلے ہاتھ ملانے سے حل ہو جاتے ہیں۔ میرا ہاتھ تو ہر وقت جیب سے باہر ہی رہتا ہے کہ جانے کب کس سے ہاتھ ملانا پڑ جائے......" وہ مسکرایا۔ "تم چاہو تو ہاتھ ملا کر یہ معاملہ اسی جگہ دبا سکتے ہو۔"
"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا ہوں۔" زبیر کی نظریں اس کے چہرے پر گھوم رہی تھیں۔
"اس نے تمہاری بیوی کو قتل کیا اور تم نے اسے قتل کر دیا۔ تمہارا انتقام پورا ہو گیا۔ تم میرے ساتھ ڈیل کر لو، میں یہ قصہ اسی جگہ ختم کر کے سرمد کے قتل کا کیس ہمیشہ کے لیے دبا دوں گا...... آزاد گھومو اور اپنا کام کرو۔ ورنہ تم کو گرفتار کرنا ہی پڑے گا اور تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو گے۔" انسپکٹر کا لہجہ درشت ہو گیا اس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ اس سے کسی رحم کی امید نہ رکھی جائے۔
"کیا ڈیل چاہتے ہو؟" زبیر نے اس کا جائزہ لیا۔
"اس کیس کو دبانے کی کیا قیمت دے سکتے ہو؟" انسپکٹر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
زبیر اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ مسکرایا۔ "تم چاہتے ہو کہ میں قیمت دے کر تم سے ڈیل کر لوں؟"
"ہاں میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "دوسرا راستہ یہ ہے کہ میں تم کو گرفتار کر لوں۔"
"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم مجھے دو دن کی مہلت دے دو۔" زبیر کے دل میں اس کے لیے غصے کی آگ تھی جو پیسے کے لیے اس سے اس کام کی ڈیل کرنا چاہ رہا تھا جو کام اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ زبیر کے دماغ میں ایک دم سے بہت سی باتیں ابھر آئی تھیں۔ وہ اسی لیے اس سے ایک دو دن کا وقت لینا چاہتا تھا۔
"دو دن کی مہلت کیوں مانگ رہے ہو؟" انسپکٹر جلال نے تیکھے انداز سے پوچھا۔

"ایک اچھا ڈنر کریں گے۔ دو دن کے بعد میری سالگرہ ہے۔ سالگرہ کے موقع پر تحفہ دینا اچھا عمل ہے۔" زبیر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرایا۔
انسپکٹر اس کی بات سن کر ہنسا اور بولا۔ "میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کر دی تھی۔ تم تو یاروں کے یار ہو۔ ٹھیک ہے ہم دو دن کے بعد ڈنر پر ملتے ہیں۔ ڈنر کہاں دے رہے ہو؟"
"تمہارا موبائل نمبر میرے پاس ہے۔ ڈنر سے دو گھنٹے پہلے بتا دوں گا۔" زبیر خوش دلی سے بولا اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا پھر انسپکٹر.... دل ہی دل میں مسکراتا ہوا چلا گیا۔ ادھر انسپکٹر.... نے قدم باہر رکھا، زبیر کے چہرے کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور اس کی جگہ نفرت نمودار ہو گئی۔
زبیر نے دروازہ مقفل کیا اور سیدھا اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ کمرا روشن کرنے کے بعد وہ متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا رہا۔ اسے کوئی غیر معمولی چیز دکھائی نہیں دی۔
اچانک وہ چونکا۔ اس کی نظریں اس ٹیبل پر ٹھہر گئیں جہاں بیٹھ کر وہ اپنے آفس کا کام کیا کرتا تھا۔ اس وقت اس میز پر ایک کتاب پڑی ہوئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اپنی نگاہیں اس میز سے ہٹائے بغیر اس جانب بڑھتا رہا۔ قریب جا کر وہ نیچے جھکا اور اس کے چہرے پر حیرت ابھر آئی۔ اس کی نگاہیں میز پر گھوم رہی تھیں اور پھر اس کتاب پر رک گئیں، وہ ناول جو اس کے زیر مطالعہ تھا۔ اس ناول کے اندر سے مختلف صفحات پر چھوٹے رنگ برنگے کاغذ باہر جھانک رہے تھے۔ زبیر نے احتیاط سے وہ ناول اٹھا لیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔
جس صفحے میں پہلا کاغذ نشانی کے طور پر رکھا تھا، زبیر نے وہ صفحہ کھول لیا۔ اس صفحے پر تین الفاظ کو ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے آگے کے صفحات کھولے جہاں نشانیاں لگی ہوئی تھیں۔ جس صفحے پر نشانیاں رکھی ہوئی تھیں وہاں الفاظ ہائی لائٹ کیے ہوئے تھے۔
زبیر نے اٹھ کر کاغذ اور پنسل لی اور شروع سے لے کر آخر تک ہائی لائٹ کیے الفاظ ترتیب سے لکھے اور جب اس نے وہ سب الفاظ ملا کر پڑھے تو وہ اس طرح سے عبارت بنتی تھی۔
"اب میں افسوس ہی کر سکتا ہوں۔ اس افسوس اور غم کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں تمہارے گھر آیا ہوں۔ دل دکھی ہے، یقین کرو میں تم کو مارنا نہیں چاہتا تھا مگر تمہاری ضد نے مجھے بے اختیار کر دیا تھا۔ تمہارے گھر آ کر اقرار کرنے اور معافی مانگنے آیا ہوں۔ سوری۔"
زبیر نے مضطربانہ انداز میں اس تحریر کو متعدد بار پڑھا اور پھر جلدی سے اس نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور میز کے

پاس جا کر اس نے میز کے اوپر کے حصے کی کئی تصویریں بنائیں اور اس کے بعد وہ ان تصویروں کو بار بار کلوز کر کے دیکھتا رہا۔

زبیر سوچ رہا تھا کہ وہ کون تھا جس نے نتاشا کو قتل کیا اور وہ کیا بات منوانا چاہتا تھا کہ نتاشا کے انکار اور ضد سے مجبور ہو کر اس نے اس کا خون کر دیا تھا۔ اسے اپنے کیے پر دکھ اور افسوس تھا، وہ اس کے گھر آیا اور اس ناول کے الفاظ کو ہائی لائٹ کر کے اس نے ایک عبارت لکھ دی۔

ایک بات زبیر کے دماغ میں مسلسل گردش کر رہی تھی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے اس ناول کو پڑھا ہوگا، یا پھر وہ اتنا بے خوف تھا کہ اس نے یہاں بیٹھ کر بڑے اطمینان سے الفاظ تلاش کر کے ان کو ہائی لائٹ کیا اور عبارت کی شکل دے دی۔

قاتل کا اقرار اس کے سامنے تھا اور اب اسے اس قاتل کو تلاش کر کے سزا دینی تھی۔ زبیر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ طمع سے بھرے ہوئے بے حس انسپکٹر کو بھی اسے سبق سکھانا تھا۔

☆☆☆

سنبل اس وقت اپنے کمرے میں تھی جب اسے اطلاع ملی کہ زبیر اس سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ پہلے تو اس نے انکار کر دیا اور پھر اس نے ملنے کا ارادہ کر لیا۔

زبیر ڈرائنگ روم میں تھا۔ جب سنبل اس کے پاس گئی تو اس کا بھائی کچھ کھانے پینے کا سامان لینے کے لیے چلا گیا۔

سنبل اس کے سامنے سرد مہری سے کھڑی تھی۔ کچھ خاموشی کے بعد زبیر بولا۔ ''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''میں سن رہی ہوں۔'' سنبل نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔

''نتاشا تمہاری دوست تھی...... تم دونوں نے ایک ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ ایک دوسرے کے بارے میں بہت سی باتوں کو جانتی ہو گی میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم سے نتاشا نے کوئی ایسی بات شیئر کی تھی جس سے تم کو لگا ہو کہ وہ پریشان ہے اور کوئی اور اسے پریشان کر رہا ہے۔''

''اسے کوئی پریشان کر رہا تھا؟'' ایک دم سے سنبل چونکی اور اس کے چہرے پر جو متانت کے سائے تھے، وہ چھٹ گئے۔

''میرے علم میں ایک بات آئی ہے کہ کوئی ہے جو اُس سے اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔ نتاشا کے انکار کی وجہ سے اس نے نتاشا کا خون کر دیا۔'' زبیر نے بتایا۔

''یہ بات آپ کو کیسے پتا چلی؟'' سنبل کی بے چینی دو چند ہو گئی، اس کے چہرے کی سرد مہری معدوم ہو گئی تھی۔

''اس کی تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا۔ مجھے تم یہ بتاؤ نتاشا نے تم سے ایسی کوئی بات کی تھی؟''

''ان دنوں میں نتاشا نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔'' سنبل نے جواب دیا۔

''نتاشا کو ناول پڑھنے کا شروع سے ہی شوق تھا؟'' زبیر نے پوچھا۔

''آپ کے کمرے میں موجود وہ کتابیں جو شیلف میں سجی ہوئی ہیں وہ دو بھرے کارٹن نتاشا کو کسی نے بھیجے تھے اور اس نے لکھ کر بھیجا تھا کہ کتابیں پڑھا کرو۔''

''میرے لیے یہ ایک انکشاف ہے۔ میں نے کبھی سنبل سے ان کتابوں کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے اور اس کو میں نے کئی بار پڑھتے بھی دیکھا تھا...... وہ کون تھا......؟ کس نے وہ ساری کتابیں بھیجی تھیں؟'' زبیر مضطرب ہو گیا۔

''نتاشا تب ہی کوئی کتاب پڑھتی تھی جب اُس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح اسے کچھ شوق بھی ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کتابیں کس نے بھیجی تھیں، اس کا نہ تو نتاشا کو پتا چلا تھا اور نہ کبھی ہم دونوں کے درمیان اس بارے میں کوئی بات ہوئی تھی۔''

زبیر بے چینی کے عالم میں سوچنے لگا۔ ''وہ کون تھا...... جس نے نتاشا کو اتنی کتابیں بھیجیں...... اس بات میں شک نہیں ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے، اسے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے اور اس نے بہت کچھ پڑھ رکھا ہے۔''

''یہ بات آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' سنبل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''مجھے یاد کر کے بتاؤ...... نتاشا نے کبھی کسی کے بارے میں کوئی ذکر کیا ہو...... کوئی ایسی بات جو صرف تم دونوں ہی جانتی تھیں؟''

سنبل سوچنے لگی اور جھجکتے ہوئے بولی۔ ''ایک بار نتاشا نے مجھ سے ایک بات کا ذکر کیا تھا اور وہ بات اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔''

''وہ کیا بات تھی؟'' زبیر اس کے قریب ہو گیا اور اس کی مضطرب نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور وہ سنبل سے جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ سنبل چپ رہی...... کمرے میں ایسی خاموشی اور سکوت چھا گیا تھا کہ دیوار پر لگے کلاک کی سوئی کی آواز بھی کافی تیز معلوم ہو رہی

فریاد

ایک صاحب قبر کے پاس کھڑے رو رو کر کہہ رہے تھے۔ ''تم تو چلے گئے ہو مگر میری زندگی کو خزاں بنا گئے۔''

ایک راہ گیر نے اُن سے ہمدردی سے پوچھا۔ ''اس قبر میں آپ کا کوئی عزیز، رشتے دار یا کوئی دوست دفن ہے؟''

ان صاحب نے جواب دیا۔ ''جی نہیں، یہ میری بیوی کے پہلے شوہر کی قبر ہے۔''

یوگا

ایک عادی شرابی کی بیوی کو کسی نے مشورہ دیا کہ اپنے شوہر کو یوگا کی مشق کی طرف راغب کرو۔ اس طرح شراب چھوڑنے میں آسانی ہوگی۔

دس ماہ کی طویل اور صبر آزما مشقت کے بعد وہ شخص یوگا میں ماہر ہوگیا۔ اس مشورہ دینے والے نے عادی شرابی کی بیوی سے پوچھا۔

''یوگا کا کوئی فائدہ ہوا؟''

''جی ہاں۔'' بیوی نے جل کر کہا۔ ''اب وہ سر کے بل کھڑے ہو کر بھی شراب پی سکتے ہیں۔''

راجا اسلم حیات، سرگودھا

تھی۔

''مجھے بتاؤ...... میں جاننا چاہتا ہوں۔'' جب سنبل نہیں بولی تو زبیر نے اپنی بے تابی سے مجبور ہو کر پھر پوچھا۔ سنبل نے فیصلہ کیا کہ وہ چھپانے کے بجائے ماضی کا ورق سامنے لے ہی آئے......

☆☆☆

نادر کو انسپکٹر جلال سے شدید خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ ظالم اسے مار کر اس کی موت کو کوئی ایسا رنگ دینے والا ہے جس سے اس کے اندر کا کوئی مذموم مقصد پورا ہو جائے۔

نادر نے فیصلہ کیا کہ وہ شہر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے نظر سے اوجھل ہو جائے۔ وہ اس وقت ایک ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ رات کے ساڑھے نو بجے کا وقت تھا اور شدید سردی ہونے کی وجہ سے سامنے سڑک پر ویرانی سی دکھائی دے رہی تھی۔

ایک عجیب خوف نے اُسے گھیر رکھا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے جلدی سے اپنی چائے ختم کی اور کاؤنٹر پر پیسے دے کر اپنی جیکٹ کی زپ آگے سے کھینچ کر بند کی اور دونوں ہاتھ اس کی جیبوں میں ٹھونس کر ایک طرف چل پڑا۔

سردی سے اس کے کان سن ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ نکال کر جیکٹ کے کالر کھڑے کر لیے تھے۔ پھر اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پرس نکالا اور اس کے اندر موجود پیسے گن کر اطمینان محسوس کیا اور اپنی چال میں تیزی لے آیا۔

نادر جس سڑک کے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ اس سڑک پر اِکا دُکا ہی کوئی آ رہا تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ اس سڑک کی دوسری طرف بس اسٹینڈ تھا۔

اچانک ایک کار اس کے عقب سے آئی اور اس سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ نادر کی تیز چال میں نرمی آ گئی اور وہ کار کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس کے دل میں خوف کی ایک لہر اُٹھی اور وہ کوشش کرنے لگا کہ یہ دیکھ سکے کہ کار کے اندر کون بیٹھا ہے۔

اچانک کار کا دروازہ کھلا اور...... کوئی اندر سے باہر نکلا۔ وہ اندھیرے میں تھا اور اس کی شکل دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ نادر اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ قریب سے ایک تیز رفتار کار گزری تو اس کی روشنی اس شخص کے چہرے پر بجلی کی سی تیزی سے پڑی اور وہ چہرہ پھر اندھیرے میں چلا گیا۔ اس ایک جھلک میں نادر نے اسے دیکھ لیا تھا۔ نادر کے قدم اسی جگہ ساکت تھے۔ اُس کا دل زور سے دھڑکا، اس نے گردن گھما کر اپنے عقب میں دیکھا۔ دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نادر خطرہ بھانپ گیا تھا اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ وہ اس جگہ سے دوڑ لگا دے۔

ابھی وہ بھاگنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اس کے عقب سے آواز آئی۔ ''مجھ سے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ ایک بات کرنی ہے۔ زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

نادر تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے سوچا شاید وہ پھر اس سے کوئی کام لینا چاہتا ہے اور اسے پیسہ ملنے والا ہے۔ وہ دوبارہ اس کی طرف گھوم گیا۔ اس شخص نے اپنے گلے میں لٹکا ہوا مفلر چہرے کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

''کیا بات کرنی ہے؟'' نادر نے پوچھا۔

''میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ کر... بات کرتے ہیں، میرے پاس تمہارے لیے ایک لفافہ بھی ہے۔'' اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے دکھایا۔ ''یہ لفافہ تم کو

خوش کردے گا۔"

نادر کا خیال صحیح نکلا تھا۔ وہ پھر کوئی کام لے کر اس کے پاس آیا تھا اور اس کے عوض اسے لفافے میں بند پیسے ملنے والے تھے۔ نادر اپنے اندیشے اور قیاس کو پسِ پشت ڈال کر گاڑی کی طرف بڑھا اور ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ اس نے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔

"ہماری پہلی ملاقات یاد ہے۔ تمہارے بارے میں مجھے ایک دوست نے بتایا تھا کہ تم رقم لے کر کوئی بھی کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہو۔ تم نے میرا کام تو کر دیا لیکن اس نے تم کو ڈھونڈ لیا اور تم اس سے بھی رقم لے کر اس کے لیے کام کرنے لگے۔"

نادر چونکا۔ "میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے آپ کو کوئی نقصان ہو۔"

"میں جانتا ہوں لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ تم اس سے ملو۔ انسپکٹر جلال میرا ابھی پالتو ہے۔ اسے بھی ہڈی ڈال کے آیا ہوں۔ انسپکٹر اُسے مار دے گا اور وہ اپنی بیوی کے قاتل کی کھوج میں جو بھاگا پھر رہا ہے، اس کے قدم رک جائیں گے اور قصہ ختم ہو جائے گا...... اس کی کھوج دفن ہو جائے گی۔"

نادر نے متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "اس کی بیوی کے قاتل کو آپ جانتے ہیں؟"

اس نے اپنی نگاہیں سامنے مرکوز رکھی تھیں۔ سڑک سنسان اور ویران تھی، وہ بولا۔ "میں چاہتا تو یہ تھا کہ جلال سے تم بات کرو اور اسے مارنے کی ڈیل تمہارے ذریعے سے ہو لیکن مجھے اعتبار نہیں تھا۔ تم اسے بتا دیتے اور مجھے کسی اور کی مدد لینی پڑی...... تم نے اس کام کی اچھی خاصی رقم گنوا دی۔" یہ کہنے کے بعد اس نے چہ...... چہ...... چہ کرتے ہوئے تاسف کا اظہار کیا۔

ایک دم اس نے گاڑی روک دی اور اپنے بدلے ہوئے لہجے میں حکم دیا۔ "گاڑی سے اتر جاؤ۔"

نادر کے لیے اس کا بدلاؤ حیران کن تھا۔ اس کے لہجے میں ایسی دہشت تھی کہ نادر نے اس کی بات ماننے میں ہی عافیت محسوس کی اور کار کا دروازہ کھول کر ایسے باہر نکلا جیسے وہ کچھ دیر اور اسی سیٹ پر براجمان رہا تو وہ شخص سفاکی کی مثال قائم کر دے گا۔

نادر نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ وہ ایک ویرانے میں کھڑا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ کب اس نے گاڑی اس سڑک سے موڑ کر اس ویرانے پر...... ڈال دی تھی۔

اچانک ایک عجیب سی آواز آئی جس نے اس سنسان جگہ کے سکوت کے کانوں کو بھی خبر نہیں ہونے دی تھی۔ گاڑی آگے بڑھ گئی تھی اور نادر اسی جگہ کھڑا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تغیر کے رنگ بکھر رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور سینے سے نکلنے والے خون کو اپنے ہاتھ پر لگا دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس شخص نے بے آواز ریوالور سے گولی اس کے سینے میں اتار دی تھی اور اس کا سینہ خون سے بھر گیا تھا۔

ایک دم وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں اور تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اسی تکلیف میں وہ اوندھے منہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس ویرانے میں اس کا بے جان جسم پڑا تھا۔

☆☆☆

جب سے زبیر کی ملاقات سنبل سے ہوئی تھی، وہ اسی وقت سے مضطرب تھا۔ گھر واپس آ کر اسے ایک پل چین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے لیے وہ رات بھاری تھی۔ وہ کسی طرح سے رات گزارنا چاہتا تھا۔ اسے دن کے سورج کا انتظار تھا اور وہ انتظار اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔

جیسے تیسے اس نے رات گزاری لی تھی۔ وہ نتاشا کے قاتل کی کھوج کو منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا تھا اور سب کچھ سوچ لیا تھا۔

اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا تو دن کے دس بج چکے تھے۔ وہ پیدل ہی گھر سے باہر نکلا اور کتابوں کی مارکیٹ چلا گیا۔ وہاں بہت سے پبلشرز کے دفاتر تھے۔ وہ اس آفس کے سامنے پہنچ گیا جس نے وہ ناول شائع کیا تھا جس کے بہت سے الفاظ کو ہائی لائٹ کر کے ایک تحریر بنا کر قاتل نے اپنے جرم کا اقرار بھی کیا تھا اور زبیر کو ایک نئی راہ بھی دکھا دی تھی۔

جب بیس منٹ کے بعد وہ اس آفس سے باہر نکلا تو وہ ایک کاغذ کو اپنی جیب میں ڈال رہا تھا۔ اس کے قدم تیزی سے ایک رکشے کی طرف بڑھے اور اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر انسپکٹر جلال کو کال کی۔

جونہی اس کی آواز آئی، زبیر نے کہا۔ "آج کا لنچ ایک ساتھ کریں تو کیسا رہے گا؟"

"بہت اچھا رہے گا۔ آج میں چھٹی پر ہوں۔" دوسری طرف سے انسپکٹر چہکا۔

زبیر نے وقت دیکھا۔ "ایک ایڈریس آپ کو بھیجوں گا۔ آپ بارہ بجے وہاں پہنچ جائیں، ایک پُرتکلف لنچ آپ کے انتظار میں ہوگا۔" زبیر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''صرف لنچ ہی ہوگا، یا کچھ اور بھی ملے گا جس سے تمہاری جان کو سکھ آجائے؟'' انسپکٹر بولا۔

''اپنی جان کے سکھ کے لیے ہی تو یہ سب کر رہا ہوں۔'' زبیر کے چہرے پر متانت آگئی۔

''آج مزہ آجائے گا۔ میں اس جگہ پہنچ جاؤں گا۔'' انسپکٹر خوش ہو گیا تھا۔

زبیر نے فون بند کیا اور رکشے والے کو ایڈریس بتا کر اس میں بیٹھ گیا۔ رکشا ایک پوش علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ جس بنگلے میں زبیر کو جانا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر اس نے رکشا رکوایا اور کرایہ ادا کر کے چل پڑا۔

بنگلے کے باہر اس کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ زبیر نے بیل پر انگلی رکھ دی۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی کے چلنے کی آواز آئی اور جونہی تھوڑا سا گیٹ کھلا، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو آنے والے کے منہ سے ایک دم نکلا۔

''تم......؟''

''تم مجھے جانتے ہو؟'' زبیر نے بغیر لمحہ ضائع کیے پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے فوری نفی میں گردن ہلائی۔

''میں اندر آسکتا ہوں۔'' زبیر نے اجازت چاہی۔

''مجھے کہیں جانا ہے، آپ کون ہیں اور کس کام سے آئیں ہیں مجھے یہیں بتا دیں۔'' آنے والے کہا۔

''بہت ضروری بات کرنی ہے جو یہاں نہیں ہوسکتی۔''

''آج مجھے جلدی ہے، آپ دو گھنٹے کے بعد آجانا۔'' اس نے کہہ کر گیٹ بند کر دینا چاہا۔

''ایک گھنٹے کے بعد تو آپ کی فلائٹ ہے۔ آپ یہ ملک چھوڑ دیں گے۔'' زبیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ چونک اٹھا۔

''آپ کو کس نے کہا، میں ملک چھوڑ رہا ہوں؟'' اس کے چہرے پر حیرت برسنے لگی۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اندر آنے دیجیے، بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔'' زبیر نے اطمینان سے کہا۔

اُس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہے۔ آخر کار وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے، اندر آجاؤ لیکن پندرہ منٹ سے زیادہ بات نہیں ہوگی۔'' اتنا کہتے ہی اس نے ایک دم سے گیٹ بند کر دینا چاہا لیکن وہ جانتا نہیں تھا کہ زبیر نے پہلے ہی ایک پیر اندر رکھا ہوا تھا۔ گیٹ بند نہ ہوا اور اسی لمحے زبیر نے اس کو دھکا دیا اور اندر جاتے ہی گیٹ بند کر دیا۔

وہ گرتے ہی جلدی سے اُٹھا اور چاہتا تھا کہ زبیر پر حملہ کر دے لیکن ایسا ممکن نہ ہوسکا کیونکہ زبیر نے اس کو دبوچ لیا تھا۔

''تمہارے لیے اچھا یہی ہوگا کہ تم کوئی مزاحمت مت کرو اور چپ چاپ اندر چلو...... مسٹر اسد نواز صاحب......'' زبیر دانت پیس کر بولا۔

زبیر کی گرفت مضبوط تھی اور اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ زبیر کی بات مان کر اندر چل پڑے۔

دونوں اندر چلے گئے۔ کشادہ اور ہر سہولت سے سجائی وی لاؤنج قابلِ ستائش تھا۔ زبیر نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

زبیر نے اس کا جائزہ لیا اور اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی ٹانگ پر رکھے تھے۔

''یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔'' زبیر نے کہا۔

''ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟'' اسد کو حیرت ہوئی۔

''وہ دن یاد کرو جب میں اپنے آفس کی بلڈنگ سے باہر نکل رہا تھا اور لفٹ سے نکلتے ہی میرا تم سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔'' زبیر نے بتایا تو وہ یاد کرنے لگا۔ زبیر پھر بولا۔ ''تم نے سوری کیا تھا اور جاتے ہوئے مجھ سے ہاتھ بھی ملایا تھا......''

''مجھے یاد نہیں ہے۔'' اسد نے بے پروائی سے سر کو جھٹکا۔

زبیر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ خوش پوش تھا اور اس کی عمر میں سال سے زیادہ تھی۔

زبیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک پوچھا۔ ''میری بیوی کو کیوں قتل کیا تھا؟''

وہ چونکا اور فوراً بھڑکا۔ ''تمہاری بیوی کو میں نے قتل کیا تھا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ مجھ پر تم یہ الزام لگا بھی کیسے سکتے ہو؟''

''تم ایک بڑے بزنس مین باپ کی اولاد ہو۔ تمہارا باپ بیرونِ ملک رہائش پذیر ہے۔ تم نے یہاں اپنے شوق کی خاطر پبلشنگ ادارہ قائم کیا تھا جو دس دن قبل فروخت کر چکے ہو اور اسے تمہارے ایک دوست نے خریدا ہے...... لکھنا تمہارا شوق ہے اور تم نے اپنے لکھے ناول خود چھاپے ہیں۔''

''اِن باتوں سے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔ میرے گھر میں گھس کر مجھ پر الزام لگا رہے ہو؟ تم ہو کون؟'' وہ سیخ پا ہو گیا۔

''میں نتاشا کا شوہر ہوں اور نتاشا کو تم نے قتل کیا تھا۔ تم اُس سے ایسی کون سے بات منوانا چاہتے تھے کہ انکار پر تم نے اسے قتل کر دیا۔'' زبیر کی آواز بھی اونچی ہو گئی تھی۔

یہ کیا بکواس ہے۔'' وہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اسی وقت زبیر

نے اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا کہ وہ پھر کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"اب اگر تم اُٹھے تو مجھے مجبوراً اپنا پستول نکال کر تمہارے سر میں چھید کرنا پڑے گا۔" زبیر غصے سے بولا تھا۔ "تم میرے گھر آئے تھے اور تم نے اپنے ناول کے الفاظ کو ہائی لائٹ کر کے اقرار کیا تھا کہ تم نتاشا کے قاتل ہو۔ وہ پڑھ کر میں نے سوچا یہ سب وہی کر سکتا ہے جس نے یہ ناول کئی بار پڑھا ہو، یا پھر اس ناول کو لکھا ہو۔"

"میرا خیال ہے مجھے پولیس کو بلا لینا چاہیے۔" اسد نے کچھ فاصلے پر رکھے اپنے موبائل فون کی طرف دیکھا۔

"تم نتاشا کو اُس وقت سے تنگ کر رہے تھے جب تم دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ تم نے اسے شادی کے لیے ہر طرح سے منانے کی کوشش کی ...... اسے لالچ بھی دیا اور ڈرانے دھمکانے کی بھی کوشش کی لیکن وہ تم سے نفرت کرتی تھی اور اس کی شادی مجھ سے ہو گئی لیکن پھر بھی تم نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اُس دن تم اس کے پیچھے ہمارے گھر آئے اور اسے مجبور کرنے لگے کہ وہ مجھ سے طلاق لے کر تم سے شادی کر لے...... اس کے انکار پر تم جنونی ہو گئے اور اُسے جان سے مار دیا......"

"تم اپنی بکواس جاری رکھو...... تم مجھ سے بھی اچھے رائٹر ہو۔" وہ مسکرایا۔

"جب تم مجھ سے پہلی بار ٹکرائے اور سوری کرتے ہوئے تم نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو میں نے ایک چیز محسوس کی اور تمہارے ہاتھ کی طرف دیکھا...... جب تم میری غیر موجودگی میں میرے گھر آئے تو تم نے گرد آلود میز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ٹکا دیے تھے، شاید تم کچھ سوچ رہے تھے، یا تم کو اپنے کیے پر ندامت تھی لیکن تم نہیں جانتے تھے کہ تم اپنے ہاتھوں کا نقش چھوڑ کر جا رہے ہو جس نے میری کھوج کو یہاں تک پہنچا دیا۔"

زبیر کی بات سن کر وہ پہلی بار کچھ پریشان دکھائی دیا۔ اس کی نگاہیں اپنے ہاتھوں کی طرف چلی گئیں اور اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر دیں۔

"تمہاری فضول باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔" اسد نے کہا۔

زبیر نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم سے پہلی بار جب ہاتھ ملایا تو میں نے کیا محسوس کیا جانتے ہو......؟ اور جب تمہارے ہاتھوں کا نقش گرد آلود میز پر دیکھا تو میرے دل نے کہا، یہ وہی ہے......" زبیر کہتے ہوئے رک گیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ "ایک بار تم نے نتاشا کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے اپنے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا چاقو سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا...... گرد آلود میز پر تمہارے ہاتھوں کا نقش موجود تھا جس میں تمہاری نو انگلیاں تھیں......" زبیر نے کہتے ہی اس کا بایاں ہاتھ اُٹھا کر اوپر کیا تو اس ہاتھ کا انگوٹھا نہیں تھا۔

اسد نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اسے ایک طرف دھکا دے کر کھڑا ہو گیا۔ زبیر فرش پر گر گیا......

وہ بولا۔ "اب بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو سن لو میں اس دن نتاشا کو یہی کہنے گیا تھا کہ وہ تم سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے لیکن اس نے انکار کر دیا اور مجھ سے اس کا انکار برداشت نہ ہو سکا...... پھر مجھ سے اس کا خون ہو گیا...... اچھا ہے تم یہاں آ گئے ہو...... میری آج فلائٹ ہے میں چلا جاؤں گا لیکن تمہاری زبان ہمیشہ کے لیے بند کر کے جاؤں گا۔" زبیر نے تو وہ بات اندھیرے میں تیر چھوڑنے کے مترادف کی تھی لیکن اسد نے اقرار کر لیا تھا کہ اس نے نتاشا کو قتل کیا تھا۔

"میں نتاشا سے بہت محبت کرتا تھا۔ جب مجھ سے اُس کا قتل ہو گیا تو مجھے بہت ندامت ہوئی اور اسی ندامت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں تمہارے گھر گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس میز پر ٹکا کر افسوس کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنی کتاب کے الفاظ ہائی لائٹ کیے اور وہاں سے چلا آیا۔ جب میں تم سے ٹکرایا تھا تو میں تمہاری بیوی کو قتل کر کے تمہارے آفس تم کو مارنے کے لیے گیا تھا لیکن تم جا رہے تھے اور میں ایسا نہ کر سکا۔"

اسد تیزی سے ایک طرف گیا اور دراز کھول کر اندر سے پستول نکال کر اس نے اس کا رخ زبیر کی طرف کر دیا۔ زبیر کھڑا ہو گیا تھا۔

"اچھا ہوا تم یہاں آ گئے۔ تم کو مار کر میں سکون سے باہر جا سکوں گا۔ نادر کو تو میں نے مار دیا...... تم مر جاؤ گے تو پھر کوئی نہیں ہوگا جو نتاشا کے قاتل کی کھوج میں بھاگے گا...... مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اسد نے کہہ کر جونہی گولی چلانے کے لیے اپنی انگلی کو جنبش دینی چاہی اسی وقت زبیر نے برق رفتاری سے پاس پڑا گلدان اُٹھا کر اسے دے مارا۔ عین اس وقت جب وہ ٹریگر دبا رہا تھا۔ گلدان اس کے ہاتھ پر لگا اور پستول کا رخ تیزی سے اس کے اپنے سینے کی طرف ہو گیا اور گولی چل گئی۔ اس کے سینے سے خون بہنے لگا اور وہ فرش پر گر گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ساکت ہو گیا۔

زبیر اپنی جگہ سے اُٹھا اور اسد کا بے جان جسم دیکھنے لگا۔ خون ارد گرد پھیل گیا تھا۔ اس نے وقت دیکھا، گیارہ بج کر بیس

منٹ ہو گئے تھے۔ زبیر نے سوچا تھا کہ وہ اسد کو زندہ پکڑ کر پولیس کے حوالے کرے گا اور انسپکٹر جلال کے لیے بھی اس نے ایک الگ منصوبہ بندی کی تھی۔ لیکن اسد کی موت نے اس کی سوچوں کا رخ بدل دیا تھا۔ اب اسے کچھ اور کرنا تھا۔

زبیر کے پاس سوچنے کے لیے وقت کم تھا۔ اُس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک دم اس نے اسد کے موبائل فون کی طرف دیکھا اور جلدی سے فون اُٹھا کر اس نے ایک نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا رابطہ ہوا تو اس نے پیزا کے ساتھ کچھ اور لوازمات کا آرڈر دے کر موبائل فون ایک طرف رکھا اور اسے اپنے رومال سے اچھی طرح سے صاف کر دیا۔

اس کے بعد وہ ٹی وی لاؤنج سے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ اس کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا۔ اس نے بیڈ روم میں جا کر تین، چار چادریں نکالیں اور اسد کی لاش کو اس میں لپیٹ دیا اور اسے کھینچ کر ڈرائنگ روم میں لے گیا اور دروازے کے پاس رکھ دیا۔

وہ کام کرنے کے بعد زبیر نے کپڑے سے اچھی طرح خون صاف کیا اور خون آلود کپڑوں کو ایک کمرے میں پھینک کر دروازہ بند کرنے کے بعد اچھی طرح سے ہاتھ دھوئے اور انہیں خشک کرنے کے بعد انسپکٹر جلال کو کال کر دی۔

وہ اسی کی کال کے انتظار میں تھا۔ دوسری بیل پر اس کی آواز آئی۔ ''ہیلو جانی۔''

''میں ایک پتا بھیج رہا ہوں وہاں بیس منٹ میں پہنچ جائیں اور یہ پتا میں اپنے دوسرے نمبر سے بھیجوں گا۔'' زبیر اطمینان سے بولا۔

''جلدی بھیجو...... میں اٹھارہ منٹ میں تمہارے پاس ہوں گا۔'' اس کی چہکتی آواز آئی۔

زبیر نے کال منقطع کر کے پہلے اسد کے موبائل فون میں انسپکٹر جلال کا نمبر جانی کے نام سے محفوظ کیا اور اس کے بعد اسے اس جگہ کا پتا بھیج دیا۔

انسپکٹر جلال کے آنے سے قبل پیزے والا آ گیا تھا۔ زبیر نے سارا سامان لے کر ڈائننگ ٹیبل پر سجا دیا۔ اس کے بعد اس نے اچھی طرح سے جائزہ لیا کہ کہیں کوئی خون کا دھبا تو دکھائی نہیں دے رہا...... سب کچھ ٹھیک تھا۔

انسپکٹر جلال اپنے دیے وقت سے دس منٹ لیٹ آیا۔ زبیر نے کھڑکی سے پہلے یہ دیکھا کہ اس کے ساتھ کون آیا ہے۔ وہ اکیلا ہی اپنی گاڑی میں تھا۔ زبیر نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا اور گیٹ کھول کر انسپکٹر کو گاڑی اندر ہی لے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ گاڑی اندر لے گیا اور زبیر نے گیٹ بند کر دیا۔

''میری گاڑی اندر کیوں لگوا دی تم نے؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ باہر ہی رہنے دیتے۔ میں نے تو ایسے ہی کہا تھا کہ اندر لے آئیں'' زبیر بولا۔

''خیر اب لگ گئی ہے تو کوئی بات نہیں۔'' انسپکٹر نے کہتے ہوئے وہاں کھڑی اسد کی قیمتی کار کو دیکھا۔ ''مہنگی گاڑی رکھی ہوئی ہے۔''

''میرا شوق ہے۔'' زبیر نے کہتے ہوئے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

دونوں جب ٹی وی لاؤنج میں پہنچے تو انسپکٹر ہر چیز کی طرف ایسے دیکھتا رہا جیسے وہ اُٹھا کر بھاگ جائے گا۔

''تم تو میری سوچ سے بھی زیادہ دولت مند ہو۔'' اس نے للچائی نظریں ارد گرد سے ہٹائی نہیں تھیں۔

''پہلے کچھ کھا لیتے ہیں پھر باتیں کریں گے۔'' زبیر اُسے ڈائننگ ٹیبل کی طرف لے گیا۔ پیزا، پاستہ کے ساتھ کھانے کے دوسرے لوازمات کو دیکھ کر انسپکٹر کی رال ٹپکنے لگی تھی۔

اس نے کرسی سنبھال لی اور چھری کانٹا پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی زبیر بھی بیٹھ گیا۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔

زبیر نے کھاتے ہوئے کہا۔ ''ساتھ ساتھ بات بھی ہو جائے۔''

''ہاں بالکل۔'' اس نے منہ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے اپنی بیوی کے قتل کے الزام سے نکالنے کے لیے آپ کتنی رقم لیں گے؟'' زبیر نے پوچھا۔

''پہلے کم کا ارادہ تھا۔ لیکن اب تمہاری عیش دیکھ کر میں نے ارادہ بدل لیا ہے۔ تم مجھے دو کروڑ دو گے۔''

''یہ بہت زیادہ ہیں۔''

''یہ بات کوئی عام آدمی کہے تو میں مان لوں۔ تمہارے منہ سے یہ بات جچتی نہیں ہے۔ میرا ماضی کا ریکارڈ اُٹھا کر دیکھ لو جو میرے ہاتھ چڑھا میں نے اسے کبھی چھوڑا نہیں ہے...... تم خوش قسمت ہو جس سے میں نے ڈیل کی بات کی ہے۔'' اس نے پاستہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ رقم میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ آپ کھائیں میں صرف پانچ منٹ میں آیا۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''بینک منیجر کو کال کرنے...... تاکہ ہمارے وہاں پہنچنے تک وہ اتنی رقم کا انتظام رکھے۔''

''رقم تم مجھے بینک سے لا کر دو گے؟''

"بینک قریب ہی ہے۔ آپ ایک طرف گاڑی میں رہنا۔ میں دس منٹ میں واپس آؤں گا اور آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں۔" اس نے ایک بڑا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

زبیر سیدھا ڈرائنگ روم میں گیا۔ وہ اس دروازے سے باہر نکلا اور کار کی ڈگی کھول کر برق رفتاری سے ڈرائنگ روم میں گیا اور اس نے چادروں میں لپٹی اسد کی لاش کو اُٹھایا اور باہر لے جا کر ڈگی میں رکھا اور ڈگی بند کر کے ایک کپڑا اُٹھا کر فرش پر پڑنے والے خون کے دھبے صاف کیے اور واپس جا کر ڈرائنگ روم سے ملحق باتھ روم میں ہاتھ دھوئے اور اپنے رومال سے صاف کر کے واپس ڈائننگ ٹیبل کے پاس پہنچا تو انسپکٹر بے فکری سے کھانے میں منہمک تھا۔

"جلدی سے ختم کرلیں بینک چلنا ہے۔" زبیر نے جاتے ہی کہا۔

انسپکٹر جلال نے اسی وقت کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور رومال سے منہ صاف کرنے کے بعد بولا۔ "جہاں رقم کی بات آجائے وہاں دوسرا کام اسی وقت بند...... چلو چلتے ہیں۔"

انسپکٹر کھڑا ہو گیا اور دونوں باہر نکلے تو زبیر نے بہانے سے واپس جا کر وہ تمام جگہیں صاف کر دیں جہاں اس کے ہاتھ لگے تھے۔ اس کے بعد وہ واپس گیا اور انسپکٹر کو بینک کا بتا کر بولا۔ "آپ وہاں پہنچیں میں پیچھے آرہا ہوں۔"

انسپکٹر جلال نے کار باہر نکالی اور ایک طرف کا رخ کر لیا۔ زبیر نے گیٹ بند کیا اور کپڑے سے اپنے ہاتھوں کے نشان صاف کرنے کے بعد وہ واپس اندر گیا اور اسد کا موبائل فون کپڑے سے اُٹھا کر ایک نمبر ملانے کے بعد سلسلہ بحال ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

اچانک زبیر کی نظر ڈائننگ ٹیبل پر پڑی اور اس کی نگاہ اسی جگہ منجمد ہو کے رہ گئی۔

☆☆☆

انسپکٹر جلال نے بینک سے کچھ ہی فاصلے پر کار کھڑی کر دی۔ اس کے بالکل سامنے بینک کا مین گیٹ تھا اور اس کی نگاہیں اسی جگہ جمی ہوئی تھیں۔ اسے زبیر اندر جاتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنا موبائل فون نکال کر زبیر کو کال کرنا چاہی لیکن اپنی جیبوں پر ہاتھ مارنے کے باوجود اسے اپنا موبائل فون نہیں ملا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے اپنا موبائل فون ڈائننگ میز پر رکھا تھا اور شاید وہ اسی جگہ بھول آیا تھا۔

انسپکٹر جلال کے چہرے پر پریشانی عیاں ہونے لگی۔ وہ اس تذبذب میں تھا کہ وہ اسی وقت واپس جائے اور وہاں سے اپنا موبائل فون لے کر آئے، یا اسی جگہ موجود رہ کر زبیر کا انتظار کرے۔ اس نے مناسب یہی سمجھا کہ وہ زبیر کا انتظار کرے۔ رقم لے کر اسی کے ساتھ جا کر اپنا موبائل فون لے لے گا۔

اسے انتظار کرتے ہوئے بیس منٹ سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ زبیر تو اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اس کی گاڑی کے پاس ایک پولیس کی گاڑی رکی اور اندر سے ایک ساتھ چار پولیس والے باہر نکلے۔

ان میں سے ایک اہلکار انسپکٹر جلال کو جانتا تھا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی ٹھٹکا لیکن اس علاقے کے انسپکٹر نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور کہا۔ "اپنی کار کی ڈگی کھولو......"

"کیا ہوا ہے؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ابھی بتاتے ہیں...... کار کی ڈگی کھولو۔" انسپکٹر نے کہا۔

ناچار انسپکٹر جلال نے ڈگی کھول دی۔ انہوں نے دیکھا کہ چادر میں لپٹا کچھ پڑا ہے۔ جب اسے کھولا تو وہ اسد کی لاش تھی۔ انسپکٹر جلال کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا ہے۔

"مجھے اس لاش کا معلوم نہیں ہے۔" انسپکٹر جلال نے جلدی سے کہا۔

"تمہاری کرپشن کے قصے بہت سنے تھے۔ کسی کو قتل کر کے اس کی لاش لے کر اس طرح گھومتے ہوئے مل جاؤ گے، یہ میں نے نہیں سوچا تھا......" انسپکٹر نے متانت سے کہا۔

وہاں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ کئی لوگوں نے ویڈیو بنانا شروع کر دی تھی۔ انسپکٹر جلال اپنی صفائی دیتا رہا لیکن وہ اسے گرفتار کر کے لے گئے......

☆☆☆

ٹی وی پر مسلسل انسپکٹر جلال کی خبر چل رہی تھی۔ اُس کی کار سے لاش برآمد ہوتے ہی اس کی کرپشن کی خبریں بھی بیان کی جاری تھیں، گڑے مردے باہر نکلنے لگے تھے۔ ہر نیوز چینل اسی خبر کو نشر کر رہا تھا۔

زبیر کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور اُس کی نظریں باہر تھیں۔ ٹی وی کی آواز اس کے پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ شاید زبیر نے اس لیے اس خبر کی آواز اونچی رکھی تھی کہ وہ متاشا کو سنانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں نے تمہارے قاتل کا کھوج بھی لگایا اور ایک راشی اور بے ایمان انسپکٹر کو بھی انجام تک پہنچا دیا ہے۔

❖❖❖

سرورق کی دوسری کہانی

وطن پرست

یعقوب بھٹی

پرانے رسم و رواج اور ریتیں آج بھی قائم ہیں... لوگ اُن پر چلنا اپنی غیرت سمجھتے ہیں... جو ان روایتوں کا احساس اور پاس نہیں رکھتے... انہیں بے غیرت اور غدار سمجھا جاتا ہے... جدید دنیا سے دور ہمارے دیس کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے ایسے ہی روایت پرست لوگوں کی کہانی... نہ ختم ہونے والے مسائل اور الجھنوں نے انہیں ہتھیار اٹھانے پر مجبور کردیا تھا...

سرد ترین علاقوں میں یقین اور بے یقینی کے درمیان الجھی زندگی کے نشیب و فراز......

برسات کا موسم اس بار ایک نیا قہر برپا کر کے رخصت ہو گیا تھا اور اپنے پیچھے تباہی و بربادی کے انمٹ نقوش چھوڑ گیا تھا۔

موسم کروٹ لے چکا تھا اور خنکی خاصی بڑھ گئی تھی۔ پہاڑوں اور میدانوں پر مشتمل...... قدرت کے بے پناہ خزانے اپنے سینے میں چھپائے اس بدقسمت سرزمین پر چاندنی رات اپنے پورے فسوں کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے زمین نے خود میں چھپا سارا سونا اپنی اوپری

پرت پر چڑھا دیا ہے۔

زمین اور پہاڑ سنہرے رنگ میں رنگ کر کسی جادوئی سرزمین کا منظر پیش کر رہے تھے۔ آبادی سے دور ایک ویران پہاڑ کی چٹان سے فضا میں رباب کی مدھر تان اُبھری اور رفتہ رفتہ ایک لہر بن کر ہوا کے رخ پر بہنے لگی۔

یہ ایک معروف دُھن تھی۔ ”چاند میری زمیں...... پھول میرا وطن۔“

رباب پر یہ دُھن بجانے والا ایک نوجوان تھا۔ مخصوص رنگ کا سیاہ لباس...... گھنگھریالے گہرے براؤن بال جو پٹوں کے مانند چہرے کے اطراف گرے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی داڑھی مونچھ...... وہ ایک خوبرو نوجوان تھا جس کی رباب بجاتے ہوئے آنکھیں بند اور چہرے پر کرب کی کیفیت تھی۔

نوجوان کے ہاتھوں میں رباب اور گود میں AK47 پڑی تھی۔ رباب اور رائفل کا یہ عجیب کمبی نیشن تھا۔ نوجوان کے کندھوں پر گرم چادر تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آتا تھا۔

چاندنی رات اور رباب کی آواز نے مل کر جیسے پوری کائنات پر سحر طاری کر دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کائنات کی گردش بھی تھم گئی ہو۔

اسی پرفسوں ماحول میں بھاری بدن کا ایک نوجوان چٹان کے عقب سے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ اس نے بلند آواز میں نوجوان کو آواز دی۔

”اوئے بغلول (دیوانہ، احمق) یہ کیا غضب کر رہا ہے؟“ آنے والے کی آواز میں تشویش انگیز غصہ تھا۔ ”تجھے بجانے کو صرف یہ دُھن ملی تھی۔“ قریب آ کر اس نے نوجوان کے ہاتھ سے رباب چھین لیا۔ سحر ٹوٹ گیا...... کائنات کی گردش دوبارہ سے بحال ہو گئی۔

نوجوان نے آنکھیں کھولیں۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ دُھن بجاتا نہیں ہوں...... یہ خود میری انگلیوں میں سرایت کر جاتی ہے۔“ اس کی آواز میں بے بسی تھی۔

رباب بجانے والے نوجوان کا نام راغ تھا اور اسے دُھن بجانے سے منع کرنے والا اس کا چچازاد بھائی دودا تھا۔

دودا نے اسے خفگی سے دیکھا۔ ”یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ تو دھن بجاتا ہے یا یہ خود بج جاتی ہے مگر یہ معلوم ہے کہ سردار تک یہ خبر پہنچ گئی تو تیری دُھن رائفل کی تان پر ضرور بجا دے گا۔“

راغ نے سر جھکا لیا۔

دودا نے مزید اس کی گوشمالی کی۔ ”تو یہاں پہرے پر بیٹھا ہے اور تیرا دھیان کہیں اور ہے۔“

راغ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس کے چہرے کا کرب اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ان پر نظریں جما دیں۔ چہرے پر کرب اور بے بسی گڈمڈ ہو گئے۔ وہ دلخراش لہجے میں بولا۔ ”میں کیا کروں؟ میں جب بھی تنہا ہوتا ہوں ان فوجیوں کے چہرے سامنے آ جاتے ہیں جنہیں ان ہاتھوں سے مارا تھا۔ میرا خود پر اختیار ختم ہو جاتا ہے۔“ اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

دودا کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ”وہ غاصب تھے۔ ہمارے وسائل غضب کر کے...... وہ، ہم پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ ہم نے جو کیا وہ بالکل درست تھا۔“ آخر میں اس کا لہجہ آتشی ہو گیا تھا۔

راغ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”غاصب؟ وہ تو سیلابی ریلے میں پھنسے ہمارے ہی لوگوں کی مدد کر رہے تھے اور ان میں راشن تقسیم کر رہے تھے۔“

دودا نے تنفر سے سر جھٹکا۔ ”یہ محض دکھاوا اور سادہ لوح لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے کا ایک ڈھونگ تھا۔ سردار کے پاس آئے مہمانوں کی باتیں بھول گئے۔ ہمارا سونا، گیس اور ہر چیز تو یہ لوٹ کر لے جا رہے ہیں۔ ہماری بندرگاہیں انہوں نے بیچ دی ہیں...... ہمارے حصے میں کیا آ رہا ہے...... افلاس اور فاقے۔“ دودا کے گلے کی رگیں پھولنا شروع ہو گئی تھیں۔

”خود کو دیکھ لو...... چاچا نے زمین گروی رکھ کر تجھے پڑھنے بھیجا تھا۔ پڑھ کر تو نے کون سا تیر مار لیا ہے...... یا پھر ان غاصبوں نے کون سی تجھے نوکری دی ہے۔“ اس کے لہجے میں زہریلا تمسخر در آیا تھا۔

”دھکے کھا کر تو نے بندوق ہی اٹھائی ہے تو زمین کو قرقی سے بچا سکا ہے اور سردار کا دباؤ ہی تھا جو تیری بچپن کی منگ (منگیتر) کسی اور کے ڈولے میں ابھی تک نہیں بیٹھی۔“ وہ بولتا ہی چلا گیا۔

راغ کا سر جھک گیا۔ یہ تلخ حقائق کا وزن تھا جو اُس کی گردن کے عقب میں آ گرا تھا۔

جھکے سر نے دودا کو قدرے نرم کر دیا۔ وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ”تیرے خیالات کی بھنک بھی سردار کو پڑ گئی تو تیری خیر نہیں ہے۔ الٹا سیدھا نہ سوچا کر۔ چار آنے

اکٹھے کر اور بانو کو بیاہ کر لے آ۔" دودا نے اس کے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں ڈالیں۔ "سوچا کر تو صرف بانو کے بارے میں ہی سوچا کر۔"

راغ نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں تاریک سائے تھے۔ وہ راکھ راکھ لہجے میں بولا۔ "میں، بانو کو نیا دکھ نہیں دے سکتا۔ میری زندگی ہوا میں رکھا چراغ ہے۔ سردار نے میری مرضی کے بغیر ہی اس کے باپ کو پیغام بھیجا تھا۔ یہ بھی تیری کارستانی ہے۔ مجھ سے پوچھ تو لیتا۔" آخر میں وہ شکوہ کر بیٹھا۔

دودا نے اُسے گھورا۔ "خدا کے بندے کوئی امید تو زندہ رکھ۔ تجھ سے بات کر کے تو جگر کا خون ہی جلتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ قدم پٹختا وہاں سے چلا گیا۔

راغ نے خالی خالی نگاہیں سامنے جما دیں۔ یہاں سے دور دور تک نظر رکھی جا سکتی تھی۔ راغ کی نگاہیں ان راستوں پر تھیں مگر اس کا دماغ کہیں اور تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ بڑا پُرجوش تھا۔ خوب صورت مستقبل اور بانو کی رفاقت کا خواب اس کی آنکھوں میں دھنک بن کر اترا تھا مگر رفتہ رفتہ جوش مایوسی میں بدل گیا اور آنکھوں میں خواب دھندلانے لگے۔ نوکری کی تلاش میں لگنے والے دھکوں نے اس کی توانائیاں چوس لی تھیں۔ اپنی مایوسی اسے بوڑھے باپ کے چہرے پر نظر آتی تھی جو اس سے یہ بات چھپائے ہوئے تھے کہ اس کے تعلیمی اخراجات کی خاطر وراثتی زمین کا ٹکڑا رہن رکھا تھا اور اصل رقم کے علاوہ سود کی ادائیگی کا بوجھ اس کی کمر توڑے جا رہا تھا۔

زمین کے رہن والی بات زیادہ دیر چھپی رہنے والی نہیں تھی۔ یہ پہاڑ بہت جلد ہی راغ کے سر پر آ گرا۔ قرض دینے والے نے آخری تاریخ دے دی تھی۔

راغ کی بیکاری کا اب چرچا ہونے لگا تھا۔ تعلیم یافتہ کا لیبل لگنے کے بعد وہ کان میں کام کرنے والے مزدوروں میں بھی شامل نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ مزدوری کے لیے نہیں بنا تھا۔

بانو...... اُس کے بچپن کی منگیتر اور ان پہاڑوں میں کھلنے والا ایک شوخ پھول تھی۔ اسے دیکھ کر بانو کے چہرے پر جو شرمگیں لالی دوڑ جاتی تھی اور گہری سیاہ آنکھوں میں جو شوخی کروٹ لیتی تھی...... راغ اس کے لیے ساری دنیا تج دینے کو تیار تھا۔

بانو، راغ کے ماموں کی بیٹی تھی۔ ماموں صورتِ حال کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ راغ کی بے کاری اور زمین کا آخری سہارا چھن جانے کا خوف اس کو انتہائی فیصلے کی طرف لے جا رہا تھا۔ جان سے عزیز بیٹی کا مستقبل اُسے مخدوش نظر آ رہا تھا۔

دوسری جانب بیٹیوں کی جلد از جلد شادی کا قبائلی رواج بھی اسے جلد سے جلد کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے چپکے سے بیوی سے مشورہ کیا تو وہ پہلے سے تیار بیٹھی تھی۔ بیوی کی بہن...... بانو کے لیے پہلے ہی اس کے آگے جھولی پھیلائے ہوئے تھی...... جس کا بیٹا پتھر کی ٹھیکیداری کر رہا تھا اور روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔

ماموں کی طرف سے بھی دھماکا ہو گیا۔ اس نے چھ مہینے کا ٹائم دیا تھا کہ راغ نہ صرف اپنی زمین چھڑوائے بلکہ اس عرصے میں نوکری یا کوئی مضبوط کاروبار کرے ورنہ وہ اپنی بیٹی کے "فیصلے" کے لیے آزاد ہو گا۔ راغ نے ماں کو منہ لپیٹ کر روتے دیکھا اور بانو کے رخساروں پر پھولوں کو مرجھائے دیکھا تو اسے لگا زندگی کی ساری رنگینیاں اس سے روٹھ گئی ہیں۔

دنوں میں ہی زندگی کی تلخیوں نے اسے بے حد تلخ کر دیا۔

یہ سرزمین عالمی طاقتوں کے لیے بے پناہ کشش کی حامل تھی۔ یہاں مختلف طاقتیں اپنا اپنا کھیل رچائے ہوئے تھیں۔ خود راغ کے قبیلے کا سردار بھی ایسی ہی طاقتوں کے نرغے میں آ گیا تھا۔ اچانک ہی سردار کے پیٹ میں اپنے لوگوں کی ہمدردی کا مروڑ اٹھا تھا۔

احساس محرومی کو ہوا دے کر وہ اپنے لوگوں کو حکومت کے خلاف نہ صرف بھڑکا رہا تھا بلکہ ہتھیار اٹھانے پر بھی مجبور کر رہا تھا۔ یہ سارا سلسلہ بڑے خفیہ طریقے سے ہو رہا تھا۔ بظاہر سردار حکومتی نمائندوں کے ساتھ ملاقاتیں بھی کر رہا تھا اور انہیں اپنی وفاداری کا مکمل یقین دلا رہا تھا۔ درپردہ اس نے اپنے بھتیجے کے سر پر دستِ شفقت رکھا ہوا تھا جس نے باقاعدہ مسلح جدوجہد شروع کر دی تھی۔ اس بھتیجے کا نام بلند سر تھا اور اسے بھی سردار کہا جاتا تھا۔ بے روزگار اور سادہ لوح نوجوان جوق در جوق اس کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔

سردار کے نامعلوم مہمان تواتر سے آتے تھے اور زہریلے پروپیگنڈے اور لیکچروں سے ان نوجوانوں کا ذہن پراگندہ کر رہے تھے۔

دودا پہلے ہی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو چکا تھا

جس کے سبب اس کی جیبیں گرم تھیں۔ اُس نے راغ کو بھی دعوت دی۔

راغ اس سارے کھیل کو سمجھ رہا تھا مگر جو تلخیاں اس کی زندگی میں در آئی تھیں، انہوں نے اس کے سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔

راغ نے ہامی بھرلی۔

سردار بلندسر کے لیے ایک پڑھے لکھے نوجوان کی تحریک میں شمولیت بے حد خوشی کا باعث تھی۔ اس نے پہلی ملاقات میں راغ کی نہ صرف پیٹھ تھپکی تھی بلکہ نوٹوں کی ایک گڈی بھی اس کی جیب میں ڈال دی تھی۔

راغ جب پہلی دفعہ لدا پھندا گھر گیا تو گھر والوں کے اُجڑے چہروں پر اتری بہار دیکھ کر اسے دولت کی قدر کا اندازہ ہوا۔

اس کے بعد راغ نے اپنے ہی ملک وقوم کے خلاف کئی دہشت گرد کارروائیوں میں حصہ لیا۔ دل و دماغ پر بوجھ کے ساتھ ساتھ پیسہ بھی ہاتھ آنے لگا۔ جلد ہی زمین واگزار کروالی گئی۔

دودا نے راغ کے دل کی کہانی بھی سردار بلندسر کو سنا دی جس کے بعد سردار نے راغ کے ماموں کو بلا کر سمجھا دیا تھا کہ بانو...... اس کے گھر میں راغ کی امانت ہے۔

ماموں...... کانپتے قدموں کے ساتھ پگڑی سنبھالے سردار کی حویلی سے واپس آیا تھا۔ اس کی کیا مجال کہ سردار کے حکم سے سرتابی کرے۔

معاملات تیزی کے ساتھ کنٹرول میں آگئے تھے مگر راغ کے دل و دماغ اب ایک نئی آزمائش میں مبتلا تھے۔ ایک بہت بڑا بھنور تھا جو اسے تیزی سے نگل رہا تھا۔ کبھی کبھار وجود کے اندر ایک غبار سا بن جاتا تھا۔

ایسے وقت اظہار کا ذریعہ رباب ہوتا تھا۔ رباب بجانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ استاد گل نواز سے اس نے رباب بجانا سیکھا تھا اور جب سب سے پہلی دھن بجانا سیکھی تھی۔ وہ ”چاند میری زمیں...... پھول میرا وطن“ تھی۔

☆☆☆

کیری ولیمسن اور اس کی بیوی میگی کو اپنے ملک فن لینڈ سے نکلے کئی ہفتے ہو گئے تھے۔ وہ دنیا دیکھنے کے لیے نکلے تھے اور دونوں ہی بے حد پُرجوش تھے۔ اس یادگار سفر کی تیاری وہ دو سالوں سے کر رہے تھے۔ حسبِ پروگرام بیٹی کے یونیورسٹی جاتے ہی وہ نکل کھڑے ہوئے تھے۔

یہ ایڈونچر سفر وہ مخصوص قسم کی بائیکس پر کر رہے تھے۔ ضرورت کی ہر چیز بائیکس اور عقبی خاص قسم کی ٹرالیوں پر لوڈ تھی۔

تفتان بارڈر پر ایران میں اُن کی آج آخری رات تھی۔ صبح ان کو پاکستان میں داخل ہونا تھا۔ وہ دونوں درمیانے درجے کے ایک گیسٹ روم کی اوپری منزل پر تھے۔ یہاں انہیں ٹیرس کی سہولت میسر تھی۔ وہ سرد ترین ملک کے رہنے والے تھے۔ جہاں کی خنکی میں بھی انہیں گرمی محسوس ہوتی تھی۔ اوپر سے مچھروں کی بہتات نے ان کا ناک میں دم کر دیا تھا۔

وہ دونوں مختصر لباس میں ٹیرس پر آرام کرسیوں پر نیم دراز تھے۔ ان کے قریب ہی ایک پیڈسٹل فین لگا ہوا تھا اور جسم کے کھلے حصوں پر انہوں نے مچھر بھگانے والا لوشن لگا رکھا تھا۔

لائٹ انہوں نے آف کر دی تھی۔ تاروں کی مدھم روشنی میں دونوں ہیولوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔

کیری کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے میگی نے پوچھا۔

”کیا کوئی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے ہنی؟“

”نن...... نہیں تو...... پریشانی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔“ اس نے لہجے میں مصنوعی بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

میگی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ کیری کو اس کے لیے جگہ بنانا پڑی۔ میگی اس کے شانے پر سر رکھ کر پاس ہی سمٹ گئی۔

ان دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی تھی۔ پھر میگی اس کے سینے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”ہمارا ساتھ برسوں کا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میں، تمہاری مزاج آشنا ہوں۔“

کیری کو اس پر اپنایت بھرا پیار آیا۔ اسے چومتے ہوئے اس نے بوجھ ہلکا کیا۔ ”سیکیورٹی الرٹ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ فی الوقت بلوچستان کا شمار دنیا کے خطرناک ترین خطوں میں ہوتا ہے اور سیاحوں کے لیے تو یہ بالکل محفوظ نہیں ہے۔ سفارت خانہ منع کر رہا ہے۔ آگے بڑھنے کا فیصلہ ہماری صوابدید پر ہے۔“

میگی بھی متفکر ہو گئی۔ سیدھا ہو کر اُس نے نگاہیں ستاروں بھرے آسمان پر جما دیں۔

دونوں کے ہی دل بوجھل تھے۔ بلوچستان ایک اَن

چھوٹی زمین تھی۔ پہاڑ، ریت اور شفاف پانیوں والے ساحل کم ہی ملتے تھے مگر یہاں کثرت سے تھے۔

دونوں نے مل کر خواب دیکھے تھے، ناقابلِ بیان خوب صورت ساحل، ہنگو کا عالمی شہرت یافتہ نیشنل پارک...... پرنس آف ہوپ کا ہوا کے ہاتھوں تراشا ہوا عجوبہ مجسمہ، مٹی، پانی اور گیسوں سے بنے آتش فشاں...... جنہیں مڈ وال میکوز کہا جاتا...... جو اپنی مثال آپ تھے، اب ان دونوں سے زیادہ دور نہیں تھے۔

دونوں کے سینوں سے ہُوک سی اٹھ رہی تھی پھر میگی دھیرے سے بولی۔ ''سفر پر نکلتے ہوئے بھی ''خطرناک بلوچستان'' کے بارے میں ہمیں آگاہی تھی مگر اس وقت تم ذرا بھی پریشان نہیں تھے۔ تمہاری ہمت اور حوصلہ ہی دراصل میری طاقت ہے۔ تمہیں پریشان دیکھ کر میری طاقت ٹوٹ رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میگی کے لہجے میں بے حد آزردگی اُمڈ آئی۔ اس نے ٹھنڈا سانس خارج کیا اور بولی۔

''اپنے خواب سے دستبرداری بہت مشکل ہے مگر جو بھی فیصلہ کرو...... میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سسک اٹھی۔

کیری نے بے اختیار اُسے سینے سے لگالیا۔

عورت کے آنسو اگر ایک مرد کو کمزور کر سکتے ہیں تو یہی آنسو کبھی انجانی طاقت بھی دے جاتے ہیں۔ محبوب بیوی کے آنسو کیری کو ہر طوفان کا سامنا کرنے کی طاقت دے رہے تھے۔ وہ اپنے خواب سے تو دستبردار ہوسکتا تھا مگر میگی کے خواب کو ہر قیمت پر پورا کرنے کا عزم اس کے وجود میں انگڑائی لے کر بیدار ہو چکا تھا۔

خواب...... جو اس کا بھی مشترکہ خواب تھا۔

اگلی صبح میگی نہا کر نکلی تو کیری نقشہ پھیلائے اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ پہلے نہا لیا تھا اور اس کے چہرے پر بشاشت نظر آرہی تھی۔

میگی کو کسی خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ دھڑکنیں سنبھالتی کیری کے پاس جارکی۔ کیری خوشگوار انداز میں بولا۔ ''تھوڑی دیر میں ہم نکل رہے ہیں۔ ذرا سفری پروگرام پر نظر ڈال لو...... بلوچستان میں داخل ہو کر ہم رات میں سفر کریں گے اور دن مختلف چیک پوسٹوں اور قلعہ نما حفاظتی چوکیوں پر گزاریں گے۔''

میگی خوشی سے چیختی ہوئی کیری سے لپٹ گئی۔ اسے خوش دیکھ کر کیری کے دل کی کلی کھل... اٹھی تھی۔

☆☆☆

ہر طرف پھیلی تاریک رات بستی کے ایک کھنڈر نما مکان پر بھی اتری تھی۔ راغ اسی مکان کے ایک گرے ہوئے لکڑی کے شہتیر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس شہتیر کا ایک کونا اپنی جگہ پر اور دوسرا نیچے فرش پر لٹکا ہوا تھا۔

گرم چادر کے اندر رائفل کا لمس جیسے کسی آکٹوپس کے مانند چپکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک ادھوری گری دیوار کی اوٹ میں خود کو چادر میں چھپائے بانو کھڑی تھی اور تاریکی میں تاریکی کا ہی حصہ نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی...... سفیدی البتہ اس اندھیرے میں بھی محسوس ہو جاتی تھی۔

ان دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی تھی پھر اس خاموشی کو بانو نے توڑا۔

''تمہاری واپسی کا کوئی راستہ ہے؟''

راغ کا دل مایوسی سے بھر گیا۔ ''نہیں...... مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ واپسی کا راستہ موت کی وادی ہی ہے۔''

نہ جانے کیا ہوا، بانو سسکتی ہوئی راغ کے بازو سے آلگی۔ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا۔ اس کے وجود کی لامتناہی گہرائیوں میں درد کا طوفان سا پل رہا تھا۔ پل بھر میں یہ طوفان بازو کے ذریعے راغ کے وجود میں منتقل ہوگیا۔ وہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

بانو عجیب سی وارفتگی کے ساتھ اُس کے بازو کے ساتھ چہرہ رگڑتے ہوئے دلدوز انداز میں بولی۔ ''راغ! تیری جان کا دھڑکا ہر وقت میرا کلیجا دبائے رکھتا ہے۔ جس نے بھی اس وطن کے خلاف بندوق اٹھا کر پہاڑوں کا رخ کیا یا تو وہ مارا گیا یا پھر ہمیشہ کے لیے غائب ہوگیا۔ کچھ نہیں بگڑتا تو سردار اور اس کے خانوادے کا۔ تیرے جیسے غائب ہو جاتے ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس کی ہچکی سی بندھ گئی۔ آواز دبانے کے لیے اس نے چادر کا گولا سا منہ میں لے لیا تھا۔

راغ کے پاس اسے تسلی دینے کے لیے کھوکھلے الفاظ بھی نہیں تھے۔ بانو نے بڑی تلخ حقیقت اپنے لفظوں میں بیان کر دی تھی۔

راغ نے بھی اب تک یہی دیکھا تھا۔ علاقے میں سڑکوں اور اسکول کے فنڈز بھی سردار کی جیب میں جاتے تھے۔ عام لوگوں کا تعلیم کا حصول محض ایک خواب تھا۔ اپنے طور پر کوشش کرنے والے بھی سردار کی ناپسندیدگی کا نشانہ بنتے تھے جبکہ سردار کی اپنی اولادیں بیرونِ ملک پڑھ رہی

تھیں۔

راغ جس ارادے سے آیا تھا، وہ بانو کے آنسوؤں کے سبب کمزور پڑ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بالکل ہی ختم ہوجائے اس نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔

''میں چاہتا ہوں ہمارے درمیان جو بھی رشتہ ہے، وہ ختم ہوجائے۔''

بانو کو جیسے کرنٹ نے چھولیا۔ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ کر اس نے اندھیرے میں چھپے راغ کے چہرے کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔

راغ نے نگاہیں آسمان کی طرف بلند کر دیں۔ ''میں سردار کے ذریعے ماسے کو کہلوا دوں گا...... تمہارا رشتہ کہیں اور کر دے۔''

لمحہ بھر کے لیے رکنے والی بانو کی سسکیاں دوبارہ سے شروع ہو گئیں۔

راغ نے اس کے بازوؤں کے حلقے سے اپنا بازو نکالا۔ ''میں سراپا نحوست ہوں اور تمہیں اپنے سائے سے بھی دور رکھنا چاہتا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ اپنے سب سے قیمتی اثاثے سے دست بردار ہونے جا رہا تھا۔

سسکتی ہوئی بانو کو چھوڑ کر وہ کھنڈر سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدم من من وزن کے ہو رہے تھے۔ وجود سنک رہا تھا اور دل میں مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

اس طلسماتی سرزمین کے بارے میں مگی اور کیری نے جتنا سنا، پڑھا اور دیکھا تھا، وہ اس سے بڑھ کر فسوں خیز ثابت ہوئی تھی۔

دونوں نے بلوچستان کے سفر کے چوتھے دن ایک دوسرے کے سامنے برملا اعتراف کیا کہ وہ اس سرزمین کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

خوف کے حصار سے وہ دوسرے دن ہی نکل آئے تھے۔ ان کا جہاں بھی مقامی لوگوں سے واسطہ پڑا...... مقامیوں کو انہوں نے بے حد مہمان نواز پایا تھا۔ ایسی ہی مہمان نوازی سے وہ ایران میں بھی لطف اندوز ہو چکے تھے۔

ایک خانہ بدوش قبیلے کی ننھی سی بچی تو ہمیشہ کے لیے ان کے کیمروں اور یادداشت میں محفوظ ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں اشتیاق و استعجاب کے سیکڑوں رنگ لیے وہ بچی ان کے لیے اسٹیل کے برتن میں اپنی بکری کا تازہ دودھ دھو کر لائی تھی۔

اس کے علاوہ پاکستانی سیکیورٹی اداروں کا کردار بھی بے مثالی تھا۔ ہر جگہ انہیں بہترین قیام و طعام کی سہولت دی گئی تھی۔ بعض دفعہ سیکیورٹی قافلوں کے ساتھ بھی انہوں نے سفر کیا تھا۔

ان دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ خطرناک بلوچستان کے حوالے سے انہوں نے جو بھی سنا تھا، وہ محض پروپیگنڈا ہی تھا۔ یہاں کے مقامی لوگ تو بے حد سادہ، خوش مزاج اور انتہا درجے کے مہمان نواز تھے۔ وہ دونوں خوف کے سائے سے مکمل طور پر آزاد ہو کر وقت کو یادگار بنا رہے تھے۔

ان کی بنائی ویڈیوز ایک بہت بڑے اور معروف سیاحتی چینل پر دیکھنے والوں کے ایک وسیع حلقے کو مسحور کر رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ سوشل میڈیا پر ان کے فالورز کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

چاہ بہار ایران کا علاقہ تھا۔ وہاں سے سردار کے کچھ خاص مہمان آئے ہوئے تھے۔ راغ نے ان مہمانوں کو دیکھا تھا۔ ان میں ایک لمبی تڑنگی سانولے رنگ کی عورت بھی تھی جو مردوں کے انداز میں چلتی تھی اور اس خالص فراری کیمپ کے مردانہ ماحول سے ذرا بھی خائف نظر نہیں آتی تھی۔

راغ کو یقین تھا کہ چاہ بہار سے پہلے آنے والے مہمانوں کے مانند ان مہمانوں کا تعلق بھی انڈیا سے ہے۔ مہمانوں سے تنہائی میں ہونے والی ملاقات کے بعد سردار کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا۔

راغ کو اس خوشی کی وجہ کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ یقیناً ڈالرز کی نئی کھیپ اس کے اور بڑے سردار کے بیرونی اکاؤنٹس میں منتقل ہو گئی تھی۔

مہمانوں نے چند گھنٹے آرام کیا۔ اس کے بعد سارے فراریوں کو ایک اندرونی غار میں یکجا کیا گیا۔ یہ خاصا وسیع غار تھا۔ انسانی ہاتھوں نے مزید اسے نہ صرف وسعت دی تھی بلکہ تراشا خراشا بھی تھا۔

چالیس کے لگ بھگ فراریوں کا یہ مشترکہ بیڈروم بھی تھا۔

اس وقت یہ غار جنریٹر کے ذریعے سے پیدا کردہ بجلی کے سبب خوب روشن تھا۔ سارے فراری نیچے بچھی دریوں

پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے قدرے بلند جگہ پر رکھی کرسیوں پر سردار اور تینوں مہمان براجمان تھے۔ مہمان عورت نیم فوجی طرز کی چست وردی میں ایک ٹانگ پر ٹانگ رکھے بے پروا انداز میں بیٹھی سردار کے ساتھ دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھی۔ اس سے محو گفتگو سردار کی باچھیں پھیلی جا رہی تھیں۔

فراریوں کی چور نظروں کا مرکز بھی وہ کھلی کتاب جیسی مہمان عورت تھی۔

پہلے سردار نے فراریوں کے خون کو گرمایا۔ اس کے بعد باری باری دونوں مہمان مردوں نے فراریوں سے خطاب کیا۔ یہ خطاب ذہنوں کو آوارہ کر دینے والے زہریلے پروپیگنڈے سے بھرپور تھا۔ دیگر فراری اس پروپیگنڈے سے مغلوب ہو کر ریاست کے خلاف نعرے بازی کر رہے تھے۔ بظاہر تو راغ بھی ان لوگوں میں بھرپور طریقے سے شامل تھا مگر اندرونی طور پر وہ بے حد کوفت محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں سرداروں کو صرف ڈالرز سے غرض ہے اور مہمانوں کے روپ میں آنے والے انڈینز کے پاکستان کے خلاف اپنے مذموم مقاصد تھے۔ دونوں کو ان سادہ لوح فراریوں یا بلوچستان کے عام لوگوں اور ان کے مسائل سے حقیقی طور پر کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں بھیڑیوں کے پیٹ میں بھیڑ کے بچوں کے لیے ہمدردی کا مروڑ اٹھا ہوا تھا۔

راغ مہمانوں کی صورتوں پر غور کر رہا تھا۔ عورت سمیت وہ مقامی لوگوں جیسے ہی نظر آتے تھے اور مقامی زبان بھی بڑی روانی سے بولتے تھے۔

ان نام نہاد مہمانوں نے رات سردار کے لیے مخصوص جگہ پر گزاری تھی۔ صبح کے وقت رات کے پہرے داروں کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹیں تھیں۔ دیگر فراریوں کے ساتھ سرگوشیوں کا تبادلہ ہوتا تھا اور ذومعنی مسکراہٹ آگے منتقل ہو جاتی تھی۔

راغ تک بھی یہ بات پہنچ گئی کہ مہمان عورت نے رات سردار کے ساتھ گزاری تھی۔ راغ کو انڈینز کے طریقہ کار کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ پیسے کے ساتھ ساتھ اپنی عورتوں کو بھی استعمال کرتے تھے جو کام پیسہ نہیں کر سکتا تھا، وہ یہ عورتیں بخوبی کر گزرتی تھیں۔

دوپہر کے لگ بھگ مہمانوں کی واپسی ہوئی۔ مہمان عورت نہا کر مقامی لباس میں نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ آس پاس موجود فراری بڑی مشکل سے معنی خیز مسکراہٹیں چھپائے ہوئے تھے۔

مردوں نے بھی مقامی لباس زیب تن کر لیے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر فراریوں کی پیٹھ ٹھونکی تھی۔ مردوں میں سے ایک جس کی رنگت جھلسی ہوئی، بال چھوٹے اور چہرے پر برائے نام ہی گوشت تھا۔ ہر فراری سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتا تھا۔

راغ سے اُس نے ہاتھ ملایا تو اس کی گرفت میں راغ کو فولادی سختی محسوس ہوئی اور آنکھیں جیسے برمے کے مانند دماغ کو چھید رہی تھیں۔

مہمانوں کے روانہ ہوتے ہی سردار نے تین فراری کمانڈروں کے ساتھ طویل ملاقات کی۔ اس ملاقات کے اختتام پر ایک فراری کمانڈر کی کمان میں مزید پانچ فراریوں کی ایک ٹیم فوراً ہی روانہ ہو گئی۔

راغ کو کرید لگ گئی کہ یہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ اس کا چچازاد بھائی دودا بھی جانے والی ٹیم میں شامل تھا۔ اسے ہر بات کی خبر رہتی تھی۔ راغ، اس سے پوچھ سکتا تھا مگر فراریوں کے درمیان ... سردار کے چند مخبر تھے اور بے وجہ کرید کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔

راغ نے کسی اور سے پوچھنے کے بجائے دودا کا انتظار مناسب سمجھا۔

☆☆☆

کیری ولیمس اور صکی کا بلوچستان میں سفر اپنے اختتامی مراحل میں تھا۔ دو دن بعد انہیں سندھ میں داخل ہو جانا تھا۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ سیکیورٹی اداروں کی ہدایت پر دن میں سفر کر رہے تھے اور رات میں طے شدہ پلان کے تحت کسی حفاظتی چوکی وغیرہ کے ساتھ ہی شب گزارنے کے لیے اپنا کیمپ لگا لیتے تھے۔ سیکیورٹی اداروں کے مطابق یہ علاقہ زیادہ حساس تھا۔

حفاظتی چوکیوں پر گزاری یہ راتیں بڑی یادگار تھیں۔ تقریباً ہر جگہ ہی روایتی مہمان نوازی اور اکثر جگہوں پر رات کو موسیقی کی محفل بھی جمتی تھی۔ گھر بار سے دور یہ وطن کے محافظ فولاد سے ریشم میں ڈھلتے تھے تو ایسی محفلوں کو چار چاند لگ جاتے تھے۔

اس وقت وہ دونوں ایک ویرانے میں تھے۔ سڑک کی حالت بھی خاصی خستہ تھی۔ ان کے اردگرد بھوری پختہ مٹی کے چھوٹے، بڑے ٹیلوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ہوا کے کٹاؤ نے ان ٹیلوں کو عجیب وغریب شکلیں عطا کر دی

تھیں۔ وہ مبہوت ہو کر بار بار رک جاتے تھے اور کیمرے سنبھال لیتے تھے۔

سورج مغرب کی طرف جھکتا دیکھ کر کیری کو تشویش ہوئی۔ اس نے اپنا کیمرا بند کر کے خاص قسم کے بکس میں محفوظ کیا اور میگی کی طرف دیکھا جو اپنے کیمرے کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بےخبر نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر اس بچے کا سا اشتیاق اور معصوم سی خوشی چمک رہی تھی جسے من چاہے اور لاتعداد پسندیدہ کھلونے مل گئے ہوں۔

کیری چند لمحے اسے دیکھے گیا پھر عقب سے جا کر اسے بانہوں کے گھیرے میں لے کر کان کے قریب سرگوشی کی۔

''اب بس کر دو جان! ہمیں لگ بھگ دو سو کلومیٹر کا سفر کرنا ہے اور سڑک کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔''

میگی نے گلے سے منسلک ڈوری سے بندھا کیمرا چھوڑ کر سر پیچھے ڈال کر آنکھیں موند لیں۔ ''کاش میں باقی ماندہ زندگی اس سرزمین پر...... ان قدرت کے شاہکار ٹیلوں کے درمیان گزار سکتی۔'' اس کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

کیری نے شگفتہ انداز میں کہا۔ ''ساری زندگی تو تھوڑا مشکل ہے...... ہاں مگر دو سال بعد ہم دوبارہ یہاں آسکتے ہیں۔'' میگی خوشی کے مارے سیدھا ہو کر اس سے لپٹ گئی۔

کیری نے اسے بچوں کے مانند پچکارا۔ ''جلدی سے ہیلمٹ پہنو! ہمیں روانہ ہونا ہے۔ وقت خاصا کم ہے۔''

چند ہی منٹوں میں وہ اپنی اپنی بائیک پر آگے روانہ ہو گئے۔ روڈ کی خستہ حالی کے سبب کیری آگے تھا۔ وقفے وقفے سے وہ عقبی آئینے کے ذریعے میگی پر نظر ڈال لیتا تھا جو مہارت اور اعتماد سے وزنی بیگ اور عقبی ٹرالی کو سنبھالے اس کے عقب میں تھی۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہے تھے، روڈ کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ سورج ڈوبنے تک کیری کو پریشانی نے گھیر لیا۔ وہ سو کلومیٹر سے بھی کم سفر کر پائے تھے اور اندھیرا ہوتے ہی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سفر اور بھی مشکل اور سست ہو جاتا...... مستزاد یہ کہ سیکیورٹی اداروں نے رات کے سفر سے سختی سے منع کیا تھا۔

میگی سے مشورے کے لیے اس نے بائیک روک لی۔ مشکلات سے آگاہی نے میگی کو پریشان کرنے کے بجائے الٹا پُرجوش کر دیا۔ وہ بولی۔ ''ضروری تو نہیں کہ ہم رات کسی حفاظتی چوکی پر گزاریں۔ رات گزارنے کے لیے یہ بھی آئیڈیل جگہ ہے۔ وہ سامنے والا ٹیلا دیکھ رہے ہو؟''

ڈوبتے سورج کی روشنی میں کیری نے اس ٹیلے کی طرف دیکھا۔ جس کی بلندی بیس فٹ کے لگ بھگ تھی اور نامعلوم زمانے سے چلنے والی ہواؤں نے اسے اوپر سے مسطح کر دیا تھا۔

میگی کی جذبات سے بھرپور آواز اُبھری۔ ''ہم اس ٹیلے کے اوپر کیمپ لگائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ہماری زندگی کی سب سے یادگار رات ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بھرپور انگڑائی لی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو کیری کو محبوب بیوی کی آنکھوں میں محبت بھرا بستر بچھا نظر آیا۔ تمام تر خطرات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

☆☆☆

صبح رفع حاجت کے لیے جاتے ہوئے راغ نے ایک ٹیلے کے پاس مخصوص وضع قطع کی دو جدید ترین بائیکس دیکھیں تو ٹھٹک گیا۔ مخصوص سیاحتی سامان سے لدی بائیکس اور عقبی ٹرالیاں اس کے لیے بڑی حیرت کا باعث تھیں۔

ایسی بائیکس اور سامان اس نے دنیا کی یاترا پر نکلے امیر ملکوں کے سیاحوں کے پاس ہی دیکھی تھیں۔ اس کا دماغ خود بخود ہی کل جانے والی ٹیم کی طرف چلا گیا۔

واپسی پر اس نے غار میں دیکھا کہ جانے والی ٹیم کے ممبران جن میں دودا بھی تھا، گہری نیند میں غرق تھے۔ ان کے چہروں پر کسی مہم کی تھکن تھی۔

جلد ہی راغ کے علم میں یہ بات آگئی کہ ٹیم ایک ''انگریز جوڑے'' کو ان کے ساز و سامان سمیت پکڑ کر لائی تھی۔

راغ کے دماغ نے کڑیاں جوڑیں...... خاص مہمانوں کی آمد...... اس کے بعد ٹیم کی روانگی اور سیاح جوڑے کو اپنی تحویل میں لینا...... ایک ہی سلسلے کی کڑیاں نظر آتی تھیں۔

چند گھنٹوں بعد دودا جاگا تو بہت سی باتیں راغ کے علم میں آگئیں۔ دودا کے مطابق جس جوڑے کو پکڑ کر لایا گیا ہے، وہ پاکستانی خفیہ ایجنسی کے جاسوس تھے اور اُن کا مقصد ہمارے خفیہ ٹھکانوں کی جاسوسی کرنا تھا۔ ورنہ کون پاگل موٹر سائیکلوں پر اس ویرانے کی خاک چھاننے نکلتا ہے۔

راغ نے اس سے بحث مناسب نہیں سمجھی۔ دودا موٹے دماغ کا تھا اور اس دماغ میں بھی پروپیگنڈے کا زہر بھرا ہوا تھا۔

اسے یہ سمجھانا تقریباً ناممکن تھا کہ دنیا میں ایسے سرپھرے سیلانیوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو بائیکس تو کیا سائیکلوں اور کچھ تو پیدل ہی خدا کی بنائی اس دنیا کو دیکھنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

دودا کو ٹانگیں دبانے کے لیے اکثر ہی چھوٹا سردار طلب کیے رکھتا تھا۔ اس دوران فراری کمانڈروں کے ساتھ چھوٹے سردار کی بات چیت بھی جاری رہتی تھی۔ دودا، پرانا اور قابل اعتماد بندہ تھا۔ اس لیے بہت سی باتیں دودا کے علم میں آجاتی تھیں۔

راغ پہرے داری کی ڈیوٹی پر تھا کہ اس کے لیے چھوٹے سردار کا بلاوا آگیا۔ یہ بلاوا قطعی غیر متوقع تھا۔ پیغام لانے والا اس کی جگہ ڈیوٹی پر کھڑا ہوگیا اور راغ رائفل کندھے سے لٹکائے چھوٹے سردار کے پاس پہنچ گیا۔

شاخ در شاخ پھیلے غار کا ایک حصہ چھوٹے سردار کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں شاندار قالین اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ یہاں آنے والوں کے لیے پاؤں دھونا لازم تھا۔

پانی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے چند کلومیٹر دور ایک کاریز کو کٹ لگایا گیا تھا۔ جہاں سے پانی باربرداری کے لیے وقف گدھوں پر لاد کر لایا جاتا تھا۔ پانی کمیاب تھا۔

پاؤں دھونے کے ساتھ راغ نے منہ پر بھی پانی مار لیا۔ پاؤں خشک کر کے غار میں داخل ہوا اور چھوٹے سردار کے سامنے جا کر کھڑا ہوا۔ غار کے دہانے سے آنے والی روشنی وہاں تک آ رہی تھی۔

چھوٹے سردار کو جوانی الوداع کہہ رہی تھی۔ لچھے دار بالوں اور گھنی داڑھی مونچھ کے سیاہ بالوں میں اب چاندنی چمکنے لگی تھی۔ چہرے کی لالی اور آنکھوں کی چمک ابھی جوں کی توں تھی۔

راغ نے اکثر اوقات چھوٹے سردار کو لیٹے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھا اور ایک فراری کمانڈر کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ راغ کو دیکھتے ہی گفتگو کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

ایک مخصوص فاصلے پر رک کر راغ نے مؤدبانہ انداز میں ناف پر ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیا۔ ”راغ حاضر ہے

سردار!''

حاضری کے یہ مخصوص الفاظ ہمیشہ ہی راغ کے مزاج پر ناگوار گزرتے تھے مگر کیا کرتا صدیوں سے سرداروں کی غلامی کرنے والے عام لوگوں میں یہی طریقہ رائج تھا۔

''اوئے آ راغ! آج تیری انگریزی تعلیم کی ضرورت پڑگئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سردار مسکرایا۔

راغ نے مزید سر کو جھکا لیا۔ سردار سے کسی قسم کا سوال، جواب بے ادبی میں شمار ہوتا تھا۔ اسی سب وہ خاموش تھا مگر دل و دماغ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس کی ''انگریزی تعلیم'' کی کیا ضرورت پیش آسکتی تھی؟ یہ سوال نقارے کے مانند دماغ میں گونج اٹھا تھا۔

چھوٹا سردار مزید بولا۔ ''ہم نے ایک جاسوس جوڑا پکڑا ہے۔ ظاہر ہے وہ ہماری زبان کہاں سمجھتے ہیں۔ تو نے ترجمانی کرنی ہے...... کرے گا نا؟''

''کرلوں گا سردار! آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔''

سردار نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور فراری کمانڈر سے مخاطب ہوا۔ ''کیمرا وغیرہ سب تیار ہے؟''

''جی سردار! سب تیاری مکمل ہے۔''

سردار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فراری کمانڈر بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ راغ فوراً ایک طرف سمٹ گیا۔ غار سے نکلتے ہوئے فراری کمانڈر نے جھک کر سردار کی جوتی سیدھی کی اور وہ غار سے باہر نکل آئے۔ راغ بھی مؤدبانہ انداز میں ان کے عقب میں تھا۔

سردار کو دیکھ کر ایک اور فراری کمانڈر نزدیک آگیا۔ سردار اس سے مخاطب ہوا۔ ''پکڑے جانے والے جاسوسوں کی تلاش شروع ہوچکی ہوگی۔ ہر بندہ اوٹ میں رہے۔ سگریٹ اور آگ کھلے میں جلانے والے کے لیے موت کی سزا ہے۔ جانور اوپر غاروں میں لے آؤ اور جاسوسوں کے موٹر سائیکلوں پر بھوری چادریں ڈلوادو۔''

''جو حکم سردار!'' فراری کمانڈر نے سر جھکایا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

راغ جانتا تھا کہ سردار کہاں جارہا ہے۔ یہ ایک خونی غار تھا جہاں قیدیوں کو رکھا جاتا تھا اور گردنیں کاٹنے کا عمل بھی وہیں سرانجام دیا جاتا تھا۔

راغ کو اس جگہ سے وحشت سی ہوتی تھی۔ بے گناہوں کے خون کی باس جیسے اس وحشت ناک غار میں رچ بس سی گئی تھی۔

راغ کا سر بھاری ہونے لگا۔ سردار کے عقب میں چلتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا۔ نظر نہیں آرہا تھا مگر بے گناہوں کا خون اِن ہاتھوں پر بھی تو تھا۔

احساسِ گناہ، ندامت اور سب سے بڑھ کر اس شرمندگی کے سبب اس کا سر مزید جھک گیا کہ وہ اپنی پاک سرزمین کا غدار ہے۔

سینے کی گہرائیوں میں پچھتاوے اور ندامت کی آگ جل اٹھی تھی۔ کاش وہ اس زہریلی دلدل میں نہ اترتا۔ زمین چھن جاتی تو کیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سلامت تھے، روزی کا کوئی سلسلہ بن ہی جاتا۔ رہی بانو تو اس سے وہ اب خود ہی دستبردار ہوگیا تھا۔

اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ ایک آرزو نے جنم لیا۔ کاش وقت کو موڑا جاسکتا۔ وہ دوبارہ اسی مقام پر ہوتا جہاں سے ایک راستہ اس دلدل کی طرف اور دوسرا...... اُس طرف جاتا تھا جہاں زمین کی قرقی یقینی تھی۔ بانو کا کسی اور کے آنگن میں اترنا بھی تقریباً یقینی تھا مگر غدار کا مکروہ نشان پیشانی پر نہیں تھا۔ دن، رات، ماں، باپ اور بہن بھائیوں کا ساتھ تھا۔ جان ہر وقت سُولی پر ٹنگی نہیں تھی اور ایک آس امید زندہ تھی۔ ڈگری اس کے پاس تھی کسی بھی وقت اچھی سی نوکری مل سکتی تھی۔

آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل خدا کے آگے بے اختیار سجدہ ریز ہوکر دعاگو ہوگیا۔ ''اے خدائے بزرگ و برتر مجھے اس دلدل سے نجات عطا فرما۔''

اس پل دل کے ساتھ ساتھ اس کا رُواں رُواں دعاگو تھا۔

چپکے سے آستین سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس کا دل اطمینان سے بھر گیا۔ ایک الہامی سی کیفیت کہہ رہی تھی خدا نے اس کی دعا قبول کرلی ہے۔

خونی غار تک جانے کے لیے ایک تنگ کھوہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ کھوہ کے دہانے پر تعینات پہرے دار نے جھک کر سردار کو تعظیم دی۔ اس کھوہ میں وہ آگے، پیچھے آگے بڑھے تھے۔

خونی غار اس وقت روشنیوں سے جگمگا رہا تھا ورنہ عام طور پر یہاں صرف ایک لالٹین جلتی تھی جو ماحول کو اور بھی وحشت ناک بناتی تھی۔

ایک فراری سردار اور دو فراری یہاں پہلے سے موجود تھے جو ایک اسٹینڈ پر چھوٹا سا جدید قسم کا کیمرا نصب

کرر ہے تھے۔ ان تینوں نے جھک کر سردار کو تعظیم دی۔
سردار نے انہیں نظرانداز کر دیا۔ اس کی دلچسپی کا مرکز قید خانہ تھا۔ غار کے ایک کونے کی چھت خاصی نیچی تھی جس کے آگے لوہے کی سلاخوں والا گیٹ نصب کر کے اس کونے کو قید خانے کی شکل دی گئی تھی۔ اس قید خانے میں اس وقت لمبا تڑنگا یورپین جوڑا قید تھا۔ دونوں کی عمروں کا اندازہ چالیس سے اوپر کا تھا۔ مرد کے چہرے کے بال بڑھے ہوئے تھے اور چہرے پر چوٹوں کے کئی نشان تھے۔ اغوا کے وقت یقیناً اس کے ساتھ مار کٹائی کی گئی تھی۔
عورت کی جلد قدرے سنولائی ہوئی تھی۔ سنہرے بالوں کے ساتھ وہ ایک پُرکشش عورت تھی۔ دونوں کے چہرے خوف کی شدت سے کملائے ہوئے تھے اور وہ خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔
راغ نے محسوس کیا کہ اس کیفیت میں بھی مرد نے عورت کے گرد بازو کا حلقہ قائم کیا ہوا تھا۔ وہ اگر اس کی بیوی تھی تو یقیناً وہ اس سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ یہی پیار اور محبت دوسری طرف بھی بے انتہا موجود تھی۔ عورت گاہے بگاہے مرد کے چہرے کے زخموں کی طرف دیکھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف نظر آتی تھی اور وہ بے اختیار ان زخموں کو سہلانے لگتی تھی۔
راغ کو نہ جانے کیوں بے وجہ ہی بانو کی یاد آگئی۔ ٹھنڈی آہ کو دباتے ہوئے اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو بھگانے کی کوشش کی۔
سردار پُروقار انداز میں چلتا ہوا سلاخوں کے قریب چلا گیا۔ ساتھ آنے والے فراری کمانڈر کے اشارے پر راغ، سردار کے پہلو میں قریب ہوگیا۔
وہ دونوں سردار کی طرف دیکھتے ہوئے مزید خوف زدہ ہوگئے۔ مرد نے خوف سے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم لوگ کون ہو اور ہمیں اذیت سے دوچار کرنے کا تمہارا کیا مقصد ہے؟''
زبان انگریزی استعمال ہوئی تھی۔ سردار نے راغ کی طرف دیکھا۔ راغ نے فوراً ترجمہ کر دیا۔ سردار نے پُرستائش انداز میں راغ کی طرف دیکھا اور بولا۔
''انہیں بتا دو، سوال صرف ہم کریں گے۔ دوبارہ کچھ پوچھنے کی جرأت کی تو زبان اور اس کے بعد گردن کاٹ دی جائے گی۔''
راغ کی زبانی سردار کے الفاظ اُن تک پہنچے تو اُن کے چہرے زرد پڑ گئے۔ عورت کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

سردار کی نظریں عورت پر تھیں۔ راغ کو ان نظروں میں ہوس ہی ہوس نظر آرہی تھی۔
دونوں کو چپ لگ گئی۔
سردار فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ ''تم دونوں کا آپس میں رشتہ کیا ہے؟''
''ہم...... میاں، بیوی ہیں۔''
''تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟''
''فن لینڈ۔''
''یہاں ہماری زمینوں پر کیا کرر ہے ہو؟''
''ہم سیاح ہیں اور اس خوب صورت خطے کی سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ ایک بین الاقوامی سیاحتی چینل پر اس خطے کی ان چھوٹی خوب صورتی دیگر سیاحوں کو اس طرف راغب کررہی ہے۔ سیاحت کے سبب اس خطے کو جب بھی خوش حالی میسر آئی، ہمیں ضرور تم اچھے لفظوں میں یاد کرو گے۔'' یہ کہہ کر مرد تھوڑا سا ہچکچایا پھر دل کڑا کر کے بول ہی دیا۔
''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے تم جیسے مہمان نواز لوگوں کا ہمارے ساتھ سلوک قابلِ افسوس ہے۔''
ترجمہ سنتے ہی سردار دہاڑا۔ ''تمہیں کس نے دعوت دے کر یہاں بلایا تھا؟ اور یہ سیاحت والی بکواس نہ کرو، ہم تنگ دھڑنگ یورپین کو اپنی سرزمین پر خوش آمدید کہنے والے نہیں ہیں۔ تمہاری اصلیت کچھ اور ہے...... تم پاکستانی خفیہ ایجنسیوں کے بائر کردہ جاسوس ہو۔''
یہ الفاظ سنتے ہی دونوں کے چہرے فق ہو گئے۔ عورت گھٹنوں کے بل گر کر رونے لگی۔ مرد اُسے سنبھالنے میں لگ گیا۔
سردار بولا۔ ''ہم...... تم جاسوسوں کے بدلے اپنے تین ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کرنے جا رہے ہیں۔ تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو کیمرے کے سامنے اپنی حکومت اور اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل سے حکومتِ پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے کہو کہ وہ تم لوگوں کی رہائی کے بدلے ہمارے تین ساتھیوں کو رہا کر دے۔'' راغ نے من وعن ترجمہ کر دیا۔
مرد بولا۔ ''تم جیسا کہو گے ویسا کریں گے لیکن پہلے ہمیں پانی دو۔''
سردار کی اجازت سے انہیں پانی کی ایک بوتل دے دی گئی۔
مرد اپنی بیوی کو پانی پلانے میں مصروف ہوگیا۔
تھوڑی دیر بعد ان دونوں کے ہاتھ عقب میں باندھ

کر گھٹنوں کے بل پتھریلے فرش پر بٹھا دیا گیا۔ دو فراری نقاب لگا کر ان دونوں کے عقب میں آگئے اور شکاری چاقو ان کی گردنوں پر رکھ دیے۔

سردار بطور باغی اور غدار معروف ہو چکا تھا۔ وہ نقاب کے بغیر ہی سامنے آ گیا۔ کیمرے نے عکس بندی شروع کر دی۔

سردار نے فن لینڈ کے ان دونوں سیاحوں کے بدلے اپنے تین ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ وہ تینوں دہشت گردی کی کئی وارداتوں میں ملوث تھے اور ملک کی مختلف جیلوں میں قید تھے۔

سردار نے مطالبہ نہ ماننے کی صورت میں دونوں سیاحوں کو گردنیں کاٹ کر قتل کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ اس کے بعد کیمرا دونوں سیاح میاں، بیوی کے قریب لایا گیا جن کے چہروں پر موت کے سائے ابھی سے نمایاں ہو گئے تھے۔

حسب ہدایت انہوں نے فن لینڈ کی حکومت اور اقوام متحدہ سے مداخلت کی درخواست کی تھی کہ ان کی زندگیاں بچائی جائیں۔

واپسی پر سردار نے راغ کی ڈیوٹی مغوی سیاحوں پر لگا دی۔ مترجم ہونے کے سبب اس کی کسی بھی وقت ضرورت پیش آسکتی تھی۔

☆☆☆

میگی اور کیری کے لیے یہ سب ڈراؤنے خواب جیسا تھا جس خوف و دہشت کے سائے سے وہ مکمل طور پر نکل چکے تھے وہ اچانک ہی اپنی تمام تر طاقت سے اُن پر آ جھپٹا تھا۔

میگی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ گردن پر شکاری چاقو کے سبب معمولی سا کٹ لگ گیا تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ کیری بے چارہ اسے مسلسل تھپکنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

روتے روتے میگی نے سر اٹھایا۔ ”کیا یہ لوگ ہمیں مار دیں گے؟“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے اکلوتی بیٹی کا چہرہ گھوم گیا تھا۔

”نہیں، مجھے یقین ہے کہ ان کا مطالبہ مان لیا جائے گا۔ اقوام متحدہ کے علاوہ ہمارے ملک کی سفارتی کارکردگی بھی شاندار ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی پر امداد دینے والے ممالک کا خاصا دباؤ رہتا ہے۔ G-8 ...... یورپی یونین کے بہت سے فورم ہیں جو ہمارے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

میگی کو کچھ ڈھارس بندھی۔ ساتھ ہی احساس ہوا کہ وہ رات ٹیلے پر گزارنے کے لیے اصرار نہ کرتی تو یہ سب نہ ہوتا۔ اس نے کیری کے بازو کے ساتھ چہرہ رگڑا۔ ”سوری! یہ سب میری......“

کیری نے جملہ مکمل ہونے سے پہلے اُس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ”جو ہوا سو ہوا۔ ہم اس پر بات نہیں کریں گے۔“

میگی نے اس کی انگلی چوم لی۔ ”اوکے۔“ ساتھ ہی اس نے پُرتشویش انداز میں کیری کے چہرے کے زخموں کو دیکھا اور بولی۔

”ہمارے سامان میں فرسٹ ایڈ کٹس تھیں۔ ان لوگوں سے وہ مانگ لو۔“

کیری نے اپنے قید خانے سے باہر نگاہ دوڑائی۔ اغوا کاروں میں سے جس نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے تھے، وہ ایک قدیمی مٹی کے تیل سے روشنی پیدا کرنے والا ہنڈولا جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایسے ہنڈولے انہوں نے بلوچستان میں جگہ جگہ دیکھے تھے۔ اب سے پہلے تک یہ ہنڈولے ان کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث تھے۔ مقامی زبان میں انہیں جو کہتے تھے، وہ کوشش کے باوجود ان کی زبان پر نہیں چڑھا تھا۔

کیری نے مترجم کو آواز دی۔ ”سنو! کیا ہماری فرسٹ ایڈ کٹ مل سکتی ہے؟ وہ ہمارے سامان کے ساتھ ہی ہے۔“

مترجم سلاخوں کے قریب آ گیا۔ اور کیری کے زخموں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”معمولی زخم ہیں، ٹھیک ہو جائیں گے۔ فرسٹ ایڈ کی ضرورت نہیں ہے۔“

کیری کو خاموشی ہی اپنے مفاد میں لگی۔

تھوڑی دیر میں خونی غار کی روشنیاں گل کر دی گئیں۔ اب وہاں لالٹین کی بیمار سی روشنی تھی۔

کیری قدرے حیرانی کا شکار تھا۔ مترجم جو ایک خوب رو نوجوان تھا، اس کی آنکھوں میں اسے ترحم نظر آیا تھا یا شاید یہ اس کا وہم تھا۔

☆☆☆

راغ خونی غار سے نکل کر کھوہ کے دہانے پر آ گیا۔ پہلے والا محافظ جا چکا تھا۔ راغ کی ڈیوٹی اب یہاں پر تھی۔ اسی وقت دور کہیں ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ گونجی۔ لمحہ بہ لمحہ یہ گڑگڑاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر اسی طرف آ رہا تھا۔ راغ کھوہ کے اندر دبک گیا۔

یقیناً لاپتا ہونے والے سیاحوں کی تلاش کے لیے سرچ آپریشن شروع ہوگیا تھا۔

راغ جانتا تھا کہ چند گھنٹوں میں سیاح جوڑا عالمی شہ سرخیوں کی زینت بننے والا تھا۔ راغ کے دل و دماغ میں ایک نیا طوفان جنم لے چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ جوڑا محض سیاح تھا اور اسے مہمانوں کے روپ میں آنے والے انڈینز کی معلومات اور انہی کے ایما پر اغوا کیا گیا ہے۔

حکومت کا دہشت گردی کے سامنے گھٹنے ٹیکنا خاصا دشوار تھا۔ یقینی طور پر ان دونوں بے گناہ سیاحوں کے سر بھی کاٹ کر دھڑ سے الگ کردیے جائیں گے۔

راغ کو یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی کہ اس ہولناک منظر کو فلمایا بھی جائے گا۔ جسے دیکھنے کے بعد کون غیر ملکی بلوچستان کی سیاحت کا سوچے گا بھی...... بلکہ وہ لوگ تو پاکستان آنے سے بھی کترائیں گے۔

انڈینز کی پاکستان کی برائے نام سیاحتی صنعت کا باقی ماندہ بھٹا بھی بٹھانے کی یہ مذموم سازش تھی مگر راغ اس سے بھی قدرے ہٹ کر سوچ رہا تھا۔

وہ دونوں بلوچستان کے مہمان تھے۔ مہمان کے لیے جان دینا یہاں کی روایت تھی نہ کہ جان لینا۔ سردار کی آنکھوں پر تو ڈالرز کی پٹی بندھی تھی جس کے سبب وہ اپنی عظیم روایت کو بھلا بیٹھا تھا۔ بڑی عیاری سے سیاحوں کے ساتھ جاسوس کا لاحقہ لگا کر نادان اور سادہ لوح فراریوں کے دماغوں میں بھی زہر بھر دیا گیا تھا ورنہ راغ والی سوچ اور بھی کئی دماغوں میں پیدا ہوسکتی تھی۔

تعلیم نے راغ کو شعور بخشا تھا۔ سفیدی میں چھپی مکروہ سیاہی وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ مایوسی نے اس کے دماغ کو جکڑ کر سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی جس کے سبب وہ اس زہریلی دلدل میں پھنس گیا تھا مگر اس کی فطرت تو نہیں بدلی تھی۔ اندر سے تو وہ وہی روایتی قبائلی تھا جو اپنے مہمان کے لیے جان لے بھی سکتا ہے اور دے بھی......خون اس کی رگوں میں سنسنانے لگا۔ اس کے اندر کا روایتی قبائلی انگڑائی لے کر بیدار ہوچکا تھا۔

یہ فیصلہ کرنے میں اُس نے لمحہ بھی نہیں لگایا کہ وہ ان مہمان سیاحوں کی گردنیں کاٹنے نہیں دے گا۔ بے شک یہ بے حد مشکل تھا۔ مگر تمام تر توانائی اور صلاحیت کے ساتھ اس کے لیے بھرپور کوشش تو کی جاسکتی تھی۔

پھر ایک اور خیال نے راغ کو مزید توانائی دی۔ وہ ان سیاحوں کو بچانے میں کامیاب ہوگیا تو اس کے نام پر لگی سیاہی بھی مٹ جائے گی اور کسی حد تک اس کا ضمیر بھی مطمئن ہوجائے گا جو بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے سبب ہر وقت اسے بے کل اور بے چین رکھتا تھا۔ یہ غیر ملکی سیاح بھی اس سرزمین کے لوگوں کی مہمان نوازی کے گیت گائیں گے جس سے یقیناً اس خطے کا امیج بہتر شکل میں دنیا کے سامنے آئے گا۔

راغ کو یقین تھا کہ اس خطے کی تقدیر بدلنے والا منتر فی الحال سیاحت تھی۔ مہمان سیاحوں کو بچانے کے ساتھ ساتھ اپنی اس زمین کی تقدیر بدلنے میں جتنا ممکن ہوسکتا تھا، وہ اپنا حصہ ڈال سکتا تھا۔

انہی سوچوں کے درمیان ہیلی کاپٹر فراریوں کی اس کمین گاہ کے اوپر منڈلاتا رہا اور پھر کسی اور طرف نکل گیا۔ راغ نے سیاحوں کو بچانے کا فیصلہ کیا تو اُس کا دماغ غیر ارادی طور پر منصوبہ بندی میں مصروف ہوگیا۔ ایک قلعہ نما حفاظتی چوکی اس کمین گاہ سے تقریباً سو کلومیٹر دور تھی۔ سیاحوں کو وہاں تک پہنچا دیا جاتا تو طاقتور ہاتھ اُن کی حفاظت کرسکتے تھے۔

کمین گاہ ایک اونچی پہاڑی پر تھی۔ انتہائی بلندی تک صرف پیدل پہنچا جاسکتا تھا یا پھر خچر اور سدھائے ہوئے گدھے وہاں تک پہنچ سکتے تھے۔

سیاحوں کی طاقتور بائیکس بھی ایک خاص مقام سے اوپر نہیں آسکی تھیں۔ اگر ان بائیکس تک رسائی ہوجاتی تو یہاں سے نکلنے کی کامیاب کوشش کی جاسکتی تھی۔

کمین گاہ میں صرف گدھے تھے جن پر ان کا تعاقب ناممکن تھا۔ اصل خطرہ دس کلومیٹر دور ایک فراریوں کی نگران پوسٹ تھی۔ اس جگہ سردار کے استعمال کی خاص جیپ کے علاوہ اور بھی کئی گاڑیاں موجود تھیں۔ نگران پوسٹ اور کمین گاہ کے درمیان انڈینز کے مہیا کیے ہوئے خاص قسم کے وائرلیس سیٹ پر رابطہ رہتا تھا۔ ان وائرلیس کی فریکوئنسی ٹریس نہیں کی جاسکتی تھی۔

کمین گاہ سے نکل کر واحد راستہ نگران پوسٹ کے پاس سے ہی گزرتا تھا۔ اطراف کے پہاڑ اور کھائیوں کے سبب نگران پوسٹ کی طرف جانا ناگزیر تھا۔ نگران پوسٹ کے بعد حفاظتی چوکی تک جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

سیاحوں کو لے کر مکمل خاموشی سے یہاں سے نکلنا تقریباً ناممکن تھا۔ پہرے داری کا نظام خاصا موثر تھا اور وہ کسی طرح نکل بھی جاتے تو فوراً ہی نگران پوسٹ والوں کو الرٹ کردیا اور وہ ان کے ''شاندار استقبال'' کے لیے پہلے

سے تیار ہوتے۔

راغ کا دماغ مسلسل کوئی محفوظ راستہ ڈھونڈنے میں معروف تھا۔ یہاں کے پہاڑ اور راستے اس کے لیے ہاتھ کی لکیروں کے مانند تھے۔ نگران پوسٹ کے پاس سے ایک دشوار گزار پیدل کا راستہ حفاظتی چوکی تک جاتا تھا مگر اہم ترین سوال یہ تھا کہ سیاح سو کلومیٹر پیدل طے کر سکیں گے؟ اس کے علاوہ یہ کھیل زندگی سے زیادہ موت کا تھا۔ راغ زندگی ہار جاتا تو اس راستے پر سیاحوں کا بھٹک کر بھوک پیاس سے مرجانا تقریباً یقینی تھا۔ یہ سب مشکلات ذہن میں رکھتے ہوئے وہ اپنے اٹل فیصلے پر قائم تھا۔ ابھی اس کے پاس وقت تھا۔ رات میں اس نے سیاحوں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

رات گہری ہو چکی تھی۔ نیند سُولی پر بھی آجاتی ہے کہ مصداق میگی نیند کی آغوش میں تھی۔ اس کیفیت میں بھی اس نے پاس لیٹے کیری کا بازو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

کیری نیم غنودگی میں تھا جب ایک کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ مٹی کے تیل والا ہنڈولا کوئی تھامے سلاخوں کے قریب آرہا تھا۔

کیری چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ یہ مترجم تھا جس کی آنکھوں میں اسے ترحم نظر آیا تھا۔ مترجم کا چہرہ مزید واضح ہوا تو کیری کو اس کے چہرے کے دوستانہ تاثرات دیکھ کر ڈھارس بندھی۔ مترجم نے ہنڈولا احتیاط سے سلاخوں کے پاس رکھا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ سلاخوں کے اندر ڈالا۔

”میں راغ ہوں، تم مجھے یہاں اپنا اکلوتا دوست اور مددگار سمجھ سکتے ہو۔“

کیری کو ایک لمحے کے لیے اپنے کانوں میں یقین نہیں آیا۔ جب آیا تو اس نے بے اختیار اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا جو گرم جوشی سے معمور تھا۔

”میں کیری ڈیمسن ہوں اور یہ میری بیوی میگی ہے۔“ اس نے بھی راغ کی طرح آواز مدھم رکھتے ہوئے میگی کی طرف اشارہ کیا جو اَب کسمسا رہی تھی۔

راغ نے دوسرا ہاتھ بھی کیری کے ہاتھ پر رکھا۔ ”اطمینان رکھنا۔ تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ تم دونوں اس سرزمین کے مہمان ہو اور تمہیں باخیریت یہاں سے نکالنا میری ذمے داری ہے۔“

راغ کے لہجے میں موجود صداقت ایک طاقتور لہر کے مانند کیری کے وجود میں سرایت کر گئی۔ بے اختیار ہی اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو روکنے کی کوشش میں اس کا نچلا ہونٹ کپکپانے لگا۔

اس دوران میگی بھی اٹھ گئی تھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے راغ کو دیکھ رہی تھی۔

راغ نے مزید کہا۔ ”میں جانتا ہوں تم لوگ جاسوس نہیں بلکہ محض سیاح ہو۔ میں، اس مہمان نواز دھرتی کا ایک بھٹکا ہوا بیٹا...... تم سے وعدہ کرتا ہوں...... تمہاری خاطر اپنی جان بھی دینے سے دریغ نہیں کروں گا۔“

اگلے ہی پل میگی اس کے ہاتھوں پر چہرہ رکھے اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی اور راغ کی ہتھیلیاں اس کے آنسوؤں سے بھیگتی جا رہی تھیں۔

راغ کو یہ آنسو اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔

راغ نے ایک ہاتھ چھڑا کر میگی کے سر پر رکھا۔ ”تم...... میرے لیے بڑی بہن کے مانند ہو۔ تم دونوں کو ہمت اور جرأت دکھانے کی ضرورت ہے۔ میری بات ذرا غور سے سنو۔“

☆☆☆

فن لینڈ کے سیاح جوڑے کے اغوا اور اغوا کاروں کے مطالبے کی خبر عالمی میڈیا میں جنگل کی آگ کے مانند پھیل گئی تھی۔ پروپیگنڈے کا ایک طوفان آگیا تھا۔ انڈین اور معاوضے پر کام کرنے والے میڈیا نے ایسی گرد پھیلائی تھی کہ اغوا کار اور ان کا مطالبہ اس دھند میں دھندلا گیا تھا۔ سارا زور اس بات پر تھا کہ پاکستان ایک غیر محفوظ ملک ہے۔

فن لینڈ کا سفارت خانہ اپنے شہریوں کے لیے فوراً ہی متحرک ہو گیا تھا۔ اعلیٰ سطح پر بھی رابطے ہو رہے تھے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل کا پاکستان کے وزیرِاعظم کو فون آچکا تھا اور کال خاصی طویل تھی۔

پاکستان نے ہر سطح پر یقین دلایا تھا کہ دونوں سیاحوں کی بحفاظت بازیابی کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی۔ اغوا کاروں سے مذاکرات کا دور فوراً ہی شروع ہو گیا۔

دوسری جانب راغ اور سیاح جوڑے کے درمیان فرار کے پلان کو حتمی شکل دی جا رہی تھی۔ رات گہری ہوتے ہی تینوں سر جوڑ لیتے تھے۔

کیری اور میگی نے راغ کو یقین دلایا تھا کہ مسلسل غیر آرام دہ سفر نے انہیں سخت جان بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ

وہ عام روٹین کی زندگی میں بھی ورزش کے عادی تھے۔ سوکلو میٹر کے لگ بھگ پیدل سفر اُن کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ان کے سامان میں ایمرجنسی بیگ بھی تھے جن میں پانی، مخصوص قسم کی خوراک اور کپاس وغیرہ تھے۔ ان بیگوں کو کمر پر لاد کر بھی وہ پیدل چل سکتے تھے۔ خوراک اور پانی کی موجودگی میں سوکلومیٹر کا سفر ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

مطمئن ہو کر راغ نے اپنا خود ساختہ نقشہ اُن کے آگے پھیلا دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اکیلے ہی یہ سفر کر سکیں۔

کیری اور میگی اس قطعی غیر متوقع غیبی امداد پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خوش بھی تھے۔ میگی بار بار ممنون ہو کر راغ کے ہاتھ تھام لیتی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے تھے۔

راغ جب اُسے بڑی بہن کہتا تھا تو اسے بے حد اچھا لگتا تھا۔ لفظ بہن اور اس مقدس رشتے کی صحیح معنویت اس نے راغ کے لہجے میں محسوس کی تھی۔

اغوا کاروں نے مذاکرات کے دوران بے لچک رویہ اپنایا تھا۔ وہ اپنے مطالبے سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔

حکومتِ پاکستان خود بھی مغوی سیاحوں کی بحفاظت بازیابی چاہتی تھی۔ دوسری طرف بین الاقوامی دباؤ، غیر مستحکم معیشت اور سیلاب کے بعد آنے والی غیر ملکی امداد کے تناظر میں آخر کار حکومتِ پاکستان کو جھکنا ہی پڑا۔

اغوا کاروں کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔

ایک تیسرے ملک کی ثالثی میں مذاکرات کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ بداعتمادی دونوں طرف تھی۔ سیاح جوڑے کے بدلے تین دہشت گردوں کے تبادلے کے طریقۂ کار کو حتمی شکل دی جا رہی تھی۔

فراریوں کی کمین گاہ پر وہ جشن کی رات تھی۔ اُن کے لیے یہ بہت بڑی فتح تھی۔ کمین گاہ کو خفیہ رکھنے کی غرض سے وہ کھل کر جشن اور ہوائی فائرنگ بھی نہیں کر سکتے تھے اسی سبب بڑے غار میں جو ممکن تھا وہ کیا جا رہا تھا۔

راغ نے بھی خوشگوار حیرت کے ساتھ یہ خبر سنی تھی۔ اب اُسے سیاح جوڑے کو فرار کروانے کی ضرورت نہیں تھی۔

جشن اختتام پذیر ہو گیا۔ آج فراریوں کے لیے کھانے کا خاص انتظام کیا جا رہا تھا۔ راغ کو سردار نے طلب کر لیا۔ اسے دیکھتے ہی سردار نے پوچھا۔

''کیا حال ہے تیرے قیدیوں کا؟''

''ٹھیک ہیں سردار!'' راغ نے مختصر جواب دیا۔

''ان کے کھانے، پینے اور صفائی ستھرائی کا خیال رکھو، کسی بھی وقت وہ رہا کیے جا سکتے ہیں۔''

راغ بولا۔ ''سردار! اپنے زخموں کے لیے قیدی اپنے سامان میں موجود میڈیکل کٹ اور کھانے، پینے کا سامان مانگ رہے تھے۔ اس بارے میں کیا حکم ہے؟''

''اچھی طرح دیکھ بھال کر یہ سامان انہیں دے دو، اور رہائی کے وقت وہ صاف ستھرے لباس میں ہوں۔ عالمی میڈیا میں ہمارا تاثر بھی مثبت جانا چاہیے۔''

''جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہوگا سردار!''

کر کورنش دے کر راغ پلٹنے لگا تو سردار نے مزید کہا۔

''قیدیوں کو جلد رہائی کی خوش خبری دے دو اور اُن کا دماغ بھی صاف کرنے کی کوشش کرو، ہماری آزادی کی تحریک اور اس کا پس منظر...... ہمارے ساتھ ہونے والی زیادتیاں...... ہمارے وسائل سے ہماری محرومی اور جو کچھ تیرے علم میں ہے۔ قیدیوں کی زبانی یہ باتیں عالمی میڈیا پر پہنچ جائیں گی۔'' یہ کہہ کر اچانک سردار کے دانت چمکے۔ ''تیری انگریزی پڑھائی کا تحریک کو بھی تو کچھ فائدہ ہونا چاہیے۔''

سردار کی تقلید میں وہاں موجود فراری کمانڈروں کے بھی دانت نکل آئے تھے۔

''جو حکم سردار!''

واپسی پر راغ رہائی کی خوش خبری سیاح جوڑے کو سنانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ خونی غار کے قید خانے کا رخ کرنے سے پہلے اس نے سیاح جوڑے کی بائیکس کا رخ کیا جن کے اوپر آس پاس کے ماحول سے ہم آہنگ بھورے رنگ کی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ ان چادروں کے سبب آسمان سے اُن کا دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔

راغ نے ڈھونڈ کر ان کے صاف ستھرے کپڑوں کا بیگ، میڈیکل کٹ اور کھانے پینے کی کچھ اشیا نکال لیں۔ اس کے بعد وہ قید خانے پہنچ گیا۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کے ہاتھوں میں سامان دیکھ کر سیاح جوڑا حیران رہ گیا تھا۔ جب راغ نے انہیں بتایا کہ ان کی تحریک کا مطالبہ مان لیا گیا ہے۔ وہ دونوں کسی بھی وقت رہا کیے جا سکتے ہیں۔ یہ خوش خبری سن کر ان دونوں پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

دونوں ایک، دوسرے سے لپٹ کر زاروقطار رونے لگے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے اور دونوں ہی ایک، دوسرے کے آنسو صاف کررہے تھے۔ ایک، دوسرے کو چوم رہے تھے۔

ان کی محبت کا جذبہ اتنا طاقتور تھا کہ خود بخود ہی محسوس ہوجاتا تھا۔ اس پل بھی اسے محسوس کر کے راغ کی آنکھیں بھر آئیں۔

جذبات کا دریا اترا تو راغ نے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ میرے حوالے سے تمہاری زبان بند ہی رہے گی۔ زبان کھل گئی تو مجھے فوراً گولی ماردی جائے گی۔''

میگی نے حسبِ عادت اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اس دفعہ کیری نے بھی ان ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے تھے۔ اس لمس میں محبت اور اعتماد کی گرم جوشی تھی۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہ دونوں بالکل معصوم بچوں کے مانند نظر آرہے تھے۔

میگی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس بات کا ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔ ہماری کہانی کے تم ایسے ''گمنام ہیرو'' ہو جس کا کہیں بھی ذکر نہیں آئے گا۔''

کیری نے ان مشترکہ ہاتھوں کو دباتے ہوئے جذبات سے چور انداز میں کہا۔ ''یہ حسرت ہی رہے گی کہ تم سے دوبارہ کسی اچھے حالات میں ملاقات ہو مگر تم...... ہمارے دلوں میں ہمیشہ رہو گے۔''

راغ کے لیے آنسو روکنا مشکل ہوگیا۔ اس نے ان دونوں کی گرفت سے ہاتھ چھڑواتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

''صبح نہا دھو کر لباس تبدیل کر لینا۔ اضافی پانی مہیا کر دیا جائے گا۔ خدا نے چاہا تو اس قید خانے میں آج تمہاری آخری رات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹنے لگا تو میگی کی التجا میں ڈوبی آواز ابھری۔

''پلیز! ہماری طرف دیکھو۔''

راغ کو مجبوراً گھومنا پڑا۔ میگی اس کے لائے سامان میں سے ایک چاکلیٹ کا ریپر کھول رہی تھی۔ چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا توڑ کر اس نے راغ کے منہ میں ڈالا اور باقی چاکلیٹ کیری کو تھماتے ہوئے راغ کی آنکھوں میں اٹکے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں پر چن لیے۔

درمیان میں جنگلے کے باوجود ایک آفاقی جذبے کے تحت وہ تینوں بغلگیر ہوگئے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن تینوں انڈینز پھر آدھمکے تھے۔ ان میں شامل لمبی تڑنگی اور نسوانیت سے بھرپور عورت یہاں آتے ہی مقامی لباس تبدیل کر کے نیم فوجی قسم کا لباس پہن لیتی تھی۔ جس میں اس کے جسم کا انگ انگ دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔

فراریوں کی نگاہیں اس کے ساتھ ہی گردش میں رہتی تھیں اور ٹھنڈی آہوں کا طوفان سا آجاتا تھا۔

اس عورت کا جب بھی سردار سے سامنا ہوتا تھا، سردار کے کرخت چہرے پر نرم سی پھوار برسنے لگ جاتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی مہمانوں کے روپ میں آئے یہ انڈینز سردار کے پاس گھسے ہوئے تھے۔ دوسری طرف فراری اپنے تین ساتھیوں کے استقبال کے لیے بے چین ہورہے تھے جن کے ساتھ کئی فراریوں کے خون کے رشتے بھی تھے۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔

راغ سیاح جوڑے کے لیے کھانا لے کر گیا تو دونوں نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر چکے تھے اور اپنی رہائی کے لیے بے چین نظر آتے تھے۔

کیری کے چہرے پر بینڈیج نے زخموں کو ڈھانپ لیا تھا۔

راغ نے انہیں تسلی دی کہ رہائی میں دیر ہوسکتی ہے۔ وقت ابھی کوئی مقرر نہیں ہوا۔ وہ اطمینان سے کھانا کھائیں۔ کھانا بھلا اب کہاں سیاح جوڑے کے حلق سے اترنے والا تھا۔

انڈینز اور سردار کی تنہائی میں ہونے والی ملاقات طویل سے طویل تر ہوتی جارہی تھی۔ راغ کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ضرور کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔

شام ڈھلتے ہی آج سیاح جوڑے کی رہائی کا امکان ختم ہوگیا۔

ایک اور رات تھی اور نسوانیت سے بھرپور عورت سردار کے ساتھ تھی۔

رات گہری ہوتے ہی راغ...... سیاح جوڑے کے پاس پہنچ گیا۔ ان کے درمیان بہت دیر تک باتیں ہوتی رہی تھیں۔ میگی کے اصرار پر راغ کو اپنی کہانی سنانی پڑ گئی تھی۔ جس میں بانو کا بھی ذکر تھا۔

راغ کا دل کسی انہونی سے لرز رہا تھا۔ انڈینز کی آمد کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ یہ سوچ کر راغ نے اپنے کسی خدشے کا ان دونوں سے ذکر نہیں کیا کہ ممکن تھا یہ محض اس کا وہم ہو۔

اگلے دن کا سورج سیاح جوڑے کے لیے موت کا

پیغام لے کر آیا تھا۔ راغ کی چھٹی حس کا اشارہ درست ثابت ہوا تھا۔ انڈینز کا اپنا مذموم ایجنڈا تھا۔ انہیں دہشت گردوں اور سیاحوں کی رہائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا مقصد تو پاکستان کو دنیا کے سامنے غیر محفوظ ملک ثابت کرنا تھا۔

یہاں پاکستان نے غیرملکی سیاح جوڑے کی زندگیوں کی خاطر غیر معمولی لچک دکھائی تھی۔ بیرونی دباؤ بھی تھا۔ فیصلہ انڈینز کی توقع کے بالکل خلاف ہوا تھا۔ بازی کو دوبارہ اپنے حق میں پلٹنے کے لیے وہ سرگرم ہو گئے تھے اور شاید دو مرد دن کی روشنی میں مل کر وہ قلعہ سر نہیں کر سکے تھے جو اُن کی ساتھی عورت نے رات کے اندھیرے میں کر لیا تھا۔

سیاح جوڑا دوبارہ قابلِ رحم حالت میں شکاری چاقوؤں کی زد میں تھا اور کیمرے کے سامنے کھڑا سردار نیا مطالبہ کر رہا تھا۔

''حکومتِ پاکستان ہمارے ساتھیوں کی رہائی کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں قائم کی گئی تمام حفاظتی چوکیاں خالی کر دے ... اور فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے۔ ورنہ ان دونوں کو قتل کر دیا جائے گا اور اس قتل کی تمام تر ذمے داری حکومتِ پاکستان پر ہوگی۔''

ظاہر ہے یہ ایسا مطالبہ تھا جو پوری دنیا مل کر بھی پاکستان سے تسلیم نہیں کروا سکتی تھی۔ سیاح جوڑے کا بے موت مارا جانا یقینی تھا۔

فراری شاک کی کیفیت میں تھے۔ وہ تو اپنے پیاروں کے منتظر تھے اور مہمانوں نے آکر بازی ہی پلٹ دی تھی مگر چونکہ سردار ہی سب کچھ تھا۔ اس کے فیصلے سے اختلاف کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ آج تک انہوں نے یہی دیکھا اور سیکھا تھا۔

راغ کے دل و دماغ میں انڈینز کے لیے نفرت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سیاح جوڑے کو فرار کروانے کے ساتھ ساتھ ان انڈینز کو بھی یادگار سبق سکھانے کی خواہش پوری طاقت کے ساتھ بیدار ہو چکی تھی۔ آج رات وہ حرکت میں آنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کی شدید ترین خواہش تھی کہ انڈینز آج رات واپس نہ جائیں مگر جلد ہی اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ انڈینز واپس جا رہے تھے۔ ظاہر ہے ان کا اب وہاں کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔

راغ ہاتھ مسل کر رہ گیا۔

راغ نے اپنے پلان کو حتمی شکل دے لی تھی۔ شام کو وہ کھانا لے کر سیاح جوڑے کے پاس گیا تو اُن کی حالت

خاصی ابتر تھی۔ یقینی امید ٹوٹی تھی تو ان کے حوصلے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ وہ بے سدھ سے پڑے ہوئے تھے۔ راغ کو دیکھ کر ان کے چہروں پر زندگی کی چمک نظر آئی۔ تھوڑی کوشش سے راغ ان میں دوبارہ سے زندگی کی روح پھونکنے میں کامیاب ہوگیا۔

فرار کا پلان پہلے ہی ڈسکس ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ راغ انہیں رائفل کے استعمال سے متعلق بھی بنیادی معلومات دے چکا تھا۔ وہ دونوں پُریقین تھے کہ ضرورت پڑنے پر وہ ہتھیار استعمال کر لیں گے۔ مقامی طرز کے مردانہ لباس راغ کئی وقفوں میں وہاں تک لا چکا تھا۔ خوب قدآور ہونے کے سبب میگی بھی انہیں زیب تن کر سکتی تھی۔

راغ نے مقررہ وقت پر انہیں تیار رہنے کے لیے کہا۔ آج یہاں ان کی آخری رات تھی۔

☆☆☆

لاک اَپ کی چابی راغ کے پاس ہی تھی۔ خونی غار سے سیاح جوڑے کو باہر نکالنا اتنا مسئلہ نہیں تھا۔ مسئلے کا آغاز غار کے باہر سے ہوتا تھا۔ چند ہی میٹر کے فاصلے پر اسلحہ خانے کا محافظ تعینات تھا۔ اس کی نظروں سے بچنا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ بائیکس تک دو مزید پوائنٹ تھے جہاں دو، دو محافظ تعینات تھے۔ ان کی نظروں سے بچنا بھی مشکل تھا۔

بائیکس تک پہنچنے کے بعد آگے کا راستہ صاف تھا۔ اگلی رکاوٹ نگران پوسٹ ہی تھی جہاں چھ اور کبھی چھ سے بھی زیادہ فراری موجود رہتے تھے۔

راغ نے ساری مشکلات کو ذہن میں رکھتے ہوئے پلان ترتیب دیا تھا۔ مقررہ وقت پر راغ قید خانے کے پاس پہنچا تو میگی اور کیری لباس تبدیل کر چکے تھے۔ پہلی نظر اور نیم تاریکی میں ان کی شناخت اب خاصی مشکل ہوگئی تھی۔

راغ اپنے اعصاب پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ وہ دونوں البتہ ہیجان زدہ نظر آرہے تھے۔ راگ نے لاک کھولا اور دونوں لمحوں میں باہر تھے۔ ایک، دوسرے کا ہاتھ تھام کر دونوں راغ کے عقب میں ہر ممکن احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے۔

راغ غار کے دہانے کے پاس رک گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”تم دونوں یہیں رکو، میں آگے کا راستہ صاف کر کے آتا ہوں۔“

راغ خونی غار سے باہر نکل کر اسلحہ خانے کی طرف چل دیا۔ رائفل اس نے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اسلحہ خانے کا محافظ اسے دور سے ہی نظر آگیا۔ وہ ایک اونچے سے گول پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔

محافظ نے راغ کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے دور سے ہی ہانک لگائی۔ ”اوئے راغ! تیرا رباب کیوں آج کل خاموش ہے؟“

راغ اطراف پر نظر رکھتے ہوئے محافظ کے قریب پہنچ گیا۔ ”بس یار! چاندنی راتیں ڈھل گئی ہیں۔ چاندنی راتوں میں ہی انگلیاں حرکت میں آتی ہیں۔“

محافظ اِدھر اُدھر دیکھ کر جھجکتا ہوا۔ ”یار! سگریٹ کی طلب مارے جارہی ہے۔ ذرا میری جگہ بیٹھ میں خونی غار میں ہو کر ذرا دو سوٹے لگا لوں۔ کھلے میں سگریٹ جلانے کی تجھے پتا تو ہے کتنی سختی ہے۔“

راغ کو اپنا کام آسان ہوتا محسوس ہوا۔ ”دو، چار سوٹے کیا، پوری ڈبی پھونک آ...... میں بیٹھا ہوں یہاں۔“

اسے مشکور نظروں سے دیکھتے ہوئے جیسے ہی محافظ نے رخ پھیرا اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

راغ کی رائفل کا بٹ پوری قوت سے عقب سے اس کی گردن کے نچلے مہروں پر لگا۔ حلق سے لایعنی سی آواز نکالتے ہوئے وہ پل بھر میں ڈھیر ہوگیا۔

رائفل کندھے سے لٹکاتے ہوئے جھک کر اُس نے محافظ کی جیبیں ٹٹولیں۔ جلد ہی اسے اسلحہ خانے کی چابی مل گئی۔ کسی ایمرجنسی کے خیال سے اسلحہ خانے کی چابی ڈیوٹی پر تعینات محافظ کے پاس ہی رہتی تھی۔

راغ، محافظ کو گھسیٹتے ہوئے خونی غار کی طرف لے گیا۔ بے ہوش محافظ کو زیادہ آسانی سے اسلحہ خانے میں پہنچایا جاسکتا تھا مگر راغ جو کرنے جارہا تھا۔ اسلحہ خانے میں محافظ کی موت یقینی تھی۔ راغ کی شدید خواہش تھی کہ اس کے ہاتھوں کسی فراری کی جان ضائع نہ ہو۔ بے شک یہ بھٹکے ہوئے لوگ تھے مگر سادہ لوح اور اس کے اپنے تھے۔ مناسب روزگار مل جاتا اور زہریلے پروپیگنڈے کا توڑ ہو جاتا تو یہ لوگ قومی دھارے میں شامل ہو کر محبِ وطن پاکستانی ثابت ہوسکتے تھے۔

بے ہوش محافظ کو میگی اور کیری نے سنبھال لیا۔ اس کے جلدی ہوش میں آنے کے چانس نہ ہونے کے برابر تھے مگر پلان کے مطابق اس کے ہاتھ، پاؤں باندھنے کا فریضہ ان دونوں نے سنبھال لیا۔ محافظ کی رائفل اب کیری کے پاس تھی۔ راغ نے دوبارہ اسلحے خانے کا رخ کر لیا۔ یہاں سے اس نے چند دستی بموں کے ساتھ تین چھوٹے ہتھیار نکالے۔ اس کے بعد اس نے پلاسٹک کا ایک خاص بکس

کھولا۔ ان باکسز کے اندر ریموٹ کنٹرولڈ مائن تھیں۔ فولادی مائن کا نظارہ خاصا ہولناک تھا۔ ایک مائن بڑی بکتر بند کو اُڑانے کے لیے کافی تھی۔

راغ نے اس مائن کے استعمال کی تربیت لی تھی۔ ایک مائن کو اس نے بکس میں سے نکال کر ایکٹیو کر دیا۔ اس کا چھوٹا سا ریموٹ بھی ساتھ تھا۔ بکس میں سے ہی ڈرائی سیل نکال کر اس نے ریموٹ میں ڈال لیا۔ ریموٹ پر ایک سرخ بٹن پلاسٹک کے سخت خول میں مقید تھا۔ اس سخت خول کے سبب حادثاتی طور پر بٹن کا دب جانا ممکن نہیں تھا۔

راغ نے یہ ریموٹ جیب میں ڈال لیا۔ اس کی رینج دوسو میٹر تھی۔

وہ واپس خونی غار میں آیا تو سیاح جوڑا بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

راغ نے چھوٹے ہتھیار ان کے حوالے کرتے ہوئے ان کے استعمال کا طریقہ بھی سکھا دیا۔ اس کے بعد وہ تینوں خونی غار سے نکلے اور مختلف چٹانوں کی اوٹ لیتے ہوئے آگے بڑھے۔

دوسو میٹر کی رینج راغ کے دماغ میں تھی۔

وہ ابھی پہلی پوسٹ سے کچھ ہی دور تھے کہ اچانک ایک چٹان کے عقب سے ایک فراری نکلا۔ رائفل اس کے کندھے پر تھی اور وہ اپنی شلوار درست کر رہا تھا۔ چٹان کے عقب میں غالباً وہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہوا تھا۔

وہ تینوں لحظہ بھر کے لیے بت بن گئے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس فراری نے بڑی مشکوک نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ راغ کو اس نے پہچان لیا۔

''تو اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر یہاں کیا کر رہا ہے؟'' وہ غالباً کوئی سینئر تھا۔ اسی سبب اس کا لہجہ بے حد سخت تھا۔ ''اور یہ کون ہیں؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر سیاح جوڑے کو دیکھا۔ اگلے پل اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نمودار ہوئی۔ وہ، راغ کی طرف دیکھتے ہوئے چنگھاڑا۔

''غدار......'' باقی کے الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے تھے۔ کیری نے زندگی میں پہلی دفعہ گولی چلائی تھی اور اس کا نشانہ بھی درست بیٹھا تھا۔

رائفل کندھے سے اتارنے کا عمل درمیان میں ہی رہ گیا تھا۔ سینے پر سیاہ دھبا لیے وہ سینئر ایک کریہہ چیخ کے ساتھ پشت کے بل گرا تھا۔

گولی کی آواز مکمل خاموشی میں ابھی تک گونج رہی تھی۔

راغ حلق کے بل چیخا۔ ''بھاگو۔'' ساتھ ہی اُس نے بڑی سی پاکٹ میں سے ایک دستی بم نکال لیا۔ بمشکل تیس سیکنڈ میں ان پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ آس پاس کی چٹانوں پر دہکا ہوا سیسہ برسا تو کیری بری طرح سے چیخنے لگی۔

کیری نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ راغ ان سے خاصا آگے چلا گیا تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے راغ کا پھینکا ہوا دستی بم پہلی پوسٹ پر گرا۔ زبردست چکاچوند کے ساتھ زوردار دھماکا ہوا اور ان پر ہونے والی فائرنگ رک گئی۔

وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے راغ کے قریب پہنچ گئے۔

راغ نے ہانپی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ ''میں، دوسری پوسٹ کو الجھاؤں گا۔ تم لوگ بائیکس نکالنا۔ ٹرالیاں چھوڑ دینا، صرف ایمرجنسی بیگ سنبھالنے ہیں اور بائیکس سیدھے کر کے اکٹھی تین گولیاں چلا کر اشارہ دینا ہے۔''

ان دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ راغ کے حوصلے اور اعتماد نے ان میں بھی نئی روح پھونک دی تھی۔ پہلے کا ہیجان اور گھبراہٹ بہت حد تک کم ہوگئی تھی۔

دوسری پوسٹ قریب آتے ہی انہیں دیکھ لیا گیا۔ فوراً ہی ان پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ ایک چٹان کی اوٹ لے کر راغ نے جوابی فائرنگ شروع کر دی اور ساتھ ہی سیاح جوڑے کو اشارہ کیا۔

وہ دونوں بڑے پتھروں اور چٹانوں کی اوٹ لیتے ہوئے بائیکس کی طرف بڑھے۔ بائیکس وہاں سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ راغ نے پوزیشن بدل بدل کر پوسٹ پر فائرنگ کی۔ اس طرح وہ ان لوگوں کو ایک سے زیادہ حملہ آوروں کا تاثر دینے میں کامیاب رہا تھا۔

یہ پوسٹ دستی بم کی رینج سے دور تھی ورنہ وہ اس کا بھی صفایا کر دیتا۔ تمام تر کوشش کے باوجود وہ اپنے ہاتھوں کو فراریوں کے خون سے بچا نہیں سکا تھا مگر اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ اس کے لیے فراریوں کا خون اہمیت رکھتا تھا اور اس سے زیادہ اہمیت اس دھرتی کے مہمانوں کے خون کی تھی۔

وہ پہاڑی سے خاصا نیچے اتر آئے تھے۔ پہاڑی کے اوپر سے بھی اندھا دھند فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ یقیناً ان کا فرار پوشیدہ نہیں رہا تھا۔

اچانک راغ کے دائیں بازو کو زوردار جھٹکا لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے دہکتی ہوئی سلاخ بازو میں اتر گئی ہو، ایک جلتی ہوئی گولی اسے لگ گئی تھی۔

راغ کے حلق سے زوردار کراہ نکلی اور رائفل اس کے

ہاتھ سے گر گئی۔ درد کی بے پناہ شدت کو برداشت کرتے ہوئے اس نے زخمی بازو ہلایا۔ بازو کی حرکت بے حد کم تھی اور زخم سے بہنے والا خون اس کی بغل سے ہو کر پسلیوں پر بہنا شروع ہو گیا تھا۔

ایک بازو ناکارہ ہونے کے سبب رائفل کا استعمال بے حد مشکل ہو گیا تھا مگر کسی طرح وہ ایک ہاتھ سے فائرنگ کرتا رہا۔

راغ کا پورا وجود سراپا سماعت بن گیا تھا۔ اسے بیک وقت تین گولیوں کے فائر ہونے کا انتظار تھا۔ اس نے ایک جگہ بیٹھ کر ایک دستی بم ہاتھ میں لے لیا اور ریموٹ کنٹرول کا سخت کور توڑ دیا۔ اب سرخ بٹن دباتے ہی ایک قیامت برپا ہونے والی تھی۔

اچانک ایک خیال نے راغ میں نئی توانائی پھونک دی۔

سیاح جوڑے کے اغوا کے سبب سیکیورٹی ادارے ہائی الرٹ تھے۔ اس کے علاوہ سرچ ٹیمیں بھی متحرک تھیں۔ ہیلی کاپٹرز کی پروازوں میں بھی غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا تھا۔ زوردار فائرنگ اور دھماکے کسی بھی ٹیم یا سیکیورٹی ادارے کو اس طرف متوجہ کر سکتے تھے۔ ایسا ہو جاتا تو یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔

راغ نے ریموٹ کے سرخ بٹن کو دیکھا۔ اسلحے خانے میں ہونے والا.. دھماکا یقیناً بہت بڑا ہوگا۔ محض سو کلومیٹر دور موجود بڑی حفاظتی چوکی کا تو اس دھماکے کے بعد اس طرف متوجہ ہونا یقینی تھا۔

فائرنگ کے شور میں اچانک اوپر نیچے تین فائروں کی آواز گونجی۔ ماخذ وہی تھا جہاں بائیکس موجود تھیں۔ راغ سیدھا ہو بیٹھا۔ ریموٹ ہاتھ میں لے کر اس نے سرخ بٹن دبا دیا۔

فوراً ہی پہاڑ کی بلندی پر آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والی چمک نمودار ہوئی۔ زوردار دھماکا ہوا اور پھر دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہر طرف ہڑبونگ مچ گئی تھی۔ پہاڑ کے اوپر سے فائرنگ کا سلسلہ تو یکلخت ہی موقوف ہو گیا تھا۔ بھیانک شعلوں نے پہاڑ کی بلندی روشن کر دی تھی۔

راغ نے پوسٹ کی سمت سلامت بازو سے دستی بم اچھالا اور تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ دھماکے کے سبب پوسٹ کے محافظوں کا دبک جانا یقینی تھا۔ راغ کے پاس چند سیکنڈ تھے۔ وہ اٹھ کر بائیکس کی سمت دوڑا۔ شعلوں کے عکس میں اس نے دیکھا کہ کیری اور میگی بائیکس پر تیار بیٹھے عقب میں دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہ اپنے جاں نثار محسن کے منتظر تھے۔ ایمرجنسی بیگ ان کی کمروں سے بندھے تھے۔

راغ دوڑ کر کیری کے پیچھے جا بیٹھا۔ ”نکلو! بے شک ہیڈ لائٹس جلا لو، پہاڑوں کی اوٹ ایسی ہے کہ ہم فائرنگ کی براہِ راست زد میں نہیں آئیں گے۔“

خطرناک کھائیوں کے اوپر مختصر سے پتھریلے ٹریک پر بائیک چلانا ویسے بھی جان جوکھوں کا کام تھا اور ہیڈ لائٹس کے بغیر تو یہ ناممکن تھا۔

اسی وقت خوفناک گڑگڑاہٹ گونجی اور زمین لرزتی محسوس ہوئی۔ بائیکس بھی ڈگمگا گئی تھیں۔ راغ نے سر گھمایا۔ بارودی شعلوں کی روشنی میں، سے پتھر لڑھکتے نظر آئے اور شعلوں میں غبار سا آ گیا تھا۔ دھماکے کے سبب یقیناً اسلحے خانے والا غار بیٹھ گیا تھا مگر زمین کی لرزش اور فائرنگ کا یکلخت دم توڑ دینا کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

غار در غار پھیلا سلسلہ باہم منسلک تھا۔ لگتا تھا ایک غار کے بیٹھتے ہی پورا سلسلہ بیٹھ گیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو فراری اپنے ایک محفوظ ترین ٹھکانے کے علاوہ اچھا خاصا جانی نقصان بھی اٹھا بیٹھے تھے۔

راغ کا دل اداسی سے بھر گیا۔ وہ فراریوں کے لیے بھی افسردہ تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان لوگوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا چکا تھا۔

مسلسل ہچکولوں کے سبب راغ کے لیے سسکاریاں روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ کیری نے چیخ کر پُرتشویش انداز میں پوچھا۔

”تم زخمی ہو؟“

”ہاں، مگر معمولی زخم ہے۔“ یہ کہتے ہوئے راغ کی آواز میں نقاہت در آئی تھی۔

”ہم کہیں رک جاتے ہیں اور تمہیں ٹریٹ منٹ دیتے ہیں۔“ کیری کے لہجے میں پُرخلوص سچائی تھی۔ اپنے محسن کی خاطر وہ موت کے منہ میں بھی رکنے کو آمادہ تھا۔

راغ نے سختی سے کہا۔ ”بالکل نہیں، یہ لوگ بھی ہمارے تعاقب میں آئیں گے اور آگے نگران پوسٹ والوں کو بھی اطلاع ہو چکی ہوگی۔ وہ بھی نکل چکے ہوں گے۔ ہمیں نگران پوسٹ والوں سے پہلے اس درّے تک پہنچنا ہے جہاں سے پیدل سفر کا آغاز ہوگا۔“

کیری نے لحظہ بھر کو لب بھینچے پھر گویا ہوا۔ ”اس حالت میں کیا تم پیدل سفر کر سکو گے؟“

''میری فکر نہ کرو، راستہ ہموار ہو رہا ہے۔ رفتار بڑھاؤ نگران پوسٹ والوں نے درّہ عبور کرلیا تو ہمارا بچنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔ ہم درمیان میں پِس کر رہ جائیں گے۔''

کیری نے ہیڈ لائٹ کا مخصوص اشارہ دیا۔ یہ ان کے درمیان بہت پہلے سے طے تھا۔ مشاقی سے بائیک دوڑاتی میگی نے رفتار بڑھادی۔

خون کے مسلسل اخراج کے سبب راغ کی نقاہت بڑھتی جارہی تھی۔ راستہ مزید ہموار ہوتے ہی راغ نے بائیکس کی ساری لائٹس بند کروادی تھیں۔ اس کے سبب ان کی رفتار قدرے کم ہوگئی تھی مگر وہ محفوظ زیادہ ہوگئے تھے۔

مزید کچھ دیر میں وہ اس درّے کے قریب پہنچ گئے جہاں سے ان کو پیدل ٹریک پکڑنا تھا مگر یہاں بہت بڑی مایوسی ان کی منتظر تھی۔ بلندی پر موجود درّے کے آس پاس روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یقیناً نگران پوسٹ والے ان سے پہلے درّے تک پہنچ گئے تھے اور بلندی کے سبب یہاں رک کر اطراف پر نظر رکھنے کے لیے وہ درّہ بہتر جگہ تھی۔

راغ نے دل میں امڈتی مایوسی کو دور بھگایا۔ بائیکس یہیں چھوڑ کر درّے پر شب خون مارا جاسکتا تھا اور اس کے بعد کا راستہ صاف تھا۔

راغ کے کہنے پر بائیکس روک دی گئیں۔

میگی کو بھی راغ کے زخمی ہونے کا پتا چل گیا تھا۔ وہ بے حد پریشان ہوگئی تھی۔

راغ جانتا تھا کہ اس کے حوصلے اور ہمت کے سبب ہی ان دونوں کا حوصلہ بھی سلامت تھا۔ اسی سبب وہ اپنی ہڈیوں تک سے توانائی کشید کر رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو بتایا کہ اب کیا کرنا ہے۔

بے بسی کی موت سے زندگی کی جدوجہد کرنا ہزار گنا بہتر تھا اور اب تو ان دونوں کے اعتماد میں بے حد اضافہ بھی ہوگیا تھا۔ وہ فوراً حرکت میں آنے کے لیے تیار ہوگئے۔

پتھروں کی اوٹ لیتے اور کہیں کرالنگ کے انداز میں وہ درّے کی طرف بڑھے۔ رائفل میگی کو تھما کر راغ نے چھوٹا ہتھیار سنبھال لیا تھا۔

اگر روشنی ہوتی تو صاف نظر آتا کہ راغ کے ساتھ ایک خونی لکیر بھی ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ نگران پوسٹ والے ٹارچ لائٹس کی روشنیوں میں ہر طرف پھیل رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک چٹان کے عقب میں چھپی ہوئی میگی ٹارچ لائٹ کے دائرے میں آگئی۔

اُن کی موجودگی آشکار ہوگئی تھی۔

کئی للکارے گونجے اور ٹارچ لائٹس کا مرکز وہ چٹان بن گئی جس کے پیچھے میگی چھپی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کئی ہتھیاروں کے دہانے کھل گئے۔

پیٹ کے بل ایک بازو کے سہارے آگے بڑھتے راغ نے اپنا سر نیچے پتھروں پر ٹکا دیا۔ تمام تر کوشش کے باوجود وہ اپنی دھرتی کے مہمانوں کو بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

عقب سے تعاقب میں نکلے فراری کسی بھی لمحے پہنچنے والے تھے۔ آگے بھی نگران پوسٹ والے فراری تھے۔ دائیں بائیں ناقابلِ عبور کھائیاں تھیں۔ وہ موت کے پنجے میں پوری طرح سے جکڑے گئے تھے۔

راغ کے قریب موجود کیری نے گھبرا کر پوچھا۔ ''اب کیا کریں گے؟''

اسی دوران میگی بھی کلاوا کاٹ کر ان کے قریب آگری تھی۔

راغ نے کہا۔ ''لڑیں گے...... ماریں گے یا پھر مارے جائیں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے قریب ہی چمکنے والی ٹارچ لائٹ کی طرف فائر جھونک دیا۔

میگی نے اپنا ایک بازو راغ پر رکھا اور گلوگیر آواز میں بولی۔ ''تم نے ہماری خاطر اپنی جان جس طرح سے خطرے میں ڈالی ہے، اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ بس، مرتے وقت بھی یہی دکھ رہے گا کہ نہ تمہاری قربانی کسی کے علم میں آسکی اور نہ ہم تمہارے لیے کچھ کر سکے۔'' یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی۔

گولیوں کا شور اور بارودی دھوئیں میں دو قطعی مختلف خطوں کے باسی ایک دوسرے کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔

اس دوران کیری کی رائفل بھی دو دفعہ گرجی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ فراری انہیں گھیر کر زندہ پکڑنے کی کوشش میں ہیں۔

راغ نے کہا۔ ''میرے لیے فکرمند نہ ہو بڑی بہن، بلکہ میں تم دونوں سے شرمندہ ہوں۔ تم دونوں میری دھرتی کے مہمان تھے۔ میں، تمہاری حفاظت نہیں کرسکا۔''

اس دوران ان پر شدت سے فائرنگ ہونے لگی۔ اپنا محدود ایمونیشن بچاتے ہوئے وہ رفتہ رفتہ پیچھے ہٹنے لگے۔ جہاں انہوں نے بائیکس چھوڑی تھیں۔ وہاں خاصی بڑی چٹانیں تھیں جن کے عقب میں وہ زیادہ محفوظ رہ سکتے تھے۔

راغ نے ایک دستی بم اچھالا تو انہیں گھیرے میں لینے

والوں میں کھلبلی مچ گئی اور گھیرا مکمل ہونے سے پہلے وہ لوگ ہاٹیکس کے پاس پہنچ گئے۔

راغ کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ اس نے پانی مانگا تو میگی پانی کی بوتل کے ساتھ فرسٹ ایڈ باکس بھی لے آئی مگر تاروں کی مدھم سی روشنی میں زخم کا معائنہ اور ٹریٹ منٹ مشکل تر امر تھا۔

راغ نے پانی کے چند گھونٹ لے کر ٹریٹ منٹ سے منع کر دیا۔

فراری رفتہ رفتہ دوبارہ قریب آ رہے تھے۔ کچھ دیر میں ایک اور بدترین خدشے کی بھی تصدیق ہو گئی۔ تباہ ہونے والے فراری کیمپ سے بھی کچھ لوگ ان کے تعاقب میں آ گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دوطرفہ فائرنگ کی زد میں تھے۔

موت رفتہ رفتہ اُن کے قریب آ رہی تھی مگر وہ بے جگری سے اس سے لڑ رہے تھے۔

آخرکار وہ معجزہ رونما ہو ہی گیا جس کی راغ امید لگائے بیٹھا تھا۔

فضا میں ایک سے زائد ہیلی کاپٹروں کی گڑگڑاہٹ گونجی تھی جو تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ راغ کی ڈوبتی سانسیں بحال ہونے لگیں۔ ایک ہیلی کاپٹر کی مہیب گڑگڑاہٹ سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اس گڑگڑاہٹ سے فراریوں کی روح فنا ہونے لگ جاتی تھی۔ یہ لڑاکا کوبرا ہیلی کاپٹر تھا۔

راغ خوشی سے چلایا۔ ”مدد آ گئی ہے۔ اپنی ہاٹیکس کی ساری لائٹس جلا دو، بڑی بہن تم اپنے بال کھول دو اور ہیلی کاپٹر سروں کے عین اوپر آ جائے تو زور زور سے ہاتھ ہلاؤ۔ ضرور تم لوگ شناخت کر لیے جاؤ گے۔“ لمحوں میں ہی ہیلی کاپٹر ان کے سروں پر تھے۔ حفاظتی بلندی سے ہیلی کاپٹروں نے روشنی کے گولے فائر کیے تھے جن کے سبب ہر طرف دن کا سا سماں ہو گیا تھا۔

فراریوں کی طرف سے ہیلی کاپٹرز پر فائرنگ ہوئی جس کے بعد کوبرا کی ہیوی مشین گنز گرجنے لگیں۔

کیری نے ہاٹیکس کی ساری روشنیاں جلا دیں اور میگی نے سر پر بندھا پگڑی نما کپڑا کھول دیا۔ اس کے سنہری بال نمایاں ہو گئے تھے۔

روشنیوں نے کوبرا کے ساتھ آنے والے ٹرانسپورٹ ہیلی کاپٹر کو متوجہ کر لیا۔ وہ فوراً ہی ان کے سروں پر منڈلانے لگا۔ تیز سرچ لائٹ کا دائرہ ”سیاح جوڑے“ پر تھا۔

آنکھیں موندتے ہوئے راغ بے حد مطمئن تھا۔ اس دھرتی کے مہمان اب محفوظ ترین ہاتھوں میں تھے۔

راغ، ایک بھٹکا ہوا فراری بالآخر قومی ہیرو بننے جا رہا تھا۔

☆☆☆

دو ماہ بعد فن لینڈ میں منجمد جھیل بیکال کے کنارے ایک سنگی بینچ پر راغ اور بانو بھاری لبادوں میں لپٹے ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

راغ، بانو کو دیکھے گیا۔ خوف اور گھٹن کے ماحول سے نکل کر وہ کتنی نکھر گئی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں شفاف تر ہو گئی تھیں۔ اور گالوں پر گلاب سے کھل اٹھے تھے۔

اس کی نظروں کی تپش محسوس کر کے بانو کا رنگ مزید گلابی ہو گیا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس نے شرگیں شوخی سے پوچھا۔

”دیکھ نہیں رہا...... اپنی قسمت پر رشک کر رہا ہوں۔“

بانو نے اُس کا بازو نوچ لیا۔

راغ نے مصنوعی آہ بھری۔ ”پاگل لڑکی! میرا بازو ابھی مکمل طور سے ٹھیک نہیں ہوا۔“

بانو مزید شوخ ہو کر اس کے بازو کے ساتھ لگ گئی۔

”اب؟“ اس نے معنی خیز شوخی سے پوچھا۔

”ہاں، اب بالکل ٹھیک ہے۔“

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

بانو بولی۔ ”میرے خیال میں چلنا چاہیے۔ تمہاری ”بڑی بہن“ کھانے پر انتظار کر رہی ہوگی۔“ راغ نے کہا۔

”ہاں، چلو۔ اس سے پہلے کہ کال آ جائے۔“ انہوں نے واپسی کی راہ لی۔

پختہ روش پر اس کے بازو سے لگ کر چلتے ہوئے بانو کا لہجہ تبدیل ہوا۔ ”میں تو یہاں ہر طرف برف دیکھ دیکھ کر اُکتا گئی ہوں۔“ ساتھ ہی وہ آزردہ سی ہوئی۔ ”کیا ہم اپنے گاؤں کبھی نہیں جا سکیں گے؟“

راغ نے بھرپور بشاشت سے کہا۔ ”اگلے سال جائیں گے نا! کیری نے دو درجن سے زائد سیلانیوں کو بک بھی کر لیا ہے۔ مغربی سیاحوں کی پوری برات...... گاؤں میں ہمارے ولیمے میں شرکت کرے گی۔“

بانو نے خوشی اور شرم کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی بغل میں سر چھپا لیا۔

❖❖❖